مستنصر حسین تارڑ

اے غزالِ شب...

(ناول)

سنگ میل پبلیکشنز

اے غزالِ شب...

(ناول)

مستنصر حسین تارڑ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

میرے دوست اور میرے بھائی نیاز احمد کے لئے
جو میرے ادبی سفر میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئے!

891.4393 Tarar, Mustansar Hussain
Ay Ghazaal-i Shab/ Mustansar
Hussain Tarar.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2013.
296pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2013

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2595-7
ISBN-13: 978-969-35-2595-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اے غزالِ شب،
تیری پیاس کیسے بجھاؤں میں،
کہ دکھاؤں میں وہ سراب جو مری جاں میں ہے،
وہ سراب ساحرِ خوف ہے،
جو سحر سے شام کے رہگذر میں فریبِ رہروِ سادہ ہے،
وہ سراب زادہ، سراب گر، کہ ہزار صورتِ نو بنو میں قدم قدم پہ ستارہ ہے،
وہ جو غالب و ہمہ گیر دشتِ گماں میں ہے،
مرے دِل میں جیسے یقین بن کے سما گیا،
مرے ہست و بود پہ چھا گیا،
اے غزالِ شب،
اُسی فتنہ کار سے چھپ گئے،
مرے دیر و زودبھی خواب میں،
مرے نزد و دور حجاب میں،
وہ حجاب کیسے اٹھاؤں میں جو کشیدہ قالبِ دِل میں ہے،
کہ میں دیکھ پاؤں درونِ جان،
جہاں خوف وغم کا نشاں نہیں،
جہاں یہ سرابِ رواں نہیں،
اے غزالِ شب.....

(ن م راشد)

آ ک کے زہر موہرہ رنگ کے دبیز پتے جن کی رگوں میں زہریلا، گھنا اور لیس دار دودھ ٹھہرا ہوا تھا اور اُن پتوں کی گھناوٹ میں متعدد ڈوڈے اپنے دہن بھینچے ہوئے منتظر تھے کہ اُن میں سے کون ہے جس پر جُھلستی آگ برساتی تپش یوں اثر کرتی ہے کہ اُس کا مُنہ کُھل جاتا ہے اور اُس میں سے ایک آک کی بڑھیا، روئی کے ریشوں سے بنی ایک مائی بوڑھی برآمد ہوتی ہے جس کی نرم سفیدی کے اندر ایک سیاہ بیج ہے جسے وہ مائی بوڑھی اُڑائے لئے جائے گی، دور دراز کی زمینوں تک جہاں وہ ہانپ کر گرے گی اور اُس میں پوشیدہ بیج کو وہ زمین اپنی آغوش کی گرمی میں یوں سینچے گی کہ وہاں آک کے ایک اور بُوٹے کی کونپل پھوٹے گی.. نسل کا تسلسل جاری رہے گا..

اور تب اُس شُکر دوپہر میں.. اُس چٹیل ویرانے میں آک کے اُس بوٹے کے ایک ڈوڈے کو تپش نے پکا دیا، اُسے یوں بالغ کر دیا کہ اُس کا مُنہ کُھل گیا.. اُس میں پوشیدہ سفید ریشہ ریشمی مائی بوڑھی جو ایک مدت سے منتظر تھی کہ کب اُس خول کا مُنہ کُھلے اور کب وہ آزاد فضاؤں کی مسافر ہو جائے.. بے چینی سے نمودار ہوئی اور لُو کے گرم ہنڈولے پر سوار فضا میں ڈولنے لگی... وہ ہوا کے دوش پر بے وزن سفید ریشم کیفیت میں تیرتی پھرتی تھی جب وہ اُس کی کار کی ونڈ سکرین سے جا ٹکرائی اور یہ کار کہیں بُوریوالا کے آس پاس نہ تھی جہاں اُس نے جنم لیا تھا اور جہاں موسم تپش کے تھے بلکہ یخ بستگی کی زد میں آئے ہوئے ماسکو شہر کی بالشوئی سٹریٹ پر رواں تھی.. مائی بوڑھی کے سفید روئی ریشے کار کی ونڈ سکرین سے چپک گئے۔

''تم کہاں آ گئے ہو ظہیر الدین؟'' مائی بوڑھی نے پوچھا۔

یہ سوال پُوچھنے کے بعد وہ کُچھ دیر تو ہوا کے دباؤ سے ونڈ سکرین پر چپکی رہی اور پھر ایک نادیدہ جھونکے کی زد میں آ کر اپنی چپک سے جُدا ہو کر.. ونڈ سکرین سے الگ ہو کر اُس کی نظروں کے سامنے ڈولتی فضا میں ایک بیلے رینا کی مانند ہلکورے لینے لگی..

گالینا تو چُپ رہتی تھی.. اپنی وہیل چیئر میں چُپ رہتی تھی لیکن اُس کی بیٹی سویٹ لانا ایک طنزیہ مسکراہٹ اپنے باریک ترشے ہوئے ہونٹوں پر سجائے کہتی تھی کہ ڈیڈی.. ان دنوں آپ کھو سے گئے ہیں.. آپ ہمہ وقت کسی خواب میں رہتے ہیں اور کسی آک کے بُوٹے میں سے جنم لینے والی سفید ہلکی پُھلکی روئی سے بھی ہلکی پریوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں جو مائی بوڑھیاں کہلاتی ہیں.. پلیز یُوں حواس گم نہ کیجیے.. کچھ ضبط کیجیے.. یہ محض ایک ذہنی انتشار ہے.. آپ کا وہم ہے..

سویٹ لانا.. اگر یہاں اِس لمحے.. جب وہ اپنے فلیٹ سے تازہ مشروم خریدنے کے لئے کسانوں کی سبزی

منڈی کی جانب جانے کے لئے نکلا تھا.. اُس کے ہمراہ ہوتی تو وہ دیکھ لیتی کہ یہ اُس کا وہم نہیں ہے.. مائی بوڑھیوں کا وجود ہوتا ہے اور ماسکو میں بھی ہوتا ہے.. وہ اس مائی بوڑھی کو جو ابھی اُس کی کار کی ونڈسکرین سے چپک گئی تھی، پھر الگ ہو کر اُس کی نظروں کے سامنے ڈولتی پھرتی تھی پکڑ کر سویٹ لانا کے سامنے اپنی بند مٹھی کھول کر ثابت کر سکتا تھا کہ نہ.. یہ اُس کا وہم نہیں ہے.. وہ ذہنی انتشار کا شکار نہیں ہے..

اُس نے اپنی پرانی مسکوا کار کی بریکوں پر پاؤں کا پورا بوجھ ڈالا کہ یہ سوویٹ زمانوں کی کار اگرچہ مضبوط اور گٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی بریکوں پر جب تک ڈرائیور اپنا پورا وزن نہ ڈالتا تھا، یہ رُکتی نہ تھی..

فٹ پاتھ کے برابر میں پارک کر کے وہ کار سے باہر آ گیا..

اُس ثبوت کو دبوچنے کی خاطر جو ماسکو کی سردیلی ہواؤں میں اُس کی نظروں کے سامنے ڈولتا پھرتا تھا..

اور وہ مائی بوڑھی وہاں ہوا کے دوش پر سوار ہلکورے لیتی ہوئی گویا اُسے ایک دعوت مبارزت دیتی تھی کہ تم ساٹھ برس پیشتر جیسے بوریوالا کے اُس ویرانے میں کیسے اشتیاق سے مجھے مُٹھی میں قید کرنے کے لئے دیوانہ وار میرا پیچھا کیا کرتے تھے تو آؤ ظہیر الدین آج بھی مجھے پکڑ لو..

اور ظہیر الدین نے مصمم فیصلہ کیا کہ وہ بہرطور اُس کی دعوت قبول کر کے اُسے دبوچ کر ہی رہے گا.. سویٹ لانا کو دکھلائے گا کہ دیکھو یہ ایک سراب یا ذہنی فتور نہ تھا.. مائی بوڑھیاں ہوتی ہیں..

ماسکو کے آسمان پر بے انت مائی بوڑھیاں اڑتی پھرتی تھیں..

جن رُوسی راہگیروں نے.. سڑک پر سے گزرتے ڈرائیوروں نے.. آس پاس بلند فلیٹوں کی کھڑکیوں میں براجمان بیکار بوڑھوں نے اور فٹ پاتھ کے کنارے پیڈل مارتے نوجوان سائیکل سواروں نے گندمی رنگ کے سراسر سفید بالوں والے ایک مشرقی شباہت کے بوڑھے شخص کو دیوانہ وار فضا میں ہاتھ چلاتے، کسی شے کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے دیکھا تو اُن کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ ہمارے رُوس میں مقیم یہ غیرملکی واقعی غیرتہذیب یافتہ اور خبطی ہیں.. آخر یہ بوڑھا کسی شے کے تعاقب میں دیوانہ ہوا جاتا ہے..

اور اگر ظہیر الدین اُن سب سے مخاطب ہو کر کہتا کہ سُنو.. میں تو اپنے قصبے بوریوالا کے ویرانے میں آج سے ساٹھ برس پیشتر کے زمانوں میں ہوں اور آک کے ڈوڈوں میں سے پھوٹنے والی ایک مائی بوڑھی کے تعاقب میں ہوں.. ذی ہوش ہوں.. تو وہ اُس پر ترس کھا کر اُسے اطلاع کرتے کہ.. کامریڈ تم کس فریب میں مبتلا ہو.. یہ مائی بوڑھیاں وغیرہ ہرگز نہیں ہیں.. مئی کے اس مہینے میں ماسکو کے سُنبل کے درختوں میں سے یہ روئی کے گالے برآمد ہوتے ہیں.. یہ تو سُنبل یا سیمل کی سفید اسپرائیں ہیں جو اڑتی پھرتی ہیں.. تم کس دھوکے میں آ گئے ہو..

پر ظہیر الدین کہاں کسی کی سنتا تھا..

وہ اُس آک کی بڑھیا کے پیچھے اُسے گرفت میں لینے کی خاطر فضا میں ہاتھ چلاتا دیوانگی میں مبتلا تھا..

اُس کے تعاقب میں پرواہ نہ کرتا تھا کہ راہگیر، ڈرائیور، کھڑکیوں میں براجمان بوڑھے یا نوجوان سائیکل سوار اُسے خبطی سمجھ رہے ہیں..

وہ سفید اپسرا..روئی کے ریشوں کی بُنت سے بُنی ہوئی مائی بوڑھی اُسے چھیڑتی اڑتی جاتی تھی..آؤ ظہیر الدین.. مجھے پکڑلو..

سکول سے واپسی پر وہ سیدھا گھر نہ جاتا..

ریلوے لائن کے پار...چاول چھڑنے کے کارخانوں اور جہاں مٹی سے لیپی ہوئی زمین پر کپاس کے دھوپ میں سلگتے سفید انبار ڈھیر تھے اُن سے پرے وہ ویرانہ تھا، جہاں ایک وسعت میں آک کے بُوٹوں اور جھڑ بیریوں کے سوا اور کچھ نہ تھا... ہاں کچھ گرگٹ تھے جو گرمی کی شدت سے بولائے پھرتے تھے..اور کچھ سانپ تھے جو ذرا حرکت کرتے تو اُن کے آس پاس ساکت پڑی ٹڈیاں ہراساں ہو کر اُچھلنے لگتیں..

وہ بے دھڑک..اپنی تختی سینے سے لگائے اُس ویران جہان میں داخل ہو جاتا اور پھر کسی جنگلی بیروں کی جھاڑی کی اوٹ میں کہ وہاں دھوپ کی تندی سے کچھ بچاؤ ہوتا تھا..دبک کر آک کے اُس ایک بُوٹے کی جانب ایک عالم تحیّر میں آنکھیں وا کیے دیکھنے لگتا جس کے کسی ایک ڈوڈے کا مُنہ یکدم کُھل سکتا تھا اور اُس میں سے ایک مائی بوڑھی جنم لے سکتی تھی..

اور جب کبھی کوئی ڈوڈا تپش سے بالغ ہو کر اپنا مُنہ کھول دیتا اور اُس میں سے ایک مائی بوڑھی پُھوٹ نکلتی تو وہ جنگلی بیروں کی جھاڑی کی پناہ گاہ میں سے نکل کر اُسے دبوچ لینے کی خاطر اُس کا پیچھا کرنے لگتا..

اور یہ مائی بوڑھی کبھی بھی اُس کی گرفت میں نہ آسکی..

وہ اُسے اپنی مٹھی میں دبوچ کر محض یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس ریشے دار ملائم بے وزن شے کے اندر جو ایک سیاہ بیج معلق ہے تو کیا اُس کی..مائی بوڑھی کی رُوح اُس میں بند ہے..

پر وہ ہمیشہ ناکام رہتا..

لیکن آج عمر بھر کی ناکامی کا ازالہ ہو جانے کو تھا کہ اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ ماسکو کی ہواؤں میں اٹھلاتی مائی بوڑھی کے روئیں ریشوں پر بند ہونے کو تھا..یہ ثابت ہونے کو تھا کہ وہ نہ تو کسی وہم کا شکار تھا اور نہ ہی ذہنی انتشار میں مبتلا بوڑھا تھا..وہ ایک ہوا کے دوش پر جھولتی مائی بوڑھی اُس کی گرفت میں آیا ہی چاہتی تھی..ظہیر الدین مجھے پکڑلو..

وہ ہولے ہولے برف کے گالوں کی مانند فٹ پاتھ کے برابر میں کثیر المنزلہ فلیٹوں کے گھیرے میں آئے ہوئے سُنبل کے قد آور درختوں میں سے جنم لیتی بہکے بہکے اترتی تھیں..اُن درختوں کے گھنے پن میں کہیں کہیں گدلے اور بے رُوح آسمان کے پیوند لگے ہوئے تھے..یہ بوریوالا کے آسمان کی مانند شفاف اور کٹیلا نہ تھا کہ ایک گرم نیلی کٹار کی طرح دل میں اترتا جائے..

ماسکو کے آسمان نے بھی اُس کی ان آنکھوں کے سامنے کیسے کیسے رنگ بدلے تھے..تب یہ آنکھیں چمکیلی اور امید کے چراغوں سے روشن ہوا کرتی تھیں جن کے اندر سوائے سُرخ سویرے کے خواب کے اور کوئی خواب نہ تھا..اُن

زمانوں میں اُس کا پورا منہ زورنوخیز بدن سُرخی کی سرمستی سے دہکتا اُسے ایک دائمی خمار میں لے جاتا جہاں سوائے تیسری دنیا کے دھتکارے، کچلے ہوئے، ستم رسیدہ اور غربت کے مارے لوگوں کے اور کوئی نہ ہوتا..ایسے لوگ جن کے پاس اپنے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کے کھونے کے سوا اور کچھ نہ تھا..اور یہ وہ تھا ظہیرالدین جس نے اُن کے ہاتھ تھام کر اُنہیں ذلت کے گڑھوں میں سے نکال کر ایک سُرخ جنت کی جانب لے جاتا تھا..

کیا کبھی کسی نے اپنے کسی ایک خواب کی اتنی بھاری قیمت ادا کی تھی جتنی وہ کر رہا تھا..اُس جیسے اور بھی بہت تھے..مختلف قومیتوں اور نسلوں کے..افریقی، ایشیائی اور جنوبی امریکی جو اپنی آبائی شناخت اور عقیدے ترک کر کے ایک سُرخ سویرے کی نمود کی چاہت میں یہیں اُس ''مزدوروں کی سلطنت'' میں رچ بس گئے تھے کہ وہ اُس جنت کے وعدوں پر کیسے یقین کرتے کہ اُن کے آس پاس انسانیت کے پاؤں میں جبر اور غربت کی زنجیریں تھیں، بے شک وہ قادر و عادل ہے لیکن اُس کے جہاں میں بندۂ مزدور کے اوقات بہت سخت ہیں تو پھر وہ کیسا قادر و عادل ہے..اور اُس پر انحصار کیا کرنا..

ظہیرالدین کے بائیں رخسار پر ایک ہلکی سی ابھی تک خون آلود خراش موجود تھی اور یہ تب اُس کے ماس پر کھنچی تھی جب اُس نے آئینے میں اپنے آپ کی بجائے اپنے باپ کو دیکھا تھا اور اُس کا ہاتھ لرزش میں آ گیا تھا..اور یہ آج صبح کا قصہ تھا جب وہ اپنے مختصر غسل خانے میں شیو بنا رہا تھا اور سویٹ لانا اور بورس باری باری دروازے کو پیٹ رہے تھے کہ یہ فلیٹ کا اکلوتا غسل خانہ تھا اور اُنہیں بھی تیار ہو کر اپنے کام کاج پر جانا تھا..

آئینے میں بوریوالا ٹیکسٹائل مِل میں کام کرنے والے ہزاروں مزدوروں کی یونین کا متفقہ لیڈر..ایک سُرخ پرچم لہراتا..اُس کا باپ..ہاں یہ اُس کا چہرہ تھا..

شمس الدین انقلابی کا پُرغضب چہرہ..وہ احتجاجی جلوسوں کی قیادت کرتا جب سٹیج پر کھڑا ہوتا تو پس ماندگی اور لاچارگی کی چکّی میں پسے ہوئے لوگ اُسے ایک ایسے عیسٰی کے روپ میں دیکھتے جو اپنی بھیڑوں سے مخاطب ہو..لیکن وہ انہیں خدا کی سلطنت کی نوید نہ دیتا، مزدوروں کی سلطنت کی خوشخبری سناتا..حکومتِ وقت کی کال کوٹھڑیاں بھی اُس پر رشک کرتیں کہ یہ کیسا شخص پسِ زنداں ہے جو بکاؤ مال نہیں..کہ اُن میں سے کچھ تھے جو یہ سختیاں جھیل نہ سکے اور مناسب معاوضے کے عوض تائب ہو گئے لیکن شمس الدین انقلابی کی رگوں میں جو خون تھا اُس کی گردش کا سبب مارکس، اینگلز اور لینن کے نظریات اور اُن کے فرمودات تھے..ان پیغمبروں کی کتابیں جو اُس کے دو کمروں کے بوسیدہ کوارٹر میں سجی تھیں، وہ آسمانی صحیفے تھے جن پر وہ ایمان لے آیا تھا..اُسے توقع تھی کہ کم از کم وہ قادر و عادل ہوں گے..

ہر شخص اُسی عقیدے کو دل و جان سے حق سچ سمجھتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے..ظہیرالدین نے بھی جب ہوش سنبھالا تو اُس کے کانوں میں اذان کی بجائے مارکس، اینگلز اور لینن سرگوشیاں کرنے لگے اور وہ اُن پر ایمان لے آیا..

کوارٹر کی سیلن زدہ دیواروں پر انہی باریش زعماً کی تصویریں چسپاں تھیں..

بے شک شمس الدین ایک مارکسی انقلابی تھا لیکن وہ اپنے آپ کو مولانا حسرت موہانی کے تتبع میں ایک مارکسی مسلمان بھی قرار دیتا تھا..ایک نہایت شریف النفس قاری صاحب روزانہ اُن کے کوارٹر میں داخل ہوتے، نظریں جھکائے دیواروں پر چسپاں لادین کیمونسٹ سُرخوں کی تصاویر دیکھنے سے اجتناب کرتے، وہ اسے قرآن پاک کا درس دیتے..

قاری صاحب کبھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکے کہ آخر وہ ایک بے دین سُرخے کے بیٹے کو قرآن پاک پڑھانے کے لئے کیوں رضامند ہو گئے تھے..دراصل دل ہی دل میں وہ ان سُرخوں کے لئے ایک نرم گوشہ رکھتے تھے..وہ خود ایک افلاس زدہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، فاقوں اور ذلّتوں سے آشنا تھے اور ماں باپ کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ اُنہیں کسی عام سکول یا کالج میں پڑھایا جا سکتا تو وہ ایک دینی مدرسے کے سپرد ہو گئے۔وہ اپنے بڑے مولانا کی رفاقت میں..گلی محلے میں..قرآن پاک پڑھنے، کسی مُردے کی شفاعت کی خاطر رٹی رٹائی دعائیں مانگنے، قُل کے موقع پر زیادہ سے زیادہ سیپارے پڑھنے تا کہ مرحوم کی رُوح تک ان کا ثواب پہنچے..اکثر جاتے رہتے..یہ ایک نوعیت کی مقدس گداگری تھی اور وہ کُڑھتے رہتے..ایسی محافل میں سب طالب علموں کی نگاہیں..سفید براق چادروں پر براجمان جھومتے، قرآن پڑھتے، ہمیشہ اُن کھجوروں، پکوڑوں، کیلوں اور امردوں پر مرکوز رہتیں جو اُن کے سامنے طشتریوں میں سجے ہوتے اور وہ اللہ معاف کرے، دل ہی دل میں دعائیں کرتے کہ آخر کب آخری دعا ہو گی اور وہ ان نعمتوں پر پِل پڑیں گے اور اللہ کا شکر ادا کریں گے..قاری صاحب اگرچہ اب مناسب حد تک آسودہ ہو چکے تھے لیکن وہ اُن ذلّتوں سے داغے جا چکے تھے..اُنہیں شمس الدین انقلابی کی صورت میں ایک ایسا شخص نظر آتا تھا جو ایسی ذلّتوں کے داغ مٹانے کی خاطر زندگی وقف کیے ہوئے تھا..کاش کہ وہ بے دین نہ ہوتا..

ظہیرالدین کوئی ایسا روشن طبع طالب علم بھی نہ تھا، اُس کی لیاقت معمولی درجے کی تھی..تعلیمی کارکردگی قابلِ توصیف نہ تھی..

پاکستان میں سوویت یونین کا سفارت خانہ شمس الدین انقلابی ایسے نظریاتی مزدور لیڈروں پر اپنی عنایات کی بارش کرنے کی کوشش میں مشغول رہتا لیکن شمس الدین ان عنایات کی بارشوں میں بھیگنے سے گریز کرتا کہ وہ کسی صلے یا ستائش کا تمنائی نہ تھا..وہ دل و جان سے مساوات اور عدل پر مبنی ایک ایسے نظام کے لئے جدوجہد کر رہا تھا جس کا وعدہ اُس کے اسلام نے تو کیا تھا لیکن وہ ایفا نہ ہوا تھا..لیکن جب سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری نے بہ نفسِ نفیس اُسے پیشکش کی کہ ہم آپ کے برخوردار کو ماسکو کی سٹیٹ یونیورسٹی میں جو بعد میں کانگو کے عظیم انقلابی لیڈر پیٹرس لومبا کے قتل کے بعد پیٹرس لومبا یونیورسٹی کہلائی، ایک خصوصی سکالرشپ کے تحت پڑھائیں گے اور وہ وہاں سے اپنی پسند کے موضوع پر ڈگری حاصل کر سکتا ہے تو شمس الدین کے اجتناب پر اولاد کی محبت حاوی ہو گئی اور وہ انکار نہ کر سکا..اس نوعیت کی سہولت سوویت سفارت خانہ نہ صرف پاکستان بھر کے بلکہ دنیا بھر کے انقلابی اور ٹریڈ یونین کے لیڈروں اور ہم خیال کمیونسٹوں کے بچوں کو بخوشی فراہم کرتا تھا..

ظہیرالدین نے اپنے والد کے مشورے سے یونیورسٹی میں اپنے لئے ''مارکسی ادب تیسری دنیا میں'' کے موضوع کا انتخاب کیا..لیکن وہ جو بوریوالا کے ایک ٹاٹ سکول کا اور وہ بھی درمیانی لیاقت کا حامل ایک نوجوان تھا اتنے بڑے علمی اور تحقیقی بوجھ کو برداشت نہ کر سکا اور پڑھائی کے دوسرے سال میں ہی ہمت ہار بیٹھا..اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا..

شاید اس کی ایک وجہ گالینا بھی تھی..

ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں ظاہر ہے رُوسی زبان رائج تھی اور غیر ملکیوں کو پہلے برس میں داخلے سے قبل چھ ماہ کا روسی زبان کا ایک لازمی کورس مکمل کروایا جاتا تھا..ظہیر اگرچہ بہت روشن نہ تھا لیکن حیرت انگیز طور پر یہ زبان سیکھنا اُس کے

لئے دشوار ثابت نہ ہوا اور وہ دیگر افریقی اور جنوبی امریکی طالب علموں کی نسبت زیادہ آسانی سے رواں ہو گیا..

تو ایک وجہ گالینا بھی تھی..

وہ اُس کی ہم جماعت تھی..

ایک کھلے پھولدار فراک میں اُس کا کسی حد تک فربہ اگرچہ پُرکشش بدن اُس کی توجہ اور آنکھوں کو بھٹکاتا رہتا تھا..

بوریوالا کے ٹھیٹھ پنجابی دہقانی قصبے کے ظہیرالدین کے لئے وہ ایک اپسرا ایک سفید دودھ رنگت کی خمار آلود صراحی تھی جس کے اندر جو مے تھی، چھلک چھلک جاتی تھی جسے صرف نصیبوں والے ہی پی سکتے تھے..

وہ..گالینا..جو ماسکو کے نواح میں واقع ایک اجتماعی فارم میں جھونپڑا ڈالے ایک کھیت مزدور کی بیٹی تھی اور تہہ دل سے ایک ایسے نظام کے ظہور پذیر ہونے پر یقین رکھتی تھی جو دنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں کو ایک سرخ سویرے میں رنگ کر اُن کی قسمت بدل دے گا..وہ پاکستان سے آئے ہوئے اس قدرے جھینپو اور کلاس میں اکثر چُپ رہنے والے بُدھو سے خوش آثار نوجوان پر فدا ہوگئی..رُوسی لڑکیاں عام طور پر بہت پریکٹیکل ہوتی ہیں، وہ کسی الوہی خوابناک محبت کے انتظار میں زندگی نہیں گنواتیں، اگر کوئی دل کو بھا گیا ہے اور اُس کے کمیونسٹ نظریات بھی مستحکم ہیں تو اُسے کیوں کھویا جائے..تب وہ اپنے پھولدار فراک میں کیسی بھری بھری، متناسب اور بدن کو فوری طور پر قربت کے ہیجان سے آشنا کرنے پر قادر ہوا کرتی تھی..

اور اب..وہی گالینا..پچاس برس ہونے کو تھے..صرف دو بچے پیدا کرنے کے بعد اتنی فربہ اور بدہیئت ہو چکی تھی کہ اُسے چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی اور وہ اکثر وہیل چیئر کا سہارا لیتی..نہ صرف چلنے پھرنے بلکہ اُسے تو بولنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی.. یوکرین کی تیزاب صفت واڈکا اُس کی ہڈیوں کو گلا رہی تھی، اُس کے پھیپھڑوں میں چھید کر رہی تھی لیکن وہ اُس کے بغیر سانس نہ لے سکتی تھی..

وہ زمانے جب ابھی خواب سرنگوں نہ ہوئے تھے..

سوویت یونین میں تیار کردہ ہر شے کی مانند، ساخت میں مضبوط اور دیرپا لیکن شکل میں بھدی اور ابتدائی.. چاہے وہ ایک ٹیلی ویژن ہو، کار ہو یا ٹریکٹر..وہ سائیکل بھی کچھ خوش نما نہ تھی..اُس کی گدی موٹے چمڑے کی تھی لیکن وہ دکھائی نہ دیتی تھی، گالینا کی بھاری پُشت نے اُسے یوں ڈھک رکھا تھا کہ اُس کے پیچھے پیچھے ایک اور سائیکل پر سوار ظہیرالدین ہونکتا بے دم ہوتا چلا آتا تھا، اُسے دریائے ماسکو کے کنارے شہر سے بہت باہر دور تک چلی جاتی سفید پگڈنڈی پر ایک اور سائیکل نظر تو آتی لیکن نہ تو اُس کے گھومتے ہوئے پہیے دکھائی دیتے اور نہ ہی آس پاس گزرتے برچ کے سفید جنگل..اور نہ ہی گالینا نظر آتی کہ وہ اپنے پھولدار فراک میں اڑتی چلی جاتی تھی..

ظہیرالدین اُن زمانوں کے پاکستانی نوجوانوں کی مانند ایک معصوم اور ان چھوئی معصوم کنواری روح تھا جو عورت اور جنس کا تجربہ تو کیا ان کے بارے میں تکنیکی معلومات بھی نہ رکھتا تھا..وہ کچھ زیادہ معصوم اس لئے بھی تھا کہ بڑے

شہر کا نہ تھا، بوریوالا کا تھا.. وہ اے حمید کی رومانویت اور وہی وہانوی اور دت بھارتی کے ناولوں کی ہیجان انگیزی میں پلا بڑھا تھا.. اور اپنی شلوار ہر سویر چپکتی ہوئی محسوس کر کے شرمندہ ہوتا رہتا تھا.. اسے قطعی طور پر کچھ اندازہ نہ تھا کہ ایک لڑکی کو کیسے رام کیا جاتا ہے.. کن ترکیبوں سے آمادہ کیا جاتا ہے اور اگر وہ آمادہ ہو جائے تو پھر اُس صورت حال سے بخوبی کیسے نپٹا جا سکتا ہے.. وہ ایک کھیرے کی مانند ہرا بھرا اور معصوم تھا.. چنانچہ پیش رفت گالینا نے کی.. اتوار کے روز کرائے کی سائیکلوں پر شہر سے باہر دریائے ماسکو کے کنارے پر پھیلے ہوئے اہل ماسکو کے من پسند برچ کے جنگلوں میں جا کر پکنک منانا اُس کی.. گالینا کی تجویز تھی..

ظہیرالدین کو پہلی بار احساس ہوا کہ یورپی اور خاص طور پر رُوسی لڑکیاں عام پاکستانی لڑکیوں کی نسبت زیادہ توانا اور مستحکم ہوتی ہیں.. اُن میں ایک دھانسو قسم کی مردانگی ہوتی ہے.. وہ اس سوشلسٹ نظام میں بے وجہ تو ٹریکٹر نہیں چلاتی تھیں، کھیتوں میں مردوں کے برابر اُن سے بڑھ کر مشقت کرتی تھیں.. ماسکو میں بیشتر ٹیکسی ڈرائیور لڑکیاں بلکہ عورتیں تھیں.. اُس نے انہیں دریائے ماسکو میں لنگر انداز سٹیمروں میں سے وزنی گانٹھیں اور کریٹ اپنی کمر پر بوجھ کر کے ڈھوتے دیکھا تھا.. ماسکو کے ایک مرکزی چوک میں سوشلسٹ انقلاب کی نمائندگی کرتا ایک شاندار مجسمہ نصب تھا تو اُس میں توانا بدن کے ایک مزدور کے ہاتھوں میں اگر ایک ہتھوڑا بلند تھا تو اُس کے برابر میں جو عورت ایک درانتی کو تھامے ہوئے کھڑی تھی تو وہ بھی برابری کی سطح پر شریک تھی..

ماسکو کی آبادی کے آخری آثار کا اختتام ہوا اور وہ دونوں کھلی فضا میں سانس لینے لگے.. ابھی تک وہ پہلو بہ پہلو چلے آتے تھے اور پھر گالینا اُس سے آگے نکلنے لگی.. اُس نے پیڈل مار مار کر اپنے آپ کو ہلکان کر لیا لیکن وہ پیچھے رہتا گیا..

گالینا اپنی سائیکل کی کاٹھی کو اپنے کولہوں میں روپوش کرتی اڑتی چلی جا رہی تھی.. اُس کا پھولدار فراک کبھی کبھار ہوا کے کسی تیز جھونکے کی زد میں آ کر اوپر اٹھتا اور اُس کی سفید دودھیا ٹانگیں نمایاں ہو کر ظہیرالدین کی پسینہ بھری آنکھوں کو خیرہ کر دیتیں..

وہ دوپہر.. برچ کے جنگلوں کی چھاؤں میں..

نتھنوں میں درختوں کے تنوں کے گرد بچھی جنگلی گھاس کی ہریاول کی کچی مہک اور اُس کے برابر میں لیٹی ہوئی گالینا کے پھولدار فراک میں نیم پوشیدہ اُس کے گورے بدن کی عورت دیوانگی خوشبو.. یہ کیسی مہک اور خوشبو تھی جو نہ کبھی شیراز کے گلابوں سے کشید ہوئی اور نہ کسی عطار کے مرتبان میں سے اٹھی.. اور وہ جو برفانی بلندیوں پر انجانے اور ان دیکھے پھول کھلتے ہیں یا ستمبر کے آخر میں ہارسنگھار کے سفید زرد ڈنٹھلوں والے پھول سورج کی پہلی کرنوں کی تمازت کی تاب نہ لا کر ٹپ ٹپ گرتے ہیں.. یہ سب عطر ڈال سے گر چکے یا توڑے گئے پھولوں سے کشید ہوتے ہیں.. جب کہ وہ جو گالینا کے پھولدار فراک میں پوشیدہ اُس کی قربت کے باعث حدّت میں آئے ہوئے بدن میں سے مہک اٹھتی تھی وہ اُن سب پر حاوی ہوتی تھی.. یہ مہک زرد پھولوں سے نہیں ایک زندہ اور گرم بدن عورت میں سے پسینے اور خود سپردگی میں سے کشید ہوتی دُھوم مچاتی تھی..

ظہیرالدین کیسے تاب لاسکتا..ایک معصوم،اب تک منجمد مکھن کیسے نہ پگھل جاتا۔

وہ ساری عمر اُس دوپہر کے اُس لمحے کو یادداشت میں زندہ کر کے حساب کتاب کرتا رہا کہ کیا اس خودسپردگی نے ایک بے اختیاری کی کیفیت میں جنم لیا یا یہ ایک طے شدہ منصوبہ تھا۔

وہ دونوں تو کیا اُن کی سائیکلیں بھی گھاس پر اوندھی پڑی ہانپتی تھیں..اُن کے بدنوں تلے جو گھاس تھی اُس میں پہلے گیلاہٹ نہ تھی..اُن کے اوپر برچ کے شجر بلند ہوتے چلے جاتے تھے اور اُن کی آخری شاخوں تک وہ مہک پہنچتی تھی جس میں وصال کے گیلے سندیسے تھے اور ہوا اُن کی قربت کی خبر ہرسُو عام کرتی تھی..اگلے اتوار اُنہوں نے ایک نہایت مُردہ اور پتھر دل سرکاری دفتر میں حاضر ہو کر باقاعدہ شادی کر لی..

بوریوالا..گالینا کے لئے ایک ہول تھا..

وہ اسے پسند نہ کر سکی..

ظہیرالدین نے بہانہ تو یہی کیا کہ ہم گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کی خاطر محض چند روز کے لئے ماسکو سے پاکستان آئے ہیں تاکہ تم دیکھ لو کہ میرا آبائی وطن کیسا ہے..اس کے شجر،گُل بوٹے اور کھیت کھلیان،نہریں اور دریا اور موسم کیسے ہیں..میرے ماں باپ سے ملاقات کر لو..لیکن در پردہ..وہ لوٹنا نہیں چاہتا تھا..وہ گالینا کے ردّعمل کا منتظر رہا..اور وہ ایک کٹڑ کمیونسٹ ہونے کے باوجود ایک بیوی کی حیثیت سے ایک سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حامل تھی..اُسے آسائشیں اور سہولتیں درکار تھیں،ایک مہذب معاشرہ درکار تھا..وہ ایک کامریڈ..نظریاتی حوالے سے اُس سے بڑھ کر متحرک اور باعمل شمس الدین کے دو کمروں کے بوسیدہ کواٹر میں زندگی کرنے سے مفاہمت نہ کر سکی..

اور شمس الدین کے لئے..گالینا،اُس کی بہو،کوئی عام سی لڑکی نہ تھی..وہ ایک سُرخ سویرا تھی جو اُس کے عُسرت زدہ کواٹر میں طلوع ہو گیا تھا..وہ ہمیشہ اسے نہایت عقیدت اور احترام سے تکتا..کہ میں کیسا بخت آور ہوں کہ میرے اس گھروندے میں لینن کے دیس کی،سوویت یونین کی سرزمین پر جنم لینے والی ایک لڑکی..میری بہو کے رُوپ میں اُتری ہے..میرا بس چلے تو میں اُس کے پاؤں دھو دھو کر پیوں..

ایک شب،جب گالینا کوارٹر کے صحن میں واقع جڑوں والے کنویں کی منڈیر پر تادیر ماحول کی یکسانیت سے بیزار ہو کر بیٹھی رہی اور پھر نیند کی ایک گولی پھانک کر بان کی ایک چارپائی پر جا سوئی تو وہ اپنے باپ کے ساتھ تنہا ہوا..

''ابّا..آپ اس ملک میں جس نظام کو لاگو کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں میں اُس نظام میں پہنچ چکا ہوں..کوئی دن جاتا ہے جب دنیا بھر کے کچلے ہوئے لوگ اپنی زنجیریں توڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور ہم سب بلاتفریق ملت و مذہب..ایک ہی مساواتی کڑی میں پروئے جائیں گے..میں اُس کمیونسٹ نظام کے پایۂ تخت میں ہوں..اور میں دنیا بھر میں سُرخ انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد میں معاون ثابت ہو سکتا ہوں..وہیں ٹھہرنا چاہتا ہوں..آپ کے خواب میں زندگی کرنا چاہتا ہوں..''

شمس الدین اپنے بیٹے کے اندر رونما ہونے والی اس تبدیلی پر حیران تو ہوا کہ اُس کی لیاقت تو معمولی ہوا کرتی

تھی اور اُن زمانوں میں اُسے کمیونزم سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی..اور اسے اس امکان پر فخر بھی ہوا کہ اُس کا بیٹا ایک بڑی بین الاقوامی تبدیلی میں معاون ثابت ہوسکتا ہے تو اُس نے بخوبی اجازت دے دی..

گالینا نے سُکھ کا سانس لیا..

بے شک وہ میلوں ٹھیلوں اور نوجوانوں کے اجتماع میں نہایت پُر جوش انداز میں انقلابی ترانہ "انٹر ناشنل" گایا کرتی تھی پر وہ دل سے انٹرنیشنل نہ ہوسکتی تھی، صرف رُوسی ہوسکتی تھی..

شمس الدین انقلابی ایک کمیونسٹ ہونے اور مزدوروں کو مسلّح انقلاب کی ترغیب دینے کے جُرم میں حسن ناصر کے ہمراہ گرفتار ہوا، برف کی سلیں، پانی کی اذیت، آنکھوں میں ریت اور متعدد پسلیاں اور ہڈیاں شکنجوں میں تڑوانے کے بعد..نہ صرف حسن ناصر کی لاش کو لاہور کے شاہی قلعہ کی فصیل سے نیچے پھینک دیا گیا بلکہ کچھ لمحوں بعد شمس الدین انقلابی کا ابھی تک زندہ وجود بھی قلعے کی دیواروں پر سے دھکیل دیا گیا..

تاریخ میں صرف حسن ناصر کا نام آتا ہے..

شمس الدین انقلابی چونکہ بوریوالا ایسے غیر معروف قصبے کا ایک ٹریڈ یونین لیڈر تھا، اُس کے تعلقات براہ راست نہ تو کمیونسٹ پارٹی سے تھے اور نہ ہی اُس کا رابطہ سوویت سفارت خانے سے تھا اور نہ ہی وہ حسن ناصر کی مانند ایک نواب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا..اس لئے وہ گمنامی میں مرگیا..اور اُس کی یاد میں کوئی نوحہ نہ لکھا گیا، اُس پر کسی نے سُرخ سلام نہ بھیجا۔

اُن زمانوں میں..

راہ چلتے لوگ..رُوس کی وسیع وسعتوں سے اپنے مقدس شہر ماسکو کی زیارت کے لئے آنے والے دہقان اور مزدور.. یوکرین، سائبیریا، قزاقستان، ازبکستان، داغستان سے آنے والے زائرین جب ظہیر الدین اور گالینا کو گورکی سٹریٹ یا پُشکن سکوئر میں پہلو بہ پہلو چلتے دیکھتے تو ان پر نثار ہو جاتے..ایک ایشیائی کامریڈ اور ایک رُوسی لڑکی بانہوں میں بانہیں ڈالے اُس عظیم خواب کی تعبیر تھے جس میں رنگ اور نسل کی کوئی قید نہ تھی..بلکہ وہ ظہیر الدین کو تشکر کی نگاہوں سے تکتے کہ اے کامریڈ تم اپنے وطن اور عقیدے سے مُنہ موڑ کر انسانی تاریخ میں سب سے عظیم خواب میں شامل ہونے کے لئے اور معاون ثابت ہونے کے لئے ہمارے ہاں چلے آئے ہو..

اور اِن زمانوں میں..

وہ ایک شُودر ہو چکا تھا..اُس کا گندمی رنگ اور غیر ملکی چہرہ ایک عذاب ہو چکا تھا..وہ مُنہ چھپائے پھرتا تھا اُس سلطنت میں جہاں وہ کبھی راج کیا کرتا تھا..ایک وی آئی پی ہوا کرتا تھا..فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے، زیر زمین ریلوے میں سفر کرتے ہوئے بہت سی نگاہیں حقارت اور ذلّت کی اُس پر پڑتیں کہ یہ کون ہے..اور یہاں کیا کر رہا ہے..ہمارے ملک سے دفع کیوں نہیں ہو جاتا..ایک اندھیری گلی میں گئی رات..ایک بار ایک تھیٹر سے باہر نکلتے ہوئے، یوم مئی کی پریڈ سے واپسی پر..رُوسی گنجے نوجوانوں اور لڑکیوں نے اُسے زدوکوب کیا تھا، اُس پر تھوکا تھا..

سوویت یونین کے ڈھانچے میں دراڑیں آئیں اور پھر وہ اپنے قدموں پر مسمار ہوا تو اُس کے ساتھ ہی ظہیرالدین کا وجود اور عظیم مساواتی تصور بھی ڈھے گیا اور وہ گویا ایک عظیم کھنڈر کے درمیان تنہا کھڑا رہ گیا کہ اب میں کہاں گھر بناؤں.. یہاں سے کدھر جاؤں..گالینا جو اُس کے تصوراتی مثالی جہان کے خواب کی پُر جوش رفیق تھی، وہ بھی بہت بودی نکلی، اُس کا ساتھ نہ دے سکی..اُس نے کیسے اُن ابتدائی ایام میں اُسے ایک رومان آلود لہجے میں پنجابی کے کچھ فقرے سکھائے تھے کہ کہو..مینوں تیرے نال پیار ہو گیا اے..اور گالینا اس فقرے کو اتنے درست تلفظ سے ادا کرتی کہ اُس پر ایک پنجابی مُیار کا گمان ہوتا.. پر اب وہ سب کچھ بھول بھال چکی تھی..وہیل چیئر میں ڈھیر یوکرین کی واڈکا کے گہرے گھونٹ بھرتی اُسے رُوسی میں لعن طعن کرتی رہتی، اُسے کوستی رہتی..وہ اُسے کیسے موردِ الزام ٹھہراتا کہ ان طویل برسوں میں اُس نے سوائے اس دو کمرے کے تنگ فلیٹ، ایک غسل خانے، مسلسل تنگ دستی اور دو بچوں کے سوا اُسے اور کیا دیا تھا..

وہ زمانے جب دریائے ماسکو کے پانیوں پر ہمیشہ افق کی سرخی بکھی رہتی، کناروں پر پھیلے ہوئے برچ کے جنگلوں میں اُس کے خواب دھند کی مانند ایک خمار میں تیرتے پھرتے..تب سوویت حکومت کی جانب سے ایک خصوصی انقلابی ایشیائی فنڈ میں سے اُسے ایک ماہانہ وظیفہ باقاعدگی سے پہنچ جاتا..اس کے سوا وہ ایک نامعلوم سے سرکاری محکمے میں نامعلوم سا اہلکار بھی تعینات تھا جس کی ذمہ داریاں بھی نامعلوم تھیں لیکن تنخواہ اتنی معقول تھی کہ جس سے بخوبی گزارہ ہوتا چلا جاتا..لیکن جونہی اتھل پتھل ہوئی..سوویت یونین کے طول وعرض میں واقع شہروں اور قصبوں کے چوکوں میں ایستادہ لینن کے لاکھوں مجسّمے اوندھے ہو کر زمیں بوس ہونے لگے اور اُن کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کی فاحشہ جل پریاں براجمان ہونے لگیں تو نہ صرف اُس کا ماہانہ وظیفہ منقطع ہوا بلکہ اُس نامعلوم ملازمت سے بھی اُسے جواب مل گیا..

بورس کی پیدائش کے فوراً بعد گالینا کو تب کے دنیا کے سب سے بڑے سٹور گُم میں ایک سیلز گرل کے طور پر ملازمت مل گئی تھی جو کہ ایک حکمران اعزاز تھا..وہ صرف ایک سیلز گرل نہ تھی بلکہ ایک ان داتا تھی جس کے قدموں میں روسی ضرورت مند پڑتے، منت سماجت کرتے تھے کہ تمام تر صنعتی اور خلائی ترقی کے باوجود سوویت یونین میں روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی شدید قلت تھی..ایک ٹیلی ویژن کا حصول چاہے وہ انتہائی بھدی اور ابتدائی ساخت کا ہو..تقریباً ایک معجزہ تھا..ایک اونی کوٹ.. چند جرابوں اور جوتوں کے ایک جوڑے.. یہاں تک کہ ایک ٹائی کو حاصل کرنے کے لئے ضرورت مندوں کی قطاریں لینن کے مقبرے تک چلی جاتیں..اب یہ گالینا پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ اُن سینکڑوں خواہش مندوں میں سے کن دو چار درجن لوگوں کی خواہش پوری کر سکتی تھی..کبھی کبھار وہ کاؤنٹر کے نیچے سے کچھ نذرانے قبول کر کے کسی حاجت مند پر کرم کر دیتی اور یہ اضافی آمدنی بھی اُن کے مناسب گزارے کا سبب بنتی..سوویت یونین کے ڈھے جانے سے گالینا کی یہ بادشاہت بھی ڈھے گئی..اُس کے کاؤنٹر پر روزانہ جتنے بھی اونی کوٹ، جرابیں، جُوتے اور ملبوسات آتے وہ پڑے رہتے، فروخت نہ ہو سکتے کہ نئے نظام کے تحت اُن کی قیمتیں ایک عام شہری کی گرفت میں سے نکل کر عرشوں تک جا پہنچی تھیں..اس کے علاوہ گُم سٹور کی سُرخ عمارت کے عقب میں ایک انٹرنیشنل مارکیٹ وجود میں آ چکی تھی جہاں دنیا بھر کے مہنگے ترین ڈیزائنر ملبوسات، گھڑیاں، اوورکوٹ، پین، ہینڈ بیگ، سگریٹ لائٹر اور زیر جامہ وغیرہ برائے فروخت تھے..اور چونکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ارب پتی اب ماسکو میں تھے اور وہ بھی بے دریغ اپنی وہ

دولت جوانہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی برکتوں سے شب بھر میں حاصل کی تھی، وہاں لٹاتے تھے..تو گالینا کے کاؤنٹر کی جانب کون دھیان کرتا..اُس کے ہاں جو مقامی ساخت کے زیر جامہ برائے فروخت تھے، اُن سے تو ماسکو کی متمول خواتین کے سینے اور اندرون چھلتے تھے..

جب کبھی کوئی عظیم تہذیب زوال پذیر ہوتی ہے..ایک نظام سرنگوں ہوتا ہے، ناکارہ اور بیکار ہو کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے تو اُس تہذیب اور نظام کے جتنے بھی کل پُرزے ہوتے ہیں اُن کے سوا جو گرگٹ کی مانند رنگ بدل لیتے ہیں، وہ سب بھی ناکارہ اور بیکار ہو جاتے ہیں، اور اُن کی جگہ نئے لوگ آ جاتے ہیں..حکومت میں، ثقافت اور صحافت میں یہاں تک کہ ادب اور مصوری میں بھی..جیسے سٹیٹ ٹیلی ویژن پر اپنے فرائض سرانجام دینے والے جتنے بھی پروڈیوسر یا ڈرامہ نویس تھے وہ پارٹی کی ہدایات اور مارکس اور لینن کے خیالات اور تحریروں سے آگہی کا نور حاصل کر کے اُس کی روشنی میں مزدوروں اور دہقانوں کی حکمرانی کے سُرخ سویرے اپنے ڈراموں میں تشکیل دیتے تھے جن کے ہر منظر میں انقلابی گیت الاپتی ہمہ وقت مسکراہتی دہقانی عورتیں اور درانتیاں فضا میں بلند کیے ہوئے مضبوط بدن مزدور ہوا کرتے تھے اور اُن کے پس منظر میں ہمیشہ ایک سُرخ سورج طلوع ہو رہا ہوتا تھا..یہ سب ہدایت شدہ تصورات اُن کے خون میں یوں گردش کرتے تھے کہ اگر وہ کرنا بھی چاہتے تو اُن سے روگردانی نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ بھی ناکارہ اور بیکار ہو گئے..اُن کی جگہ جو نئے لوگ سامنے آ رہے تھے، وہ نئے نظام کی ترجمانی کرتے تھے..وہ امریکی مزاحیہ شوز یعنی سِٹ کام کو رُوسی زبان میں ڈھال کر پیش کرتے تھے..امریکی پاپ سٹارز کو نمایاں کرتے تھے، میڈونا کی چھاتیاں ابھی تک اتنی مستحکم اور بھری ہوئی کیوں ہیں اس پر تحقیقی تجزیے پیش کرتے تھے..رُوسی عوام بھی کسانوں، مزدوروں، کدالوں، ہتھوڑوں، درانتیوں اور عظیم باپوں سے اُکتا چکے تھے اور وہ ''بے واچ'' کی تقریباً برہنہ خواتین کی بے حیائی کے شیدائی ہو رہے تھے..

بالآخر گالینا کو بھی گم سٹور کی ملازمت سے جواب مل گیا کہ وہ ایک بھدی اور بوڑھی عورت ہو رہی تھی اور وہاں اُس کی جگہ لینے کے لئے نوخیز اور متناسب بدنوں کی بہت سی لڑکیاں تھیں جو چیونگم چباتی تھیں اور ہر گاہک کا استقبال ''ہے گائز'' کرتی تھیں..وہ دونوں..ظہیر الدین اور گالینا..اب بورس اور سویٹ لانا کے رحم و کرم پر تھے۔

نہ ہوتے تو بہت سے بے کار ہو چکے دیگر روسیوں کی مانند کلیساؤں کے دروازوں پر یا سُرخ چوک میں سیاحوں سے بھیک مانگ رہے ہوتے..

بورس، ہنوز غیر شادی شدہ، اُس کا چالیس برس کا بیٹا افغان جنگ میں ایک بازو سے محروم ہو چکا بیٹا، جب اُس کے سامنے بیٹھا ہوتا تو وہ اُس کے چہرے مُہرے اور رنگت میں اپنی کوئی شباہت ڈھونڈتا لیکن وہاں کچھ سُراغ نہ ملتا..

وہ ایک خصوصی اور دائمی رُوسی چہرہ تھا..

وہاں نہ ظہیر الدین کا اور نہ ہی..شمس الدین انقلابی کی نسل کا کچھ شائبہ نظر آتا۔ بورس کی آنکھوں میں ایک بیگانگی اور سرد مہری کی پرچھائیاں تھیں..کبھی اُسے شک ہوتا کہ وہ اُس کا بیٹا نہیں ہے..وہ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی میں بے آرام رہتے..بورس کی آنکھیں اُس پر ہوتیں تو وہ ہمیشہ اس شک کا شکار رہتا کہ وہ اُس کا احتساب کر رہا ہے..دل ہی دل میں فیصلہ کر رہا ہے کہ یہ جو میرے سامنے بیٹھا غیر ملکی شخص ہے تو کیا اسے سائبیریا کے کسی سرد خانے میں بھیج دینا چاہیے..اُس نے کوئی نہ کوئی

جرم تو کیا ہے..اور ظہیرالدین اُس کے سامنے دم روکے بیٹھا رہتا کہ کہیں مجھے سزا نہ ہو جائے..

اُدھر بورس..یہ محسوس کرتا تھا کہ اس شخص نے مجھے ایک بیٹے کے طور پر کبھی قبول نہیں کیا..یہ میری رُوسی شباہت کو ناپسند کرتا ہے..بے شک بورس میں ایک سرد بے اعتنائی تھی لیکن وہ چاہت کے باوجود اپنے باپ کے ساتھ ایک ربط میں نہ رہ سکا..وہ جانے کس پنجاب کے ہمہ وقت تذکرے کرتا بے وجہ مسکراتا رہتا تھا..اُن کے درمیان کسی تعلق کی جڑیں گہری نہ ہو سکیں..اور سویٹ لانا خاہیر..ظہیرالدین جب کبھی بے دھیانی میں چائے کا ایک گھونٹ بھر کر..غسل خانے سے باہر آتے ہوئے،فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے بے دھیانی میں اُسے سامنے پاتا تو لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک جاتا کہ وہ اپنی ماں کی ہو بہو تصویر تھی..اُسے برچ کے درختوں میں گم ہوتی ایک سائیکل نظر آنے لگتی،ایک پھولدار فراک او جھل ہونے لگتا..

یونیورسٹی کے زمانوں میں ہی وہ چند جدید باغی عناصر کی قربت میں آ گئی تھی جو واڈکا سے گریز کرتے تھے کہ یہ ایک اولڈفیشنڈ کمیونسٹ خمار تھا،وہ چرس اور ہیروئن کے نروان میں اجتماعیت سے مُنہ موڑ کر کسی بھی واضح مقصد کے بغیر مکمل شخصی آزادی کے پھریرے لہراتے تھے..اُن میں سے جو سرکردہ تھا وہ افغان جنگ میں کام آ چکے ''ہیرو آف دے مدرلینڈ'' کا اعزاز حاصل کرنے والے ایک کرنل کا بیٹا تھا اور وہ ہمیشہ اعلان کرتا کہ اُسے افغان جنگ ہارنے کا کچھ قلق نہیں کیونکہ روسی افغانستان نہ جاتے تو آسودہ کرنے والی حشیش اور عرشوں پر لے جانے والی ہیروئن رُوس نہ آتی.. یونیورسٹی کے بعد ان جدید باغی عناصر میں سے کچھ تو روس کے نئے نظام میں مدغم ہو گئے اور کچھ فنونِ لطیفہ کی جانب راغب ہو گئے..

سویٹ لانا جسے اداکاری کا خبط تھا،وہ مہینوں بیکار بیٹھی رہتی اور پھر کہیں سے بلاوا آ جاتا کہ ہم فلاں امریکی کامیڈی شو کو رُوسی میں ڈھال رہے ہیں اور وہ کچھ عرصہ کے لئے باکار ہو جاتی..وہ ایک مناسب سی مزاحیہ اداکارہ کے طور پر نئے رجحانات کے پیروکار ٹیلی ویژن پر اپنا مقام بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھی..

سویٹ لانا،بورس کے خدشات اور واہموں سے اتفاق کرتی تھی کہ اُن کا باپ جس کے قریب وہ دونوں کبھی نہ آ سکے،دن بہ دن ایک معمہ بنتا جا رہا ہے،اُلجھتا جا رہا ہے..اُنہیں خوب یاد تھا کہ بچپن میں وہ پورے شد و مد سے اُنہیں مذہب سے دور رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا کہ یہ ایک افیون ہے اور اپنے مُلحد ہونے پر فخر کرتا تھا..

سوویت یونین کے انہدام پر عیسائیت جو کسی کونے کھدرے میں پوشیدہ اچھے وقتوں کی منتظر تھی، یکدم نمودار ہو گئی تھی..درانتی اور ہتھوڑے پر صلیب غالب آنے لگی..جیسے کسی سرمائی بارش کے بعد برچ کے جنگلوں میں راتوں رات کھمب اُگ آتے ہیں ایسے پورے روس میں نئے کلیسا اُگنے لگے تھے یہاں تک کہ پیوٹن..کے جی بی کا نظریاتی طور پر کٹڑ کمیونسٹ اور مُلحد ایجنٹ..اِن دنوں زرق برق شاہانہ لباس لاٹ پادریوں کے سامنے جھکا اُن کے لبادوں کو عقیدت سے بوسے دیتا مذہب کے لئے وارفتگی کا اظہار کرتا تھا..لیکن نہ تو گالینا ہی اپنے آبائی مذہب کی جانب پلٹی اور نہ ہی بورس اور سویٹ لانا کو عیسائیت سے کچھ رغبت پیدا ہوئی،وہ بدستور ایک آزاد اور مُلحد ذہن کے ساتھ بغیر کسی احساسِ جرم کے روس کے نئے سرمایہ دارانہ نظام میں داخل ہو گئے..

لیکن ظہیرالدین..جو کبھی اُنہیں مذہب سے اجتناب کے مشورے دیا کرتا تھا اب اکثر انہیں سامنے بٹھا کر تلقین کرنے لگا تھا کہ انہیں اسلام کا بہ غور مطالعہ کرنا چاہیے..کہ اُن کا دادا..انقلابی ہونے کے باوجود ایک کمیونسٹ کے طور پر

ہلاک کر دیئے جانے کے باوجود، ایک مسلمان تھا.. یہ ماہیت قلب تو نہ تھی ایک انتہائی سنگین فاتر العقلی تھی جو اُن کے باپ کے ذہن پر سوار ہو رہی تھی.. اُنہوں نے ماسکو کے فٹ پاتھوں پر روزگار کے حصول کے لئے ذلیل ہوتے، دھکے کھاتے، پولیس کے ہاتھوں زدوکوب ہوتے بے شمار اُزبک اور تاجک نوجوان دیکھے تھے جن کی ریاستیں آزاد ہوئیں تو وہ بیروزگاری کا شکار ہو کر بھوکے مرنے لگے اور اُنہوں نے پھر اُسی ملک کا رخ کیا جس کے چُنگل سے وہ بخوشی آزاد ہوئے تھے اور وہ مسلمان تھے.. وہ اُن میں اور اپنے آپ میں کوئی مطابقت یا ذہنی قربت محسوس نہ کرتے تھے بلکہ کسی حد تک اُن سے مخاصمت رکھتے تھے.. تو وہ بھلا اُن کے مذہب کی جانب کیسے مائل ہو سکتے تھے.. اُن کے باپ کے تو یوں لگتا تھا جیسے سارے کل پُرزے جواب دے رہے تھے.. جن کل پرزوں کو کسی زمانے میں الحاد اور کمیونزم کا موبل آئل رواں رکھتا تھا، اب اُن میں مذہب کی ریت کے ذرے اٹکنے لگے تھے.. وہ اکثر اصرار کرتا کہ وہ دونوں کبھی جمعہ کے روز اُس کے ہمراہ چل کر دیکھیں تو سہی کہ ایک اُزبک مسجد میں کتنے بے شمار لوگ عبادت کیسے کرتے ہیں.. مذہب کی جانب مائل ہو جانے کے علاوہ وہ اپنے وطن روس کے زمینی مناظر سے بھٹکتا اپنے پنجاب کے موسمی تہواروں، وہاں کے پھولوں، شجروں، جوہڑوں اور آک میں سے پھوٹنے والی مائی بوڑھیوں کی جانب رجوع کرتا چلا جا رہا تھا.. لمحۂ موجود کی تمام تر زمینی حقیقتوں سے بیگانہ ہو کر اپنے ماضی کی جانب سفر کرنے لگا تھا..

مذہب کی بوسیدگی چاہے وہ عیسائیت کی ہو یا اسلام کی.. اُنہیں قبول نہ تھی..

گالینا روسی ساخت کی اگرچہ مضبوط لیکن بے آرام وہیل چیئر پر ڈھیر تھی اور آج کی واڈکا کی بوتل اُس کی گود میں پڑی اپنے خالی پن کا ماتم کر رہی تھی.. بورس اور سویٹ لانا کی آنکھوں میں تھکاوٹ کے آثار تھے..

گالینا کو مشروم سُوپ جس میں روسی جڑی بوٹیوں کی آمیزش ہوتی تھی، تیار کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی اور اُس نے ظہیر الدین کو قریبی مارکیٹ سے مشروم لانے کے لئے روانہ کیا تھا اور وہ ابھی تک، رات گہری ہونے لگی تھی، لوٹا نہیں تھا.. جانے وہ کھمبیوں کے کس جنگل میں جا نکلا تھا کہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا.. یہ نہیں کہ وہ اُس کے لئے پُرتشویش اور فکرمند تھے.. بلکہ قدرے بے زار تھے کہ آج شب ہم مشروم سُوپ کے بغیر رہ جائیں گے..

فلیٹ کے آہنی دروازے پر ایک اذیت ناک حد تک زوردار دستک ہوئی.. پہلے ظہیر الدین سر جھکائے اُن سے نظریں چُراتا داخل ہوا اور اُس کے پیچھے ماسکو پولیس کے دو نوجوان سرد مہری اور بیزاری میں ڈوبے چہروں کے ساتھ اندر آ گئے.. اُن میں سے ایک نے اُن تینوں میں سے جانے کس کو مخاطب کر کے کہا ''کیا آپ گواہی دیں گے کہ یہ شخص اس فلیٹ میں رہتا ہے.. اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے.. کیا آپ..... اسے جانتے ہیں؟''

''ہاں..'' گالینا اپنی خمار آلود اونگھ میں سے باہر آ گئی اور وہیل چیئر کے پہیوں پر ہاتھ کا بوجھ ڈالتی اُسے دھکیلتی اُن کے قریب آ گئی ''یہ.. میرا خاوند ہے.. کیا اِس نے کوئی جرم کیا ہے؟''

''ہم کہہ نہیں سکتے..'' ان دونوں میں سے جو زیادہ بیزار نظر آ رہا تھا، اُس نے کہا ''لیکن.. یہ شخص.. فٹ پاتھ کے ساتھ اپنی کار پارک کر کے.. یہ غیر ملکی شخص.. عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا.. سمیل کے درختوں کے ایک جھنڈ میں اُن میں

سے پھوٹنے والے روئی کے گالوں کے پیچھے ہاتھ چلاتا اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا.. یہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتا تھا.. اس لئے ہم نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا.. آپ اسے جانتی ہیں ناں؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ میرا خاوند ہے..'' گالینا کے لہجے میں درشتگی در آئی..

اُن دونوں کی نظروں میں ایک حقارت اتر آئی.. ایک روسی عورت اور یہ ذلیل غیر ملکی..''اس کی شہریت کیا ہے.. انڈین، افریقی..''

''روسی..''

''کوئی شناخت؟''

اُنہوں نے اُس کی شہریت کے کاغذات اور روسی پاسپورٹ بے یقینی میں مبتلا بہت دیر تک دیکھا.. پاسپورٹ پر چسپاں تصویر سے اُس کا موازنہ کیا اور قدرے مایوسی کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے..

''تم کہاں تھے ظاہیر؟'' گالینا نے سرزنش کی..

وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا رہا..

''تم مشروم لینے کے لئے گئے تھے.. تو اب تک کہاں تھے؟''

''میں..'' ظہیر الدین نے سر اُٹھایا اور ایک بچے کی مسکان اُس کے لبوں پر پھیل گئی..''میں.. مائی بوڑھیوں کے تعاقب میں کھو گیا تھا اور رات ہو گئی..''

اُن تینوں نے دیکھا کہ اُس کے سفید ہوتے بالوں میں ایک ریشے دار مائی بوڑھی' جیسے وہ بھی اُس کے بالوں کا ایک حصّہ ہو، اٹکی ہوئی تھی..

●○●○●○●

''آریف....''

سفید اور ابھی تک گھنے برف بہاؤ بالوں میں اُس کا... ہلٹرڈ کا.. خوش نما چہرہ اُس پر جھکا تھا، اگرچہ زوال کے تانے بانے جُھریوں کی صورت اُس چہرے پر بُنے ہوئے تھے لیکن اس کی خوشنمائی رخصت نہ ہوئی تھی.. انگرڈ برگ مین کی مانند بڑھاپے میں بھی وہ ایک پُر وقار، پُرتمکنت اور ایک دوسری نظر ڈال دینے کے لائق کشش بھری عورت تھی.. تو پھر وہ جوانی میں کیسی رہی ہوگی.. ایک ''نوجوان کمیونسٹ رضا کار'' کے روپ میں.. سینے پر سُرخ ربن اور ہتھوڑے اور درانتی کے پیتل کے میڈل سجائے... برلن کے مشرقی حصے میں سٹالن ایلی کے دونوں جانب قطار اندر قطار منظم کھڑی کثیرالمنزلہ فلیٹوں کی عمارتوں میں.. ہر فلیٹ پر دستک دے کر اُس میں قیام پذیر مزدوروں میں کمیونزم کے معجزوں کے پمفلٹ تقسیم کرتے، اُنہیں سرخ سلام کر کے رخصت ہوتے ہوئے.. درجنوں ٹین ایج رضا کار جرمن لڑکوں اور لڑکیوں کے چہروں میں سے اُس کے دل کو مٹھی میں بھر لینے والے حسن کا آفتاب یوں ظاہر ہوتا کہ اُن فلیٹوں کے مکین صرف اُس کا دل رکھنے کی خاطر وہ پمفلٹ بخوشی قبول کر لیتے جن کے انبار پہلے سے اُن کی کوڑے کی ٹوکریوں میں پڑے ہوتے تھے..

ہلٹرڈ ہر خوبصورت لڑکی مانند خوب آگاہ تھی کہ اُس کی شباہت لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے لیکن وہ پُرتکبر نہ تھی.. اُسے یقینِ کامل تھا کہ صرف مارکس اور اینگلز کا ابدی پیغام عام کرنے کے لئے اُسے ایسی شکل سے نوازا گیا تھا..

اُس کے رضا کار ساتھیوں میں سے کچھ لڑکے ایسے تھے جو تہہ دل سے جرمنی پر روسی غلبے کو ناپسند کرتے تھے.. بے شک جس فلسفے کے وہ پیروکار تھے، اُس کی جڑیں جرمنی میں سے ہی پھوٹی تھیں.. مارکس اُنہی کی نسل میں سے تھا اگر ایک یہودی اُن کی نسل کا ہو سکتا تھا تو.. لیکن وہ روسیوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ہزیمت کو نہ بھولے تھے.. وہ دل ہی دل میں اپنے نازی ماضی پر نازاں تھے.. یہ روسی تھے جنہوں نے انہیں سٹالن گراڈ اور لینن گراڈ میں شکست سے دوچار کر کے برلن کا رخ کر لیا تھا.. تو وہ ان فاتحین کی مغلوبیت کو تہہ دل سے قبول تو نہ کرتے تھے.. اگر آج وہ نوجوان کمیونسٹ تنظیم کے سرفروش ممبر تھے تو صرف اس لئے کہ وہ ذرا منافقت سے کام لے کر اپنا مستقبل سنوارنا چاہتے تھے.. انہیں اس تنظیم میں سرگرمی دکھانے پر یونیورسٹی میں آسانی سے داخلہ مل سکتا تھا، بہتر ملازمت حاصل ہو سکتی تھی.. لیکن ہلٹرڈ کے دل میں ایسی منفعت کا کوئی منصوبہ نہ تھا، وہ سچے دل سے کمیونزم کے فلسفے پر یقین رکھتی تھی اور اس کی بین الاقومیت اور اس کے نسلِ انسانی کی نجات کا واحد ذریعہ ہونے پر ایمان رکھتی تھی..

''آریف..'' وہ اُس کے پہلو سے اٹھ کھڑی ہوئی ''میں سونے جا رہی ہوں.. کیا تم ابھی کچھ دیر اپنی کتابوں اور تصویری البموں کے ساتھ گزارو گے.. اور تم گزارو گے.. اگر تمہیں پینے کے لئے وائن کی خواہش ہو تو کپ بورڈ کی چابی

ٹیلی ویژن کے اوپر پڑی ہے..اسے دوبارہ مقفل کرنا نہ بھولنا..''

''تم وائن اور واڈکا کی اُن چند بوتلوں کو اتنے اہتمام سے مقفل کیوں رکھتی ہو..کیوں بلٹرڈ..'' صوفے پر دراز عارف مسکرایا..کہ وہ ہر شب اپنے بیڈروم میں جانے سے پیشتر یہی فقرے دوہراتی تھی..اور عارف نقوی بھی..ایک اونی چیک شرٹ اور فاختائی رنگ کی سلیقے سے استری شدہ پتلون میں..بے حلقے کی عینک میں..ابھی تک جھاڑ جھنکار کی مانند گھنے سفید بالوں اور درخشاں رنگت میں اپنی پینتالیس برس سے بیوی ہو چکی بلٹرڈ کی نسبت کچھ کم خوش شکل نہ تھا..

اگر بلٹرڈ..جس کے قدموں میں روزانہ نہ سہی ہر ہفتے کم از کم ایک دو تو بہرصورت محبت کے اعلان یا شادی کی درخواستیں نچھاور ہو جاتی تھیں..صرف اُس پر..مشرقی برلن میں منعقد کردہ بین الاقوامی نوجوان ادیبوں کی کانفرنس میں شامل..سینکڑوں میں سے کسی ایک نوجوان شعلہ بیاں پاکستان کے شہر..کراچی سے آئے ہوئے ادیب پر بلٹرڈ کی آنکھیں یوں ٹھہر گئی تھیں کہ اُس کے چہرے سے جدا ہونے کا نام نہ لیتی تھیں تو اس میں اُس کا کچھ دوش نہ تھا..اور اگر عارف نقوی ترقی پسندی کے سرخ خواب میں یوں رنگا ہوا کہ اُس کی ٹائی ہمیشہ شوخ سرخ رنگ کی ہوتی اور کوٹ کے کالر پر سرخ گلاب بھی ہوتا اور وہ بھی اُس کی جانب مائل ہو گیا تو اس میں اُس کا بھی کچھ قصور نہ تھا..

البتہ ایک تکنیکی فرق تھا..

اگر بلٹرڈ اس ایشیائی نوجوان پر فدا ہوئی تو صرف اُس کی شکل پر نہ ہوئی بلکہ اس کی انقلابی شعلہ بیانی اور تقریر کی رومانویت پر ہوئی جبکہ عارف..اگر مائل ہوا تو وہ ایک ایشیائی تھا، پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتا تھا تو وہ صرف اُس کے الوہی حسن کی تابناکی کی تاب نہ لا سکا..

اور یہ تو پینتالیس برس پیشتر کے..گزر چکے زمانوں کے قصے ہیں..

''تم کبھی بھی الکوہل کے رسیا نہیں رہے آریف..یہ میں جانتی ہوں..اُن دنوں تو تم بیئر کو ہاتھ لگانے سے بھی جھجکتے تھے..بلکہ مجھے یاد ہے کہ تمہارا جو مقدس مہینہ محرم کا ہوتا تھا، تم ان دنوں مجھ پر بھی پابندی لگا دیتے تھے کہ میں کھانے کے ساتھ وائن کا ایک گھونٹ بھی نہ بھروں اور میں تمہاری خواہش کا احترام کرتی تھی..اب بھی کرتی ہوں..اگرچہ تم بظاہر مذہب پر یقین نہ رکھتے تھے لیکن تم اپنے بزرگ حُسین کے سوگ میں پورا مہینہ سیاہ لباس پہنتے تھے..لیکن ان پچھلے دو تین برسوں میں تم میں ایک تشویش ناک تبدیلی ظہور میں آئی ہے..میں جب بھی تمہیں تمہاری کتابوں اور تصویری البموں کے درمیان چھوڑ کر سونے کے لئے جاتی ہوں تو اگلی صبح واڈکا کی کم از کم ایک خالی بوتل ٹیلی ویژن ٹرالی کے نیچے یا پردوں کے عقب میں روپوش ملتی ہے..اسی لئے میں کپ بورڈ کو مقفل رکھتی ہوں تا کہ تم حد سے نہ گزر جاؤ..ایسا کیوں ہو رہا ہے آریف..؟''

''بلٹرڈ..'' اُس کے لہجے میں محرم کی سوگواری کی سیاہی تھی ''وہ کرشن جو معاشرے کی اونچ نیچ ختم کرنے کی خاطر سب کو امن اور برابری کا درس دینے کے لئے اپنی بانسری پر انقلابی دُھنیں بکھیرا کرتا تھا..اب وہی کرشن سرمایہ دارانہ نظام میں ایک پاپ سنگر ہو گیا ہے..''

''وہی پرانے قصے..تم ابھی تک مفاہمت نہیں کر سکے..'' بلٹرڈ نے بیزاری سے نہیں ایک شگفتہ محبت کی کونپل

کے پھوٹنے کے انداز میں کہا اور پھر سے اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی..اُس کے رخسار پر اپنی ہتھیلی کو یوں پیار سے رکھا جیسے ایک پرندہ پھولوں کی ایک ڈال پر اترتا ہے ''جب تم اور تمہارے روشن خیال دوست لکھنؤ کی اِندر سبھا سٹیج پر پرفارم کیا کرتے تھے اور تم ایک کرشن کے روپ میں سٹیج پر آتے تھے..جو ایک خدا نہ تھا، ایک عام انسان تھا تو نہ صرف اُس کا پیراہن بلکہ اُس کی مُرلی بھی سرخ رنگ کی ہوتی تھی کہ وہ تمہارا تخلیق کردہ..ایک نیا کرشن تھا..آریف..تمہارا کسی بھی کرشن پر اب کچھ اختیار نہیں رہا..اگر اُس نے اِن زمانوں میں اپنے وہ سرخ لبادے ترک کر دیئے ہیں جو تمہاری آرزو اور تخیل نے اُسے پہنائے تھے اور اب وہی کرشن نیلے بدن والا سرمایہ داری نظام کی دُھن پر رقص کر رہا ہے تو تم اس تبدیلی سے سمجھوتہ کرلو..جیسے میں نے کر لیا ہے..یہیں پر ایک ایشیائی اور یورپی ذہن کے درمیان جو خلیج ہے، وہ ظاہر ہوتی ہے..تم اپنی جذباتیت میں اپنے آدرشوں پر ابھی تک اٹل ہو..اور میں..منطق کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ جان چکی ہوں کہ کمیونزم کی بساط پر بچھے جو ہمارے بادشاہ تھے وہ مات کھا چکے ہیں، جو کر جیت گئے ہیں..میں سونے جا رہی ہوں۔''

اِنگے نا قوی نے اپنے ماں باپ کی خوش شکلی سے کچھ استفادہ نہ کیا تھا..وہ اُن سے اتنی مختلف تھی کہ گود میں لیا ہوا ایک پرایا بچہ بھی ہو سکتی تھی، ہاں کبھی کبھار جب وہ مسکراتی، اُن کی اکلوتی اولاد..تو اُس مسکراہٹ میں عارف اور ہلڈ کے کچھ شائبے پل بھر کے لئے ظاہر ہوتے اور فوراً ہی زائل ہو جاتے..

اُس نے اپنے ماں باپ کو قطعی طور پر نظر انداز نہیں کیا تھا..وہ انہیں باقاعدگی سے ہر کرسمس پر ایک کارڈ بھیجتی تھی..

وہ اپنے دراز قامت اور بے تحاشا فربہ امریکی خاوند کے ہمراہ آسٹریلیا منتقل ہو چکی تھی جہاں وہ دونوں کسی ساحلی قصبے میں مچھلیوں کا کاروبار کرتے تھے اور خاصے آسودہ تھے..اس دوران وہ تین بچے پیدا کر چکے تھے اور عارف اِنگے کی روانہ کردہ بچوں کی تصویروں میں سے اپنے آپ کو تلاش کرتا..اور آزردہ ہوتا..وہ دیگر یورپی بچوں کی مانند موٹے تازے گورے چٹے تو ہوتے پر اُن کی شکلوں میں نہ کوئی ایشیائی نمکین پن تھا اور نہ ہی کوئی کشش..بلکہ وہ اسے چھوٹے چھوٹے سؤروں کی طرح گل گوتھنے نظر آتے..ظاہر ہے اُنہوں نے کبھی آگاہ نہ ہونا تھا کہ ان کے کوئی ایسے نانا جان بھی تھے جو لکھنؤ سے ہجرت کر کے کراچی میں آبسے تھے اور ایک پاکستانی..نانا جان تھے..

عارف نقوی اس بین الاقوامی اکھاڑ پچھاڑ کی زد میں آ کر زائل ہو رہا تھا، اُس کی اِس دنیا میں موجودگی کے آثار ملیامیٹ ہو رہے تھے..نہ صرف اس دنیا بلکہ نظریاتی وابستگی کے جہان میں بھی اُس کے سارے نشان پہچان مسمار ہو چکے تھے..سوویت یونین کے یوں منظر سے تحلیل ہو جانے پر وہ بے آسرا ہو گیا تھا..اُنہی دنوں اسے اپنا لکھنؤ اور کراچی شدت سے یاد آنے لگے تھے..

ابھی دو برس پیشتر وہ اس جذباتی یادداشت سے مغلوب ہو کر چند روز کے لئے کراچی چلا گیا اور وہاں پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ صرف اُس پر ہی نہیں اُس سمندر شہر پر بھی زمانے گزر چکے ہیں..

وہاں اُس کی عمر کے بیشتر لوگ دم توڑ کر خاک ہو چکے تھے..

کوئی بھی شناسا نہ ملا..

بیڈروم کے ٹیبل لیمپ کی روشنی کچھ دیر تک... جتنی دیر میں ہلٹرڈ واش روم میں دانتوں کو برش کر کے ماؤتھ واش سے غرارے کر کے فارغ ہوئی تب تک بند دروازے اور فرش کے درمیان کی جھری میں سے سرائت کرتی اُس کے قدموں تک پہنچتی رہی، عارف کی نظریں قالین پر رینگتی ہوئی اپنے قدموں تک آتی دودھیا روشنی کو تکتی رہیں تا آنکہ وہ یکدم بجھ گئی.. ہلٹرڈ ٹیبل لیمپ آف کر کے بستر پر دراز ہو گئی تھی..

عارف نے کسی حد تک اطمینان کا ایک سانس بھرا..وہ جس تنہائی کا منتظر تھا وہ اُس کے آس پاس اتر گئی.. ٹیلی ویژن پر دھری چابی اٹھا کر اس نے کیبنٹ کے کواڑ وا کیے، روسی واڈکا کی ایک مُہر بند بوتل نکال کر اسے کھولا اور اپنے گلاس کو لبریز کر لیا..ہلٹرڈ کا کہنا درست تھا کہ وہ کبھی الکوہل سے شغف نہ رکھتا تھا..کسی مذہبی اجتناب کی رکاوٹ نہ تھی بس وہ اس کی کڑواہٹ سہار نہ سکتا تھا اور اگر اب پچھلے کچھ عرصے سے سہارتا چلا آیا تھا تو اس کا سبب تھا..اگر ایک شخص دل کی گہرائیوں سے اس یقین کا اسیر ہو کہ وہ حق پر ہے اور اس کے گرد کی دنیا میں ذلتوں کے مارے جن لوگوں کی سسکتی بستیاں ہیں، انہوں نے بالآخر اشتراکیت کی آخری منزل تک پہنچ کر زریں بلند و بالا شاہانہ محلات میں بدل جانا ہے اور اِن کے چیتھڑوں اور بھوک میں لپٹے مکینوں نے بالآخر شاہانہ لباس زیب تن کر کے تخت نشین ہو جانا ہے او وہ شخص ان محلات اور تخت نشینوں کے تصور میں زندگی کرتا ہو اور پھر یکدم یہ ایک باطل خواب ہو جائے، وہ خیمے اجڑ جائیں، اُنہیں آگ لگا دی جائے اور اُن پر گھوڑے دوڑا دیئے جائیں اور وہ اس شہرِ آرزو کے اجڑنے پر تنہا ماتم کرنے والا ہو..جل چکے خیموں کی راکھ سے اس کا چہرہ اٹا ہو..وہ کھنڈروں کے درمیان میں پرندوں کو ڈرانے والے بڑاوے کی مانند تنہا ہاتھ پھیلائے کھڑا رہ جائے تو اُسے اپنے تصور کی شکستگی سہہ جانے کے لئے سہارے کی حاجت ہوتی ہے جو کہ واڈکا کی تیز تیزاب شراب ہی اُسے مہیا کر سکتی تھی..

اپنے آبائی مذہب سے بیگانگی کے باوجود کربلا کا استعارہ ایک سرخ انقلاب کی نوید کے طور پر اُس کے خون میں گردش کرتا تھا..اُسے بھی حُسین کی مانند اپنے سچ پر مکمل بھروسہ اور ایمان تھا اور وہ اپنے تئیں باطل کی قوتوں کے سامنے بے جگری سے صف آرا ہوا تھا..لیکن..وہ بھی اُسی کی مانند ہار گیا اور اُس کے خیمے بھی اُس کے آس پاس جل چکے تھے، گھوڑوں کے سُموں سے روندے جا چکے تھے..اور یزید..دیوارِ برلن کے انہدام کے بعد..مغربی برلن کی جانب سے بے خطر دندناتا ہوا چلا آیا تھا اور اب باطل کے سنگھاسن پر براجمان راج کرتا تھا..اُس نے اُس کی بیعت تو نہ کی لیکن اُس کے زیرِ سایہ سرنگوں ہو گیا..کہ اس کے سوا اُس کے پاس فرار کا کوئی اور راستہ نہ تھا..

دیوار برلن اُس کے لئے..عارف نقوی کے لئے گویا سلمان کے معبد کی دیوار تھی جس سے لپٹ کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر گریہ کیا جا سکتا تھا..یہ ایک سرحد تھی اُس کے خوابوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے سرابوں کے درمیان..اور جب یہ دیوار گری تو لکھنؤ کے تھیٹروں میں انقلابی کرشن کا کردار ادا کرنے والا یہ اداکار..یہ مفکر اور روشن خیال دانشور، اپنے آدرشوں پر مستحکم شخص خود بھی گر گیا..

دیوار گری تو اُس کے پار مغربی برلن کی جدید کاروباری شیشہ عمارتوں، اقتصادی گہما گہمی..آزاد تجارت..قحبہ خانوں اور نائٹ کلبوں کی چکا چوند میں اُسے یزید کا چہرہ دکھائی دیا جس نے ایک مرتبہ پھر حسین کو زیر کر لیا تھا..وہاں کی آسائش، نفاستوں

اور سہولتوں میں اسے مزدوروں اور دہقانوں کے راج کی آخری سانسوں کے گھنگھرو سنائی دینے لگے لیکن وہ بے بس اور بے وطن تھا..اُن کی نسل کا نہ تھا جن کے وطن میں وہ اپنے وطن کو تیاگ کر بس گیا تھا تا کہ وہ اُس لمحے کا گواہ ہو جب تاج اچھالے جائیں گے اور تخت گرائے جائیں گے اور راج کرے گی خلقِ خدا..

نہ تاج اچھالے جا سکے، نہ تخت گرائے جا سکے اور نہ ہی خلقِ خدا راج کر سکی.صرف سرمایہ داری کا خدا یزید کی صورت میں ظاہر تھا جو کہ اول بھی تھا اور آخر بھی..اُس کی اور ہلٹر ڈ کی واحد ذاتی جائیداد یہ ایک بیڈ روم کا فلیٹ تھا جو برلن کے اس قدرے سرسبز نواح میں کثیر المنزلہ عمارتوں کے ہجوم میں کسی ایک عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا اور وہاں رات گئے تک روشنی رہتی..

ہر شب کی مانند جب ہلٹر ڈ اُسے ہدایات دے کر سونے کے لئے چلی جاتی.. پانی کی آمیزش کے بغیر واڈکا سے لبریز گلاس وہ چند گھونٹوں میں خالی کر دیتا تو لامحالہ..ہر شب کی مانند وہ شاید ہزاروں مرتبہ دیکھے جا چکے اپنے بوسیدہ ہو چکے تصویری البم شیلف میں سے نکالتا اور اُنہیں ایک مقدس کتاب کی مانند کھول کر اُن پر جھک جاتا..ہر تصویر اُسے از بر تھی کہ وہ تصویریں صرف اُن البموں میں ہی نہیں اُس کے ذہن میں بھی چسپاں ہو چکی تھیں...وہ سب کی سب امتدادِ زمانہ سے بھوری پڑتی جاتی تھیں..کونے ڈھلکتے جاتے تھے اور وہ سب بلیک اینڈ وہائٹ تھیں جن کا بلیک دُھندلا رہا تھا اور وہائٹ پھیکا پڑ چکا تھا..

اُن راتوں میں وہ سر جوڑ کر انگریز سرکار کے خلاف باغیانہ پمفلٹ لکھتے..ایک خفیہ ہینڈ مشین پر پرنٹ کر کے اُنہیں سنسان گلیوں اور بند ہو چکے بازاروں میں دیواروں اور دروازوں پر چوری چھپے چسپاں کر کے رات کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے..اگلے روز ڈھنڈیا پٹ جاتی اور اُن میں سے کچھ گرفتار کر لئے جاتے..وہ جو دبیز عینکوں والے، پریشان بڑھے ہوئے بالوں والے، ٹوٹی ہوئی چپلوں اور اکثر بھوکے رہنے والے نوجوان تھے کسی کامریڈ کے گھر میں یا کسی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر دنیا کو بدل دینے کی جدوجہد میں نشتر کے طور پر کوئی ڈرامہ تحریر کرتے..لکھنؤ کی نوابی اور جعلی تہذیب کو رد کرتے ہوئے ایک سرخ سویرے کی آمد کو خوش آمدید کہنے کے لئے کوئی کھیل لکھتے..عارف نقوی کی خوش شکلی اُس کی اداکارانہ صلاحیتوں پر حاوی تھی اور وہ اکثر ان انقلابی ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کیا کرتا..اور اکثر پولیس کا چھاپہ پڑ جاتا اور وہ اپنے دبیز میک اپ اور تھیٹر کے لباس سمیت روپوش ہو جاتا..

ایک بجھتی ہوئی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر میں کچھ مدھم سے چہرے تھے..یہ شخص جس کے بال شانوں تک آتے تھے اور اسے کامریڈ لوگ خواجہ گیسو دراز کے نام سے پکارتے تھے ایک درمیانے درجے کا انقلابی شاعر تھا اور ان ڈراموں میں بخوبی راون کا کردار ادا کیا کرتا تھا جو اُن کے نزدیک جبر اور آمریت کی ایک علامت تھا، سرمایہ دارانہ نظام کا ایک پرتو تھا..وہ بعد میں ایک ان پڑھ ہندو عورت کے نیم سیاہ لیکن متناسب بدن کے عشق میں مبتلا ہوا اور اُس کی اکلوتی بیٹی ہمیشہ اس مخمصے میں رہی کہ میں کسی مندر میں جا کر ماتھا ٹیکوں یا کسی مسجد میں داخل ہو کر سجدہ ریز ہو جاؤں..

سب بکھر گئے تھے..

اُسے تب..جب کہ وہ اپنے خواب کے نیلے انقلابی دھندلکوں میں بسیرا کرتا تھا نہ کبھی لکھنؤ کے زمانوں کا خیال

آیا اور نہ ہی کراچی میں گزارے ہوئے ایام کا.. لیکن وہ دیوار کیا گری کہ ان دونوں شہروں نے اس پر یلغار کر دی کہ کیوں بھٹکتے پھرتے ہو.. ہم تمہارے منتظر ہیں.. لوٹ کے گھر آ جاؤ.. اور اس نے دو برس پیشتر ان کی پکار پر کان دھرا اور بہت پچھتایا.. جب بلٹر ڈاپنے زوال آمادہ گھٹنوں میں اُٹھتی ٹیسوں کی اذیت کم کرنے کی خاطر ایک یوگا کورس میں شامل ہوئی تو وہ اُس کی اجازت سے چندروز کے لئے کراچی چلا گیا..

یہ تو کوئی پرایا شہر تھا..

اُس نے لیاری کے اُس چھپر چائے خانے کو ڈھونڈ ھ نکالا جہاں لرزتی ہوئی ٹانگوں والی گندی میزوں پر چائے کی ایک پیالی پر جس کے کنارے میلے اور بھر چکے ہوتے کیسے کیسے انقلاب جنم لیتے تھے اور وہ سب کامریڈرات گئے تک مارکس کے ادبی نظریات پر بحثیں کرتے، ایک دوسرے کی توجیہوں کو رد کرتے پُر جوش ہوا کرتے تھے لیکن وہاں اب جتنے بھی لوگ تھے وہ سب کے سب جانے کون تھے.. وہ اُن کے درمیان میں ایک پوری شب بے مقصد بیٹھا رہا.. بیتے دنوں کی دھند میں ملفوف تنہا بیٹھا رہا.. وہ جہاں کہیں بھی اپنے کسی پرانے رفیق کی جستجو کرتا، اُس کی کھوج کرتا تو وہ دم توڑ کر خاک ہو گیا ہوتا یا خبر ملتی کہ وہ کہیں امریکہ یا کینیڈا میں اپنی اولاد کے ہاں گمنام پڑا ہے..

کوئی بھی شناسا نہ ملا..

اور اس شہر بے مثال میں گولی کا زور تھا..

بھتہ وصول کرنے کا ایک مقدس فریضہ تھا.. بوریوں میں بوجھل لاشیں ایک دستور تھا.. لسانی تنازعوں کی آگ سلگتی تھی جس میں کبھی بھائی لوگ بھسم ہوتے تھے اور کبھی خان لوگ.. منافرت اور تنگ نظری اس شہر کی گلیوں میں ایک آسیب کی مانند چھا چکی تھی..

وہ اس گورکھ دھندے میں ایک گمشدہ بچے کی مانند بھٹکتا پھرا اور بالآخر اپنی ایک بھتیجی کو دریافت کر کے اُس تک جا پہنچا.. جسے اُس نے آج تک دیکھا ہی نہ تھا اور نہ ہی وہ بھتیجی مکمل طور پر یقین کر سکی کہ اُس کے سامنے کھڑا یہ شخص.. سپید رنگت اور سفید گھنے بالوں والا.. جو یکدم نمودار ہو گیا ہے واقعی میرے مرحوم باپ کا بھائی بھی ہو سکتا ہے.. ایک موہوم سی یاد تھی کہ ابا کہہ رہے ہیں کہ بیٹے تمہارے ایک تایا جان بھی ہوا کرتے تھے جو سُرخے تھے، وہ مدتوں پہلے کسی جرمن عورت کے ساتھ بیاہ کر کے وہیں کہیں بس گئے تھے..

دو تین روز میں ہی اُسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک ناروا اور اجنبی بوجھ تھا..

وہاں کراچی میں اُس کی جان پہچان کا کوئی نہ تھا..

اور یہاں برلن میں بھی.. کوئی نہ تھا..

تو پھر وہ کہاں کا تھا..

●○●○●○●

وہ جو یکدم سرخ چوک میں داخل ہونے والی ایک تاریک گلی میں سے نکل کر اُس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے، چھ سات گنجے تھے جن کی کھوپڑیوں پر ٹیٹو کُھدے ہوئے تھے اور ان کے واڈ کا سے آگ ہوتے بھدّے روسی چہروں پر نفرت اور انتقام کے الاؤ جلتے تھے..

گالینا نے اسے متعدد بار منع کیا تھا کہ وہ شام کے بعد تنہا فلیٹ سے نہ نکلا کرے اور اگر نکلے تو اس کے آس پاس جہاں شاہراہ روشن ہو وہاں چہل قدمی کر لیا کرے لیکن فلیٹ کے اندر محبوس محسوس کرتا وہ اکثر تازہ ہوا میں چند سانس بھرنے کے لئے نکل جاتا، کچھ دیر گالینا کی ہدائت پر عمل کرتے ہوئے اپنی رہائشی عمارت کے بلاک کے نیچے فٹ پاتھ پر ٹہلتا اور پھر اُسے ایک ہول سا اٹھتا کہ میں ایک قیدی تو نہیں ہوں جو فٹ پاتھ کے اس پنجرے میں مقیّد رہوں اور تب وہ اپنی من مانی کرتا، جدھر جی چاہتا اُدھر کو نکل جاتا اور اکثر کراسنایا پلوشٹ یعنی سُرخ چوک کا رخ کر لیتا..سرخ چوک روسیوں کے لئے صرف کریملن ٹاور، ایک پیاز نما گنبدوں والے کلیسا اور پتھریلے فرش کا نام نہیں، یہ اُن کے دل میں زندگی کا خون بھرنے والی ایک پھڑکتی ہوئی رگ ہے جس کے بغیر ماسکو شہر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا..کمیونسٹ راج میں یہ ایک مقدس معبد کی شکل اختیار کر گیا کہ کریملن کی فصیل کے سائے میں عظیم لینن کا حنوط شدہ بدن ایک شیشے کے شوکیس میں لاکھوں زائرین کی اُس آخرت کا سامان کرتا تھا جس پر وہ ایمان نہ رکھتے تھے..سرخ چوک میں کمیونسٹ حج ہر برس یوم مئی کے موقع پر ہوتا تھا جب سوویت فوج کی قاہر اور دندناتی ہوئی قوت اس کے سینے پر یوں چلتی تھی کہ اس کی دھمک سے مغرب اور امریکہ لرزش میں آ جاتے تھے..کریملن کی دیوار پر ایستادہ بھاری فوجی وردیوں اور دبیز اوورکوٹوں میں ملبوس سینے پر آویزاں تمغوں کے بوجھ کو بمشکل سہارتے کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر چوک میں سے گزرتی سپاہ اور جنگ کے ہولناک ہتھیاروں کو سلام کرتے تھے.. ظہیرالدین کے لئے وہ لمحے کیسے یادگار تھے جب وہ روسیوں کے ہجوم میں پھنسا فلک شگاف نعرے لگا کر اشتراکی نظام کے ساتھ اپنی غیر مشروط وابستگی کا اظہار کیا کرتا تھا..اور اس نے اپنی آنکھوں سے یوم مئی کے موقع پر کریملن کی دیوار پر بُت بنے ایستادہ اس نظام کے اہم ترین رہنماؤں کو دیکھا تھا..خروشچوف، بلگانن، بیریا، مکویان، کوسیگن..تو یہی گزر چکے زمانوں کی وابستگیاں تھیں جو اُسے سرخ چوک کی جانب قدم اٹھانے پر مجبور کر دیتیں..

اور پھر یکدم ایک بغلی گلی سے وہ گنجے نمودار ہو گئے..نفرت کے تندور میں دہکتے سرخ چہرے نیم تاریکی میں سے ظاہر ہو گئے..

وہ ان کا مقابلہ تو کیا کرتا، اُن کے آہنی مکّوں اور زنجیروں سے گھائل ہوتا سرخ چوک کے پتھروں پر ڈھیر ہوتا گیا..

''حرامی غیر ملکی..ہماری عورتوں کو خراب کرنے والے..گو بیک..تم سؤر..غیر ملکی..''

''میں روسی ہوں..میں..''

''باسٹرڈ..''

جب وہ ڈولتا لڑکھڑاتا ایک خون آلود چہرے کے ساتھ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو گالینا نے اپنی وہیل چیئر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اعتنائی سے کہا''ظاہیر..میں نے تمہیں خبردار کیا تھا.تم اب سوویت یونین میں نہیں ہو..ایک آزاد جمہوری روس میں ہو..میں نے تمہیں خبردار کیا تھا..''

●○●○●○●

مجھے نہیں معلوم کہ آج کی شب میں کہاں بسر کروں گی..

اور یہ پہلی شب تو نہیں جب مجھے قطعی طور پر کچھ اندازہ نہیں کہ میں کہاں سوؤں گی..اور یہ کوئی قابل تشویش بات بھی نہیں کہ ایک جپسی کی زندگی اسی بے یقینی سے عبارت ہے کہ آج کی شب وہ کونسے خیمے میں بسر کرے گی اور وہ خیمہ کس سرزمین پر ایستادہ ہوگا..اور اُس خیمے میں وہ تنہا ہوگی یا کوئی اور بھی ہوگا..طے شدہ شب و روز اپنے معمولات میں جکڑے ہوئے بے جان لوگوں کے ہوتے ہیں اور جپسی لوگ جاندار ہوتے ہیں اس لئے وہ ہزاروں برسوں سے ایک ہی راستے پر چلتے ہوئے معمولات سے انحراف کرتے ہیں..اسی لئے نہیں جانتے کہ آج کی شب کہاں بسر ہوگی..

میرے کانوں میں عجب مترنم گھنگھروؤں کی چھنک اور ڈرمز کی تھاپ اترتی ہے جو اس ریستوران، جس کی کھلی چھت پر میں بیٹھی ہوں، اس کے عقب میں واقع لاہور کے اُن گنجان پرانے مکانوں، جھروکوں اور حویلیوں سے آ رہی ہے جسے مقامی لوگ ہیرا منڈی یا ڈائمنڈ مارکیٹ کے نام سے جانتے ہیں..

میں نے کچھ روز اپنے استاد جی شبیر حسین کی خصوصی سفارش پر ایک ڈانسنگ گرل شمع کے کوٹھے پر گزارے ہیں..

وہ ناچ گرل..شمع..میرے لئے تو ایک عجوبہ اور آزاد روح شے تھی..اگر آپ میری اٹھی ہوئی انگلی کی سیدھ میں دیکھنے کا تردد کریں تو میں اُس کے کوٹھے کی نشاندہی بھی کر سکتی ہوں کہ کچھ بعید نہیں کہ گھنگھروؤں کی یہ چھنک اُسی ناچ گرل کے تھرکتے پاؤں کی آ رہی ہو..اور یہ جو طبلے کی تھاپ سنائی دے رہی ہے تو اُس کے بارے میں میں حلفیہ بیان دے سکتی ہوں کہ وہ استاد جی کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے..میرا خیال تھا کہ میں شمع سے بہت کچھ سیکھ سکوں گی..میں نے جو ملکوں ملکوں خاک چھانی ہے ایک رُک سیک اور ایک گٹار کے ساتھ تو نہ صرف میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کے لئے گھر سے نکلی تھی بلکہ میری آرزو تھی کہ میں اپنی اس آبائی تہذیب کے رقص کا مشاہدہ کر کے، اسے جپسی رقص کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اسے ایک بین الاقوامی معجزے کے طور پر متعارف کرواؤں..لیکن اُس شمع کا ناچ..اور وہ ہمیشہ کرنسی نوٹ اچھالتے مخمور تماشائیوں کے سامنے ہی اپنے انگ متحرک کرتی..ایسا تھا جو میری سمجھ میں نہ آ سکا..وہ رقص نہ تھا، نیم کلاسیکی، فلمی اور ہیجانی انداز میں تھرکتے جانے کی کوئی ورزش تھی جس میں فن کے اظہار کی بجائے جنسی برانگیختگی کے پہلو پُر اشتعال ہوتے تھے...میں تب وہاں سے..اگرچہ وہ ایک شفیق اور مہربان عورت تھی..رخصت ہوئی، جب گئی رات اُس کے کوٹھے پر اور شمع اُس کے قدموں میں بچھ گئی، کسی مرکزی وزیر کا ایک خوش شکل اگرچہ لڑکھڑاتا ہوا بیٹا آیا اور اُس کی نظر..اور میں اپنے اُستاد کے پہلو میں بیٹھی مشاہدہ کر رہی تھی..مجھ پر پڑ گئی..کچھ دیر بعد اُس نے مجھے نہایت شستہ انگریزی میں مخاطب کیا کہ وہ کارنیل یونیورسٹی سے

بین الاقوامی امور میں ڈگری حاصل کر چکا تھا اور میرے ساتھ رقص کرنے کی مؤدب خواہش کا اظہار کیا جو میں نے بخوشی قبول کر لی کہ یہی تو میری تمنا تھی کہ میں اپنے اس آبائی خطے میں آؤں.. یہاں اپنے جپسی گیت سناؤں اور رقص کروں.. میں اُس کے ادب آداب سے بھی بے حد متاثر ہوئی لیکن کچھ ہی دیر بعد بھانپ گئی کہ نہ تو وہ میرے گیتوں میں اور نہ ہی میرے جپسی رقص میں بلکہ صرف میرے بدن میں دلچسپی رکھتا تھا اور میں آپ کو بتا دوں کہ اکثر جپسی لڑکیوں کی چھاتیاں بڑی بڑی ہوتی ہیں.. میں.. بتیس برس کی ہو چکی ہوں، کوئی نادان، معصوم اور بھولی بھالی لڑکی نہیں ہوں.. میں نے ملکوں ملکوں سفر کیا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے لیکن صرف اُس گھاٹ کا جو میرے دل کو بھاتا تھا.. اور وہ جو ایک جہاز نما گاڑی میں سے اتر کر ایک حفاظتی دستے کے ہمراہ شمع کے کوٹھے پر آیا تھا، اُس نے کچھ دیر بعد مجھ سے دست درازی کی کوشش کی، میری چھاتیوں پر ہاتھ رکھا اور ایک سرگوشی میں بہت سی رقم کی پیشکش کی اور یہ مجھے گوارا نہ تھا..

میں، جینا اسلام، ایک روما جپسی، ایک پاکستانی باپ کی بیٹی ایک بدن فروش تو نہ تھی، میرے کچھ ذاتی اصول تھے، ایک اخلاقی حد تھی..

کیا آپ جاننا پسند کریں گے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں؟

اگر آج کی شب میں لاہور کی ہیرامنڈی کی حد پر واقع ایک ایسے ریستوران کی چھت پر بیٹھی ہوں جس کے سامنے.. آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے اور اس دنیا میں کیسے کیسے خوش نما مناظر والے ریستورانوں میں سے میں نے کھانا کھایا ہے اور ان کی تعداد سینکڑوں میں ہوگی.. آئرلینڈ، انگلستان، بلغاریہ، ترکی، ایران کبھی سمندروں کے کنارے.. پہاڑوں میں پوشیدہ.. قدیم کھنڈروں میں ترتیب شدہ.. آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں کی قربت میں.. اور یہ فہرست بہت طویل ہے.. لیکن میں کبھی بھی ایک ایسے ریستوران کی چھت پر نہیں بیٹھی جس کے سامنے ایسا گنگ کر دینے والا.. تاریخی، روشن اور ناقابل یقین منظر ایک رات میں ہو.. عین سامنے سرخ راجھستانی پتھر سے تعمیر کردہ شاہی مسجد ہے جس کے گنبد کسی خانہ بدوش لڑکی کے ابھاروں کی مانند متناسب اور دودھیا ہیں.. سرخ چار دیواری کے اندر ایک تالاب کے پانیوں کے اندر روشنیاں نصب ہیں اور وہ پانی پارے کی مانند تھرتھراتے اور جگمگاتے ہیں.. اور بائیں جانب لاہور کے شاہی قلعے کا ہیبت ناک پھاٹک اور اُس کے اندر وہ شیش محل جس کے ہر شیشے میں میں اپنا عکس تصور کر سکتی ہوں.. اگرچہ میرا چہرہ کسی مغل پرنسس کی مانند ایک نمکین مشرقیت کی دل کشی کا حامل تو نہیں لیکن کچھ ایسا برا بھی نہیں کہ وہ ان مغل عہد کے ہزاروں شیشوں میں منعکس ہو اور وہ شیشے شرمندہ ہوں..

کیا آپ دلچسپی رکھتے ہیں کہ میں ڈینیوب کے کنارے اپنے شہر بوداپسٹ سے نکل کر یہاں راوی کے کنارے لاہور تک کیسے آ پہنچی؟

لیکن میں اپنی داستانِ سفر بیان کرنے سے پیشتر میرا خیال ہے، میں آپ کو اپنی گٹار کے ساتھ ایک ایسا جپسی گیت سناؤں جو میں نے بلغاریہ کے کالڈراش جپسی خاندان کی ایک بوڑھی عورت سے سیکھا تھا، اس گیت کو خانہ بدوشوں کے قومی ترانے کا درجہ دیا جاتا ہے، اُس بوڑھی جپسی کے منہ میں دانت نہیں تھے اور غالباً وہ سو برس سے اوپر کی عمر کی تھی.. اُس کے پوپلے منہ میں سے حرف بمشکل برآمد ہوتے تھے اور ان کے ساتھ وہ مجھ پر پھونکیں مارتی چلی جاتی تھی تاکہ

میں کسی آسیب کا شکار نہ ہو جاؤں..ہو سکتا ہے ان میں سے کچھ حرف میری سمجھ میں نہ آئے ہوں اور میں نے اُن سے اپنی پسند کا مطلب نکال لیا ہو..اور ہاں میری آواز روایتی انداز میں سُریلی نہیں ہے، اس میں ایک قدرتی ان گھڑت ہے جو جپسی گیتوں کی جذباتی ادائیگی کے لئے موزوں ہے..آپ سننا پسند کریں گے ناں؟

''میں نے سفر کیا ہے..
میں نے سفر کیا ہے..میں نے سفر کیا ہے طویل شاہراہوں پر..
اور میری ملاقات ہوئی ہے پُرمسرت خانہ بدوشوں سے..
وہ روما تھے..
اور یہ روما خانہ بدوش کہاں سے آئے..
خیموں کے ساتھ، خوشی کی شاہراہ پر سفر کرتے..
کہاں سے آئے..
اے خانہ بدوشو..اے بھائیو..
میرا ایک بڑا خاندان ہوا کرتا تھا..
تب ایک سیاہ بادل (ہٹلر) نے اُنہیں قتل کر دیا
میرے ساتھ آ جاؤ خانہ بدوشو تمام دنیا سے..
کیونکہ..خانہ بدوشوں کی شاہراہیں کھل گئی ہیں..
اب وقت آ گیا ہے اے خانہ بدوشو..کہ تم کھڑے ہو جاؤ..
ہم سربلند ہو جائیں گے اگر آج ہم عمل کریں گے..
میں نے سفر کیا ہے طویل شاہراہوں پر..''

گیت الاپتے ہوئے ردعمل جانچنے کے لئے میں آپ کے چہرے کو تک رہی تھی تاکہ مجھے اس جپسی گیت کی پسندیدگی کے کچھ آثار نظر آئیں..میرا خیال ہے اس گیت نے آپ کو سوگوار کر دیا ہے..
مجھے نہیں معلوم کہ آج کی شب میں اس شہر لاہور میں کس چھت تلے، کس گھر، ریسٹ ہاؤس یا ہوٹل میں بسر کروں گی..ہو سکتا ہے مجھے کسی بند دوکان کے تھڑے پر سونا پڑے..ویسے میرے پاس اپنا سلیپنگ بیگ موجود ہے..
اس گھریلو ریستوران کے بلند ترین حصے پر جسے یہ لوگ ممٹی کہتے ہیں، کچھ اچھی شکلوں والے الہڑ اور بے دریغ نوجوان بیٹھے ہوئے ہیں جو متمول گھرانوں کے لگتے ہیں اور مجھے شک ہے کہ اُن کی منرل واٹر کی بوتلوں میں منرل واٹر نہیں کہ وہ بار بار بے وجہ کھلکھلا کر ہنستے ہیں..اور وہ کن اکھیوں سے مجھے تکتے ہیں..اگر وہ میرے لئے آج کی شب کے لئے کوئی بندوبست کر سکیں تو شاید میں قبول کر لوں..مجھے امید ہے کہ وہ مجھ سے میرے جپسی گیتوں کے سوا اور کسی شے کی توقع نہیں

کریں گے.. اگر کریں گے تو اُنہیں مایوسی ہوگی.. ہوسکتا ہے اُن کی مایوسی انہیں زبردستی پر آمادہ کر دے.. یا وہ مجھے اپنے گھر یا کسی گیسٹ ہاؤس سے باہر نکال دیں کہ کم از کم ایک بار تو ایسا ہو چکا ہے.. اور اگر وہ نکال بھی دیں تو میرا کیا ہے، میں کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گٹار کو آغوش میں لے کر مدھم آواز میں جیسے اپنے آپ کو سنا رہی ہوں کچھ جپسی گیت گاؤں گی اور یوں صبح ہو جائے گی..

تو میں جینا اسلام ہوں..

اور یہاں ایک بڑی مصیبت ہے جب میں اپنا نام بتاتی ہوں تو ہر کوئی پُر مزاح ہونے کی حماقت انگیز کوشش کرتا ہے.. کہ اچھی وہی.. جینا لولو برجیڈا والی جینا.. اور میں زبردستی مسکراتے ہوئے کہتی ہوں کہ ہاں وہ بھی لیکن دراصل میں اردو والی جینا ہوں.. تیرے بنا کیا جینا.. جیسے آپ کے پُرکھوں کے نام ہوتے تھے مائی جِنداں.. بی بی جیونی.. ایسے جینا اور اس کے ساتھ اسلام.. کہ یہ میرے پاکستانی باپ کا نام ہے.. مصطفیٰ اسلام..

اگر آپ اب تک اُکتا نہیں گئے اور واقعی دلچسپی رکھتے ہیں کہ میں اپنے گھر بوداپسٹ سے نکل کر.. ہنگری سے نکل کر.. یہاں تک کیسے چلی آئی تو میں اپنی مسافت کے برسوں کو چند لمحوں میں قید کرتی ہوں اور مختصر طور پر اپنی کہانی بیان کرتی ہوں..

وہ بے خودی اور بے اختیار قوت جس نے مجھے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا، وہ زندگی کی خارجی اور داخلی تجربوں میں سے نوخیز کونپلوں کی مانند پھوٹ نکلی تھی.. میں نے ایک خواب دیکھا تھا.. ایک تنگ گلی ہے جس کے گرد گھیرا ڈالے قدیم جھروکوں اور شکستہ بالکونیوں والے سحر انگیز سانس لیتے مکانوں کی بالائی منزلوں پر جو دھوپ اترتی ہے وہ وہیں کچھ دیر قیام کر کے پھر سے پلٹ جاتی ہے اور یوں اُس تنگ گلی میں ایک سوگوار سرمئی اندھیرا ہمہ وقت براجمان ہے.. اُس گلی کی بوسیدہ اور سرخ رنگت کی اینٹوں کی جھریوں میں سے یکدم ہریاول بھرے بُوٹے پھوٹنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُسے ڈھانپ لیتے ہیں.. گلی کا فرش روپوش ہو جاتا ہے اور ہریاول کا ایک وسیع کُنج اُس پر بچھ جاتا ہے، میں کم از کم ایک انجانے پرندے کی کُوک اُس ہریاول کی پوشیدگی میں سے جنم لیتی سُن سکتی ہوں.. اور پھر میں ایک پرانے، نیم تاریک مکان میں داخل ہوتی ہوں جس کے مکین کب کے جا چکے ہیں اور اُس مکان کی پہلی منزل پر ایک کمرہ ہے جس کی کھڑکی گلی کی جانب کھلتی ہے اُس میں رنگین شیشے جڑے ہیں اور اُن میں سے ایک الوہی سرخ روشنی سرائت کرتی ہوئی اُس کمرے کو بھرتی ہے اور میں اُس روشنی میں نہا جاتی ہوں..

میں بس اسی خواب کے تعاقب میں یہاں تک چلی آئی ہوں..

آج شام.. جب کہ میں کوچہ و بازار میں چلتے پھرتے مجھ پر متجسس نظریں ڈالتے لوگوں سے آنکھیں چُراتی لاہور شہر کے اندرون میں، لوہاری دروازے کے اندر گلیوں میں بھٹک رہی تھی اور میرے ہاتھ میں میرے باپ کا لکھا ہوا ایک پتہ تھا جسے میں نے تلاش کرنا تھا کہ وہ انہی گلیوں میں پلا بڑھا تھا تو یکدم میں پھر سے اُس خواب میں داخل ہوگئی.. ایک تنگ گلی تھی جس کے گرد گھیرا ڈالے قدیم جھروکوں اور شکستہ بالکونیوں والے سحر انگیز مکان سانس لیتے تھے.. اور اُس گلی کی سرخ اینٹوں کی جھریوں میں سے جیسے کسی جادو کے زور پر بوٹے پھوٹتے تھے.. اور وہاں ایک مسمار ہوتا قدامت سے سرنگوں

ہوتا ایک گھر تھا جس میں کوئی بھی نہ رہتا تھا..اور اُس گھر کے اندر ایک کمرہ..اُس کی گلی کی جانب کھلتی کھڑکی کے شیشے رنگین تھے..لیکن یہ خواب نہ تھا، حقیقت تھی..

میرا باپ مصطفٰی اسلام اسی گھر میں پیدا ہوا تھا..

اس نے کہا تھا کہ جینا..اور یہ نام اُسی نے رکھا تھا..

اُس نے کہا تھا کہ جینا..اگر تم اپنی آوارہ خانہ بدوشی کے دوران میرے آبائی شہر جا پہنچو تو..کوچہ کمانگراں کے اُس مکان کو جا تلاش کرو کہ وہاں رنگین شیشوں والی ایک کھڑکی ہے اور میں جب جوانی کی نوخیز حدت میں سلگتا تھا تو اس کھڑکی میں سے ایک الوہی سرخ روشنی کمرے کے اندر کو منور کرنے لگتی تھی اور وہ میرے بلند آدرشوں کی اشتراکیت کی بین الاقوامی سچائی کی روشنی ہوا کرتی تھی..کیا اب بھی وہ سرخ روشنی وہاں موجود ہے یا بجھ چکی ہے، یہ میں جاننا چاہوں گا..

لیکن میں اتنی آسانی سے تو کوچہ کمانگراں کی اُس گلی میں نہیں پہنچ گئی تھی جس کی اینٹوں میں سے ہریاول پھوٹتی تھی۔

میں بہت در بدر ہوئی..رُسوا اور پامال ہوئی..کوچہ بہ کوچہ..شہر بہ شہر خوار ہوئی، اپنی ایک گٹار، ایک رُک سیک، ایک سلیپنگ بیگ کے ساتھ..کسی بھی زیر جامہ کے بغیر..اور اس در بدری کے دوران مجھ پر بہت کچھ آشکار ہوا..

زندگی اور موت پردۂ راز ہیں، معمے ہیں جن کا حل خدا کے پاس ہے..چاہے ایک انسان کا مذہب کچھ بھی ہو..

جس سچائی کو آپ حرفِ آخر سمجھ کر گھر سے نکلتے ہیں، وہ آخری اور حتمی سچائی نہیں ہے..اُس کے سوا اور بھی سچ ہیں..آپ ہی کی محبت آخری محبت نہیں اور نہ ہی آپ کے دُکھ آخری دکھ ہیں ان کے سوا بھی محبت اور دکھ ہیں..

اور یہ کہ اس آفاقی سلطنت میں ہماری کچھ حیثیت نہیں ہے، ایک ذرّہ بھی تم سے کہیں بڑھ کر حیثیت والا ہے کہ اُس نے قائم رہنا ہے اور تم نے فنا ہو جانا ہے..

اور میں اس دوران شہرۂ آفاق ناول نگار پاؤلو کولہو سے بھی ملی..وہ اگرچہ ایک بڑا اور ابد تک قائم رہنے والا ناول نگار نہیں ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر لمحۂ موجود میں وہ تمہیں رومانی طور پر متاثر کرتا ہے اور تمہیں اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے..اور وہ بھی ایک خانہ بدوش ہے..در بدر بھٹکتا آخری سچ کا متلاشی ہے..

میں اگر یہاں تک لاہور تک آن پہنچی تو ایک جپسی کی مانند در بدر ہوتی، بھٹکتی، سرحدیں عبور کرتی، زمین کے سینے سے لگ کر اُس کی دھڑکن پر کان دھرتی، کبھی کھلے آسمان تلے راتیں بسر کرتی کوچہ کوچہ قریہ قریہ بھٹکتی پہنچی..میرے راستوں میں ترکی بھی پڑتا تھا جہاں میں نے مولانا روم کے شہر قونیہ میں گھومتے ہوئے رقص کرنے والوں کے ساتھ چند روز بسر کئے تاکہ میں اُن کے الوہی رقص کے کچھ انداز اپنے آبائی جپسی رقص میں شامل کر کے ایک نیا آوارہ گرد اور رومانی رقص دریافت کر سکوں..تصوف کے کچھ بھید پا سکوں..سبھی تو نہیں لیکن اُن میں سے کچھ درویش گھومتے ہوئے افلاک پر نہیں میری چھاتیوں پر نظر رکھتے تھے..

میں نے کچھ عرصہ ایک ایرانی فلم ساز کے ہمراہ بھی گزارا اور یہ بھی ایک منفرد تجربہ تھا..میری تمنا تھی کہ میں ایران کے بویار احمد اور افغانستان کے کوچی خانہ بدوشوں کی رفاقت میں کچھ سفر کروں لیکن یہ تمنا پوری نہ ہو سکی..

میں ہندوستان بھی گئی تھی جہاں ممبئی میں ایک فلم پروڈیوسر کے فلیٹ میں تین ماہ قیام کیا کہ شائد وہ میرے لئے کسی فلم میں اداکاری کرنے اور گیت گانے کا بندوبست کر سکے لیکن کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا..وہ ایک مکار اور جھوٹا شخص تھا جو میرے عورت ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا..آپ مجھ پر شائد شک کریں لیکن میں،اب تک کے بیانیے سے آپ اتنا تو جان چکے ہوں گے کہ میں جھوٹ بولنے والوں میں سے نہیں ہوں..تو صرف اس لئے نہیں کہ میں لمحۂ موجود میں اس شہر میں ہوں اور میرا باپ بھی کبھی ایک پاکستانی تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ لوگ جو لاہور میں رہتے ہیں اپنی خوش بختی کا اندازہ نہیں لگا سکتے..یہ ایک میزبان اور غیروں سے بھی اپنوں کی طرح ملنے والا شہر ہے..یہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی وعدہ کر کے اُسے پورا نہ کرے..میری ملاقات اگر کسی خاندان سے ہوگئی ہے تو انہوں نے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مجھے کھانے کے لئے مدعو نہ کیا ہو اور اکثر اپنے گھر میں رہائش کی پیشکش نہ کی ہو جب کہ ممبئی ایک خود پرست،فریبی اور بے رحم شہر ہے اور..وہ بہت گندا ہے..

چنانچہ اپنی طویل دربدری کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں اب اسی شہر میں قیام کروں گی..یہیں رقص کروں گی اور اپنے گیت گاؤں گی کہ یہ ایک میوزیکل شہر ہے..اور اس شہر پر میرا حق بنتا ہے..آخر باپ کی جانب سے میں کم از کم آدھی لاہورن تو ہوں..اور اگر یہ شہر میرے لئے سراسر پرایا ہوتا،میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو بھی میں ہنگری کے اُن باشندوں کی مانند جو ذوقِ جمال رکھتے ہیں،اس شہر کو امرتا شیر گل کے حوالے سے دل کے قریب جانتی..اُس کا سکھ باپ شیر گل آپ کے شاعر اقبال کا انتہائی قریبی دوست تھا اور اقبال جب پیرس گئے تو اُس کے شاہانہ گھر میں قیام کیا..اور اُس کی ماں ہنگیرین تھی..بوداپسٹ میں ایک گلی ''امرتا شیر گل'' کے نام پر ہے۔آپ کے ذہن میں یہ سوال جنم لے رہا ہوگا کہ امرتا شیر گل جس کے حسن کا کُل ہندوستان میں چرچا تھا اور اُس کا بدن شفاف شیشے کا بنا ہوا تھا جس میں دودھ کی دھاریں تھیں اور وہ ایک مرد مار عورت تھی اور بے وجہ شائد خودکشی کے نتیجے میں جوانی میں ہی مرگئی اور دریائے راوی کے کنارے اُس کی لاش جلائی گئی تو اُس کا باپ تو شیر گل تھا تو میرا باپ..مصطفےٰ اسلام کون ہے..

آپ کچھ صبر کریں،میں بتاؤں گی..

رات گہری ہو رہی ہے اور لاہور کے شاہانہ قدیم آثار کو منور اور مخمور کرتی روشنیاں ایک ایک کر کے گُل ہونے لگی ہیں اور مٹی پر بیٹھے وہ بے فکرے نوجوان اب اونگھنے کو ہیں..

میرا باپ..مصطفےٰ اسلام شیخ کون ہے؟

●○●○●○●

ایک بیٹی.. اور وہ بھی اکلوتی بیٹی.. چاہے وہ پچھلے دو برسوں سے آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہو.. اور ابھی کل ہی اُس کا ایک محبت سے بھرا خط آیا ہو جس کے لفافے پر چسپاں ڈاک کے ٹکٹوں پر ثبت مُہر پر لاہور ایک بجھی ہوئی روشنائی میں بھی پڑھا جا سکتا ہو اور لاہور کی مُہر کو دیکھ کر میرے دل نے کیسی کسک آمیز کروٹیں لی تھیں اور اس نے لکھا ہو کہ ڈیڈی میں بالآخر اُس گلی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں جس کی اینٹوں میں سے ہریاول کا گھنا پن پھوٹتا مجھے خوابوں میں دکھائی دیا کرتا تھا اور وہ گھر مسمار ہونے کو آتا گھر جس کی سرخ اینٹیں اپنے مقام سے کھسک رہی ہیں کہ ان میں اپنی قدامت کو سہنے کی مزید سکت نہیں اور اُس کے ایک کمرے میں رنگین شیشوں والی ایک کھڑکی جو جانے کب سے کھلی تھی، اُس میں سے ایک الوہی سرخ روشنی داخل ہو رہی تھی جس میں میں نہا گئی.. اور آپ ڈیڈی اسی کمرے میں پیدا ہوئے تھے ناں.. تو وہ بیٹی اپنے باپ کا تعارف کرواتے ہوئے کہیں نہ کہیں جھجک جائے گی، کچھ دید لحاظ کرے گی، کچھ حقائق سے جان بوجھ کر چشم پوشی کر لے گی تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں مصطفےٰ اسلام شیخ خود ہی بیان کروں کہ میں کون ہوں..

میں اِدھر بودا میں ہوں.. اُدھر پسٹ ہے اور درمیان میں ڈینیوب بہتا ہے جو ان دونوں بستیوں کو ملا کر بوداپسٹ کے شہر کو جنم دیتا ہے..

رات کے اس پہر ڈینیوب کے پانی نیلے نہیں ایک سیاہ چادر کی مانند سوگواری سے لگتا ہے کہ تھمے ہوئے ہیں.. اس کے دونوں کناروں پر تجارتی عمارتوں اور فلیٹوں کے جو سلسلے سر بلند ہیں اُن میں سے ایک فلیٹ ایسا ہے جس میں رات کے اس پہر بھی روشنی ہے جو اُس سیاہ چادر پر پڑتی ہے تو اُس میں ایک روشن سلوٹ پڑ جاتی ہے.. یا پھر کوئی کار دریا کنارے ایک موڑ مڑتی ہے تو اُس کی روشنیاں اُس کے پانیوں کی سوگوار چادر پر ایک روشن دھبّے کی صورت نمایاں ہوتی ہیں اور پل بھر میں بجھ جاتی ہیں..

اگرچہ دسویں منزل پر واقع میرا یہ مختصر فلیٹ بھی ڈینیوب کے رُخ کھلتا ہے لیکن اس کی روشنی ان دس منزلوں سے اتر کر جب ڈینیوب کے پانیوں پر پڑتی ہے تو اتنی مدھم ہو چکی ہوتی ہے کہ بمشکل سجھائی جاتی ہے..

مجھے ڈر ہے کہ اگلے برس میں اس فلیٹ میں نہیں ہوں گا..

سوویت یونین کے زیر تسلط.. جتنی بھی ریاستیں تھیں اور اُن میں سے کچھ پر کچھ جبر نہ تھا کہ وہاں کی کمیونسٹ تحریکیں بخوشی ایک عظیم آدرش کی شراکت کار ہوئی تھیں.. پولینڈ، مشرقی جرمنی، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، البانیہ اور ہنگری وغیرہ تو اُن کے لئے سوویت یونین ایک رول ماڈل تھا جس کی پیروی ایک مقدس فریضے کی مانند کی جاتی

تھی، ہر ملک اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے سوویت یونین میں ڈھالنے کا آرزومند تھا..وہاں کے راہنما بھی بھاری اونی اوورکوٹ اور ہیٹ پہنتے جن کے نیچے اُن کی آنکھیں دکھائی نہ دیتیں، اُسی طور اپنے چہروں کو کرخت اور منجمد کئے جن پر مسکراہٹ لانا ایک گناہِ کبیرہ تھا..وہ بھی اپنے مجسّمے ملک کی ہر شاہراہ پر، ہر چوک اور ہر تاریخی مقام پر ایستادہ کرواتے اور مخالفین کو نہایت کھری نیت سے نیست و نابود کروا دیتے۔ یوم مئی کے موقع پر سرخ چوک میں دندناتی، دلوں میں دہشت بھر دینے والی فوجی پریڈ اور مہلک ہتھیاروں کی نمائش کے تتبع میں اپنے ملک کی مرکزی شاہراہ پر یہی انتظام ہو بہو کرتے.. خروشچوف نے جب اعلان کیا کہ اگلے دو برس کے اندر اندر ہر سوویت شہری کے سر پر ایک چھت ہوگی جو اُس کی اپنی ہوگی.. بے شک ایک یک کمرہ فلیٹ، ایک ایسا غسل خانہ جس کا دروازہ بند کرنے سے آپ کموڈ پر نہ بیٹھ سکیں اور آپ کا چہرہ واشنگ بیسن کے اوپر لگے شیشے سے جا ٹکرائے، ایک کبوتر خانے کے موافق ہو..لیکن ہر شہری کے لئے ایک پناہ گاہ..اور یہ وعدہ پورا ہوا..لاکھوں کی تعداد میں یہ ڈربہ نما فلیٹ تعمیر ہو گئے اور ہر فرد کو ایک چھت میسّر آ گئی..اُدھر سوویت یونین میں یہ تعمیراتی سرگرمی شروع ہوئی تو ادھر ان کامریڈ ملکوں میں بھی اسی نوعیت کی بھگدڑ مچ گئی..

میں جس فلیٹ میں پچاس برس سے رہتا ہوں یہ اُسی بھگدڑ کے نتیجے میں ظہور میں آیا تھا..

پھر سوویت یونین کے تن بدن میں دراڑیں پڑنے لگیں..گورباچوف کی اصلاحات کے نتیجے میں یہ بدن ڈھیلا پڑنے لگا اور اُس کی گرفت ان ریاستوں پر بھی ڈھیلی پڑنے لگی اور یوں ہنگری بھی ''آزاد'' ہو گیا..ایک زمانے میں.. ہنگری کے عوام نے سوویت شکنجے سے آزاد ہونے کے لئے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا، مقامی کمیونسٹ حکمران اس عوامی ریلے کے سامنے ڈولنے لگے تو سوویت یونین اپنے ان پیاروں کو بچانے کے لئے ان کی دعوت پر دخل انداز ہوا اور اس بغاوت کو اور لوگوں کو اپنے ٹینکوں سے کچل دیا اور اب وہ گھر بیٹھے بنا کسی جدوجہد کے آزاد ہو گئے تھے اور یہ جو غیر متوقع آزادی تھی اس میں اُن سینکڑوں کمیونسٹ دور میں تعمیر کردہ بھدی اور بے روح عمارتوں کو جمہوریت کی توہین گردانا گیا اور انہیں مسمار کر دینے کا فیصلہ ہو گیا کہ ان کی جگہ نہایت شاندار اور منفعت بخش شاپنگ کامپلیکس، لگژری ہوٹل، قمار خانے اور ایک ڈزنی لینڈ تعمیر ہو سکتا تھا، چنانچہ مجھے ڈر ہے کہ میں اگلے برس اس فلیٹ میں نہیں ہوں گا، اسے گرا دیا جائے گا..

میں جب ایک کمیونسٹ یوتھ ہوسٹل سے یہاں منتقل ہوا تھا تو اس منتقلی کو بھی تو بے شمار برس ہونے کو آئے ہیں تو اس دوران میں آسانی سے اس سے کہیں بہتر اور فراخ رہائش گاہ میں منتقل ہو سکتا تھا لیکن میں...روجا کے لعن طعن کے باوجود یہیں ٹکا رہا کہ..اس فلیٹ کی کھڑکی کے نیچے ڈینیوب بھی بہتا تھا جس سے میں جدا نہ ہو سکتا تھا..

اگر میں راوی سے ایک عرصے سے جدا ہو چکا تھا تو اب ایک اور دریا سے..جو میری محبتوں اور چاہتوں کا امین تھا، جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

صرف ایک دریا کے بہاؤ سے نہ بچھڑنے کے لئے ایک تنگ اور غیر آرام دہ فلیٹ میں عمر بھر پڑے رہنا سستی رومانویت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، ایک کٹڑ انقلابی کو تو رومان پسند نہیں ہونا چاہیے لیکن میری نظریاتی بنیادوں میں کوئی کجی تھی کہ میں رومانویت سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا..پنجاب یونیورسٹی میں زیر تعلیم فلسفہ کے بیشتر انقلابی طالب علموں کی مانند میں بھی پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے ملک رؤف صاحب کے توسط سے مکمل روسی کلاسیکی ادب پڑھ چکا تھا..ماسکو میں ایک کثیر

پیمانے پر شائع ہونے والے شاہکار روسی ادب کے اردو تراجم کوڑیوں کے مول مل جایا کرتے تھے..ان میں سے اکثر تراجم ظ۔انصاری کی پسینہ آلود مشقتوں کی گواہی دیتے تھے،انصاری صاحب قدرے نستعلیق کا مرید تھے جن کے ترجموں میں روسی کردار،کاؤنٹ یا دہقان،لکھنؤ کے بانکوں کی زبان بولتے تھے...اسی پبلشنگ ہاؤس سے لینن کی تقاریر اور افکار کے درجنوں جلدوں پر محیط مجموعے بھی دستیاب ہو جاتے تھے جن کی بار برداری پر ان کی قیمت سے زیادہ لاگت اٹھتی تھی..یہ مجموعے ہر اُس شخص کی مطالعہ گاہ میں سجے نظر آتے جو ترقی پسند سوچ رکھتا تھا یا یہ تأثر دینا چاہتا تھا..کہ وہ ترقی پسند ہے اگرچہ ایسے خود ساختہ دانشوروں کو ان ضخیم جلدوں کے اوراق پلٹنے کے بھی کم ہی فراغت حاصل ہوتی تھی اور اگر وہ دل پر پتھر رکھ کر دو چار صفحے پڑھ لیتے تھے تو یہ دقیق فلسفہ ان کے سر پر سے گزر جاتا تھا لیکن اس کا حوالہ انہیں ادبی اور انقلابی محفلوں میں معتبر کر دیتا تھا..روسی ادب کا مطالعہ تو ہم جیسوں کے لیے ایک مقدس فریضہ تھا لیکن مجھے اردو ادب سے بھی بے حد لگاؤ تھا..اور یہاں بھی ترقی پسند مصنفین ہی میرے دل کو بھاتے تھے..''انگارے'' ایک مشعل راہ تھی،سجاد ظہیر کی ''لنڈن کی ایک رات'' اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ وہ اگر انقلاب کی بجائے ادب کی جانب دھیان کرتے تو نسبتاً زیادہ کامیاب رہتے..بیدی، کرشن چندر،فیض،ساحرؔ،اختر الایمان،کیفی اعظمی اور جوش وغیرہ تو انقلاب اور تبدیلی کے پیامبر تھے لیکن میں شائد قدرے برگشتہ ہو گیا تھا کہ مجھے منٹو بھی بے حد عزیز تھا..یہاں تک تو کچھ گنجائش نکل سکتی تھی..اور میں نے اپنے آپ کو بہت مطعون بھی کیا کہ میں اپنے نظریئے سے روگردانی کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن جس شخص کی تحریر نے میرے دل کو مٹھی میں لے لیا،وہ شفیق الرحمٰن تھا،ایک نہایت بورژوا اور رجعت پسند ادیب..اُن کی دیگر تحریروں کا تذکرہ طوالت کے خوف سے نہیں کرتا لیکن انہوں نے اپنے سفرنامے ''دجلہ'' میں جس طور جرمنی،آسٹریا اور ہنگری میں ''نیلے ڈینیوب'' کی دُھن پر بہتے اس دریا کو لفظوں کی جادوگری سے رواں کیا ہے تو میں اس کے آبی رومان میں مبتلا ہو گیا..بہتر رہائش گاہوں کے بجائے اسی مختصر فلیٹ میں عمر بھر اس لئے پڑا رہا کہ اس کے دامن میں شفیق الرحمٰن کا نیلا ڈینیوب بہتا تھا..

آپ یقیناً اکتاہٹ کا شکار ہو رہے ہوں گے کہ یہ شخص مصطفیٰ اسلام اگر تقریباً پچاس برس سے اس سرزمین پر ہے..اپنی زمین سے بچھڑ کر اس کے اجنبی موسموں میں حیات کرتا ہے تو یہ کیسے یہاں آ گیا اور کیوں آ گیا..اور کیوں اپنے کوچہ کمانگراں کی اُس گلی کو جو کسی خواب میں ہریاول کی دھند میں اترتی ہے اور اس گھر کو جس کے ایک کمرے کی رنگین شیشوں والی کھڑکی جس میں سے ایک سرخ روشنی در آتی ہے کیوں اُسے ترک کر دیا اور یہاں چلا آیا..اور تب تو یہ آگاہ نہیں تھا کہ روئے زمین پر کوئی شہر بوداپسٹ نام کا بھی ہے اور جب یہ آگاہ ہوا تو شفیق الرحمٰن کے نیلے ڈینیوب سے آگاہ ہوا..

مرتضےٰ اسلام شیخ..میرے والد صاحب..جو کہ سیالکوٹ کے ایک گاؤں ظفر وال کی پس ماندگی اور غربت سے اٹھ کر لاہور میں آ بسے..وہ شاہ عالمی کی جوتوں کی مارکیٹ میں ایک چھوٹی سی دوکان میں سستے اور ناپائیدار جوتوں کا کاروبار کرتے تھے اور تھوک فروش تھے..ایک ایماندار،وعدے کے پکّے،نماز روزے کے پابند،کنجوس..ایک معمول کے شیخ صاحب تھے..ایک ایسے شخص جن سے اگر پوچھا جاتا کہ آپ جنت میں قیام کرنا پسند کریں گے یا جہنم میں..تو وہ یقیناً غیر سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے کہتے کہ..جہاں کہیں بھی دو چار پیسے کا منافع ہو..وہ ایک قریب المرگ عزیز کے سرہانے روشن موم بتی کو اُس کے مرتے ہی فوراً بجھا دینے پر یقین رکھتے تھے تاکہ اصراف سے بچا جا سکے..جونہی میں نے میٹرک پاس کیا

اور نمایاں پوزیشن میں پاس کیا تو انہوں نے مجھے اپنی پدرانہ شفقت سے نوازتے ہوئے کہا کہ برخوردار پڑھائی بہت ہو چکی، اب میرے برابر میں آ بیٹھو اور جوتے فروخت کرو..لیکن میں نے بغاوت کر دی اور کالج میں داخلہ حاصل کر لیا تو وہ مجھ سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے میرے ماہانہ جیب خرچ میں کمی کر دی..اور ازاں بعد جب مجھے پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے فلسفہ میں داخلہ مل گیا تو گویا میرے والد صاحب..مرتضےٰ اسلام شیخ کی لٹیا ہی ڈوب گئی..انہوں نے مجھ سے تقریباً کنارہ کشی کر لی..میں اپنے تعلیمی اخراجات..جز وقتی انشورنس ایجنٹ ہونے کے حوالے سے پورے کرنے لگا..

اور وہاں پنجاب یونیورسٹی میں وہ باغی عناصر تھے جنہیں عرفِ عام میں سُرخے کہا جاتا تھا..یہ دُھن کے پکے لاابالی اور جذباتی قسم کے لوگ تھے اور میں ان کے زیرِ اثر آ گیا..

کیا یہ تعارف کچھ طویل ہوتا جا رہا ہے؟

قصہ مختصر..ایک روز میرے ایک پروفیسر جنہیں جمعیت والے سُرخا مہاراج کے نام سے پکارتے تھے اور وہ اکثر گرفتار ہو جاتے تھے اور پھر چھوٹ جاتے تھے..کبھی نوکری سے برخواست کر دیئے جاتے تھے اور پھر ترقی پسند وکیلوں کی کوششوں سے بحال ہو جاتے تھے اور جب وہ کلاس میں لیکچر دیتے تھے تو عارضی طور پر جمعیت والے بھی برگشتہ ہو جاتے تھے..تو انہوں نے ایک روز مجھے پاک ٹی ہاؤس میں چائے کی ایک پیالی کے اوپر کہا کہ مصطفےٰ..سوشلسٹ ریپبلک آف ہنگری کے صدر مقام بوداپسٹ میں دنیا بھر کے ترقی پسند نوجوانوں کا ایک پندرہ روزہ اجتماع ہو رہا ہے..اخراجات کی ذمہ داری سوشلسٹ ریپبلک کی ہے..کیا تم اس میں شریک ہونا پسند کرو گے..میں سفارش کر سکتا ہوں..

میں قدرے متعجب ہوا کہ آخر پروفیسر صاحب یعنی سرخے مہاراج دیگر درجنوں انقلابی نوجوانوں کی بجائے مجھ ایسے کلاس میں سب سے آخری نشستوں پر بیٹھنے والے شخص کی سفارش کیوں کریں گے..نہ تو کلاس کے خاتمے پر میں اُن سے کوئی انقلابی بحث کرتا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے اُن کے نظریات کی بنا پر انہیں اپنا گورو مانا تھا..یہ پہلی بار تھا کہ ہم پاک ٹی ہاؤس کی ایک میز پر چائے کی ایک پیالی کے آمنے سامنے بیٹھے تھے..اور میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ پاکستان میں جتنے بھی پختہ اور تادمِ مرگ کمیونسٹ رہنے والے لوگ ہیں اور وہ گنے چنے ہیں تو سوویت سفارت خانہ صرف اُن کی سرپرستی کرتا ہے بلکہ اُن کی کسی بھی سفارش کو جانچے بغیر قبول کر لیتا ہے لیکن میں ہی کیوں؟

''تم اس لئے کہ..'' وہ میرے تذبذب کو بھانپ گئے ''میں تمہاری بے لوث نظریاتی وابستگی کا قائل ہوں..تم جس طور یونیورسٹی میں رجعت پسند قوتوں کی نمائندگی کرنے والی ایک مذہبی جماعت کے جاہل کارکنوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہو، وہ میری نظر میں ہے..اور تم صرف جذبات میں بہہ جانے والے نوجوان نہیں ہو..تم ایک منطق کو بروئے کار لا کر اس نتیجے پر پہنچے ہو کہ اشتراکیت ہی اس دنیا کے پس ماندہ لوگوں کو معتبر کرنے کا ذریعہ ہے..میرے خیال میں اگر تم اس اجتماع میں شریک ہو گے جہاں دنیا بھر کے روشن خیال سوچ رکھنے والے نوجوان موجود ہوں گے تو تم اپنے ترقی پسند نظریات پر مزید پختہ ہو سکو گے..اگر تم اس اجتماع میں شامل ہونا چاہتے ہو تو پاکستان سے براہ راست ہنگری نہ جا سکو گے کہ یوں تم حکومت کے خفیہ اداروں کی نظر میں آ جاؤ گے..لاہور سے تم پیرس پہنچو گے اور وہاں کچھ لوگ تمہارے منتظر ہوں گے جو تمہیں بوداپسٹ لے جانے کے ذمہ دار ہوں گے..واپسی بھی اسی راستے سے ہو گی..کیا تم دلچسپی رکھتے ہو؟''

ہمارے اس گھر میں لوہاری دروازے کے اندر کوچہ کمانگراں کی ایک گلی میں.. چھوٹی اینٹوں سے تعمیر شدہ اُس گھر میں ہمہ وقت ایک بُو ٹھہری ہوئی ہوتی تھی.. کیونکہ اس گھر کے دو کمروں کو ایک گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور وہاں فرش سے بلند ہو کر چھت تک جوتوں کے انبار بھرے پڑے ہوتے تھے.. چونکہ یہ جوتے اعلیٰ درجے کے نہ ہوتے تھے، غریب غرباء کے استعمال کے لئے کم قیمت اور زیادہ نفیس نہ ہوتے تھے تو اس لئے اُن کی ساخت کے لئے جو چمڑا استعمال میں لایا جاتا تھا، وہ بھینسوں اور بوڑھی گائیوں کا ہوتا تھا اور وہ بھی کسی چمڑے کے کارخانے میں مناسب کیمیائی عمل سے پختہ نہ کیا جاتا تھا کہ یوں اُس کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا تھا جو میرے والد صاحب کو قبول نہ تھا.. چنانچہ چمڑے کی ابتدائی ناگوار بُو اُس گھر میں ٹھہری رہتی تھی اور یہی بُو نہ صرف ہمارے گھر کے اندرون میں.. بلکہ ہر شے میں.. بستروں، تکیوں اور غسل خانے کے تولیوں یہاں تک کہ دیواروں پر جمی قلعی کی موٹی تہہ کے اندر بھی سرائت کر چکی تھی بلکہ اُس گھر کے ہر مکین کے بدن میں بھی رچ بس چکی تھی.. یہاں تک کہ جب کبھی میری ماں جو والد صاحب سے کم کنجوس نہ تھیں، مجھے گلے لگاتیں تو مجھے ان میں سے بھی مردہ گائے کی بُو آتی... البتہ اس دائمی طور پر گھر کے درو دیوار میں رچی بسی بُو کا ایک مثبت پہلو بھی تھا، کوچہ کمانگراں کے کناروں پر گندگی کی جو کھلی نالیاں تھیں جو اکثر غلاظت بھری رکاوٹوں سے لاچار ہو کر گلی کے فرش پر ابل پڑتیں اور یوں غسل خانوں کے بول و براز کو اُن پر بچھا دیتیں، دھوپ تیز ہوتی تو یہ غلاظت خشک ہو کر سکڑنے لگتی اور اس میں سے اٹھتی ہوئی بساند مکینوں کے کپڑوں میں سے بھی اٹھنے لگتی.. لیکن ہماری ذاتی چمڑے کی بُو کے آگے وہ ٹھہر نہ سکتی اور یوں ہم اُس سے محفوظ رہتے.. پروفیسر سُرخے مہاراج کی پیشکش کی اُس شب میں سو نہ سکا، بستر میں کروٹیں بدلتا رہا.. کہیں اس پیشکش میں فریب کا کوئی سراب نہ ہو.. مجھے کسی حد تک غیر قانونی طور پر پیرس سے بوداپسٹ پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے واپس بھی آنا تھا اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی سرکاری ادارے کو خبر نہ ہو.. اُن زمانوں میں ایوب خان کی خفیہ ایجنسیاں ایسے شکاری کتوں کی مانند تھیں جنہیں ہر طرف سرخ ہی سرخ نظر آتا تھا.. وہ سہاگ رات کے سُرخ جوڑے میں ملبوس دولہن کو بھی چیر پھاڑ سکتے تھے کہ یہ سرخ لباس تو کیمونسٹ ہے، مُلحد ہے اور پاکستان مخالف ہے اور اُن کی کچھ پُچھ پڑتیت نہ ہوتی.. شیخوپورہ کے ایک طالب علم نے سوویت سفارت خانے کی جانب سے اردو میں شائع ہونے والے رسالے ''طلوع'' کے ایڈیٹر کو کسی مضمون کے بارے میں ایک خط لکھا تو نہ صرف اُسے جیل کی ہوا کھانی پڑی بلکہ اُس پر شدید تشدد بھی کیا گیا.. برسوں بعد آئی ایس آئی کے ایک بریگیڈیئر بلا بڑے فخر سے اقرار کرتے تھے کہ ہاں میں نے سندھ میں کیمونسٹوں اور ان کے حامیوں کا قلع قمع کر دیا کہ اُن کے قتل ملکی سلامتی کے لئے جائز تھے تو کیا ایسے حالات میں ایک کیمونسٹ ملک کا سفر اور وہ بھی غیر قانونی، دانش مندی ہے..؟

شائد یہ نصف شب کا سمے تھا.. باہر نہ صرف کوچہ کمانگراں بلکہ اندرون شہر کے دیگر گلی کوچے ایک نیند بھری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہ ساون کی آخری تاریخوں کی ایک حبس میں ٹھہری ہوئی رات تھی اور میرے کمرے کی رنگین شیشوں والی کھڑکی کے کواڑ کھلے تھے اس آس میں کہ شائد کوئی ایک آدھ جھونکا ہوا کا بھٹکتا ہوا آ نکلے اور میرے پسینے نچڑتے بدن پر ایک ٹھنڈی سرور بھری پھونک مار دے.. شائد یہ نصف شب کا سمے تھا جب میں نے دیکھا کہ اُس کھلی کھڑکی

کے اندھیرے کو ایک تیز دودھیا روشنی زائل کرتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہو رہی ہے.. یہ روشنی مجھ تک آئی اور میرے پلنگ، بستر، تکیے اور مجھ سمیت ہر شے کو روشن کر دیا.. پر اس کا دودھیا پن تادیر نہ رہا، اس میں ایک پرچم کی طرح لہراتی تیز سرخی گھلنے لگی جیسے دودھ میں سرخ رنگ کی پچکاری چلا دی جائے تو اُس کے دودھیا پن میں لہو رنگ لہریں ہلکورے لینے لگتی ہیں.. پھر اگلے پل وہ روشنی ایک سرخ آبی جھرنے کی مانند بہنے لگی..

کیا یہ ایک شگون تھا جو میرے مخمصے کو شفاف کرنے کے لئے آشکار ہوا تھا کہ تمہیں ایک سرخ سلطنت میں جانا چاہئے.. اگرچہ ترقی پسندی میں شگونوں اور توہمات کی کچھ گنجائش نہ تھی لیکن..

میری، مصطفےٰ اسلام شیخ کی لاہوری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں..

ان آنکھوں کے پردوں پر نہ تو لاہور کی آلودگی اترتی تھی اور نہ ہی انہیں گوبر آلود دُھول نابینا کرتی تھی.. اور نہ ہی آس پاس کہیں چمڑے کی بُو تھی.. بلکہ یہ آنکھیں شفاف بلوریں ہوا کی کھنکتی پازیبوں کی دُھن پر مخمور ہو کر مسکراتی تھیں کہ یہ یورپ کے موسم تھے..

اور پھر بوداپسٹ کی قدیم تاریخی عمارتوں کی سحر انگیز شکیبائی.. اس کے قدیم بام و در کے طلسم، اس کے گنبدوں کی دل میں اتر جانے والے جادو.. سب اپنی جگہ.. پر یہ لاہوری آنکھیں دراصل اس لئے کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ ان کے سامنے شفیق الرحمٰن کا ڈینیوب بہتا تھا.. نیلے ڈینیوب کے پانیوں میں جو بھنور پڑتے تھے تو گویا والز رقص کی دُھن پر گھومتے جاتے تھے..

ہم سب پُر جوش اور جوانی کے سرخ خمار میں رنگے چہروں والے.. ایشیائی، افریقی، یورپی، جنوبی امریکی نوجوان جو اس اجتماع میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے، اس قدیم شہر کے گلی کوچوں میں بانہوں میں بانہیں ڈالے ''انٹر نا شنل'' گاتے پھرتے اور ایک نئی مساوات اور عدل پر استوار ہونے والی دنیا کے خوابوں میں مخمور گاتے پھرتے تھے.. ہر دن.. عید کا دن تھا اور ہر شب.. شب برات.. اور نظریاتی وابستگی کی پُر خلوص یگانگت تھی.. اجنبی لوگ ہمارے رخساروں پر بوسے دیتے، ہمارے پیراہنوں پر لینن کی شبیہہ اور سرخ ستارے والے میڈل ٹانک کر اپنی محبت کا اظہار کرتے.. جمناسٹک کے حیرت ناک مظاہرے.. اجتماعی فارموں کی کھلی فضا میں لوک رقص اور دنیا بھر کے کھانے.. اور مشروبات بھی.. ہم تو اتنی پذیرائی کی تاب نہ لا کر حواس کھو بیٹھے..

اس گہما گہمی اور اجتماعی رنگا رنگی کے دوران ایک شب میں جان بوجھ کر تنہا ہوا اور ایک پُر پیچ کلاسیکی بناوٹ والے آہنی قدیم پُل کے برابر میں سے اترتی سیڑھیوں پر قدم رکھتا ڈینیوب کے کنارے تک چلا گیا.. چونکہ دلوں کے حال صرف خدا جانتا ہے اگر وہ ہے تو.. اس لئے کسی نے نہ جانا کہ میں ایک رجعت پسند ادیب شفیق الرحمٰن کے زیر اثر ڈینیوب کے پانیوں کو چھونا چاہتا تھا..

اور جیسے وہ ایک شگون تھا محلّہ کمانگراں کی رنگین شیشوں میں سے داخل ہونے والی ایک تیز دودھیا روشنی جو پل بھر میں لہو رنگ ہو گئی تھی، ایسے یہاں بھی جب میں نے جھک کر ڈینیوب کے پانیوں میں ہاتھ ڈالا تو ان کی نمی کے دوش پر سوار

اُس کا نیلا رومان، خانہ بدوش موسیقی اور رقص کرتے ہوئے بھنور انگلیوں کے راستے میرے بدن میں سرائت کرتے گئے اور مجھ سے گویا ہوئے کہ..اے مصطفیٰ اسلام شیخ بے شک تم ایراوتی اور پاروشنی ایسے قدیم دریا کے کناروں سے آئے جس کا ذکر ویدوں میں درج ہے لیکن ذرا غور تو کرو کہ زمانے بدل چکے ہیں، تمہارا وہ راوی اب کتنا گدلا، آلودہ اور سُست ہو چکا ہے اپنے کنارے آباد باشندوں کی مانند..اور ذرا محسوس کرو کہ میں کتنا شفاف، نیلا اور گہرا ہوں..میرے پانیوں میں وِی آنا کے والٹز اور بوداپسٹ کی لوک موسیقی گھلی ہوئی ہے تو تم واپسی کا سفر اختیار نہ کرو..میرے کناروں پر ہی ٹھہر جاؤ..مجھے تمہارے بدن کا لمس پسند آ گیا ہے اگرچہ..اس میں چمڑے کی بُو ہے..

وہ خواب اندر خواب دو ہفتے پل بھر میں گزر گئے..گیت گاتے، مارکس اور لینن کے مقدس حوالے دیتے..دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ کہ تمہارے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے زنجیروں کے اور کچھ نہیں ہے..

دن بھر ہم فیکٹریوں اور اجتماعی زرعی فارموں میں مارے مارے پھرتے کہ وہ کمیونزم کی عظمت کی درخشاں نشانیاں تھے اور جب شام ہوتی تو کبھی آپرا کی شان وشوکت ہماری آنکھوں کو چندھیاتی..کبھی چیخوف کا کوئی ڈراما سٹیج پر کھیلا جاتا..ہنگری کے لوک رقصوں کے مظاہرے میں شریک ہو کر ہم بھی ناچنے لگتے اور کبھی پٹوفی کے انقلابی گیت گانے لگتے اور وہ جو وطن واپسی کی آخری شب تھی وہاں سٹیج پر..رَو جا تھی..

اور اب میں جس راز میں آپ کو شریک کرنے جا رہا ہوں یہ جینا تو بیان نہیں کر سکتی تھی، اسی لئے میں نے اپنا تعارف خود کروانے کی پیشکش کی تھی..ویسے ان جدید زمانوں میں یہ کوئی ایسا راز بھی نہیں رہا کہ اسے افشا نہ کیا جا سکے لیکن ہماری نوخیزی کے زمانے بہت معصوم اور ان پڑھ ہوا کرتے تھے..جنس ایک ایسا شجرِ ممنوعہ ہوا کرتا تھا کہ اس کا پھل چکھنا تو درکنار ہم اُس کا ایک پتہ بھی چبا کر یہ نہیں جان سکتے تھے کہ آخر اس کا ذائقہ اور گرم رس کیسا ہے..ہم بازاری اور ہیجان خیز ناول پڑھ کر اکثر اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل پیرا ہو کر کچھ گیلی تشفی حاصل کر لیتے تھے اور پھر مجرم بنے پھرتے اپنے ماں باپ سے آنکھیں نہ ملاتے تھے..یونیورسٹی میں جو ہم جماعت لڑکیاں تھیں ہم اُن میں سے اکثر کو باجی کہہ کر مخاطب کر لیتے یا بہت شرمیلے ہوتے تو بہن جی کے درجے پر فائز کر دیتے..اور وہ بلا شرکت غیرے ہمیں ہمیشہ بھائی کے لاحقے کے ساتھ مخاطب کرتیں..ہم اُن میں سے ایک کو اپنی جانب چلتے آتے دیکھتے تو اکثر ہماری نگاہیں اُس کے چہرے سے اتر کر اُس کے نیچے جو نسوانی بناوٹیں ہوتی تھیں اُن میں بھٹکنے لگتیں اور ہم اپنے آپ کو سرزنش کرتے کہ ایک بہن کو یوں دیکھتے ہیں.. ہمارے کان سرخ ہو جاتے اور ہمیں کامل یقین ہو جاتا کہ وہ ہمارے بدن کی لرزش اور خیزگی سے آگاہ ہو گئی ہے..

چنانچہ میں بھی بیشتر نوجوانوں کی مانند تب تک ''سبز'' تھا..ایک خرگوش کی مانند معصوم اور بے داغ تھا..بوداپسٹ کے اس اجتماع میں یہی مصیبت درپیش ہوتی کہ میرے کنوارے کندھوں پر نسوانی بدنوں کا بوجھ پڑنے لگا..وہاں دیس دیس کی کامریڈ لڑکیاں بھی تھیں جو دوستانہ ماحول میں، اشتراکیت کے گیت گاتے جذباتی ہو کر نہایت خلوص سے ہم سے لپٹ لپٹ جاتیں، اتنی ہمارے اخلاقی پیمانوں کے مطابق بے جھجک اور قدرے بے حیا تھیں..میں دیگر شرکاء کے بارے میں تو حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بے حجابی میری کنوارگی کے لئے ماچس کی ایک بھڑکتی ہوئی تیلی ثابت ہوتی..

تو وہاں رَو جا تھی..

وہ ایک ہنگیرین خانہ بدوش تھی.. جپسی نسل کی تھی..

اور یہ جپسی لوگ کون ہیں.. اپنے تعارف کے ساتھ میں ان کا تعارف بھی منسلک کرتا ہوں، ہنگری میں بہت ساری مختلف اور مخلوط نسلوں کے ٹھکانے ہیں اور اُن میں سینکڑوں برسوں سے یہاں.. کبھی اس نگر کبھی اُس دریا کنارے اور کبھی اُس جنگل میں خیمے ڈالے روما خانہ بدوش بھی ہیں... کبھی آبادیوں کے نواح میں طویل قیام کرتے ہیں اور قسمت کا حال بتا کر.. گھریلو دستکاریاں بنا کر.. جو مزدوری مل جائے وہ کر کے اور کبھی رقص کا مظاہرہ کر کے اور کبھی عصمت فروشی کے ذریعے وہ اپنے رزق کا بندوبست کرتے ہیں.. ایڈورڈ گبن کی تاریخ ''سلطنت روما کا عروج اور زوال'' کے ایک باب میں درج ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں شط العرب کے کنارے چند کشتیاں لنگر انداز ہوئیں جن میں سوار لوگ بہت رنگا رنگ اور بھڑکیلے لباسوں میں تھے.. سرحدی محافظ اُنہیں گرفتار کر کے بغداد میں خلیفہ کے دربار میں لے آئے.. اُن کا کہنا تھا کہ وہ ''ذاٹ'' یا ''جاٹ'' قبیلے کے ہیں اور ان کا تعلق ہندوستان کے صوبے راجستھان سے ہے اور وہ مقامی آبادی کے سلوک سے تنگ آ کر وہاں سے فرار ہوئے ہیں.. ہارون الرشید اُن کے شوخ رنگ لباسوں اور نیم سیاہ بدنی بناوٹ کی کشش سے بے حد متاثر ہوا اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو سلطنت کی سرحدوں پر موجودہ ترکی میں آباد کر دیا جائے.. سلطنتوں کی اتھل پتھل سے سرحدوں میں بھی تغیر آتا رہا اور وہ لوگ ہولے ہولے ترکی سے رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری کے اندر تک سرائت کرتے چلے گئے.. یہ روما جپسیوں کے آغاز کی کہانی ہے.. آج بھی روما جپسی اپنا ناطہ ہندوستان کی سرزمین سے جوڑتے ہیں اور ان کی زبان کے تینوں لہجوں میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں... تازہ ترین تحقیق کے مطابق یہ جپسی ہندوستان کے شمال میں آباد جاٹ قبیلوں میں سے ایک ایسے قبیلے کے افراد ہیں جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر ہجرت کر گیا..

اگرچہ روما جپسی سینکڑوں برسوں سے مختلف مشرقی یورپی ممالک میں آباد ہیں لیکن کسی ایک مقام پر جڑیں نہیں پکڑتے، حرکت کرتے سرحدیں عبور کرتے رہتے ہیں.. مقامی آبادی نے کبھی انہیں قبول نہیں کیا، ہمیشہ انہیں شودر سمجھا.. جب ان علاقوں پر عثمانی ترکوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے بھی انہیں ایک مجرم نسل گردانا، اگر کسی قصبے میں کوئی بچہ غائب ہو گیا ہے تو یقیناً اسے خانہ بدوشوں نے اغوا کیا ہے.. اگر کوئی ایسا قتل ہو گیا ہے جس کا سراغ نہیں مل رہا تو نزدیک ترین خانہ بدوش نوجوانوں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا جاتا.. چوری چکاری تو ہمیشہ اُنہی کے کھاتے میں ڈالی جاتی.. چنانچہ ان خانہ بدوشوں کو کسی بھی سرزمین یا اُس کے باشندوں نے قبول نہ کیا.. اس کے باوجود وہ اپنی آبائی ثقافت، موسیقی، شاعری، زبان اور آوارہ گردی کی خصلت سے تائب نہ ہوئے.. اور جب جرمنی میں تھرڈ رائخ کا قیام عمل میں آیا اور اڈولف ہٹلر کو عوام نے بھاری اکثریت سے جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب کر لیا تو اُس نے نہ صرف یہودیوں کو بلکہ مفتوح ممالک کے خانہ بدوشوں کو بھی ایک حقیر اور تلف کر دینے کے لائق بے مقصد نسل قرار دیا.. بے شک ہٹلر نے اپنا امتیازی نشان سواستیکا ہندوستان سے مستعار لیا لیکن اُس نے ان قدیم ہندوستانیوں کو لاکھوں کی تعداد میں.. یہودیوں کی مانند گیس چیمبرز میں، فائرنگ سکواڈز کے سامنے کھڑا کر کے اور اکثر بھوکوں مار کے ہلاک کیا.. تاریخ میں صرف یہودیوں کی ہلاکت اور ان کے ''ہولوکاسٹ'' کے قصے دہرائے گئے لیکن ان خانہ بدوشوں کے قتل عام کا تذکرہ اس قابل نہ سمجھا گیا کہ اس سانحے پر مبنی فلمیں بنائی جاتیں، ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کو بیان کر کے زندہ رکھا جاتا.. صرف وہ سانحہ تاریخ میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے جس کے سوگوار سیاہ

پرچم بلند کر کے انسانی ضمیر کو مسلسل جھنجھوڑتے رہیں..خانہ بدوشوں کی ہلاکت کا پرچم کسی نے بلند نہ کیا..

تو رَوجا وہاں تھی..

بودا پیسٹ میں منعقد کیے جانے والے ترقی پسند کیمونسٹ نظریات سے اتفاق کرنے والے دنیا بھر سے آنے والے نوجوانوں کے اس اجتماع کی وہ آخری شب تھی جب ان کے اعزاز میں موسیقی کی ایک الوداعی محفل ترتیب دی گئی جس میں ہنگری میں آباد تمام قومیتوں کے آبائی رقص اور لوک گیت پیش کئے گئے..اس شب کا اہتمام بوداپسٹ سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک ایسی شجروں سے سیاہ ہوتی پہاڑی پر کیا گیا جس کے پہلو میں سے ڈینیوب بل کھاتا ہوا نکلتا تھا..

شب کا اختتام خانہ بدوشوں کے ایک قدیم، ہنگامہ خیز اور رنگا رنگ رقص پر ہوا..

اور وہاں رَوجا تھی..

وہاں اور بھی درجنوں خانہ بدوش لڑکیاں اور لڑکے تھے جو ایک وجد کی کیفیت میں رقص کناں تھے لیکن میری نگاہ ایک گھیرے دار شوخ رنگ کے تقریباً راجستھانی گھاگھرے والی سیاہ اور اداس آنکھوں والی لڑکی پر ٹھہر گئی..اُس کے ہاتھ ایک الم ناک فریاد کی صورت ہوا میں اٹھتے تھے اور اُس کے پاؤں گٹار کی موسیقی پر پرندوں کی مانند ٹھمکتے تھے..

یہ محض اتفاق تھا کہ سٹیج کے سامنے جو سینکڑوں کا نہیں ہزاروں کا ہجوم ہوگا جو آج شب کی آخرت سے رنجیدہ اور المناک رومانویت میں مبتلا تھا..رَوجا رقص کرتی گیت گاتی عین میرے ہی سامنے آ گئی اور اُس کے دونوں فضا میں بلند ہاتھ لحہ بھر کے لئے ساکت ہوگئے اور پاؤں رُک گئے..اس لحہ بھر کی ٹھٹک کے بعد وہ پھر سے خانہ بدوش رقاصاؤں کی ٹولی کا ایک حصّہ بن گئی..

نہیں، یہ محض اتفاق نہیں تھا..

واجبی تعارف کی جھجک کے چند لمحے تھے..اُس ہجوم سے بچھڑ کر اُس سرسبز پہاڑی سے اتر کر ڈینیوب کے کناروں تک اترنے کے چند لمحے تھے..جیسے یہ سب کچھ طے ہو چکا تھا، بخت میں درج ہو چکا تھا، نصیب کی تختی پر پہلے سے ثبت شدہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا، یہ محض اتفاق نہ تھا..بلندی پر اُس شبِ آخر کے اہتمام میں جو روشنیاں جگمگاتی تھیں وہ یہاں دریا تک آتے مدھم ہوتی پانیوں پر بجھ کر اُن کی سیاہی میں ڈوبتی جاتی تھیں..

ڈینیوب کے کناروں پر میری معصومیت اُس کے پانیوں کی گیلاہٹ میں گم ہوگئی..

''میں نے سٹیج پر رقص کرتے، اپنا گھاگھرا بدن کے گرد گھماتے، اپنے سامنے بیٹھے ہزاروں لوگوں میں سے صرف تم پر اپنی آنکھیں رکھ دی تھیں..اور میں اُس لمحے اپنی خانہ بدوش حس سے جان گئی تھی کہ ان آنکھوں نے اب عمر بھر کے لئے تم پر ہی رکھے رہنا ہے..تم بے شک یقین نہ کرو اور مجھے کچھ پروا نہیں اگر تم نہیں کرتے لیکن میں بھی تمہاری طرح آج تک ان چھوئی تھی..ایک جپسی زندگی میں اپنے آپ کو صرف ایک مرد کے سپرد کرتی ہے اور وہ مرد تم ہو..اس لئے میں نے اپنے آپ کو بلا حیل وحجت تمہارے سپرد کر دیا..اور اب تم کہیں نہیں جا سکتے..''

رومانیہ یا ہنگری کے تمام جپسی ہمہ وقت سفر میں نہیں رہتے، ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو خانہ بدوشی کو ترک کر کے اپنے لئے ایک غیر متحرک اور متمدن ٹھہراؤ والی زندگی کا چناؤ کر لیتے تھے اور شہروں میں دائمی رہائش اختیار کر

لیتے تھے، وہ دیگر لوگوں کی مانند ملکی قوانین کا احترام کرتے لیکن ایک مستقل متمدن قیام کی زندگی گزارتے تھے..

زوجا کا خاندان تقریباً ایک سو برس سے خانہ بدوشی ترک کر کے بوداپسٹ کے نواح میں واقع ایک قصبے میں مقیم تھا.. بیشتر افراد پڑھے لکھے اور شہری ثقافت میں ڈھل چکے تھے.. زوجا بھی بوداپسٹ یونیورسٹی سے ابلاغیات کی ڈگری حاصل کر کے ایک مقامی اخبار میں فیچر رائٹر کے طور پر ملازمت کرتی تھی.. اور یہ اُس کی مجبوری تھی کہ اُسے ہر حال میں سوشلزم کی عظمت کے قصیدے بیان کرنے تھے، ہنگری کی بے مثل صنعتی ترقی کے گیت گانے تھے اور ہر وہ شخص جو حکومت سے ذرہ بھر اختلاف رکھتا ہو اُسے انقلاب دشمن ٹھہرانا تھا..

ان تمام متمدن حقائق کے باوجود.. جیسے ہمارے ہاں ایک کشمیری، جاٹ، آرائیں یا راجپوت کی خصلت نہیں بدلتی چاہے وہ آکسفورڈ یا کولمبیا کا فارغ التحصیل ہی کیوں نہ ہو یا ایک جرنل ہو کر ایک پورا ملک غصب کر لے.. ایک بڑبڑاتے ہوئے غوں غوں کرتے، کچھ نہ سمجھے خدا کرے ایک وزیراعظم ہو جائے.. سوس بینکوں میں جمع شدہ اربوں روپے آپ کی کرپشن کی دوہائی دیں، کچھ بھی ہو جائیں آپ کی آبائی خصلت کی جڑیں آپ کے بدن کے اندر جوں کی توں موجود رہتی ہیں.. ایک آرائیں، ایک جاٹ، ایک اونٹوں کے بالوں کو تراشنے والا اپنی خصلت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا.. کچھ ایسے ہی.. ایک جپسی.. چاہے وہ کتنی ہی تعلیم یافتہ یا تہذیب یافتہ ہو جائے اپنی آبائی خصلت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے، اُس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی..

زوجا بھی تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود ایک بے دریغ، قابو میں نہ آنے والی ایسی رُوح تھی.. جس کی خصلت نہ بدلی تھی..

اُس نے اگر اپنے آپ کو پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت میرے سپرد کر دیا تھا تو یہ ایک وقتی جنسی ہیجان کی کرامت نہ تھی..

البتہ ڈینیوب کنارے میرے پہلے جنسی ایک نوعیت کے سانحے کے بعد اُس نے ایک سرگوشی کی تھی.. مصطفےٰ، تم میرے پہلے اور آخری مرد ہو لیکن.... یہ کیا ہے کہ مجھے کہیں سے گائے کے کچے چمڑے کی بُو آتی ہے..

یہ میں ہوں، مصطفےٰ اسلام شیخ..

اپنے مختصر فلیٹ کی بالکونی میں رات کے اس پہر بیٹھا ہوا جس نے ایک روشن دنیا کا خواب دیکھا تھا، میرے آس پاس وہ خواب کب کا منتشر ہو چکا اور میں تنہا اُس کے کھنڈروں میں نوحہ خواں ہوں.. ڈینیوب کی سیاہ چادر کو تکتا جاتا ہوں جو لگتا ہے کہ سوگواری میں ہے.. زوجا جو روزِ اول سے ہی اپنی جپسی نسل کے خدوخال کے علاوہ ایک بھرے بدن کی لڑکی تھی، ان بیتے برسوں کے دوران قدرے بے ڈھب اور بے کشش ہو چکی ہے اور اس کے باوجود اُس کے جنسی اشتیاق میں کچھ فرق نہیں آتا.. مجھے یہاں بالکونی میں بیٹھے ہوئے اُس کے بھاری خراٹوں کی آواز آ رہی ہے اور نیچے ڈینیوب بہتا جا رہا ہے.. یا شاید تھم چکا ہے..

●○●○●○●

وارث چوہدری کھدّر کے ایک کُرتے میں ملبوس جو اُس کی نیلی پھٹکی ہوئی بوسیدہ لگتی جین کے گھٹنوں سے اوپر ہی اوپر رہ جاتا تھا، جب اپنے کاروباری شریک اشوک کوہلی کو خوش آمدید کہہ کر پلٹا...اُس کے ایک ایسے سُوٹ کی توصیف کر کے جس کی قیمت سے ایک چھوٹی موٹی اگرچہ متاثر کرنے والی سپورٹس کار بھی خریدی جاسکتی تھی اور اُس کے پہلو سے لگی، ششدر کھڑی نہایت خوبرو اور قدرے کم سن دکھائی دیتی روسی لڑکی کو جس کی بھوری آنکھیں وارث چوہدری کے شاہانہ دمکتے کسی زار کے محل سے مشابہ سنہری لونگ روم میں داخل ہوتے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں..دونوں رخساروں پر چوم کر اور اشوک کوہلی کی ایک اور پسند کی داد دیتے ہوئے کہ یہ ہندو بنیا جس نے جانے کیسے فن لینڈ میں اپنی پیدائش کر لی تھی، یورپ کے ہر ملک میں پلا بڑھا تھا اور اب ایک مدت سے روس میں مقیم تھا کہ سوویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد یہاں تجارتی ممکنات کی ایک گنگا بہنے لگی تھی جس میں اشوک کوہلی جب بھی ڈبکی لگاتا تو کسی سٹیل فیکٹری، کسی تعمیراتی ٹھیکے یا کسی کوئلے کی کان کے ساتھ ظاہر ہوتا، صرف دیوالی کے موقع پر ہندوستان جاتا، ماسکو کے امیر ترین افراد میں بھی سرفہرست تھا، آخر اُس کی پسند صرف نابالغ قسم کی لولیٹا ایسے کچے بدنوں کی لڑکیاں ہی کیوں تھیں تو جب وارث چوہدری اشوک کوہلی کو خوش آمدید کہہ کر پلٹا تو لونگ روم میں تہذیب یافتہ قہقہوں کی، ایسے قہقہے جو صرف متمول ترین لوگوں کے حلق سے ہی برآمد ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں..سرگوشیوں اور چیک کرسٹل کے گلاسوں اور چاندی کی طشتریوں کہ جن میں ایسی نایاب..مہنگے ترین کیوی آر.. پرانے سوس پنیر..نایاب زیتون اُس جاپانی مچھلی کے قتلے جس کی انتڑیوں میں جو زہر ہوتا ہے اور جسے صرف نامور شیف ہی صاف کر سکتے ہیں اور ایسی مچھلی کو بنانے اور تلنے کے لئے ایک جاپانی شیف کچن میں موجود تھا..اور اگر اُس زہر کی ایک بوند بھی مچھلی میں رہ جائے تو اُسے کھانے والا فوری طور پر..سانس پی جانے والے سانپ کا ڈسا بھی کچھ لمحے سانس لے جاتا ہے لیکن اُسے کھانے والا فوری طور پر مردہ ہو جاتا ہے..تو ایسی نایاب خوراکیں اُن چاندی کی طشتریوں میں..اور اُنہیں تھامے ہوئے مؤدب روسی ویٹر جو ہر مہمان کے سامنے پیش ہو کر کمر تک یوں جھک جاتے کہ دائیں ہاتھ میں تھالی وہ طشتری ان کے سر سے بھی بلند ہو جاتی..تو اس نفیس، دمکتے ہوئے امارت کی مہک میں رچے سنہری پن میں، جس میں روسی زبان کی درشتگی خال خال ہی سنائی دیتی تھی کہ انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور پنجابی لہجے اُس پر حاوی ہو رہے تھے..تو وارث چوہدری پلٹا اور اس نے طمانیت کا ایک گہرا سانس ان شاہانہ انتظامات کو روانی سے بہتے دیکھ کر بھرا کہ یہ خصوصی پارٹی اُس کے دوست اور کاروباری شریک اشوک کوہلی کے اعزاز میں نچھاور کی گئی تھی جس کے پہلو سے لپٹی وہ لولیٹا کوشش بسیار کے باوجود اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں کو سمیٹنے اور اُن کو رفو کرنے میں ناکام رہی تھی..اشوک کوہلی نے اپنی آبائی تجارتی ہندو دانش کو بروئے کار لا کر طویل مذاکرات کے بعد اپنے اور وارث چوہدری کے لئے دریائے ماسکو کے کناروں پر ابھی حال ہی

میں مکمل ہونے والا ایک بیس منزلہ فائیوسٹار ہوٹل نہایت مناسب قیمت میں..محض نوے ملین ڈالر میں حاصل کرلیا تھا جس کی خرید کے اگلے روز ہی ان دونوں کو اس ہوٹل کے لئے سوملین ڈالرز کی پیشکش ہوگئی تھی لیکن اُن کی جانب سے انکار ہوگیا تھا کہ وہ دس بیس ملین ڈالرز کے منافع والے سوداگر نہیں تھے..

وارث چوہدری کی یہ پارٹی غیر معمولی نہ تھی، وہ اکثر مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ کسی نہ کسی بہانے..کبھی یوم مئی کے موقع پر..کبھی پاکستان کے یوم آزادی پر..کبھی شاہ حسین کے عرس کے روز..اور کبھی یونہی اپنے لائل پور کے لئے اداس ہو کر ایسی پارٹیوں کا بندوبست کرتا ہی رہتا تھا..وہاں رُوسی سرمایہ کار..اولمپک میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے روسی کھلاڑی..ٹینس کے عالمی کھلاڑی..کچھ غیر ملکی سفیر..چند مقامی وزراء وغیرہ تو تھے ہی لیکن ان کے سوا ماسکو میں آباد..روس کی شہریت رکھنے والے..بوڑھے ہوچکے متعدد پاکستانی بھی تھے اور اُن کے ہمراہ اُن کی روسی نژاد بیگمات بھی تھیں جن میں سے کچھ نے عجیب شوخ رنگوں کی ساڑھیاں یا شلوار قمیضیں پہن رکھی تھیں لیکن بیشتر نے اپنے بھدے سراپے کو مختصر بلاؤزوں اور نیلی جینوں میں جکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی..

اور سب جانتے تھے کہ وارث چوہدری کی ہاں کبھی بھی شراب، وائن، بیئر یا پرے ٹیف کے وہ برانڈ میز پر نہیں سجتے جو عوام الناس کی پہنچ میں ہوتے ہیں..بلکہ وہاں ایسے برانڈ پیش کیے جاتے تھے جو نہایت قلیل تعداد میں خصوصی ناموں کے ساتھ صرف مخصوص گاہکوں کے لئے تیار کیے جاتے تھے جن میں افریقی حکمران، عرب شہزادے..برونائی کے سلطان اور ملک سے باہر مقیم پاکستانی سیاستدان شامل تھے..وائن کے لئے بھی شرط یہ تھی کہ وہ 1930ء میں کشید کی گئی ہو جو کہ فرانس میں وائن کا بہترین سال تھا..اور وہ پاکستانیوں کی روسی نژاد بیویاں اسی نوعیت کے مشروبات کے گھونٹ بھرتیں احتیاط کرتی تھیں کہ ان کے ہاتھوں سے وہ گلاس چھوٹ نہ جائے جو چیکوسلواکیہ کے بیش قیمت کرسٹل کی جگمگاہٹ سے دمکتا تھا یا وینس کے سینٹ مورینو کی گلاس فیکٹریوں میں خصوصی تخلیق شدہ تھا..اُن کی یہ احتیاط محض ایک نفسیاتی رکاوٹ تھی ورنہ وہ گلاس اُن کے ہاتھوں سے گر جاتا تو بھی اُس کے کرچی کرچی ہونے کا چھناکا دبیز ایرانی قالینوں میں دفن ہوکر بے آواز ہو جاتا اور اُس میں سے چھلکنے والا مشروب اُن کے گل بوٹوں کو سینچتے ہوئے اُن میں جذب ہو جاتا.. پاکستانیوں کی ان روسی نژاد بیویوں کی آنکھوں میں وارث چوہدری کے وسیع و عریض لونگ روم کی چھت سے لٹکتے متعدد فانوسوں کی جگ مگ روشنیوں کے علاوہ حسد کی چنگاریاں بھی بھڑکتی تھیں..ابھی یہی چودہ پندرہ برس پہلے یہ وارث چوہدری اُن جیسا ہی تھا، ایک تنگ فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ تنگی ترشی سے گزر اوقات کرتا ایک پرائیویٹ پاکستانی فضائی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا اور اس کی یہی بیوی جواب پردھان بنی بیٹھی ہے..اور ماسکو میں ابھی حال ہی میں جو ایک ملینئرز کلب تشکیل ہوئی ہے اُس کے بارے میں اپنی عینک اور ناک چڑھا چڑھا کر کیسے کندھے اچکاتے بے اعتنائی سے بیان کر رہی ہے کہ میں تو دوبارہ وہاں نہیں جاؤں گی..وہاں جتنے بھی امیر کبیر نودولتیے آتے ہیں وہ تہذیب، روسی ادب اور کلاسیکی موسیقی سے یکسر ناآشنا ہیں..وہ لوگ اپنی تازہ ترین ماڈل کی پورشے، سیاہ بے باخ یا سلور رولز رائس اور ماسکو سے باہر اپنے شاہانہ کئی ایکڑ میں پھیلے ڈاچا گھروں کے سوا اور کوئی بات نہیں کرتے تو میں دوبارہ وہاں جانے والی نہیں، البتہ وہ دل ہی دل میں اُس کی کچھ معترف بھی ہوتیں کہ اس نے نہایت برے وقتوں میں بھی اپنے خاوند کا ساتھ دیا تھا..تنگی ترشی میں بھی اُس کی محبت کا دامن نہ چھوڑا

تھااور اب جب کہ اُس کا خاوند اپنی فہم وفراست اور کاروباری دوراندیشی سے شہر کے متمول ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا، اس میں تکبر اور نام ونمود کی حرص نام کو نہ تھی اور نہ ہی وہ اپنے خاوند کی امارت کی ڈینگیں مارتی..آج بھی اُس نے ایک معمولی سا بلاؤز پہن رکھا تھا..عامیانہ سی جین تھی اور اُس کی ستواں ناک پر دھری عینک کے فریم میں ہیرے نہیں جڑے تھے..اُدھر وارث چوہدری بھی اسی اچنبھے کی زد میں آتا کہ وہ روس کا امیر ترین پاکستانی ہونے کے باوجود ابھی تک ایک سادہ اور مخلص انسان تھا..ویسا ہی تھا جیسا اُن زمانوں میں ہوا کرتا تھا جب وہ بار بار اپنی جیب کے چند سکّوں کو گنتا تھا کہ کیا میں ان سے لائل پور کے جہانگیری پلاؤ کی ایک پلیٹ خرید سکتا ہوں یا نہیں...اور اس نے اپنے اُن رفیق ہم وطنوں کو نہیں بھلایا تھا جن کی مالیاتی سطح سے بلند ہو کر وہ بین الاقوامی معیشت کا بھیدی ہو گیا تھا..

بہرطور ان پاکستانیوں کی روسی بیویوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ محبت کی مانند حسد کی سلگاہٹ بھی اندھی ہوتی ہے جو بلاجواز کسی انسان کو راکھ کرتی رہتی ہے..ایک شکل سے نہایت بودا اور جاہل لگتا روسی ویٹر اشوک کوہلی کے سامنے آ جھکا ''سَر مسٹر چوہدری نے برلن کی ''بلیک فارسٹ ڈیلی کاٹسن'' سے خصوصی طور پر صرف آپ کے لئے آپ کی پسندیدہ جرمن کھٹے سیبوں کی ایپل پائی منگوائی ہے..برلن سے ماسکو آنے والی پرواز میں قدرے تاخیر ہو گئی تھی..''

اشوک کوہلی نے جھکے ہوئے بودے ویٹر کی طشتری میں سے ایپل پائی کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں منتقل کیا اور اسے چکھ کر کہنے لگا ''یہ تو ٹھنڈی ہو چکی..کیا تم نہیں جانتے کہ کھٹے سیبوں کی ایپل پائی ہمیشہ سلگتی ہوئی بھاپ دیتی گرم ہونی چاہئے..''

''سوری سر..'' ویٹر دہشت زدہ ہو کر سمٹ گیا ''صرف چند لمحے عنایت کر دیں..میں اسے گرم کر کے لاتا ہوں۔''

کوہلی کے پہلو سے لگی نابالغ لولیٹا نے ذرا اچک کر اُس کے رخسار پر ایک گیلا بوسہ ثبت کیا اور نخریلی ہو کر بولی ''آشوک..پلیز..کیا میں یہ ٹھنڈی جرمن ایپل پائی کھا سکتی ہوں..بجا طور پر ہم روسیوں کو یہ جرمن زہر لگتے ہیں لیکن اُن کی ایپل پائی کھانے میں تو کچھ حرج نہیں..پلیز۔''

اشوک کوہلی نے پسپا ہوتے ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا..

تو وارث چوہدری جب اپنی سدابہار مسکراہٹ کی خوشگواری کے ساتھ اپنے دوست اور کاروباری شریک اشوک کوہلی اور اس کے پہلو میں پیوست نابالغ لگتی دوشیزہ کو خوش آمدید کہہ کر پلٹا ہے..اور اس دوران وہ سب لمحے گزر چکے ہیں جن کا بیان ہو چکا ہے تو لونگ روم کے اُس کونے میں جہاں فانوسوں کی روشنی کم کم پہنچتی تھی..اپنے آپ کو پوشیدہ کرتا ایک دبیز سنہری صوفے میں دھنسا بے ترتیب بالوں اور غیر استری شدہ کوٹ میں ملبوس ظہیر الدین اُس کی نظر میں آ جاتا ہے اور وہ وارث چوہدری اپنے مہمانوں بلکہ اشوک کوہلی کو بھی فراموش کر کے اپنی معصوم مسکراہٹ کو بمشکل قابو میں لاتا اُس کی جانب نہایت پُرشوق چلتا آتا ہے اور کہتا ہے ''ظہیر..تم کب آئے؟''

اُسے محسوس ہوا کہ ظہیر الدین کے بالوں کی سفیدی میں شاید روئی کا ایک گالا اٹکا ہوا ہے..لیکن نہیں یہ صرف ایک شائبہ تھا..

''تم بہت دیر سے آئے ظہیر..''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میرے فلیٹ سے ماسکو کے نواح میں اس جنگل میں واقع تمہارے گھر کا فاصلہ کتنا ہے..اتنا طویل کہ میری پرانی کار کا دم ٹوٹنے لگا اور میں راستہ بھی بھول گیا۔''

''تم تقریباً نصف صدی سے اس شہر کے مکین ہو اور اب بھی راستے بھول جاتے ہو..''

''مجھے چالیس پینتالیس برس پیشتر کے ماسکو کے سب راستے از بر تھے جیسے اپنی گھر کی سیڑھیاں اور دروازے ذہن نشین ہوتے ہیں، تم ان سیڑھیوں کو دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے قدم انہیں پہچانتے ہیں اور نہ ہی کچھ لمحے غور کرتے ہو کہ یہ جو سامنے دروازہ ہے کیا یہ میرے کمرے کا ہے تم بے جھجک اُس میں داخل ہو جاتے ہو ایسے ماسکو کے راستے ہوا کرتے تھے لیکن سوویت یونین مسمار ہوا تو اتنی دھول اٹھی کہ راستے اس دھول سے اٹ گئے، ان کے نقش چھپ گئے، ان کی پہچان روپوش ہو گئی..اب یہ تمام میرے اپنے شہر کے راستے میرے لئے اجنبی ہیں اور میں اکثر بھٹک جاتا ہوں۔''

''سوگ اور ماتم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے ظہیر..نظام کی تبدیلی کو سولہ برس ہونے کو ہیں اور تم ابھی تک سیاہ لباس میں ہو..'' وارث چوہدری کی معصوم مسکراہٹ سمٹ کر اب ایک سوگوار تاثر میں ڈھل رہی تھی..وہ اپنے ہمدمِ دیریں کے لئے کُڑھتا رہتا تھا..

''تم جانتے ہو لیل پوری کہ میں کوئی اتنا کمیونزم کے فلسفے کے لئے دل و جان قربان کر دینے والا شخص نہ تھا لیکن میں شمس الدین انقلاب کا بیٹا ہونے کے ناطے اسی سوچ میں ڈھل گیا جو کہ میرے باپ کی تھی.... یہ میرے جینز کی مجبوری تھی اور سرخ سویرے کا خواب میری زندگی کو بامقصد کرتا تھا..اب میری حیات کا کوئی جواز باقی نہیں رہا.. ہاں موت کے بعد قُل کی رسم ہوتی ہے، پھر چالیسویں کی تقریب ہوتی ہے اور مرنے والے کے لئے قرآن پاک پڑھ کر اُس کی مغفرت کی دعا کر کے ہم فارغ ہو جاتے ہیں لیکن وہاں ایک شخص مرتا ہے..اور اگر ایک پورا نظام مردہ ہو جائے تو کتنے روز یا کتنے برس سوگ منایا جاتا ہے یہ تو کوئی طے شدہ روائت نہیں ہے..وارث..میں ہرگز ایک سیاہ لباس میں نہیں ہوں لیکن اتنی بڑی تبدیلی کا جو دھچکا ہے میں اس سے سنبھل نہیں پا رہا..تم سنبھل گئے..''

''ہاں..'' وارث پھر سے مسکرانے لگا..''میں چالیسویں کے بعد سوگ سے فارغ ہو گیا تھا کہ مجھے زندہ رہنا تھا.. گالینا نہیں آئی؟''

''اُسے یہاں ٹرانسپورٹ کرنے میں کچھ مسائل تھے۔'' ظہیر بھی پہلی بار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے اُن میں اٹکے ہوئے روئی کے گالے یا ایک مائی بوڑھی کے ریشے محسوس کرنا چاہتا ہو، مسکرایا ''میں اسے پہلے تو رضامند کرتا..پھر اس کی وہیل چیئر دھکیل کر راہداری میں اس لفٹ تک لاتا جو اکثر خراب رہتی ہے اور پھر اسے اور اس کی وہیل چیئر کو کار میں کسی نہ کسی طرح پیک کرتا..اسے یوں بھی میرے ماضی کے دوستوں سے کچھ دلچسپی نہیں..''

تب وارث چوہدری نے...اور جب وہ گالینا کے عشق میں مبتلا ہو کر اُس کے کندھے پر سر رکھ کر اس کی سائیکل اور اس کے پھولدار لباس کی یاد میں بھوں بھوں کرتا رویا کرتا تھا اور جب وہ خود اینا کی محبت میں فنا ہو کر حواس باختہ ہوا تھا تو یہی ظہیر الدین اُس کو ڈھارس دیا کرتا تھا تو تب وارث چوہدری نے ظہیر الدین کے چہرے پر چند مندمل ہو چکی خراشیں دیکھیں، اُس کی ناک بھی قدرے سُوجی ہوئی لگتی تھی..''ظہیر..یہ کیا ہوا ہے؟''

''جو کچھ ہمارے جیسوں کے ساتھ ہونا چاہیے وہ ہوا ہے۔''

''تم میرے ساتھ آؤ..'' وارث کے چہرے پر تشویش کی شکنیں ابھریں ''ہم ذرا الگ ہو کر..تنہائی میں کچھ دکھ سکھ شیئر کرتے ہیں..''

''تمہیں بھی کوئی دکھ ہو سکتا ہے..'' ظہیر کی مسکراہٹ ایک قہقہے کے کناروں پر آ کر رک گئی..'' میں یہاں آرام سے ہوں..تم اپنے مہمانوں کا خیال رکھو۔''

''وہ اب خود اپنا خیال بخوبی رکھ رہے ہیں، انہیں میری موجودگی کی نہ پرواہ ہے اور نہ ہی ضرورت..آؤ..''

لونگ روم کی مخمور بھنبھناہٹ کے ایک کونے میں کچھ سیڑھیاں جو ظاہر نہ ہوتی تھیں، کہیں پاتال میں اترتی لگتی تھیں..وہ نشیب میں پھیلے ایک وسیع لان گل و گلزار تک جاتی تھیں اور پھر وہاں سے اتر کر ایک تہہ خانے تک چلی جاتی تھیں جہاں ایک پوشیدہ اور مختصر سوئمنگ پول ایک آبی قرار میں بچھا ہوا تھا اور اس کے قرار میں مدھم تلاطم تخلیق کرتی ایک مچھلی ناک پُھلاتی، ڈوبتی ابھرتی تیر رہی تھی..اور سب جانتے ہیں کہ مچھلیاں لباس نہیں پہنتیں..

وہ اس مکمل پوشیدہ تنہائی میں سوئمنگ پول کے شفاف پانیوں پر کبھی اپنا چہرہ سطح پر لا کر پھنکارتی ہوئی سانس لیتی اور کبھی ڈبکی لگا جاتی..ان دونوں کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھ کر وہ تھم گئی اور فوراً پول سے باہر آ گئی..وہ صرف تیرتی ہوئی پُر کشش اور متناسب لگتی تھی ورنہ وہ ایک ڈھیلی چھاتیوں والی بے جان بدن کی ایسی لڑکی تھی جو برہنہ حالت میں بھی ہیجان کی کوئی ایک چنگاری بھی نہ بھڑکا سکتی تھی..اُس کے نچڑتے بدن سے سوئمنگ پول کا فرش گیلا ہونے لگا..''مسٹر وارث..میں رہ نہ سکی تھی..میں معذرت کرتی ہوں..میں چلی جاتی ہوں۔''

وہ اسی برہنہ حالت میں نچڑتی کناروں کو گیلا کرتی رخصت ہو گئی۔

''تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے..یہ سُوجا ہوا لگتا ہے..''

ظہیر الدین نے اپنی بپتا بیان کی، روسی گنجوں کے ہاتھوں اپنے پٹ جانے کا قصہ بُجھے دل سے بیان کیا اور یوں بیان کیا جیسے وہ صبح کی سیر کے معمول کا قصہ سنا رہا ہو۔

''تم کیوں سامنا نہیں کر سکتے ظہیر..قبول نہیں کر لیتے کہ وہ زمانے نہیں رہے جب ہم اس ماسکو کی گلیوں میں رات بھر بے خطر گیت گاتے پھرتے تھے اور راہگیر ہمارے جوش سے متاثر ہو کر ہمارے رخسار چوم لیا کرتے تھے..تم کیوں ان زمانوں میں شام کے بعد اس شہر کی گلیوں میں نکل جاتے ہو..''

''وارث چوہدری میں ایسا بودا شخص تو نہیں کہ حالات کی یک رخی کو قبول کر کے سمجھوتہ نہ کر سکوں لیکن..تم سیانے ہو، وقت کی چاپ پہچان لیتے ہو..مفاہمت کر لیتے ہو..''

''نہیں..'' وارث چوہدری نے اپنے ہاتھوں میں کب کا تھاما ہوا 1930ء کی درخشاں فرانسیسی وائن کا گلاس حلق میں انڈیل لیا ''میں نے بھی مفاہمت نہیں کی صرف زندہ رہنے کے لئے اس نئے نظام کو مجبوراً قبول کر لیا..میں تمہاری طرح ایک کونے میں اپنے بدن میں کُبھی خوابوں کی کرچیوں کی اذیت سے لطف اندوز ہوتا اپنے آپ پر ترس کھاتا زندگی نہیں کر

سکتا تھا.. چالیسیوں کے بعد میں اس نئے سرمایہ دارانہ نظام کے اکھاڑے میں اتر آیا کہ ٹھیک ہے اگر قوت، لالچ، بے حسی اور بے رحم غیرانسانی لوٹ کھسوٹ کا یہی امتحان ہے تو مجھ میں بھی ایک لیل پوری روح ایسی ہے جو دل سے مفاہمت کئے بغیر سب کو پچھاڑ سکتی ہے.... میں ایک اپنے آپ پر ترس کھانے والا شخص نہیں ہو سکتا..''

''تم ایک بہادر سورما ہو۔'' ظہیر کے لہجے میں کچھ تلخی نہ تھی..'' جب کہ میں بزدل اور ابھی تک خوابوں کے فریب میں الجھا ہوا ایک شخص ہوں.. مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور اوپر جا کر اپنے مہمانوں کی نگہداشت کرو..''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ انہیں میری نگہداشت کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ وہ بھول چکے ہوں گے کہ ان کا میزبان کون ہے، ظہیر.. مجھے تم جیسے دوستوں کی ضرورت ہے.. اور میں جانتا ہوں کہ تم ایک مدت سے خود رحمی کے مرض میں مبتلا الگ تھلگ بیکار پڑے ہو اور کیا میں نے ہر ملاقات پر تمہاری منت سماجت نہیں کی کہ تم میرے شریک ہو جاؤ.. اپنے لئے نہیں میرے لئے.. یوکرین میں میری دو سٹیل فیکٹریاں متحرک ہیں تو تم وہاں ان کا چارج سنبھال لو.. اگر نہیں تو جو تم چاہو وہ ہو سکتا ہے.. غیر اور اجنبی لوگ مجھ سے منسلک ہو کر ممتاز اور متمول ہو رہے ہیں اور تم تو میرے اپنے ہو.. کیا تمہیں تنگی ترشی میں اپنے آپ کو دُکھ دینے سے سُکھ ملتا ہے؟''

اُس لمحے تہہ خانے میں اترتی سوئمنگ پول کے پانیوں تک آتی سیڑھیوں پر سے اشوک کوہلی کی نوخیز، نابالغ لولیٹا اتری، ان دونوں کی جانب ایک نابالغ مسکراہٹ پھینکتے اور پھر اُن کی موجودگی سے سراسر غافل ہو کر اپنے آپ کو جین، بلاؤز اور پھر اپنے زیر جامہ سے آزاد کر کے سوئمنگ پول میں کود گئی..

اگر چہ وہ ایک لولیٹا تھی لیکن اس کی چھاتیاں نوخیز نہ تھیں.. خاصی بڑی اور بھری بھری تھیں یا بڑی کر دی گئی تھیں..

وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے اور اب ان دونوں کے دم میں سکت کم ہو چلی تھی اور وہ پھولتا تھا، ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے دیکھتے جاتے تھے کہ کیوں ظہیر آج سے پینتالیس برس پیشتر کا دم خم کیا ہوا جب تم ایک سائیکل پر سوار پھولدار فراک والی گالینا کے پیچھے اڑتے ہوئے جاتے تھے اور وہ ظہیر اسے وارث کو دیکھتے ہوئے گویا کہتا تھا کہ تم وارث.. جب ایک سوویت سکالرشپ پر ماسکو آئے تھے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر رو رو کر برا حال کر لیتے تھے کہ مجھے میری ماں یاد آ رہی ہے، اس کے ہاتھ کے دال کدو یاد آ رہے ہیں اور جب تم اینا.. کی جانب دل و جان سے اُمڈ پڑے تھے تو ماں رہی اور نہ دال کدو.. تمہاری اینا دریائے ماسکو کے دوسرے کنارے پر کہیں رہتی تھی اور تم انہی راتوں میں جب تمہیں ماں یاد آیا کرتی تھی دریا کے اس کنارے کھڑے ہو کر نہایت بھدی آواز میں اور وہ بھی سسکیاں بھرتے۔ ''لنگھ آ جا پتن جھناں دا او یار..'' گایا کرتے تھے..

وہ سیڑھیاں طے کرتے.. زمانے طے کرتے محض اپنی مسکراہٹوں میں جب لونگ روم کی سطح پر آئے تو اس میں ہجوم ہو چکے مہمانوں کی تعداد اور ان کی گہما گہمی، خمار آلود شوخیوں اور بے تکلفیوں میں اضافہ ہو چکا تھا.. اور ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنے میزبان کی غیر موجودگی کو محسوس نہ کیا تھا کہ ان کے اندر دنیا کی مہنگی ترین شرابوں اور خوراکوں کی الوہی حیات اُبل رہی تھی جس کے سانسوں نے اس لونگ روم کے جگ مگ فانوسوں، سونے کے پانی سے آرائش شدہ گل بُوٹوں والے ڈنر سیٹس.. کھڑکیوں کے آگے دبیز جھالروں میں سمٹے ہوئے سنہرے پردوں، ایرانی قالینوں میں بُنے گئے شکارگاہ

کے جانوروں اور دیواروں پر آویزاں نایاب تصویروں..اور ان میں....اینا کی وہ پورٹریٹ ممتاز اور اور دل ربا تھی جو روس کے سب سے بڑے پورٹریٹ پینٹر نے تخلیق کی تھی اور اس نے محض پانچ لاکھ روبل کے عوض اینا کو سامنے بٹھا کر یہ پورٹریٹ بنائی تھی تو ان سب بے جان اشیاء کو اس الوہی حیات کے سانسوں کی پھونک نے زندہ کر دیا تھا..سونے کے پانیوں سے آرائش شدہ گل بوٹے مہکنے لگے تھے..شکارگاہ کے منظر میں نقش غزال چوکڑیاں بھرنے لگے تھے اور..اینا کی پورٹریٹ کے لب ملتے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے..صرف ایک الوہی پھونک کا کرشمہ..

اشوک کوہلی کی بظاہر نابالغ لگتی لولیٹا سوئمنگ پول میں جب متعدد بریسٹ سٹروکس لگا کر اوپر آئی اور اس کے لئے تیراکی کا یہ انداز یوں بھی مناسب تھا کہ اس کی بریسٹس سٹروکس لگا سکتی تھیں، اشوک کوہلی یونہی فدا نہیں ہو گیا تھا تو وہ فوراً اپنے گیلے بالوں کو سکھانے کی خاطر لونگ روم سے متصل ایک واش روم میں چلی گئی اور ایک قدم آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اس میں اُسے جو عکس نظر آئے وہ اسے گنگ کر دینے کے لئے کافی تھے...جس ڈیزائن اور نزاکت کے پورسلین کے ڈنر سیٹ باہر ڈائننگ ٹیبل پر سجے تھے یہاں واش بیسن اور کچھ گل دان اور وہ جو فرش تھا اور یہاں تک کہ کموڈ بھی اسی پورسلین کے ساختہ اور نزاکت کے وہی گل بوٹے لئے ہوئے تھے..بال سکھانے سے فارغ ہو کر اس نے کموڈ پر بیٹھنے سے اجتناب کیا کہ کہیں اس پرنقش گل بوٹے زندہ ہو کر اس کے زیریں حصّے کو گدگدی نہ کریں..

وارث چوہدری نے درست کہا تھا، ان دونوں کی طویل غیر موجودگی کو کسی نے محسوس نہ کیا تھا کہ بیشتر مہمان اپنے اپنے عرش پر پہنچ چکے تھے اور وہ نشیب کی دنیا سے ماورا ہو چکے تھے..

''تم شراب کو تو کبھی کبھار ہاتھ لگاتے ہو مولوی..تو کم از کم کسی خوراک کو ہاتھ لگا لو..کھانے کے لئے جس پکوان کی خواہش کرو..جس ملک کے پکوان کی خواہش کرو..میں تمہیں ایرانی کیوی آر پیش کروں جو روسی کیوی آر سے کہیں بڑھ کر ذائقے دار اور قیمتی ہوتا ہے۔''

''مجھے ایک مچھلی کے پیٹ میں سے نکالے گئے بدبودار انڈوں سے کچھ رغبت نہیں۔''

''ویسے مجھے بھی نہیں۔'' وارث نے ایک شرارتی سرگوشی کی ''لیکن اشوک کوہلی..اپنی مرغوب 1930ء کے برس کی خمار شدہ وائن کے ساتھ صرف کیوی آر..اور وہ بھی ایرانی کیوی آر کے سینڈوچ پسند کرتا ہے..''

''کچھ دیسی دانہ پانی نہیں ہے..'' ظہیر کے لہجے میں بیزاری آنے لگی..

''سنو..'' وارث نے پھر سرگوشی کی ''ابھی پچھلے ہفتے ماں جی نے نہ صرف مجھے دال اور کدّو بنا کر بھیجے ہیں بلکہ ان کے ہمراہ دیسی سرسوں کی گندلوں کا ساگ بھی ہے دیسی گھی کے تڑکے کے ساتھ..مجھے خیال نہیں رہا ورنہ میں مکّی کی روٹی کا بھی بندوبست کر لیتا..لبنانی روٹی البتہ موجود ہے..کہو..''

''نہیں..'' ظہیر نے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جو ایک روسی ویٹر کو بلانے کے لئے اٹھا تھا ''اس ماحول میں نہیں..اگر ایک یورپی ویٹر چاندی کی ایک طشتری میں سرسوں کا ساگ پیش کرے گا تو اس میں سے وہ مہک رخصت ہو جائے گی جو پنجاب کی مٹی میں سے پھوٹتی ہے..مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''ہُر وارلیس..'' ماسکو میں تعینات جرمن سفیر جو اس لمحے برلن کی بلیک فارسٹ ڈیلی کاٹسن کے چیز کیک سے منہ

بھر رہا تھا، وارث کو دیکھ کر اپنے بھاری ڈیل ڈول میں جھومتا اُس کے قریب آ گیا ''ونڈر بار.. دعوت کا شکریہ..''

''یورایکسی لینس.. اِٹ از مائی آنر..'' وارث چوہدری نے بنا متاثر ہوئے برابری کی سطح پر مسکراتے ہوئے کہا ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ تناول نہیں فرما رہے..''

''دراصل میں.. الاسکا کی سالمن مچھلی کو ڈائننگ ٹیبل پر تلاش کر رہا تھا..''

''ابھی اور اسی وقت یورایکسی لینسی.. یہ وارث چوہدری کا گھر ہے یورایکسی لینسی، یہاں اگر آپ ایک مرمیڈ کی فرمائش کریں گے تو وہ بھی میرے تہہ خانے کے سوئمنگ پول میں تیرتی مل جائے گی..''

''ونڈے بار..'' جرمن سفیر اپنے موٹاپے کے اندر تھل تھل کرتا ہنسنے لگا.. ''یورآ رونڈرفل.. ویسے میری خواہش ہے کہ آپ اپنا کاروبار جرمنی میں بھی پھیلائیں.. ہم تعاون کریں گے..'' وارث چوہدری نے سنی ان سنی کر دی اور کسی نامعلوم شخص کو کچھ اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یورایکسی لینسی.. آپ کو قدرے دقت تو ہوگی، اگر آپ سیڑھیاں اتر کر میرے لان میں چلے جائیں تو وہاں تقریباً پندرہ منٹ بعد نہ صرف الاسکن سالمن مچھلی بلکہ بیف سٹیکس، ٹراؤٹ اور کنگ پرانز کو جو کوئلوں پر بھونے جا رہے ہیں، ان سے لطف اندوز ہو سکیں گے.. صرف پندرہ منٹ بعد..''

لِونگ روم کی بھیڑ میں شہزادمیاں نام کا ایک پاکستانی، ڈھلتی عمر اور ایک نکمے چہرے والا الگ ہوا اور وارث کی جانب ایک پرشوق چال چلتا آ گیا.. یہ محض اتفاق تھا کہ جس روسی لڑکی کے ہتھے وہ چڑھ گیا اس کا باپ کے جی بی کا ایک جنرل تھا اور اب اپنے سسر کی برکت سے پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہو چکا تھا.. وارث چوہدری نے اس کی جانب زیادہ دھیان نہ دیا اور ایک سرسری مسکراہٹ کے ساتھ اسے فارغ کر دیا..

ماسکو کی اُس شب میں شہر سے خاصے فاصلے پر ایک گھنے جنگل کے اندر ہی اندر ارب پتی لوگوں کے جو چند گھر ہریاول میں ڈھکے چھپے تھے تو اس جنگل کے داخلے پر ہر چند قدم کے فاصلے پر پرائیویٹ رکاوٹیں حائل تھیں جہاں مجبوراً رکنے والی ہر کار کے مکینوں سے سکیورٹی گارڈ استفسار کرتے کہ آپ نے کہاں اور کس کے پاس جانا ہے اور کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت کوئی دعوت نامہ ہے.. ان حفاظتی انتظامات کے پار کوئی چڑیا بھی نہیں جا سکتی تھی..

وارث چوہدری کے پرہجوم لِونگ روم میں جب قادر قریشی داخل ہوا اور وہ حسبِ معمول ایک سیاہ شیروانی، لٹھے کی کھڑ کھڑ کرتی شلوار، بہاولپوری زریں کھسے اور ایک گز بھر لمبی تسبیح میں ملبوس تھا جو فرش کو چھونے کو آتی تھی، اس کے ماتھے پر محراب کا ایک زخم خوردہ نشان سیاہ ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر ایک لومڑ مسکراہٹ کھیلتی تھی.. ظہیر کے چہرے کی شکنیں گہری ہو گئیں ''تم نے اسے بھی مدعو کر رکھا ہے؟''

''نہیں..'' وارث نے قادر قریشی کی جانب ایک ناگوار نظر کی.. ''مجھے نہیں معلوم یہ شخص کیسے بیریئر کراس کر کے باہر تعینات میرے سکیورٹی گارڈز کو جُل دے کر یہاں پہنچ گیا ہے.. ظہیر میں اسے کیسے مدعو کر سکتا تھا..''

قادر قریشی ایمن آباد کے ایک اگرچہ نادار مگر پرہیزگار اور متقی امام مسجد کا دوسری بیوی سے تیسرا بیٹا تھا لیکن وہ اپنے سادہ لوح باپ سے جدا ایک چالاک، ایک عیاش اور زناکار خصلت کے ساتھ پیدا ہوا.. اُسے سوشل ازم سے تو کیا دین سے بھی

کچھ شغف نہ تھا..عورتوں کا شوقین اور جنسی کج روی کی انتہائی مکروہ ورزشوں کا رسیا، ہیرامنڈی کی گندی ترین گلیوں میں جتنی بھی کریہہ النظر اور عمر رسیدہ طوائفیں تھیں ان کا کاروبار اس کے دم قدم سے چلتا تھا..اگرچہ وہ گھن آلود حالتوں میں بھی دین کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا اور نشاط کے ابلتے ہوئے لمحوں میں ''جزاک اللہ'' اور ''سبحان اللہ'' کا ورد کرتا رہتا..جب وہ رات گئے لاہور کی ہیرامنڈی سے خلاص ہو کر نشے میں بدمست ایمن آباد واپس ہوتا اور مسجد سے ملحقہ کوارٹر کی دیوار پھلانگ کر اندر جاتا تو اکثر سجدے میں گرے ہوئے اُس کے متشرع والد کی نورانی داڑھی اپنی برخوردار کی قبیح حالت دیکھ کر آنسوؤں سے نچڑنے لگتی اور وہ اسے سرزنش بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ایک شب ایسا کرنے پر قادر نے بدمستی میں انہیں تھپڑ مار دیا تھا..

انہی دنوں اس کے کانوں میں بھنک پڑی کہ اگر مناسب رابطے قائم کر کے اپنے آپ کو ترقی پسند سوچ کا حامل ایک نوجوان ثابت کر دیا جائے تو سوویت یونین میں مفت تعلیم کے درخشاں مواقع حاصل کئے جا سکتے ہیں..قادر قاسمی جیسے شاطر شخص کے لئے یہ ایک بہت ہی آسان امتحان تھا..اس نے کمیونزم کے مختلف کتابچوں کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو خصوصی انقلابی گفتگو سے آراستہ کیا، ہر جان پہچان والے کو کامریڈ کے لاحقے سے مخاطب کیا اور دنوں میں نہایت پُر جوش اور کٹڑ کمیونسٹ کے طور پر اپنی پہچان کروالی..

وہ ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کے کٹھن امتحان میں اس لئے بھی ناکام ہو گیا کہ اس جیسے نظر باز شخص کے لئے اس کے دائیں بائیں زناکاری کے وسیع امکانات موجود تھے..اُس کی دونوں شادیاں طلاق پر منتج ہوئیں کہ اس کی شبینہ کج روی میں کچھ فرق نہ آتا تھا..وہ ان ایام میں..سوویت یونین کے ایام میں قدرے تنگ دستی سے گزارہ کرتا رہا..یہ گزارہ ہو سکتا تھا اگر وہ حکومت کی جانب سے ملنے والے غیر ملکیوں کے وظیفے کی رقم کو دیکھ بھال کر روزمرہ کی ضروریات پر خرچ کرتا لیکن اس کی دیگر ضروریات کے لئے یہ رقم ناکافی تھی..کبھی وہ دریائے ماسکو میں چلنے والے سیاحوں کے مخصوص سٹیمروں پر ایک گائیڈ کے فرائض سرانجام دینے لگتا، وہاں سے اپنی حرکتوں کی وجہ سے نکالا جاتا تو ماسکو کے نواح میں جو دیہات تھے ادھر مزدوری کے لئے نکل جاتا..آلو اکھیڑتا..مویشیوں کو نہلاتا..لیکن جونہی سوویت یونین کی معیشت کی کچی دیوار دھڑام سے گری تو اس کا نصیب جاگ اٹھا۔

جن چھاپہ خانہ میں کمیونسٹ لٹریچر اور روسی ادب کے شاہکار چھپتے تھے جو پاکستان میں پیپلز پبلشنگ ہاؤس تک پہنچتے تھے وہاں امریکی جاسوسی ناولوں کے روسی ترجمے اور پورنوگرافک میگزین دھڑا دھڑ شائع ہونے لگے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی رگوں میں جنس کی ہوس کا خون رواں ہو تب ہی اس میں سے دولت کے جھرنے پھوٹتے ہیں..

قادر قریشی کا لاہور کی ہیرامنڈی سے لے کر ماسکو تک کے بے مہار جنسی تجربوں کا ہیجان یہاں اُس کے کام آ گیا، رزق حلال کمانے کا ایک وسیلہ بن گیا، راتوں رات نہ صرف عرب امارات، مصر اور تھائی لینڈ وغیرہ میں بلکہ افریقہ کے پس ماندہ ترین خطوں اور پاکستان کے دور دراز دیہات میں بھی روسی، ازبک، تاجک اور یوکرین کے بدنوں کی ایک وسیع منڈی وجود میں آ گئی جس نے مقامی طوائفوں کے کاروبار کو شدید زک پہنچائی..ان کے سیاہ یا گندمی بدنوں کے مقابلے میں یہ درآمد شدہ گوریاں بہت ہی گوریاں تھیں اور ان کے جسم متناسب اور پُراشتعال تھے اور..وہ نسبتاً کم داموں میں دستیاب ہو جاتی تھیں..دبئی میں ان غیر ملکی اپسراؤں کو ایک اور سہولت بھی حاصل تھی..وہ موٹے اور ناکارہ ہو چکے عیاش

عربوں کو مرغوب تو تھیں ہی لیکن وہاں شوٹ کیے جانے والی ہندوستانی فلموں کے ہیجان خیز گانوں میں ہیرو اور ہیروئن کے پس منظر میں وہ ایک نہایت برہنہ پس منظر تھیں..اگر چہ وہ رقص کی باریکیوں سے چنداں آگاہ نہ تھیں لیکن ان کی ٹانگیں لامبی اور سڈول تھیں اور ان کے سینے فراخ تھے جنہیں وہ فراخ دلی سے نمایاں کرتیں..اور یوں وہ اپنا تعارف ایک فلمی اداکارہ کے طور پر کرواتیں..جس اجتماعی رقص میں وہ شریک ہوتی تھیں ان کی وڈیو چلا کر کیمرے کو صرف اُس ایک نیک بخت پر مرکوز کر کے ایک اور وڈیو تیار کی جاتی جس سے ظاہر ہوتا کہ پردۂ سکرین پر بس یہی نیک پروین تھیں جن کے رقص نے اُس منظر میں جان ڈال دی تھی۔ یہ وڈیو متوجہ کرنے اور ایک مشہور اداکارہ کی قربت حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لئے نہایت اشتعال انگیز ثابت ہوتی اور وہ اپنے خزانے لٹا دیتے..

جونہی ایک سرخ سویرے کی جگہ ایک سرمایہ دارانہ ڈالر سویرا طلوع ہوا تو خلائی تسخیر کے ادارے..سائنسی تحقیق کے منصوبے..فنون لطیفہ کی ترویج ایسے خسارے کے سودے کوڑے دان میں پھینک دیئے گئے کہ ان میں مالی منفعت نام کو نہ تھی..یہ کارِلا حاصل تھے جن کے ذریعے صرف قومی فخر اور عزت نفس کی تشفی ہو سکتی تھی..ایک آزاد اور جمہوری معیشت کا خاصا ہے کہ دولت حاصل کرنے کے لئے اس کا کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں ہوتا چنانچہ انسانی گوشت کی برآمد اگر منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی تو یہ بہترین معیشت تھی..اس صنعت نے سوویت یونین کے انہدام کے بعد دن دونی اور رات چوگنی کہ یہ صنعت راتوں کو ہی عیاں ہوتی تھی، ترقی کی..صنعتی بھاری مشینری، زرعی آلات اور ٹریکٹر..کاریں اور ہوائی جہاز اور دیگر مصنوعات اگر چہ نہایت بھدے لیکن مضبوط جو سوویت یونین کے زمانے میں باعث افتخار تھے، ان کی جگہ روس کی سب سے منافع بخش صنعت..نسوانی بدنوں کی برآمد نے لے لی..

اور قادر قریشی کا کُل جنسی تجربہ یوں کام آ گیا کہ وہ اس صنعت کا دیرینہ اور ہنر مند کاریگر تھا..جانچ سکتا تھا، پرکھ سکتا تھا، دیکھ بھال کر صرف ایسے مال کو ہاتھ لگاتا تھا جسے ہاتھ لگانے کی خاطر مشرق وسطیٰ کے شیوخ اور پاکستانی وڈیرے اور سیاستدان تن من دھن لٹا دیں..وہ ماسکو میں اس صنعت کا سب سے بڑا صنعت کار ہو گیا..وہ باقاعدگی سے اپنے مال کی کھیپ جنسی طور پر ناآسودہ خطوں کو برآمد کرنے لگا اور اس نے ان خطوں میں اپنا اعتبار قائم کر لیا..اسے اکثر ایسے مال کے حصول کے لئے کچھ زیادہ تردّد نہ کرنا پڑتا کہ یہ مال اپنے قدموں پر چلتا ایک ایسے نہایت امریکی طرز کے جدید دفتر میں پہنچ جاتا جس کے داخلے پر دو نہایت اٹھتے ہوئے سینوں والی خواتین اپنے آگے رکھے بیکار ہو چکے کمپیوٹروں پر بے وجہ انگلیاں چلا رہی ہوتیں اور وہ اس مال کو خوش آمدید کہہ کر بگ باس کے آفس میں جانے کی اجازت دے دیتیں..ان میں سے بیشتر ایسی خواتین ہوتیں جنہوں نے سوویت یونین کے زمانوں میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کبھی بدن فروشی پر مجبور ہو جائیں گی..بے شک تنگی ترشی ان کے نصیب میں تھی، کبھی فاقوں کی نوبت بھی آ جاتی لیکن کبھی سوچا بھی نہ تھا..

وہ کبھی بیلچوں سے ماسکو کے کوچۂ و بازار میں ڈھیر برف کو صاف کرنے والی تھیں، سڑکوں پر جھاڑو لگانے والی..ٹریکٹر ڈرائیور..اجتماعی فارموں میں مشقت کرنے والی..سرکاری دفتروں میں ٹائپسٹ یا کلرک تھیں..لیکن ان میں سے کچھ نہایت پڑھی لکھی سلجھی ہوئی سکولوں اور کالجوں میں پڑھانے والی دانش ور قسم کی خواتین بھی ہوتی تھیں..نظام کی تبدیلی اور آزاد معیشت کے نتیجے میں رہائش، اشیائے خورد و نوش، لباس اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کے نرخوں میں یکدم اتنا اضافہ ہو گیا تھا

کہ ان کی قلیل تنخواہ میں روزانہ کی ڈبل روٹی، پنیر کے ایک ٹکڑے، گوشت کے ایک قتلے اور ایک چھت کی گنجائش نہ رہی تھی..ان میں سے ایک نہایت مدبر شکل کی امیدوار نے قادر قاسمی کے سامنے اپنا کیس پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ سر..میں پہلے اپنا ذہن فروخت کرتی تھی اور اب اپنا بدن بیچنا چاہتی ہوں اور یہ یقیناً نسبتاً ایک آسان مرحلہ ہوگا کہ ذہن سوال کر سکتا ہے جب کہ بدن لب بستہ رہتا ہے..

اور ایسی امیدواروں میں سے صرف چند ایک اتنی خوش بخت ہوتی تھیں جو قادر قاسمی کے کڑے معیار پر پوری اترتی تھیں..صرف وہ جن کے بدن کسے ہوئے ہوتے تھے اور ابھی توانا اور پرکشش ہوتے تھے..اسے بہت فخر تھا کہ اس نے پچھلی کھیپ میں کم از کم ایک پی ایچ ڈی پروفیسر..دو سائنس دان اور روسی ادب کی ایک محقق خاتون کو برآمد کیا تھا..

''نہیں..'' وارث نے جب قادر قریشی کی جانب ایک ناگوار نظر کی تھی ''مجھے نہیں معلوم کہ یہ شخص کیسے بیریئر کراس کر کے باہر تعینات میرے سکیورٹی گارڈز کو جُل دے کر یہاں پہنچ گیا ہے..ظہیر میں اسے کیسے مدعو کر سکتا تھا'' تو قادر قریشی اپنی لومڑ مسکراہٹ اور اس چہرے کے ساتھ جو کنویں میں سے پانی نکالنے والے چمڑے کے ایک بوکے سے مشابہ تھا، فرش پر گھسٹتی تسبیح کے دانے گراتا بے حجاب اس کی جانب بڑھتا چلا آتا تھا..

''چوہدری صاحب..'' وہ بغیر کسی حوصلہ افزائی کے وارث کے ساتھ بغل گیر ہو گیا ''مجھے میری سیکرٹری نتاشا نے خبر کی کہ آج شب آپ کے ہاں ایک دعوتِ طعام ہے جس میں آپ کے کاروباری شریک اشوک کوہلی کے علاوہ مقامی پاکستانیوں اور ان کی بیگمات کا اجتماع ہے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے یہاں حاضر نہ ہوتا..آپ کے دفتری عملے سے کچھ کوتاہی ہوگئی ہوگی ورنہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آپ ایک پاکستانی اور مسلمان بھائی کو مجھ ایسے غریب الدیار بھائی کو مدعو نہ کرتے اور ہاں اس غفلت پر آپ ہرگز اپنے عملے کو سرزنش نہ کیجئے گا'' قادر قریشی نے اپنے اردگرد ایک شاطرانہ نگاہ کی ''ماشاءاللہ..کیسا روح پرور اجتماع ہے۔''

وارث چوہدری ایک ٹھنڈے مزاج کا اعتدال پسند شخص تھا، شدید ترین اشتعال کے باوجود اپنے آپ کو روس کی شدید ترین برفوں سے بھی کہیں بڑھ کر اپنے آپ کو سرد رکھ سکتا تھا..اس نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہ کیا ''قریشی صاحب..برادر آپ میرے معزز مہمان ہیں..میں اپنے عملے کو..ویسے میں نے ارادہ تو کر لیا تھا لیکن آپ کی سفارش کی وجہ سے سرزنش نہیں کروں گا اگرچہ انہوں نے آپ کو دعوت نامہ نہ بھیج کر ایک سنگین غلطی کا ارتکاب کیا۔'' اس نے ایک سپاٹ اور مصنوعی طور پر مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ نزدیک سے مؤدب ہو کر گزرتے ایک ویٹر کو متوجہ کیا ''آئیون..معزز مہمان کے پینے کے لئے کچھ لاؤ..''

''چوہدری صاحب..میں پینے میں کچھ احتیاط کرتا ہوں۔'' قادر قریشی نے اپنی لومڑ مسکراہٹ سمیٹ کر ایک پرتقدس انداز اختیار کر لیا ''لیکن اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو میری مجال ہے..چوہدری صاحب میری یہ کیسی خوش بختی ہے کہ چند روز میں مجھے آپ کی ہمسائیگی کا شرف حاصل ہو جائے گا..''

''کیسے؟..'' وارث چوہدری نے ایک بے اعتبار لہجے میں سوال کیا..

''یہ محض اتفاق ہے کہ ابھی پچھلے ہفتے میں نے آپ کے علاقے میں نصف ایکڑ پر پھیلا ہوا ایک غریب خانہ محض چند ملین ڈالرز میں خرید لیا ہے.. میں نے سوچا کہ اپنے پاکستانی اور اسلامی بھائی کی ہمسائیگی اختیار کرنے سے ہم دونوں اخوت اور محبت کے ایک روح پرور بندھن میں منسلک ہو جائیں گے..''

قادر قریشی ایک گرگ خصلت شخص تھا جو اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے میں ماہر تھا.. وہ ایک ایسا بھیڑیا تھا جو اپنے تیز کسی بھی منافع بخش گوشت کو دانتوں میں بھنبھوڑتے ہوئے بھی مکمل سکون میں رہتا تھا لیکن.. الکوہل کی آتش کے دو چار گھونٹوں سے وہ بھڑک اٹھتا تھا اور حواس کھو بیٹھتا تھا.. وارث چوہدری اپنے مہمانوں کی مدارات کرنے کی خاطر کہیں اور منتقل ہو چکا تھا اور یہ صرف ظہیر الدین تھا جو اس کے سامنے صوفے میں دھنسا کسی گاڑی کے منتظر مسافر کی مانند اُکتایا ہوا بیٹھا تھا..

''یار ظہیر الدین..'' قادر بخش پر الکوہل کی آتش اثر کر چکی تھی ورنہ وہ اس کے ساتھ اتنا بے تکلف نہ ہوتا کہ اس کے کاندھے پر ایک مربیانہ دھپ لگا کر اس کے برابر کی نشست پر دھم سے گر جاتا ''نہ صرف تم نے بلکہ تمہارے والد شمس الدین انقلابی نے سرخ سویرے کے خوابوں میں زندگی گنوادی.. میں نے سوویت یونین میں قدم رکھتے ہی یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ لادینیت پر استوار یہ نظام جس میں مخرب الاخلاق کی کوئی انتہا نہ تھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا.. جس معاشرے میں شراب نوشی اور زناکاری..'' اس نے ایک لذت آمیز انداز میں اپنے ہونٹوں کو دبا کر چوسا ''عام ہو اس پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا عتاب اترتا ہے.. وہ قومیں اور بستیاں ملیامیٹ کر دی جاتی ہیں جو روگردانی کی مرتکب ہوتی ہیں.. میں ایک ممتاز عالم دین کا بیٹا ہوں اور میں ان مسائل سے بخوبی آگاہ ہوں..''

''یقیناً..'' ظہیر الدین نے ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ گفتگو میں الجھنے سے گریز کیا..

''ویسے ظہیر..'' وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گیا ''تم لوگ.. ماسکو میں جتنے بھی پاکستانی ہیں.. تم جیسے شکست خوردہ انقلابی، تم مجھ سے اجتناب کرتے ہو یہ میں خوب جانتا ہوں.. جانتے ہو کیوں مجھ سے گریزاں رہتے ہو، صرف اس لئے کہ تم دین کی اصل روح سے واقف نہیں ہو.. تم مجھ سے اس لئے فاصلہ رکھتے ہو کہ میں.. کیا میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تمہارے اس بھائی نے ابھی پچھلے ہفتے اسی علاقے میں.. محض چند ملین ڈالرز میں.. اس گھر سے کہیں بڑھ کر شاندار ایک گھر خریدا ہے..''

''مبارک ہو..''

''بڑی بوسیدہ سی مبارک دی ہے تم نے ظہیر الدین..'' وہ اپنا پورا جبڑا کھول کر ہنسنے لگا.. اور اس کی ہنسی ایک مخرب الاخلاق لگڑ بگڑ کی ہنسی سے مشابہ تھی'' ویسے تم لوگ مجھ سے اس لئے گریزاں رہتے ہو ناں کہ میں مقامی مال غیر ملکی منڈیوں میں سپلائی کرتا ہوں، اعتراض کرتے ہو.. تو برادر تم جیسے لامذہب لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ ایک دینی مسئلہ ہے جس میں کچھ قباحت نہیں.. یہ سب جنہیں میں برآمد کرتا ہوں کفار کی بیٹیاں ہیں.. ایک طرح سے کنیزیں ہیں، مال غنیمت ہیں تو ان کا کاروبار عین شرعی ہے بلکہ سچ پوچھو تو میرا ایمان ہے کہ مجھے اس کا اجر ملے گا.. ہاں ان میں سے کچھ ازبک یا تاجک وغیرہ مسلمان بھی ہوتی ہیں لیکن وہ نام کی مسلمان ہوتی ہیں.. ایک بے دین معاشرے میں پرورش پانے سے وہ بھی بے دین ہو چکی ہوتی ہیں، مجال ہے ان میں سے کوئی ایک بھی نماز روزے کی پابند ہو.. محض نام کی مسلمان ہوتی ہیں تو انہیں سپلائی کر دینے میں بھی کچھ حرج نہیں..''

''یقیناً..''ظہیرالدین نے پھر کہا اور اس لمحے اُس کی آنکھیں وارث چوہدری کے لِونگ روم کی ایک قدآدم شیشے کی کھڑکی کے پار گئیں اور وہاں سمیل کے چند درخت سر جوڑے کھڑے تھے اور ان میں سے کسی ایک شجر میں سے اس لمحے ایک مائی بوڑھی ایک سفید ریشہ دار اوڑھنی میں ملبوس شرماتی لجاتی پھوٹی، ڈولتی ہوئی ہوا کے دوش پر ہولے ہولے سرکتی آئی اور قدآدم شیشے کے ساتھ چپک گئی..''میں تمہارے وطنوں سے آ رہی ہوں ظہیرالدین.. بوریوالہ سے.. بہت طویل فاصلے طے کر کے.. تمہیں بلانے.. ماسکو کی اس بھیگی رات میں چلی آئی ہوں.. کیا تم باہر آ کر میرا تعاقب نہیں کرو گے.. میں منتظر ہوں..''

●○●○●○●

ماضی کی گورکی سٹریٹ اور نئے نظام کے تحت حال کی ٹورسکایا سٹریٹ کے آخر میں، انٹرنیشنل سنٹر جہاں دنیا بھر کے فیشن ہاؤسز کے آؤٹ لیٹ تھے، ڈیزائنر گھڑیاں، زیورات، پین، سوٹ کیس، لائٹر، سوٹ، اوورکوٹ، لیڈیز بیگ وغیرہ وغیرہ برائے فروخت تھے، اگرچہ ایک لیڈیز بیگ ایک عام روسی کی چھ ماہ کی تنخواہ سے بھی بمشکل خریدا جا سکتا تھا اور جسے ماسکو کے نودولتیے آسانی سے درجنوں کے حساب سے خرید لیتے تھے تاکہ آئندہ پارٹی کے موقع پر انہیں بارسوخ دوستوں کی بیگمات کی خدمت میں ایک حقیر تحفے کے طور پر پیش کیا جا سکے تو اس انٹرنیشنل سٹور کے عین سامنے، شاہراہ کے پار، سرخ چوک کے داخلے کے نزدیک نیلے پلاسٹک کے پانچ اِگلوگھر ایستادہ تھے.. ان کی تعداد چھٹی کے روز سرخ چوک کا دیدار کرنے والے سیاحوں کی تعداد کی مناسبت سے بڑھ جاتی تھی.. سیاح جو ماسکو نوردی پر نکلنے سے پیشتر ہوٹل کے غسل خانے میں اپنے آپ کو ہلکا کر لیتے تھے، دو تین گھنٹوں کی سیر کے بعد اس نفسیاتی بوجھ کا شکار ہو جاتے تھے کہ شاید بوجھ پھر سے بڑھنے لگا ہے تو اس کا مداوا شہر کے گلی کوچوں میں کیسے ہوگا اور وہ ان اِگلوگھروں کو دیکھ کر کھل اٹھتے تھے اور ان سے خارجہ نوعیت کا استفادہ حاصل کر کے پھر سے ہلکے پھلکے محسوس کرنے لگتے تھے۔ ان اِگلوگھروں یا عارضی پیشاب خانوں کے آگے ایک آرام کرسی میں دھنسی ایک فربہ ملازمہ ضرورت مندوں سے دوروبل وصول کر کے انہیں ٹکٹ تھما کر یا تو صبر کرنے کو کہتی تھی اور اگر کوئی ایک اِگلوگھر فارغ ہوتا تھا تو اس کی جانب اشارہ کر دیتی تھی اور وہ قطعی طور پر آگاہ نہ تھی کہ سڑک کے پار انٹرنیشنل سنٹر کے فٹ پاتھ کے ساتھ پارک شدہ جو سیاہ کار دیر سے کھڑی ہے، اس کی پچھلی نشست پر براجمان سردار قالب اس پر نظر رکھے نگرانی کر رہا ہے کہ کیا وہ ہر ضرورت مند سے داخلے کے دوروبل وصول کر کے اسے ٹکٹ تھماتی ہے یا کبھی کبھار رقم وصول کر کے ٹکٹ نہیں کاٹتی بلکہ اسے آنکھ کے اشارے سے اِگلو استعمال کرنے کو کہتی ہے اور وہ دوروبل اپنے تھل تھل سینے میں چپکے سے اڑس لیتی ہے..

قالب کا سُسر لیوسرنوف سابق کے جی بی کا ایک سابق ایجنٹ جو اپنے زمانے میں کمیونسٹ نظام سے ذرّہ بھر روگردانی کرنے والے کوئی ایک فقرہ بھولے سے تنقید کا کہہ جانے والے مرتد اور منحرف حضرات کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں نہایت نیک نام تھا.. ایسے لوگ اکثر اپنے فلیٹ میں، فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے یا کسی ویران گلی میں پراسرار طور پر مردہ پائے جاتے.. اس کی خصوصیت کمیونزم سے اختلاف رکھنے والے دانشوروں اور صحافیوں کو بھی راہِ راست پر لانا تھا، انہیں راتوں رات غائب کرنا اور انہیں گمنام قبروں میں اعزاز کے ساتھ دفن کر دینا تھا اور اُسے اس مزدوروں کی سلطنت کا دفاع کرنے کی بے مثل کارکردگی کی وجہ سے آئیون خوفناک کے نام سے جانا جاتا تھا اور وہ اس لقب پر نازاں ہوتا تھا کہ یوں وہ

ایک زار کے برابر میں آ کھڑا ہوتا تھا..جونہی پانسا پلٹا، میزیں الٹ گئیں، گورباچوف نے کمیونزم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی تو وہ فوری طور پر ماسکو سے فرار ہو کر اپنے آبائی یوکرین کے ایک گاؤں میں جا روپوش ہوا..

نئے روس کے لڑکھڑاتے، کبھی پارلیمنٹ میں مدہوشی سے گرتے سنبھلتے صدر یلسن نے جب اپنے جانشین کے طور پر پیوٹن کو نامزد کیا تو اس نے فوری طور پر اپنے آپ کو مستحکم کرنے کی خاطر اپنے کے جی بی کے دور میں جتنے بھی رفیق تھے، انہیں کھوج نکالا اور ان میں لیوسمرنوف بھی شامل تھا....صدارت حاصل کرنے کے بعد، اس طاقت کو مجتمع کر کے مکمل غلبہ حاصل کرنے کے لئے اسے اپنے دیرینہ اور آزمودہ ساتھیوں کی بے لوث رفاقت درکار تھی..پیوٹن نے اپنے ان رفیقوں کو کسی بھی قانون کی سرحد سے پار جا کر کہ وہ خود قانون تھا، بے دریغ نوازا..اور نوازنے کے ڈھنگ بھی نرالے تھے..مثلاً اس نے اپنے ایک سابقہ باس، کے جی بی کے ایک جنرل کو..جسے سائبیریا کا زار اس لئے کہا جاتا تھا، کہ وہ اکثر ماسکو کی کسی ایک جیل میں سزا کاٹتے ہوئے قیدیوں کو..اور ان کے جرم معمولی ہوتے، کسی سٹور سے جوتوں کا ایک جوڑا چوری کرنے کا جرم..یا کسی ٹریفک حادثے میں سزا یافتہ..وہ پوری جیل کے ہزار ڈیڑھ دو ہزار قیدیوں کو سائبریا کے سرد خانوں میں بھیج دیتا تاکہ وہ وہاں جبری مشقت سے سوویت معیشت کو مضبوط کر سکیں..وہ خود بھی سائبیریا کے آخری قصبے کا رہنے والا تھا اور جونہی اتھل پتھل ہوئی وہ ماسکو سے فرار ہو کر اپنے اس قصبے میں ایک فارم ہاؤس کی چوبی کوٹھڑی میں جا چھپا..اور پیوٹن نے اسے بھی تلاش کر کے ماسکو آنے کی دعوت دی اور گزر اوقات کے لئے شہر بھر میں تربوز فروخت کرنے کی اجارہ داری تفویض کر دی..اور یہ تربوزوں کی فروخت کی اجارہ داری کوئی معمولی نوازش نہ تھی..ماسکو میں کم از کم ڈیڑھ سو ایسے مقامات کا تعین کیا گیا جہاں فٹ پاتھ پر تربوزوں کے ڈھیر لگا کر انہیں مقامی لوگوں اور سیاحوں کو فروخت کیا جا سکتا تھا..ماسکو کے باسی بہت کم لوگ آگاہ ہوں گے کہ آئس کریم کے بعد یہ تربوز تھے جن پر وہ دل و جان سے فدا ہوتے تھے اور اس کے سرخ گودے کے واڈکا سے بڑھ کر شیدائی تھے..یہ کہولت زدہ جنرل پرانے زمانوں کا زار آف سائبیریا اپنی پرانی وردی میں ملبوس جس پر آرڈر آف لینن..سٹار آف سٹالن اور ہیرو آف سوویت یونین نوعیت کے تمغے سجے ہوتے تھے، پچھلے پہر واڈکا کی ایک بوتل گود میں رکھے وصولی کے لئے نکلتے، اپنی سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر ڈھیر نکلتے اور ان تقریباً ڈیڑھ سو مقامات پر ایک ایک لمحہ توقف کرتے اپنے کارندوں سے دن بھر کی تربوزوں کی کمائی وصول کرتے رات بارہ بجے فارغ ہو کر شہر سے باہر اپنے ڈاچا میں چلے جاتے جہاں ایک ازبک عورت صرف ان کے بستر کو گرم کرنے کی خاطر برہنہ حالت میں بے زار لیٹی رہتی اور جب وہ قدم رنجہ فرماتے تو انہیں جگہ دے کر اٹھ کر چلی جاتی کہ یہی اس کی ڈیوٹی تھی..

اسی طور مارضی کے آئیون دے ٹیریبل یعنی لیوسمرنوف کو پیوٹن نے یوکرین کے ایک گاؤں میں دریافت کر کے ماسکو طلب کیا..اور اسے پورے شہر میں عارضی طور پر ایستادہ پیشاب خانوں کا ٹھیکہ عطا کر دیا..چنانچہ کم از کم پچاس ایسے مقامات کی نشاندہی کی گئی جہاں حاجت مندوں کے لئے سہولت مہیا کی جا سکتی تھی..سرخ فوج کے لئے سائبیریا اور چین سے ملحقہ برفیلی سرحدوں کی پہرے داری کے لئے لاکھوں کی تعداد میں پلاسٹک کے جو نیلے اِگلو مستعمل تھے، وہ سوویت نظام کے ساتھ سرخ فوج کے مختصر ہونے سے بیکار ہو چکے متروک شدہ فوجی گوداموں میں ڈھیر پڑے تھے..اور تب ان کا ایک انقلابی مصرف دریافت کر لیا گیا..ان اِگلو گھروں کو گوداموں میں سے نکال کر، فوج کو معمولی سی ادائیگی کر کے انہیں ماسکو کے

مختلف مقامات پر پیشاب گھروں کے طور پر ایستادہ کر دیا گیا.. یہ ایک ایسا منافع بخش اور لوگوں کو بوجھ سے نجات کا وسیلہ مہیا کرنے کا کاروبار تھا جس کے لئے کچھ زیادہ سرمایہ کاری کرنے کی حاجت نہ تھی، سات آٹھ سو اگلو گھروں کو حاصل کرنے کے لئے کچھ زیادہ رقم صرف نہ ہوتی تھی ان میں اتنے ہی کموڈ نصب کرنے پر بھی کچھ زیادہ خرچ نہ اٹھتا تھا اور ان کی دیکھ بھال کے لیے، ضرورت مندوں سے رقم وصول کر کے ٹکٹ دینے کے لئے بس ڈیڑھ سو کے قریب خواتین درکار تھیں اور انہیں بھرتی کرنا چنداں دشوار نہ تھا.. اس آزادی اور جمہوریت کے دور میں ایسے آسان روزگار کے مواقع روز روز نہ ملتے تھے.. لیوسمرنوف کی آئیون خوفناک ایسی سفا کی ایک قصہ پارینہ تھی، اب تو وہ ایک گداز دل کا سوشل ورکر تھا جو خدمت خلق کے جذبے سے سرشار صرف دو روبل کے عوض خلق خدا کو ایک سہولت مہیا کر دیتا تھا۔

لیکن وہ اُس کہولت زدہ تربوزوں کے بیوپاری جنرل کی مانند ذاتی طور پر ہر روز اپنے پیشاب خانوں کی دن بھر کی آمدنی وصول کرنے کے لئے نہیں جاتا تھا..

یہ ذمہ داری اس کے پاکستانی داماد سردار قالب کی تھی..

اور سردار قالب پچھلے بیس منٹوں سے سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر براجمان ایک فرمانبردار اور مطیع داماد کے طور پر اِگلو گھروں کی قطار کے آگے براجمان اُس ایک فربہ عورت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا جس کے بارے میں اسے شک تھا کہ وہ بے ایمانی کی مرتکب ہو رہی ہے..

اس کے باپ شاعرِ انقلاب سردار سیماب نے سردار قالب کے علاوہ اس کی ولادت سے پیشتر اور ازاں بعد کل نو بچے پیدا کئے تھے جو باغبانپورہ کے ایک تنگ مکان میں مکوڑوں کی مانند رینگتے پھرتے تھے.. البتہ نواں مکوڑا ابھی نہ رینگتا تھا کہ وہ ابھی دودھ پیتا تھا.. وہ ہمیشہ سے سردار سیماب نہ تھا، پیدائش سے لے کر جوانی کے آغاز تک وہ جیون علی تھا، اور جب شاعری اتری تو اس نے سیماب کا لقب اختیار کیا اور اپنے ''خاندانی'' ہونے کی شرمندگی کو فراموش کرنے کی خاطر ''سردار'' کا اضافہ کر کے معزز ہو گیا.. سردار سیماب کی باغی شاعری جو شعریت اور نغمگی سے بھرپور تھی اور اس کی قادرالکلامی میں کچھ شک نہ تھا، سیاسی جلسوں میں آگ لگا دیتی تھی، وہ جھوم جھوم کر میں انکار کرتا ہوں سو بار کرتا ہوں کی گردان کرتا ہجوم کو مشتعل کر دینے پر قادر تھا.. اس کا ترنم ایک خصوصی خاندانی پس منظر کی دین تھا، اس کے سامنے بڑی بڑی گلوکارائیں پانی بھرتی تھیں اگرچہ وہ پانی سے پرہیز کرتا تھا.. اور اسے ہر شب شراب پلانے والوں کی کچھ کمی نہ تھی.. ان میں کھدر کے کُرتے شلواروں میں ملبوس پشاوری چپلیں پہنے انقلابی جاگیردار، متمول دانشور اور سیاہ سوٹوں میں ملبوس روشن خیال صنعت کار اس کی پذیرائی میں کچھ کسر نہ چھوڑتے اور وہ ان کی مہمان نوازی سے مشکور اک عالم بے خودی میں قالین پر آلتی پالتی مارے جھوم جھوم کر اپنے شعر سناتا اور اکثر جھومتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتا اور پھر سجدے سے نہ اٹھتا بلکہ اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا جاتا، بٹھایا جاتا اور بیٹھتے ہی وہ پھر اوندھا ہو جاتا۔ چنانچہ اسے گھر پہنچانے کا بندوبست کر دیا جاتا.. ہر شب.. بلکہ گئی شب جب کوئی شوفر ڈِرون مرسیڈس یا ہونڈا اسے باغبانپورہ کے بوسیدہ مکان تلے ڈراپ کرتی تو وہ بمشکل سیڑھیاں طے کرتا اوپر آتا اور اپنی ان پڑھ اور سادہ لوح بیوی پر ڈھیر ہو جاتا.. اس ڈھیر ہو جانے کے باعث

اتنے ڈھیر سارے بچے پیدا ہو گئے جن میں سے ایک قالب بھی تھا، ان کے باپ کی ترجیح اول سرخ انقلاب تھا اور وہ سب اس کی ہر شب کی مخموری کے ڈھیر ہو جانے کے نتیجے میں پیدا شدہ بچے کسی بھی ترجیح میں نہ آتے تھے.. وہ اپنی عوامی مقبولیت اور پسندیدگی کے کسی حد تک تکبر میں اتنا غرق تھا کہ اکثر اپنے بچوں کے نام بھی بھول جاتا..نہ صرف ان کے نام بلکہ ان کی ماں کو گھریلو اخراجات کے لئے کچھ رقم فراہم کرنا بھی بھول جاتا اور وہ اُسی عُسرت اور پسماندگی میں پلتے بڑھتے رہے جس عُسرت اور پسماندگی کو ملیا میٹ کر کے مزدوروں اور کسانوں کو ایک آبرومند سرخ سویر کی نوید وہ اپنے شعروں میں جھوم جھوم کر سناتا تھا..وہ تہہ دل سے اس یقین میں بندھا ہوا تھا کہ اس کی شاعری کا ایک ایسا کائناتی اور عظیم مقصد ہے جس کے سامنے یہ بیوی اور بال بچے بے مقصد ہیں۔

اپنے باپ کی شاعری کا کشکول اٹھائے وہ سردار قالب خزانہ گیٹ ہائی سکول میں اپنی فیسیں معاف کرواتا، امدادی فنڈ سے وظیفہ حاصل کرتا بمشکل گرتا پڑتا میٹرک کے پل صراط سے بالآخر گزر گیا.. پھر باپ کے ایک جاگیردار دوست کے حوالے سے ایم اے او کالج میں داخل ہو گیا اور وہاں وہ ایف اے میں تین چار برس سے اٹکا ہوا تھا، جب نیشنل عوامی پارٹی کے ایک سرکردہ لیڈر اس کے باپ کو پشاور کے ایک جلسے میں مدعو کرنے کے لئے ذاتی طور پر ان کے گھر آئے اور انہوں نے ایک کونے میں دبکے ہوئے اسے دیکھ کر کہا ''سیماب صاحب..آپ کا یہ برخوردار ان دنوں کیا کر رہا ہے؟''

''کچھ نہیں..پچھلے کئی برسوں سے ایف اے کر رہا ہے..نالائق ہے..''

''میں اسے ماسکو بھجوا سکتا ہوں..سوویت سفارت خانے سے سفارش کر سکتا ہوں۔''

اگر وہ ذہین نہ تھا تو ایسا نالائق بھی نہ تھا..ایک عُسرت زدہ حیات اور باپ کی نہ صرف بے توجگی بلکہ بیگانگی نے اس کے دماغ کے خلیوں میں ایک بے چارگی اور بے بسی بھر دی تھی اور وہ ڈرا ڈرا سا رہتا تھا..اس کا ذہن کام کرنے سے انکاری ہو جاتا تھا..اس بے بسی اور بے چارگی نے ماسکو میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا..اگر وہ ایم اے او کالج میں بھی اتنے برس اٹکا رہا تھا تو یہاں ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کی کڑی پڑھائی کی تاب وہ کیسے لا سکتا تھا..نہ روسی زبان کا ابتدائی کورس اُس کے پلے پڑا اور نہ ہی بعد میں یونیورسٹی کے دقیق لیکچر..وہ منہ کھولے پروفیسر حضرات کے چہرے دیکھتا رہتا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں، اُس کے کچھ پلّے نہ پڑتا..ایک ڈیڑھ برس کی چھوٹ کے بعد ایک سرخ انقلابی شاعر کے جگر گوشے ہونے کے باوجود اسے یونیورسٹی سے فارغ کر دیا گیا اور بقول کسے وہ فٹ پاتھوں پر آ گیا اور اسی وظیفے پر گزر اوقات کرنے لگا جو سوویت حکومت غیر ملکی روشن خیال نوجوانوں کو مہیا کرتی تھی..

قالب بے شک بوجوہ ذہنی طور پر پسماندہ رہ گیا تھا لیکن اس کے بدن کے اندر آبائی طور پر سُر تال کی ایک لَے..طبلے کی تھاپوں کی مانند دھمک دھمک کرتی تھی..گانا بجانا اور سُر تال کا دھیان رکھنا اس کے بزرگوں کی سرشت میں تھا جن کا کچھ تذکرہ اس کا باپ کبھی نہ کرتا تھا..وہ بہت قابل رشک اور قابل حسد حد تک ایک کمال کا رقاص تھا، ایم اے او کالج کے سالانہ فنکشن کے موقع پر سٹیج پر وہ قدم رکھتا تو اس کے پاؤں میں بندھی پائلوں کے گھنگھرو چھن چھن کرتے گیت گانے لگتے..یہ یکم مئی کی جبار اور قہار فوجی پریڈ کے بعد کی شب تھی جب سرخ چوک پر جھکے آسمان پر آتش بازی کی بھڑک، گل رنگ، گل بہار اور گل فشاں ہوئی جاتی تھی اور اس آسمان کے نیچے اس مقدس چوک کے پتھروں پر ہزاروں روسیوں کے

پاؤں بے خودی اور سرخوشی میں تھرکتے تھے تو قالب قدرے منتظر رہا. لینن کے مقبرے کی سرخ پتھر کی دیوار کی ٹیک لگائے منتظر رہا اور جب سرخ چوک میں ناچتے لوگ بے دم ہونے لگے، ان کے پاؤں تھکاوٹ میں بھاری ہونے لگے تو وہ کُھردرے پتھروں پر قدم جماتا.. اپنے بدن میں دھمکتی ڈھول کی تھاپ پر کان دھرتا. بھنگڑا اڈالتا ہوا ان میں شامل ہو گیا... تھک چکے روسی رک گئے.. اس کے لئے جگہ بناتے پیچھے ہونے لگے، اسے داد دیتے، ستائش کے نعرے لگاتے تالیاں پیٹنے لگے اور تب اس ہجوم میں شامل ایک عورت.. اور وہ دو بچے جَن چکی تھی، اپنے خاوند سے الگ ہو چکی تھی لیکن ابھی تک وہ ایک خوش وضع، خوش بدن اور کسی ہوئی عورت تھی آگے بڑھی اور قالب کے سامنے آ کر رقص میں اس کے مقابل ہو گئی.. ان دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ایسی دلربائی سے ناچا کہ ان کے گرد جمع ہجوم نے بار بار تالیاں بجا کر انہیں داد دی۔

یہ تانیا لیوسمرنوف تھی..

طلاق شدہ.. اپنے دو بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور پھر بھی ابھی تک خوش وضع اور خوش بدن..

اسے اپنی عمر سے چھ سات برس چھوٹے اس معصوم سے رقاص کے ساتھ شادی کرنے میں کچھ تأمل نہ ہوا..

اور اس کے لیے.. قالب کے لئے بھی وہ ایک ایسا اگرچہ عمر میں اس سے تجاوز کرتا ایک تنکا تھی جس کے سہارے وہ ڈوبنے سے بچ سکتا تھا.. کہ اس کے پاس یونیورسٹی سے فارغ کر دیئے جانے کے بعد.. معمولی وظیفے کے باوجود، بالآخر پاکستان لوٹ جانے کے سوا اور کوئی متبادل نہ تھا.. اور وہاں.. باغبانپورہ کا ایک تنگ مکان، عُسرت، اس کے متعدد کیڑے مکوڑے بہن بھائی اور ایک خاوند کے شبینہ بوجھ سہتی مجبور اور جاہل ماں تھی.. چنانچہ قالب نے اس ایک تنکے کو سہارا کر لیا اور وہ تنکا چونکہ تجربہ کار تھا اس لئے اس نے تانیا نے اپنی تجربہ کاری سے اس بھولے نوجوان کو ہر شب ایک عالم مدہوشی میں رکھا.. جنرل لیوسمرنوف بھی معترض نہ ہوا.. ایک طلاق شدہ بیٹی دو بچوں کی ماں سے کوئی بھی مناسب روسی نوجوان کہاں شادی کر سکتا تھا..

وہ پچھلے بیس منٹ سے کار کی پچھلی نشست پر براجمان اپنے سُسر کے اِگلو پیشاب خانوں کے باہر آرام کرسی پر براجمان.. دو روبل وصول کر کے ٹکٹ فراہم کرنے والی عورت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا..

وہ اب ماشاءاللہ سے چار بچوں کا پُرفخر باپ ہو چکا تھا جن میں سے دو اسے ورثے میں ملے تھے اور دو اس کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھے.. لیلیٰ اٹھارہ برس کی ہونے کو تھی اور بلال اس سے دو برس چھوٹا تھا پر ان کے ناک نقشے اور رنگ میں کوئی ایسی نشاندہی نہیں تھی جو اُن میں پاکستانی خون کی آمیزش کو نمایاں کرے.. وہ خالصتاً روسی رنگت اور نین نقش کے حامل تھے.. یہ ایک عجیب وقوعہ تھا کہ ماسکو میں آباد وہ پاکستانی جن کی بیویاں روسی نژاد تھیں ان سب کی اولادوں میں پاکستانی نقش و نگار کا کچھ شائبہ نہ ہوتا تھا.. سردار سیماب کے اس پوتے اور پوتی میں بھی کہیں کوئی جھلک نہ تھی جو یہ غمازی کر سکے کہ ان کا دادا ایک پاکستانی ہے.. دادا تو دور کی بات باپ کی شباہت کا بھی کوئی پرتو نہ تھا اور سردار سیماب وہ کب کا جگر چھلنی ہونے کے باعث مر چکا تھا.. زمانے کے جاروب کش نے اس کی بیشتر شاعری کو دنیا کی سٹیج سے سمیٹ کر گمنامی کے کنوئیں میں ڈال دیا تھا، ہاں کبھی کبھار اس کا لکھا ہوا کوئی فلمی گیت ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر سنائی دے جاتا اور اس کے عہد

میں جینے والے اُس کی یاد میں ایک ٹھنڈی آہ بھر لیتے..اس کی موت پر ملک کے طول وعرض میں تعزیتی ریفرنس منعقد ہوئے، وزیرِاعظم اور صدرِمملکت سمیت ان گنت سیاسی لیڈروں کے تعزیتی خط اس کی بیوی کے نام آئے اور پھر کسی نے کچھ خبر نہ لی کہ باغبانپورہ کے اس مکان میں اس کے خاندان کا جو ریوڑ ہے وہ کس حال میں ہے..اس کی بیوی آئے دن پریس کانفرنسوں میں اپنی حالت زار کا رونا روتی رہتی اور حکومتِ وقت سے امداد اور ماہانہ وظیفے کی طالب رہتی..

سردار قالب..اپنے سُسر لیوسمرنوف کے اِگلو پیشاب خانوں سے حاصل ہونے والی روزانہ آمدن وصول کرنے پر متعین کر دیا گیا تھا اور اب وہ شاہراہ کے پار اُس فربہ عورت پر پچھلے بیس منٹ سے نظر رکھے ہوئے تھا جس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ اس کے تھل تھل سینے کی فراخی میں کچھ ایسے روبل پوشیدہ ہیں جو اس نے گاہکوں کو ٹکٹ دیئے بغیر ناجائز طور پر پوشیدہ کر لئے تھے..

●○●○●○●

لالٹین کے مختصر شعلے میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اُس گھٹا ٹوپ اندھیارے میں مدفون وسیع و عریض سیلی اور ٹھنڈک بھری مہک والے تہہ خانے کی تاریکی میں نقب لگا کر، روشنی کا ایک سوراخ چھید کر اس کے اندر ذخیرہ شدہ سکوت میں آئے ہوئے ہزاروں اور متروک ہو چکے شناسا پتھریلے چہروں میں سے کسی ایک چہرے کو عیاں کر سکتا۔۔

وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا کہ وہ چہرے کہیں کہیں فرش پر بھی منہ کے بل پڑے تھے۔۔وہ ان میں سے متروک شدہ کسی ایک چہرے کو ہاتھ سیدھا کر کے لالٹین کی بجھتے ہوئے چراغ ایسی مدھم روشنی کی زد میں لاتا تو وہ وہی چہرہ ہوتا۔ اُسی کا چہرہ ہوتا۔۔

ارباط سٹریٹ کی اس بغلی گلی میں جہاں ایسے ریستوران اور کافی ہاؤس کثرت میں تھے جو نسبتاً مناسب قیمت کے ہونے کے باعث طالب علموں اور کم آمدنی کے لوگوں میں مقبول تھے، اس کے آخری بوسیدہ ہو چکے مکان کے پہلو میں سے وہ سیڑھیاں اترتی تھیں اور اترتی ہی چلی جاتی تھیں اور ان کے اختتام پر قدم ایک تہہ خانے کی وسعت میں پڑ کر گونجتے تھے اور وہاں وہ سب ہزاروں کی تعداد میں بے آسرا اور بے کار پڑے تھے جیسے وہ تہہ خانہ نہ ہو تاریخ کا ایک کوڑے دان ہو۔۔ان میں سے بیشتر اپنے پاؤں پر کھڑے تھے، اپنی بنیاد کے سہارے قدرتی حالت میں ایستادہ تھے لیکن ان میں سے کچھ ایسے تھے جنہیں گرانے میں احتیاط نہ برتی گئی تھی اور وہ اپنی دونوں پتھریلی یا جستی ٹانگیں بنیاد پر ہی معلق چھوڑ آئے تھے اور اب ایک اپاہج حالت میں، ٹانگوں کے بغیر فٹ پاتھ پر گھسٹتے ایک فقیر کی طرح فرش پر پڑے تھے اور ان کے چہرے تہہ خانے کی تاریک چھت کو گھورتے تھے۔۔ان میں سے بیشتر کی ناکیں ٹوٹ چکی تھیں۔۔جیسے گندھارا عہد کے اکثر بدھ مجسموں کی ناکیں کھدائی کے دوران ٹوٹ جاتی ہیں اور پھر بازار میں ان کا کچھ مول نہیں پڑتا۔۔لیکن نہیں، وہ پھر بھی مناسب قیمت پا جاتے ہیں کہ ان کے بقیہ نروان میں ڈوبے ہوئے نقش سالم ہوتے ہیں پر یہ چہرے اگر ان کی ناکیں سلامت بھی ہوتیں تو یہ محض کاٹھ کباڑ ہوتے۔۔

مسلسل جلنے سے لالٹین کا دھاتی وجود گرم ہو گیا اور اسے تھامے رہنا مشکل ہو گیا۔۔اس کا مختصر شعلہ بجھا تو قمیر الدین اُن ہزاروں متروک شدہ مجسموں کی مانند نابینا ہو گیا جو اس تہہ خانے میں لاچار بے جان اور دم بخود تھے۔۔

قومی اخراجات کی کمی کی مہم کے دوران یہ تہہ خانہ بھی اُس کی زد میں آ گیا اور اس کی بجلی کا کنکشن منقطع کر دیا گیا۔۔کہ بے جان پڑے، تاریخ کے کوڑے دان میں پڑے، پتھر لوہے اور کانسی کے مجسموں کو تو روشنی درکار نہیں ہوتی۔۔نہ تو انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھنا تھا کہ تو کون ہے کہ وہ سبھی ایک ہی شکل کے تھے اور نہ ہی انہوں نے اب کسی رائٹنگ ٹیبل پر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں جھک کر اپنی قائم کردہ مزدوروں کی سلطنت کے مسائل حل کرنے تھے، احکام لکھنے تھے، اکتوبر انقلاب کی تاریخ رقم کرنی تھی، اپنے مرشدین مارکس اور اینگلز کی فلسفیانہ تحریروں کی تفسیر کرنی تھی، نہ ہی ٹروٹسکی کے اعتراضات کے مدلل جواب تحریر کرنے تھے چنانچہ بجلی منقطع کر دی گئی۔۔ چھ ماہ ہونے کو آئے تھے کہ یہ تہہ خانہ ایک عمیق

کنویں کی مانند اندھیارے میں غرق تھا..

اس برس ماسکو کا موسم کچھ زیادہ ہی قہر انگیز ہو رہا تھا..

''نہیں ظہیر اس موسم سرما میں اتنی شدت نہیں جتنی تم محسوس کر رہے ہو..'' وارث چوہدری نے کہا تھا ''یہ جو چالیس برس ہم پر گزرے ہیں انہوں نے اپنے زوال کا خراج ہم سے وصول کیا ہے ورنہ ہر برس اتنی ہی سردی پڑتی تھی پر تب ہماری رگوں میں خون میں ٹھنڈک نہ تھی، وہاں خون کے بجائے الاؤ گردش کرتے تھے..اور وہ جو آتش ہمارے خون میں دوڑتی پھرتی تھی محض نوجوانی کا کرشمہ نہ تھی، ہم اشتراکیت کے مذہب پر ایمان رکھتے ہوئے جو بے لوث خواب دیکھتے تھے ان کی حدت بھی ہمارے لہو میں شامل ہوا کرتی تھی..جو سرد پڑ چکی۔''

''نہیں وارث..'' اس نے اپنے دوست کے اس تجزیے سے اتفاق نہیں کیا تھا ''تمہیں اپنی کاروباری سلطنت کے انتظام وانصرام میں، صنعتیں اور جائیدادیں اور دھاتوں کی کانوں کی خرید وفروخت کی بھگدڑ میں، اس سرمایہ دارانہ نظام کی اس چوہوں کی دوڑ میں کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ہی نہیں ملتا.تم تو ریشم کے ایک کیڑے کی مانند اپنی حیات آسائش کے ایک کوئے میں بند گزارتے ہو..گھر سے باہر قدم رکھتے ہو تو تمہاری کار کھلے آسمان تلے منتظر نہیں ہوتی، اس کا پورچ بھی گھر کے اندرونی درجۂ حرارت کی سطح پر ہوتا ہے..کار میں سے برآمد ہوتے ہو تو ایئر پورٹ..جہاز کے اندر..تمہارے کثیر المنزلہ دفاتر کا ہر کمرہ.تم جہاں بھی قدم رکھتے ہو وہاں مصنوعی حدت تمہاری منتظر ہوتی ہے..تم دین ایمان سے بتاؤ کہ تم نے کب آخری مرتبہ کھلی فضا میں چند سانس لئے تھے..تم جان ہی نہیں سکتے کہ اس برس سردی میں کیسی بلا کی قہر انگیزی ہے..میرے دو کمروں کے فلیٹ کی ہیٹنگ اتنی ناقص ہے کہ اُس پر لاشوں یا آلوؤں کو محفوظ رکھنے والے ایک سرد خانے کا گمان ہوتا ہے، اور جب میں اس کی سرد قید سے باہر قدم رکھتا ہوں تو میری پرانی ماسکووچ کار برف میں دفن نظر آتی ہے اور میں اس بڑھاپے میں کدال چلاتا، اُس اس کی برفانی قبر میں سے برآمد کرتا ہوں اور وہ ظاہر ہے آسانی سے سٹارٹ نہیں ہوتی اور اگر ہو جاتی ہے تو اس کا ہیٹر کام نہیں کرتا اور میری انگلیاں برفیلے سٹیئرنگ کے ساتھ یوں جُڑ جاتی ہیں کہ اگر میں ان کو الگ کرتا ہوں تو ان کا کچھ ماس سٹیئرنگ سے چپک جاتا ہے..تو تم نہیں جانتے وارث چوہدری...''

وارث چوہدری ہمیشہ کی طرح آج بھی قدرے شرمندہ ہوا کہ وہ اسے یہ پیشکش متعدد بار کر چکا تھا پر وہ نہ مانتا تھا ''دیکھو کامریڈ..'' اس نے اپنی شرمندگی چھپانے کی خاطر اپنی معصوم مسکراہٹ کا سہارا لیا ''میں تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہراتا، اگر تم میرے مشورے کو ایک مرتبہ پھر رد کر دیتے ہو، تم مفاہمت نہیں کر سکتے..اپنی عزت نفس کو داؤ پر نہیں لگا سکتے، میرا احسان نہیں لینا چاہتے..اگرچہ لعنت ہے اس قدیمی دوستی پر اگر دوست ایک دوسرے کا سہارا بننا چاہیں اور اسے احسان کا نام دیا جائے..لیکن تم میرے مشورے پر غور تو کر سکتے ہو..پھر یہ موسم اتنے قہر انگیز نہیں رہیں گے..''

ظہیر الدین نے بہت دن وارث کے اُس مشورے پر دل جمعی اور سنجیدگی سے غور کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ آج ارباط سٹریٹ کے آخری مکان کے برابر میں سے اترتی سیڑھیاں اتر کر متروک مجسموں کے اس تاریک عجائب گھر میں آ نکلا تھا..اگرچہ اس غیر متوقع مفاہمت کا ایک اور جواز بھی تھا..

سوویت یونین کی سربلندی کے زمانوں میں یہ تو ممکن تھا کہ آپ نظر اٹھاتے تو نہ آفتاب دکھائی دیتا اور نہ

مہتاب..لیکن یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپ کی نظروں میں ولادے میر لینن کا کوئی مجسمہ نہ آ تا..شہروں، قصبوں اور دیہات کے مرکزی مقامات پر..شاہراہوں کے کنارے.. پارکوں میں اور خاص طور پر قدیم کلیساؤں کے عین سامنے..ہر مقام پر..ہر جگہ..سوائے فلک کے، زمین کے چپے چپے پر وہ اپنی واسکٹ میں انگوٹھا اڑسے، دوسرا ہاتھ فضا میں بلند کئے..اپنے تھری پیس ڈھیلے سوٹ اور ٹائی کی بھدی گرہ کے ساتھ..اپنے نیم گنجے سر اور فرنچ کٹ داڑھی میں، آنکھوں میں ایک انقلابی غصیلے پن کے ساتھ وہ آپ کی نظر میں نہ آ تا..یہ تو ممکن ہی نہ تھا..

پھر وہ جو عظیم معبد تھا سوویت یونین کا جس کے ستونوں کو جب معیشت کے زوال کی دیمک نے یوں کھوکھلا کیا کہ وہ یکدم منہدم ہو گئے اور ان کی جگہ ایک نیا سرمایہ دارانہ نظام سر بلند ہونے لگا تو وہ نظام کیسے ہر گلی کوچے اور ہر چوک میں ایستادہ اپنے ازلی دشمن کو ایستادہ برداشت کر سکتا تھا...مزدوروں کی وزارت کا وہی شعبہ جہاں ہمہ وقت یہی منصوبہ بندی کی جاتی تھی کہ پورے سوویت یونین میں کوئی کوچہ، گلی، بازار یا چوک ایسا تو نہیں رہ گیا جہاں سے لینن نظر نہ آ تا ہو...بے شک نظر آ تا ہو تو بھی ایک اور مجسمہ کہیں نہ کہیں ایستادہ کر دو..اب اُسی شعبے کو انہی مجسموں کو ہٹانے، گرانے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے معمور کر دیا گیا تھا، اس تہہ خانے میں صرف ماسکو شہر اور اس کے گرد ونواح میں سر بلند لینن کے جو مجسمے گرائے گئے تھے وہ سب کے سب استراحت فرماتے تھے، اگر وہ سب پتھر سے تراشے ہوتے تو انہیں پیس کر ان کی بجری کوٹ کر کسی نئے کلیسا کی بنیادوں میں بھری جا سکتی تھی..اگر چہ یہ بجری شرعی طور پر تو لادین ٹھہرتی تھی کہ ایک لادین شخص کے مجسمے سے بنائی گئی تھی لیکن مقدس کلیسا ہمیشہ ایسے گنہگاروں کے خون سے ہی سرخرو اور پائندہ ہوتا تھا..وہ سب پتھر سے تراشے ہوئے نہ تھے ان میں سے بیشتر تانبے سے ڈھالے گئے تھے اور یہ دھات مناسب قیمت والی تھی..لوہے کا بھی مول پڑ جاتا تھا..

''میری ایک ذیلی فرم کو حکومت نے خود ایک معاہدے کی پیشکش کی ہے..ارباط سٹریٹ کا وہ تہہ خانہ کب سے ان بیکار مجسموں سے بھرا پڑا ہے اور ایک روسی کاروباری جو کسی زمانے میں لینن کے مقبرے کے باہر ایک محافظ کے فرائض سرانجام دیتا تھا وہ اس تہہ خانے میں ایک انڈر گراؤنڈ کلب کھولنا چاہتا ہے اور حکومت جلد از جلد ان بیکار مجسموں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے..شہزاد میاں اور قادر قریشی کو اپنے ذرائع سے اس پیشکش کا علم ہو گیا ہے اور انہوں نے اس کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے مجھ سے رابطہ کیا ہے لیکن میں نے یہی بہانہ بنایا ہے کہ اس پروجیکٹ کو میں ذاتی طور پر ہینڈل کرنا چاہتا ہوں..یہاں تم آ جاتے ہو..''

''واقعی..کیسے؟''ظہیر مسکرا رہا تھا جیسے کوئی طوطا مینا کی کہانی سن رہا ہو..

''تم نے صرف اتنا کرنا ہے کہ دھات میں ڈھالے جتنے مجسمے ہیں انہیں اس تہہ خانے میں سے نکال کر..اور یہ میرے لوگ کریں گے..تم نے ان کا وزن کر کے انہیں میری فاؤنڈری میں بھجوا دینا ہے جہاں انہیں پگھلا دیا جائے گا..لوہا نہایت مہنگے داموں تعمیراتی کاموں کے لئے فروخت ہو جائے گا اور تانبے سے میری ہی فاؤنڈری میں صلیبیں ڈھال دی جائیں گی جو منہ مانگی قیمت پر آسانی سے فروخت ہو جائیں گی..''

یہ واقعی ایک طوطا مینا کی کہانی بیان ہو رہی تھی ''صلیبیں؟''، ظہیر کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''ہاں ظہیر..روس کے طول وعرض میں نئے کلیسا جنگلی کھمبوں کی مانند اُگ رہے ہیں..اور کوئی بھی کلیسا ایک صلیب کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟ اور ایک ایسی تانبے کی صلیب جو موم بتیوں اور فانوسوں کی روشنی میں دمکنے لگے اور عبادت

گزاروں کے قلب اس دمک سے منور ہو جائیں..''

اس کی ظہیر کی سمٹی ہوئی مسکراہٹ پھر پھیل گئی، اس کے لہجے میں کچھ تلخی نہ تھی بلکہ وہ قدرے محظوظ ہوا تھا ''وارث..عظیم کامریڈ..کمیونزم کے مقدس باپ کے مجسموں کو ڈھال کر ان کی صلیبیں بنیں گی..کامریڈ لینن پر کیا گزرے گی..کیا اس کا سرخ چوک کے مقبرے میں حنوط شدہ بدن اپنے شیشے کے صندوق میں ایک کروٹ نہ بدلے گا..''

''وہ بھی چند روز کا مہمان ہے..شاید اگلے ماہ لیکن یقیناً اگلے برس تک اسے بھی مقبرے سے باہر نکال کر کامریڈ سٹالن کی لاش کی مانند جلا دیا جائے گا..اس کے نظام کی مانند اس لاش کے دن بھی پورے ہو چکے ہیں..پلیز اپنے لئے نہیں تو میرے لئے پرانی رفاقتوں کے ناطے میرا مشورہ مان لو..''

تاریخ کا یہ کیسا بھیانک قہقہہ تھا کہ مذہب کو افیون قرار دینے والے لینن کے مجسموں سے ساختہ صلیبیں کلیساؤں میں آویزاں ہوں گی..

اگر ظہیر الدین آمادہ ہو گیا تھا تو محض معاشی منفعت کے لالچ میں نہیں بلکہ ایک اور دل خراش جواز تھا..

ایک کیسٹ تھی جس میں ان زمانوں کے گیت بھرے ہوئے تھے جب جوانی کی نوخیزی اور بے پروائی بوریوالہ میں بدن میں خمار بھرتی تھی..نور جہاں، زبیدہ خانم، سلیم رضا، مالا اور نسیم بیگم کی آوازیں جو ڈرائیو کرتے ہوئے اسے اپنے بہاؤ میں بہا کر واپس انہی دنوں میں لے جاتیں..وہ کیسٹ مل نہیں رہی تھی، شاید سویٹ لانا کی کیسٹوں اور سی ڈیز کے ڈھیر میں گم ہو گئی تھی..یہ محض تجسس تھا کہ میری بیٹی کی پسند کیا ہے کہ وہ ہر ڈی وی ڈی کو پلیئر میں دھکیل کر اسے ٹیلی ویژن سکرین پر دلچسپی سے دیکھتا کہ اس میں کیا ہے..امریکی فلمیں، شیکسپیئر کے ڈرامے، کچھ اطالوی آپرا، براڈوے کے ہٹ کھیل اور تب ایک اور ڈی وی ڈی میں مقفل کچھ منظر سکرین پر حرکت میں آئے اور اس کا دل رک گیا..سانس رک گیا، وہ فالج زدہ سا ہو گیا..سکرین پر اس کی سویٹ لانا تھی، برہنہ حالت میں، ایک سگار پھونکتے درمیانی عمر کے فربہ روسی کے سامنے اٹھلاتی، نخرے دکھاتی، حرکت کرتی..شمس الدین انقلابی کی پوتی اور اس کی بیٹی سویٹ لانا..

سویٹ لانا نے شرمندہ تو خیر کیا ہونا تھا وہ الٹا اس پر برس پڑی ''ڈیڈی یہ میری ذاتی سی ڈی تھی، آپ نے مجھ سے اجازت لئے بغیر اسے کیوں ڈی وی ڈی پلیئر میں داخل کیا..آپ ایک غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب ہوئے ہیں اور پھر آپ معترض بھی ہوتے ہیں..میں ایک اداکارہ ہوں اور میں نے محض ایک ماڈل کے طور پر اپنے بدن کی نمائش کی ہے..اس میں کچھ حرج ہے؟..ویسے میں اگر اس نوعیت کے پراجیکٹ قبول نہ کروں تو..میری تقریباً اپاہج ہو چکی ماں..نکمے اور ناکارہ بھائی بورس اور ڈیڈی آپ کا گزارہ کیسے ہو..گھر کے اخراجات کے لئے رقم کہاں سے آئے گی..''

یوری گگارین کے خلاء میں جست لگاتے نقرئی مجسمے کی قربت میں فٹ پاتھ کے کنارے سمپل کے درختوں کا وہ ذخیرہ موجود تھا..اور وہ جا بھی کہاں سکتا تھا کہ درخت انسانوں کی طرح کسی آئیڈیل کے خواب میں، کسی رشتے کی محبت یا نفرت میں، روزگار کی تلاش میں، اپنے عقیدے کی تلوار سے کسی کو فتح کرنے کی خاطر، کسی بھی غرض کے لئے اپنے مقام کو

چھوڑنا چاہیں تو بھی چھوڑ نہیں سکتے..اور یوں اگرچہ ان کی حیات موسموں کے تابع بے کیف اور ساکت رہتی ہے، اگر ان کی حیات میں مسرت اور سرخوشی کے جھرنے نہیں پھوٹتے تو انہیں دکھوں، ناکامیوں اور مایوسیوں سے بھی واسطہ نہیں پڑتا..اُن پر کسی بھی موسم کی شدت اثر نہ کرتی تھی، آسمانوں سے برف کے گالے اترنے لگتے تو وہ اپنے پتے جھاڑ کر ٹنڈ منڈ ہو کر اسے اپنے آپ پر گرنے دیتے..موسم گرما کی حدّت کا آغاز ہوتا تو ان کی خالی بانہوں میں سے کونپلیں پھوٹنے لگتیں اور پھر بالآخر اگر وہ درخت سمیل کے ہوں تو انہی کونپلوں کی کوکھ میں سے سفید مائی بوڑھیاں پھوٹنے لگتیں، اپنے ریشے دار سراپے میں ایک بیج سنبھالتیں، اسے دور دراز کی سرزمینوں تک لے جانے کے لیے..درخت، انسانوں کی نسبت کہیں آسودہ اور مطمئن حیات گزارتے تھے اور پھر اس مٹی میں مل جاتے تھے جس میں سے وہ پھوٹتے تھے..

ویسے یوری گگارین کے اس خلاء میں جست لگاتے دکھائی دیتے نقرئی مجسّمے کی قربت میں فٹ پاتھ کے کنارے سمیل کے درختوں کا جو ذخیرہ تھا، وہ بے خبر تھا، آگاہ ہرگز نہ تھا کہ اگلے چند ہفتوں میں انہیں بھی انسانوں کی مانند دکھ اور اذیت سے آشنا ہونا تھا..جب انہیں ایک کثیر المنزلہ ہوٹل کی تعمیر کے لئے رقبہ صاف کرنے کے لئے ایک ہی دن میں کٹ کر گر جانا تھا....شہر ماسکو کی ہریاول اور جا بجا ہجوم کرتے ہرے بھرے جھومتے درختوں تلے وہ بیش قیمت زمین تھی جسے سرمائے کا عفریت نگلنا چاہتا تھا..حالانکہ یہ درخت تو کبھی بھی کیمونسٹ نہ تھے..لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ سوویت یونین کی ناگہانی موت کے بعد اس میں بسنے والے انسانوں کی حیات میں ''انقلابی تبدیلیاں'' رونما ہوئی ہوں...ٹریکٹر ڈرائیور..سبھی نہیں لاکھوں میں سے ایک دو..یکدم سے باخ سیاہ کاروں اور نقرئی بی ایم ڈبلیوز میں گھومنے لگے ہوں..کے جی بی کے معمولی اہلکار اور خاص طور پر وہ جو کبھی پیوٹن کے پاس سے بھی گزرے ہوں..متروک شدہ ہزاروں سوویت ٹینکوں کو یا تو افریقی ریاستوں کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر کے اور یا پھر انہیں لوہے میں ڈھال کر، سوئٹزرلینڈ کے مہنگے ترین سرمائی مقام ڈیووس کے تمام فائیو سٹار ہوٹل مکمل طور پر بک کروا کے وہاں اپنے سینکڑوں رفیقوں اور ان کی داشتاؤں کے ہمراہ سکی انگ نہ کرتے ہوں..نج کاری کے دوران کسی ایک کارخانے میں مدت سے کام کرنے والا ایک سپروائزر اپنی مختصر جمع پونجی سے وہ کارخانہ اونے پونے داموں میں خرید لیتا ہے اور پھر ماسکو سے باہر ایک گھر وہائٹ ہاؤس کی مکمل نقل تعمیر کر کے اس میں قیام کر کے اپنے آپ کو ایک امریکی صدر تصور کرتا ہے..اس ایک انتشار شدہ..منہدم ہونے والے لمحے میں جب کہ اشتراکیت اپنے گھٹنوں کے بل اوندھی ہو رہی تھی اور روس کی ہر شے برائے فروخت تھی تو جنہوں نے اس نظام کے مسمار ہونے کا تادیر ماتم نہ کیا، سوگوار ہو کر فوراً سنبھل گئے، اپنے حواس قائم کر کے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نئے نظام کی خود غرضی اور لالچ کو اختیار کر لیا..اب وہ نہ صرف ماسکو پر بلکہ پورے روس پر وراج کرتے تھے..وہ سرمایہ دار لینن اور سٹالن تھے جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا..

تو یہ کیسے ممکن تھا کہ جب انسان ایک اتھل پتھل، ایک اکھاڑ پچھاڑ ایک غیر متوقع تبدیلی کے نتیجے میں..پل میں وہ معتبر تھے اور اگلے پل رذیل ہوئے، اور پل میں وہ معمولی تھے اور اگلے پل وہ غیر معمولی ہو گئے..شاہ سے گدا ہو گئے اور گدا سے شاہ ہو گئے..ابھی ایک مقام پر زمین میں قہر اور جبر کی جڑیں پھیلائے ایستادہ تھے اور ابھی منہ کے بل گر رہے ہیں اور جن کی جڑیں نہیں تھیں، وہ جڑیں پکڑ کر سربلند ہوئے جاتے ہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ یوری گگارین کے اس خلاء میں جست لگاتے دکھائی دیتے نقرئی مجسّمے کی قربت میں فٹ پاتھ کے کنارے سمیل کے جو درخت تھے، وہ اس تبدیلی کی زد میں نہ آتے..

قدیم چینی شاعر لی پو کے بقول..

اگر اکیلی مخلوق اس طرح تبدیلی سے دوچار ہو سکتی ہے..
تو یقیناً ساری دنیا بہاؤ میں ہو گی..
تو پھر کیا تعجب اگر پینگ لائی کا سمندر..
سکڑ کر ایک صاف پایاب ندی نہ بن جائے..
یا جو شخص باب سبز پر خربوزے بوتا ہے..
کبھی تنگ لنگ کا مہاراجہ رہا ہو..
اگر دولت اور عزت اس طرح سے گریز پا ہیں..
تو پھر یہ کیا ہے جو ہم اپنی محنت اور مشقت سے حاصل کرتے ہیں؟

صرف انسان یا اکیلی مخلوق ہی اس نظام کی تبدیلی سے دوچار نہ ہوئی تھی بلکہ سمیل کے درخت بھی اسی تبدیلی کے ہاتھوں کٹ جانے والے تھے..

اور وہ شخص جو سرخ چوک کے داخلے پر ایک بندر کو اپنے کاندھے پر بٹھائے دو چار روبل کے عوض غیر ملکی سیاحوں کو اس کے ساتھ تصویریں اتروانے پر مائل کر رہا ہے..ہو سکتا ہے وہ کبھی تنگ لنگ کا نہ سہی..اپنے میدان میں..سائنس، ادب، اداکاری یا موسیقی کے میدان میں ایک مہاراجہ رہا ہو..سوویت دور میں اگرچہ لاکھوں لوگ سائبیریا کے بندی خانوں میں دفن ہو گئے، آزادیٔ اظہار اور افکار کا گلا گھونٹ دیا گیا..عوام الناس کو جن بے پناہ وسائل سے زندگی کی سہولتیں اور بنیادی ضرورتیں مہیا کی جانی چاہیے تھیں، وہ سب دولتیں دنیا بھر کی انقلابی تحریکوں کی پشت پناہی کے لئے صرف ہو گئیں لیکن بہرطور اس دور میں فنون لطیفہ اور ثقافت کی بے پناہ سرپرستی ہوئی، مصوروں، موسیقاروں، شاعروں اور ادیبوں کی توقیر ہوئی، وہ مہاراجے رہے اور اب..ان میں کئی بندر کے تماشے دکھا کر پیٹ پالتے تھے..

چنانچہ چند ہفتوں میں سمیل کے درختوں کے اس ذخیرے نے بھی اس بڑی تبدیلی سے دوچار ہو کر کٹ جانا تھا..

ظہیر الدین کی مضبوط ڈھانچہ ماسکووچ کارفٹ پاتھ کے گلے لگ کر ہچکیاں بھرتی خاموش ہو گئی..وہ دراصل مائی بوڑھیوں سے مشورہ کرنے آیا تھا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں..میری بیوی گالینا ایک وہیل چیئر پر پڑی مجھے کوستی رہتی ہے..بیٹا بورس نکھٹو ہے اور سویٹ لانا گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے برہنہ بدن کی نمائش کرتی ہے..تم ہی میرے لئے کسی راستے کا تعین کر دو کہ میں کیا کروں..

اس روز موسم سرما کی شدت کی کاٹ کا آغاز تھا اور سمیل کے درخت لب وا نہ کرتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک مائی بوڑھی بھی جنم نہ لیتی تھی ان کی جڑوں کو خوف کی دیمک لگ چکی تھی کہ ہمارے دن بھی تھوڑے رہ گئے ہیں..

ظہیر الدین اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے ایک کچھوے کی مانند اپنی گردن کوٹ میں سکیڑتا، ٹھٹھرتا

بہت دیر تک منتظر رہا اور تب سگارین کے نقرئی مجسمے کے قریب فٹ پاتھ کے کناروں پر سمیل کے درختوں کا جو جزیرہ تھا، ذرا سی ہوا کے چلنے سے جھومنے لگا اور ان میں سے کسی ایک درخت کے لب کھلے، سفید ریشوں کی بناوٹ والی ایک مائی بوڑھی نے باہر جھانکا، پھر ظاہر ہوئی، ڈولتی، ہلکورے لیتی نیچے آئی اور ظہیر الدین کی منتظر آنکھوں کے سامنے آ کر پل بھر کے لئے اپنا ڈولنا موقوف کیا.. یقیناً کائنات بھی اقرار کرتی ہے کہ ساری دنیا ہی بہاؤ میں ہے تو تم بھی اس کے ساتھ بہہ جاؤ..

''میرے باپ شمس الدین انقلابی کے کوارٹر کی دیواروں پر.. مارکس اور اینگلز کے علاوہ نمایاں ترین تصویریں لینن کی تھیں جن کے ساتھ..ان کے زیر سایہ میں نے اپنا بچپن گزارا..وہ نظریاتی خدا تھے تو کیا ان میں سے ایک خدا کو میں فروخت کرنے والا ہو جاؤں..''

''اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ظہیر.. بہہ جاؤ۔''

ہولے ہولے اُسے اندھیرے کی عادت ہو رہی تھی..

ارباط سٹریٹ کے آخری مکان کے برابر میں اترتی سیڑھیوں کے آخر میں جو ایک اندھیارا مجسموں کا عجائب گھر تھا، وہ کسی حد تک اسے بجھائی دینے لگا تھا..سارے چہرے..اُن کی ناکیں، پی کیپس، فرنچ کٹ داڑھیاں، فراخ ماتھے اور ٹائیوں کی بھدی اور موٹی گرہیں، سب کی سب ایک جیسی تھیں وہ سب ایک تھے..

کوئی زمانے تھے جب ان کے قدموں میں پھول چڑھاوے چڑھتے تھے..اس کے بوٹوں کے قریب گلدستے رکھ کر وہ اپنے اس نظریاتی خدا کو آبدیدہ نظروں سے اطاعت میں سر جھکائے دیکھتے تھے اور پھر اکڑ کر اس کے حضور ایک سرخ سلام پیش کرتے تھے..وہ بے انت لوگ جو تہہ دل سے اس کی مداحی میں فنا اسے ایک مسیحا سمجھتے تھے..اور اس کی بے پناہ جاں نثار مقبولیت میں کچھ شک نہ تھا..وہ ذلتوں کے مارے لوگوں کے دلوں میں قیام کرتا تھا تو وہ سب لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی روس کے شاہی زاروں، زار یناؤں اور ان کے خاندان کے متکبر افراد کو..جن کے جور و ستم اور عوام کو جانوروں سے بھی بدتر حالت میں ذلت کے گڑھوں میں دھکیلنے والوں کو..جنہیں انقلابیوں نے ہلاک کر کے ایک گڑھے میں دبا دیا تھا تو کبھی وہ گڑھا کھود کر ان کی ہڈیاں برآمد کر کے انہیں زریں اور پھولوں سے لدے تابوتوں میں سجا کر نہایت عزت و احترام سے، تزک و احتشام سے ایک گرجا گھر میں دفن کیا جائے گا..

وہ اہل جبر جو دفن کئے جا چکے تھے، ان کی ہڈیاں سرمایہ دارانہ نظام کی صورت میں پھر سے ان کی قسمتوں کے فیصلے کرنے کے لئے نمودار ہو گئی تھیں..تو وہ بھی ایک بہاؤ میں تھیں..بے شک وہ بہت احتیاط سے قدم رکھتا بچے بچے چلتا تھا پھر بھی فرش پر اوندھے پڑے کسی مجسمے سے ٹھوکر لگ جاتی..اور وہ مجسمہ اس کی ٹھوکر سے گویا ہونے لگتا..کہ ذرا ٹھہرو..میرا کاسۂ سر اگر تمہارے پاؤں کی زد میں آیا ہے تو ذرا ٹھہرو..کچھ توقف کر لو..اگر تمہارے گندھارا کے خطے میں جہاں گئے زمانوں میں مہاتما بدھ کے پجاریوں نے سترہ ہزار سے زائد خانقاہیں اور راہب خانے تعمیر کئے..ان میں سے کچھ تو پورے شہر تھے..اور ان میں زندگی کرنے والے لاکھوں لوگ اور راہب بھی تو اس یقین کے اسیر تھے کہ ان کا عقیدہ، ان کا نظام اور ان کا سدھارتھ رہتی دنیا تک نروان اور آخری سچ کا علمبردار رہے گا..اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ کوئی اور سچائی اور کوئی راہبر جنم لے تو ذرا غور کرو..وہ

سب کچھ نابود ہو گیا..آج ان کھنڈروں میں جہاں طہارت اور سینکڑوں دعاؤں کے بغیر کوئی قدم نہ رکھتا تھا، بچے کرکٹ کھیلتے ہیں اور مقامی لوگ اپنے ازار بند کھول کر اپنے آپ کو فارغ کرتے ہیں..مہا تما بدھ نہ صرف متروک ہو گیا بلکہ وہاں طالبان آ گئے جنہوں نے اُس کے بامیان کی چٹانوں میں ہزاروں برسوں سے ایستادہ عظیم مجسموں کو مسمار کر دیا..کہ مسمار کرنے والے بھی اسی یقین کے اسیر تھے کہ ان کا سچ ہی آخری سچ ہے..تو ذرا غور کرو کہ اگر ایک مہا تما بدھ کے مجسمے وقت کی گزران تلے روندے جا سکتے ہیں تو میں..ولادے میر لینن..تو محض ایک انسان تھا..میں نے تو کبھی نہ مہا آتما کا..نہ خدائی اور نہ پیغمبری کا دعویٰ کیا لیکن میں نے کم از کم ایک کمزور، ایک دہقان، ایک پسے ہوئے ذلتوں کے مارے انسان کو عزت نفس کے ایک تخت پر بٹھانے کی کوشش تو کی..تم میرے نیت پر شک نہیں کر سکتے کہ میں نے سعی تو کی..تو کیا برا کیا؟..اگر آج میرا اوندھا پڑا چہرہ تمہارے پاؤں کی ٹھوکر میں آ گیا ہے تو مجھے کچھ غم نہیں..اگر خدا اور پیغمبر بالآخر متروک ہو جاتے ہیں کہ ان کی جگہ اور خدا اور پیغمبر آ جاتے ہیں تو اگر ایک انسان متروک ہو جاتا ہے تو کیا غم..تم میرے مسمار بدن پر سے بغیر کسی احساسِ جرم کے گزر جاؤ کہ ساری دنیا بہاؤ میں ہے، تم بھی بہہ جاؤ..

''میں بھی؟''

''ہاں کیوں نہیں..تم بھی..''

''میرا باپ شمس الدین انقلابی..تمہارا شیدائی اور پجاری تھا..ہمارے کوارٹر کی دیواروں پر تمہاری تصویریں ثبت تھیں..تو میں بھی..''

''صرف تمہارے بوریوالہ کے کوارٹر میں ہی نہیں دنیا بھر کے لاکھوں عُسرت زدہ مکانوں اور جھونپڑیوں میں میری تصویریں تھیں، اس آس میں کہ کبھی ہم بھی..ہم جو خلق خدا ہیں راج کریں گے..تم بھی ظہیر الدین..''

''میں بھی..جب کہ ساری دنیا ہی بہاؤ میں ہے..میں بھی بہہ جاؤں..''

''ہاں..اس کے سوا کوئی چارہ نہیں..''

اس اوندھے پڑے مجسمے کی گویائی یکلخت گنگ ہوئی اور وہ پھر سے بے جان ہو گیا۔ظہیر الدین اس کی خاموشی کے احترام میں کچھ دیر سوگوار رہا اور پھر اس کے وجود کو پار کر کے دوسری جانب قدم رکھا اور تب اس تہہ خانے کے اندر..ارباط سٹریٹ کے آخری مکان کے پہلو میں سے اترتی جو سیڑھیاں بجلی منقطع ہو جانے سے اندھیرے میں ڈوبی ہوئے ایک تہہ خانے میں گم ہوتی تھیں، وہاں اسے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں میں سینکڑوں سرگوشیاں اترتی ہیں..وہاں جتنے بھی، بیشتر اپنی بنیاد پر ایستادہ اپنے پاؤں پر کھڑے..کچھ ترچھے ہو کر گرنے کو، کچھ منہ کے بل پڑے..اور کچھ سر بلند جتنے بھی ولادے میر لینن کے سینکڑوں مجسمے تھے، پتھر..تانبے یا لوہے کے مجسمے اس اندھیرے میں پڑے تھے ان سب کے ہونٹ حرکت میں تھے..لرزش میں تھے..اگرچہ ابھی ابھی انہوں نے اسے بہہ جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن پھر بھی وہ شکایت کر رہے تھے..

تم بھی ظہیر الدین..

تم بھی بروٹس..

●○●○●○●

میں تب سے یہاں ہوں..

جب رات گہری ہو رہی تھی.. بلند حفاظتی فصیلوں اور مقدّس گنبدوں کو منوّر اور مخمور کرتی تیز روشنیاں ایک ایک کر کے گُل ہوتی جا رہی تھیں اور وہاں.. ہیرامنڈی کے محلّے کے آخر میں وہ ایک مکان جس میں کبھی گھنگھرو چھنکتے تھے اور اب ایک ریستوران تھا جس کے ویٹروں کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی طشتریوں میں سجے مشروبات کے گلاس کھنکتے تھے تو وہاں اُس کی چھت پر بیٹھے ہوئے میں اسی سوچ میں مبتلا تھی کہ آج کی شب کہاں بسر ہوگی.. اگرچہ میں تشویش میں نہ تھی کہ ایک جپسی کے لئے یہ ایک معمول ہے کہ اُسے آخری لمحوں تک کچھ خبر نہ ہوتی کہ وہ آج کی رات کہاں گزارے گی.. اور چھت کے کونے میں جو ممٹی بلند ہوتی تھی اس پر جو نوجوان چُہلیں کر رہے تھے وہ اب اونگھ رہے تھے، اس آس میں کہ یہ اکیلی یورپی لڑکی شاید ہم سے رابطہ کر لے.. اور میں اپنی گٹار سینے سے لگائے یہی آرزو کر رہی تھی کہ وہ اگر میرے لئے کہیں شب بسری کا بندوبست کر دیں تو میں اس پیشکش کو قبول کر لوں گی اور مجھے امید ہے کہ اُن کی نیت بُری نہیں ہوگی، وہ مجھ سے میرے جپسی گیتوں کے سوا اور کسی شے کی توقع نہیں کریں گے.. اگر کریں گے تو انہیں شدید مایوسی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مایوس ہو کر طیش میں آ جائیں اور مجھے اُس گھر یا ریسٹ ہاؤس یا کسی فلیٹ سے باہر نکال دیں.. ایسا میرے ساتھ ہو چکا ہے..

اور ایسا اب بھی ہو گیا..

میں نے کھلے دل سے اُن کی پیشکش قبول کر لی کہ میں انسانی ہمدردی اور یگانگت پر یقین رکھتی ہوں.. وہ تینوں نوجوان اگرچہ منرل واٹر کی وجہ سے تھوڑے سے مستی میں تھے لیکن وہ بے حد خوش اخلاق اور مہذب تھے.. میرے احترام میں میرے آگے پیچھے ہوتے تھے.. وہ مجھ سے میرے آبائی وطن کے بارے میں پوچھنے لگے.. کہ میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں اور کیوں آئی ہوں لیکن وہ بے حد معصوم تھے.. وہ بمشکل ہنگری کے نام سے آگاہ تھے لیکن وہ اس کے حدود اربعے سے قطعی طور پر ناواقف تھے.. یہ تو جانتے ہی نہیں تھے کہ وہاں بوداپیسٹ نام کا بھی کوئی شہر ہے جس کے درمیان میں نیلا ڈینیوب بہتا ہے اور اس کے کناروں پر جو کثیر المنزلہ عمارتیں ہیں، ان میں سے کسی ایک کی بالکونی میں میرا باپ مصطفےٰ اسلام ہر شب بیٹھتا ہے اور ایک فاتر العقل شخص کی مانند نیچے بہتے ڈینیوب کو تکتا جاتا ہے..

اگرچہ میں نے انہیں بڑے فخر سے بتایا لیکن وہ قدرے مایوس ہوئے جب میں نے انہیں بتایا کہ میرا دادا اسی شہر میں کسی شاہ عالم مارکیٹ میں جوتوں کا بیوپاری تھا اور میں اس کے انقلابی بیٹے مصطفےٰ اسلام کی اکلوتی اولاد ہوں اور اس لئے میں جینا اسلام ہوں اور مجھ میں لاہوری خون دوڑتا ہے.. بلکہ وہ کسی حد تک خوفزدہ ہو کر احتیاط پسند ہو گئے اور مجھ سے

پوچھنے لگے کہ کیا میں پنجابی جانتی ہوں.. کیونکہ وہ آپس میں اسی زبان میں کچھ مشورے کر رہے تھے.. ویسے اس دوران وہ نہایت بااخلاق اور عمدہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے یہاں تک کہ میرے برابر میں آ بیٹھنے والا نوجوان جو عمر میں مجھ سے کہیں چھوٹا تھا، ذرا سمٹ جاتا جب کبھی میری رانیں اس کے بدن سے چھو جاتیں..

پرانے لاہور سے خاصے طویل فاصلے پر ڈیفنس کے نئے علاقے کے آخری کونے میں جہاں بے حد تاریکی تھی، فلیٹوں کی تین چار نوتعمیر شدہ عمارتیں تھیں جو ابھی تک کرایہ داروں کی منتظر خالی پڑی تھیں اُن میں سے ایک کی تیسری منزل پر واقع تاریک راہداری کے آخر میں جو فلیٹ تھا، اُس کا دروازہ کھول کر انہوں نے جانے کیوں نروس ہو کر کہا کہ آپ یہاں رات گزار سکتی ہیں..

میری شکرگزاری کی کوئی حد نہ تھی..

پاکستان کی مہمان نوازی کی میں بے حد معترف تھی، خاص طور پر پاکستانی نوجوانوں کی جو میری پذیرائی میں بچھے جاتے تھے..

اُس دو کمروں کے مختصر فلیٹ کی آرائش اور بے ترتیبی اور اس میں جمع دھول سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کسی کا ٹھکانہ نہیں ایک عارضی پناہ گاہ ہے۔

وہ اتنے مہربان اور پُرخلوص تھے کہ میں نے خود سے پیشکش کی کہ میں انہیں اپنی گٹار پر کچھ خانہ بدوش قدیم گیت سناؤں اور وہ میری توقع سے بڑھ کر پُر اشتیاق ہو گئے.. بلکہ ان میں سے ایک نے معذرت کرتے ہوئے میری اجازت سے ایک مقفل کپ بورڈ میں سے سکاچ وہسکی کی ایک میگنم سائز کی بوتل نکالی اور دوبارہ معذرت کر کے اپنے گلاس لبریز کر لیے.. مجھے کبھی بھی شراب سے شغف نہیں رہا.. کبھی کبھار کسی پُرتکلف ڈنر کے دوران ایک آدھ گلاس وائن کا.. یا پھر بیئر کا ایک ٹین..اور میری بادہ نوشی کی سرحدیں یہیں تمام ہو جاتی ہیں..لیکن جب انہوں نے قطعی طور پر اصرار نہ کیا بلکہ ایک الفت بھری درخواست کی تو میں نے ان ہمدرد لوگوں کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور وہسکی کے کچھ گھونٹ بھر لئے.. میں اپنے آپ میں مگن..ایک گہرے استغراق میں آنکھیں بند کئے نہایت انہماک سے اپنی گٹار کی تاروں کو چھوتی خانہ بدوشوں کی کسی آخری شب کے پڑاؤ کی اداسی میں ڈوبا ایک گیت گا رہی تھی..لیکن میں جب کبھی اپنے انہماک سے باہر آ کر اپنے گیت کے تاثرات ان کے چہروں پر دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولتیں تو ان تینوں کی لال گلال آنکھوں میں مجھے کہیں بھی اپنی موسیقی کی روح نظر نہ آتی بلکہ وہاں ایک سرخ ہوس بھری ہوئی نظر آتی..

اور پھر وہی ہوا جو کبھی کبھار میرے ساتھ ہو جایا کرتا ہے..

یہ کیا ہے کہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام مشرقی ملکوں میں..وہ ترک ہوں یا ایرانی آپ کو ایک انسان کی صورت میں نہیں ایک بدن کی صورت میں دیکھتے ہیں..وہ نہ تو آپ کے ساتھ کسی سنجیدہ فکری بحث میں الجھ سکتے ہیں، نہ ہی اطمینان سے آپ کا نکتۂ نظر سن سکتے ہیں۔بس آپ کے بدنی تناسب کو گھورتے چلے جاتے ہیں..اُن میں سے بیشتر کے تخیل میں اگر ایک عورت گوری ہے..تو بلاشک و شبہ ایک آسان اخلاق باختہ شکار ہے، ایک جنسی مشین ہے جسے کسی بھی

وقت ذرا بہلا پھسلا کر چالو کر کے استعمال میں لایا جا سکتا ہے..

اور پھر وہی ہوا..

میں اُن کی شرافت کی قائل اس لئے ہوگئی کہ وہ پُر تشدد نہ ہوئے، زبردستی پر نہ اتر آئے اور ایسا کر لیتے تو میں اُن کا کیا بگاڑ سکتی تھی بلکہ میں جب قطعی طور پر رضامند نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی عمدہ اخلاقیات اور ہمدردی یکسر ترک کر کے مجھے اُس فلیٹ میں سے باہر نکال دیا..

تو میں اپنی گٹار اور سامان کے تھیلے کے ساتھ اس عمارت کے آگے جو فٹ پاتھ تاریکی میں تھا وہاں.. بے آسرا بیٹھی ہوں..اور میں اب بھی نہ تو تشویش میں ہوں اور نہ ہی میرے اندر کوئی خوف یا گھبراہٹ ہے کہ ایک جپسی کی حیات میں کبھی کوئی دائمی آسرا نہیں ہوتا، وہ کھلے آسمان تلے رات بسر کر سکتی ہے..اور پھر مجھے خیال آیا کہ نہیں میں اسی شہر میں.. اپنے باپ کے شہر میں اتنی بے آسرا نہیں ہوں، یہاں میرا ایک آبائی ٹھکانہ ہے..

میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک تنگ گلی ہے جس کی خستہ پرانی اینٹوں کے فرش کے درمیان میں سے کچھ کونپلیں پھوٹتی ہیں اور وہ بڑھتی ہوئی ہریاول کا ایک سمندر ہو جاتی ہیں اور میں ایک قدیم گھر میں داخل ہو رہی ہوں جس کے ایک کمرے کی کھڑکی کے رنگین شیشوں میں سے تیز روشنی داخل ہو رہی ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سرخ خواب میں تبدیل ہو جاتی ہے..یہ وہی خواب تھا جس کے تعاقب میں میں یہاں تک چلی آئی ہوں..

اُس گھر میں میرا باپ مصطفےٰ اسلام پیدا ہوا تھا..

اور میں جینا اسلام اُس کی وارث ہوں..میرا موروثی حق ہے اُس پر..میں بے آسرا نہیں ہوں..

اُس شب..جدید پُر آسائش گھروں اور چوڑی شاہراہوں کی اُس بستی سے نکل کر، گٹار کاندھے پر لٹکائے، سامان کا تھیلا کمر پر بوجھ کئے پیدل چلتی..بالآخر جب میں لوہاری دروازے کے نواح میں پہنچی تو اس کے داخلے پر سر بلند مسلم مسجد سے صبح کی نماز کی اذان بلند ہو رہی تھی..پھولوں والے کھوکھوں کے آگے دیسی گلاب اور گیندے کی ٹوکریاں اتر رہی تھیں..دروازے کے باہر بند دوکانوں کے آگے چوڑے فٹ پاتھ پر ناشتے کے اوپن ایئر ریستوران کھلے تھے..مرغ چنے..سری پائے..نہاری اور حلیم کے دیگچے چڑھے تھے اور ابھی سے کچھ لوگ ان کے سامنے بیٹھے منتظر تھے..لوہاری گیٹ کے اندر بیٹھک کا تان سے آگے چوک چکلا سے دائیں جانب شاخ کرتی گلی میں حاجی نہاری کی دوکان کے باہر برتنوں، پیالوں، بالٹیوں، تانبے کی پلیٹوں اور پلاسٹک کے ڈبوں کی ایک قطار اور وہ بھی منتظر لگی ہوئی تھی کہ کب ان میں حسب استطاعت نہاری کے گھنے شوربے انڈیلے جائیں اور کب ان کے مالک اپنے تالو میں ذائقے کی کونپلوں کو اس کے تیز مصالحوں سے سینچ سکیں..اور اس قطار کے برابر میں ایک گندی نالی کی غلاظت اتنی گھنی تھی کہ رواں نہ ہو سکتی تھی..

میں تب سے یہاں ہوں کوچہ کمانگراں کے ایک قدیم مکان کے اُس کمرے میں جس کی کھڑکی میں سے ایک سرخ روشنی بہتی چلی آئی تھی اور میرے باپ مصطفےٰ اسلام نے اسے ایک اچھا شگون جانا اور واپسی پر ایک کمیونسٹ ملک میں جانے کے جرم میں قید اور اذیت دیئے جانے کے خدشے کے باوجود وہ راوی کے کناروں سے اٹھ کر ڈینیوب کے کناروں تک جا پہنچا..جہاں میری ماں تھی..اگر وہ نہ جاتا تو میں نہ ہوتی.

میرے یہاں قیام کر جانے پر کوئی بھی معترض نہ ہوا.. نہ میری دو پھوپھیاں جو کوچہ تیراندازاں کے ایک سیلن زدہ اندھیرے مکان میں اپنی بیوگی کے آخری بال سفید کرتی ہیں اور نہ ہی میرے دونوں انکل بلکہ اُن سب کو اپنا یہ کبھی کا تقریباً لاپتہ بھائی مصطفےٰ اسلام کچھ زیادہ یاد نہ تھا.. اس کے باوجود وہ مجھ سے نہایت اپنائیت سے ملے بلکہ باری باری مجھے گلے لگا کر بہت روئے..

تب سے میں یہاں ہوں..

آپ شائد یقین نہ کریں کہ رات گئے اس کمرے کی اُس کھڑکی میں سے جس کے شیشے رنگین ہیں، ایک سیال سی روشنی بہتی آتی ہے اور میری گٹار کی ہر تار کو منور کر دیتی ہے.. مجھ سے آج تک ایک الجھن سلجھ نہیں سکی کہ جب کبھی کوئی خوش شکل نوجوان میرے بہت قریب آتا ہے تو وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر کہتا ہے کہ جینا.. یہ تم تو نہیں ہو سکتیں لیکن.. مجھے کچے چمڑے کی بو آئی ہے.. اور میں جانتی ہوں کہ یہ مجھی سے آتی ہے تو کیا یہ میرے جینز میں شامل ہے کیونکہ میری ماں نے بھی ایک روز یونہی دل لگی میں کہہ دیا تھا کہ جب پہلی بار میں نے اپنے آپ کو ڈینیوب کے کنارے تمہارے باپ کے سپرد کیا تھا تو مجھے اس کے بدن سے کچے چمڑے کی ایک بُو آئی تھی اور میں نے کہا تھا کہ ماما میں جب کبھی اپنے ڈیڈی کے گلے لگتی ہوں تو مجھے تو کبھی کسی بُو وغیرہ کا احساس نہیں ہوا تو ماں نے ہنس کر کہا تھا کہ صرف اس لئے کہ تم میں بھی وہی بُو چلی آ رہی ہے.. اب میں اس بُو سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہوں جو میرے جینز میں گھلی ہوئی ہے.. میں شائد اپنے اُس دادا کو زیادہ پسند نہیں کرتی جو شاہ عالم میں جوتوں کی مارکیٹ میں کاروبار کرتا تھا.. یہ اُسی کا تحفہ ہے..

میں یہاں بہت آرام سے ہوں..

مجھے یہاں کھانے پینے کے لئے کوئی باورچی خانہ قائم نہیں کرنا پڑا.. اس شہر کے اندرون کے قدامت کی شکستگی کی جانب مائل کوچہ و بازار ایک وسیع اوپن ایئر ریستوران ہیں جہاں سے آپ تین وقت کی خوراک اور وہ بھی نہایت ارزاں حاصل کر سکتے ہیں.. ویسے تو ہر دو قدم پر صبح سویرے بڑی بڑی کڑاہیوں میں اُبلتے غلیظ سے تیل میں میدے سے بنی روٹیاں گھما گھما کر پھینکی جاتی ہیں اور وہ ہولے ہولے پھولتی اُس تیل کو جذب کرتیں نہایت خستہ اور خوش ذائقہ ہو جاتی ہیں لیکن میں چند روز میں جان گئی کہ اگر میں نے ان پُوڑیوں کو جو جونکوں کی مانند تیل پی کر پھولتی جاتی ہیں، باقاعدگی سے ناشتے میں نوش کرتی رہی تو میں بھی انہی کی مانند پھول جاؤں گی.. انہیں ترک کر کے میں اب گرم قلچہ روٹی یوگرٹ کے ساتھ نہایت اشتیاق سے کھاتی ہوں.. دوپہر اور رات کے کھانے کے لوازمات تو اتنے پُرتکلف اور منہ میں پانی بھر لانے والے ہوتے ہیں کہ آپ کو چناؤ کرنے میں دشواری پیش آتی ہے.. مرغ چنے.. بونگ.. ہریسہ.. سری پائے.. بریانی اور اسی نوعیت کی درجنوں لاہوری خوراکیں جو مجھے یقین ہے کہ آپ کا کولیسٹرول بڑھانے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہیں.. ڈیفنس کے اُس ناخوشگوار تجربے کے بعد جب میں نے یہاں اس کمرے میں ڈیرے ڈال دیئے تو مجھے حیرت ہوا کرتی تھی کہ میری دونوں پھوپھیوں سمیت اندرون شہر کی بیشتر عورتیں جاپان کے سومو پہلوانوں کی مانند فربہ اور پھیلتی ہوئی کیوں ہوتی ہیں.. یہ اسی لاہوری کوزین کا کرشمہ ہے.. میں اپنی اس زندگی سے بے حد مطمئن ہوں..

کوچہ کمانگراں اور اس سے متصل گلیوں بازاروں کے لوگ مجھے اب پرایا نہیں سمجھتے، وہ جان چکے ہیں کہ میں نسلاً

ایک لاہورن ہوں.. بلکہ وہ مجھے پیار سے جینا کی بجائے گوری گوری کہتے ہیں بلکہ ایک خاص ردھم میں کہتے ہیں جو مجھے اتنی سریلی لگتی ہے کہ میں نے اپنے استاد جی شبیر حسین کی مدد سے ایک گیت ''گوری گوری'' اپنی گٹار پر کمپوز کیا ہے.. اُن کا کہنا ہے کہ اس دھن کی بنیاد ایک پرانا فلمی گیت ہے.. گوری گوری.. او بانکی چھوری.. کبھی میری گلی آیا کرو.. لیکن انہوں نے اس میں کلاسیکی رنگ شامل کر کے اسے ذرا مختلف کر دیا ہے.. آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ استاد جی کون ہیں جن کا تذکرہ میں بار بار کرتی ہوں..

اسی لوہاری دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بائیں ہاتھ پر بیٹھک کاتباں کے تقریباً سامنے میں نے ایک شکستہ، بوسیدہ مکان میں سے گلی پر اُمڈتے ایک محرابی جھروکے پر ایک بورڈ.. اور وہ بھی کچھ کم زمانوں کا مارا ہوا نہ تھا، دیکھا، جس پر ایک بگل اور کلارینٹ کی بھدی پینٹنگ کے نیچے انگریزی میں ''بابو بینڈ'' لکھا ہوا تھا.. اگرچہ Band کے ہجے غلط تھے یعنی Bande... مجھے بے حد تجسس ہوا کہ آخر وہاں کون رہتا ہے جو موسیقی سے شغف رکھتا ہے..

پہلی منزل تک جاتی سیڑھیاں اتنی تنگ اور عمودی تھیں کہ میں متعدد بار لڑکھڑا گئی.. اور وہاں استاد جی تھے ایک عُسرت زدہ چیتھڑوں میں لپٹے سیلن زدہ نیم تاریک ماحول میں ایک بوڑھے آسیب کی مانند اور وہ اُس لمحے ایک پرانی کلارنیٹ کے ساتھ منہ لگائے، اپنے پچکے ہوئے گال پھلاتے اس میں اپنی ناتواں پھونکیں مارتے.. ایک عجیب ماتمی سی موسیقی برآمد کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو ہلکان کرتے تھے.. مجھے یکدم اپنے سامنے پا کر ان کے پھولے ہوئے گال پچک گئے اور وہ میرا استقبال کرنے کی خاطر قدرے دِقت سے اٹھ کھڑے ہوئے.. وہ مجھے جانتے تھے.. گوری گوری..

آپ سبھی جو میری اس روئیداد کو پڑھ رہے ہیں، آپ لاہور کے رہنے والوں اور ان کے میوزیکل ورثے سے آگاہ تو نہیں ہیں تو میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اس شہر میں ایک روائت تھی کہ شادی بیاہ کے موقع پر جب دولہا گھوڑے پر سوار ایک عربی رقاصہ کی مانند اپنے چہرے پر پھولوں کا نقاب ڈالے اپنی دلہن کے گھر کی جانب روانہ ہوتا تھا تو اس کے اور باراتیوں کے آگے آگے فرانسیسی جرنیلوں کی بوسیدہ جھالردار وردیوں میں ملبوس موسیقار دھنیں بجاتے چلتے تھے اور باراتی ان پر نوٹ نچھاور کرتے تھے، یہ سب عوامی موسیقار اب کب کے بیکار ہو چکے تھے.. اس شہر کی گلیاں اور بازار کثرتِ آبادی اور غیر قانونی تعمیرات کی وجہ سے اتنے گھنے ہو چکے تھے کہ ان میں سے کسی بارات کا گزرنا محال تھا اور دولہے بھی گھوڑے کی بجائے ٹیوٹا کاروں کو ترجیح دیتے تھے.. موسیقی کے لئے پاپ موسیقی بجانے والے بے سُرے اور بے وجہ ادھم مچانے والے بینڈز کو پسند کیا جاتا تھا.. تو یہ شادی بیاہ کے روائتی لاہوری بینڈز کب کے دفن کئے جا چکے ہیں.. اگر وہ ابھی تک کہیں نہ کہیں سسک رہے تھے تو اس لئے کہ انہیں کبھی کبھار کسی نزدیکی گاؤں سے بلاوا آ جاتا تھا.. یا پھر کبھی ساہیوال یا فیصل آباد میں منعقد ہونے والے کسی میلہ مویشیاں میں بلا لیا جاتا تھا اور کبھی بیلوں کی دوڑ یا کتوں کی لڑائی کے پس منظر میں موسیقی برپا کرنے کی دعوت آ جاتی ہے.. لیکن کبھی کبھار.. وہ جو بچے کھچے بینڈ موسیقار تھے، وہ مکمل طور پر اس پیشے کو تیاگ نہیں سکتے تھے کہ موسیقی ان کے رگ وپے میں رچی بسی تھی.. وہ اسے کل وقتی پیشے کے طور پر بھی اختیار نہیں کر سکتے تھے اس لئے ان میں سے اکثر ایسے تھے جو چھابڑی فروش، تنور چی، حجام یا مزدور تھے جو لمحہ بھر کے نوٹس پر اپنی پھٹی ہوئی وردیاں زیب تن کر کے، ساز سنبھالتے، بہت جذباتی اور پُرمسرت ہوتے بینڈ کے اڈے پر پہنچ جاتے.. صرف استاد جی تھے جو فل ٹائم تھے اور

بینڈ ماسٹر کہلاتے تھے..

وہ قدرے غلیظ تھے اور اکثر مشرقی موسیقاروں کی مانند چرس کے دو چار سگریٹ پھونکے بغیر اپنے ساز کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے لیکن میں نے اُن کے اندر ایک صوفی روح پوشیدہ محسوس کی اور ان کی شاگرد ہو گئی. صرف کلارنیٹ ہی نہیں وہ جس ساز کو بھی منہ لگاتے یا اُس پر اپنی انگلیاں رکھتے اُس میں سے ایک ایسا سُر برآمد ہونے لگتا کہ ساز بھی ششدر رہ جاتا کہ کیا میرے اندر ایسے سُر بھی تھے جن کی موجودگی کی مجھے خبر نہ تھی.. بلکہ انہوں نے میری گٹار کو آغوش میں لے کر کچھ دیر اُس کی تاروں کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور کان لگا کر ان میں سے برآمد ہونے والی لَے کو غور سے سنا.. پھر تاروں کو ایک ایک کر کے ڈھیلا کیا اور دوبارہ کسا.. اور جب مطمئن ہوئے تو وہ اسے نہایت مہارت سے خانہ بدوش موسیقاروں کی طرح آسانی سے بجانے لگے اور انہوں نے اس سے پیشتر کبھی کسی گٹار کو ہاتھ نہ لگایا تھا.. اس لئے میں قائل ہوئی کہ ان کے اندر ایک صوفی روح پوشیدہ ہے جو ان کی انگلیوں میں سرائت کر کے اجنبی سازوں کے سُروں کو بھی مطیع کر سکتی ہے.. اور ان کی شاگرد ہو گئی..

وہ دیر تک اپنی بیٹھک میں سوتے رہتے.. بیدار ہو کر چرس کے چند سگریٹ پھونکتے اور پھر اگر ان کے پلّے میں کچھ رقم ہوتی تو وہ نہاری کے گھنے شوربے میں براجمان پاؤ بھر گائے کے گوشت کی خستہ بوٹی کو کم از کم تین قلچوں کے ساتھ تناول فرماتے.. سری پائے بھی ان کی مرغوب خوراک تھی اور اس کے بعد ہاتھ کی کُہنی تک آنے والا دہی کی لسی سے لبریز ایک گلاس حلق میں اتارتے اور تب ان کے رگ و پے میں سُر کا جو جہان ہوتا وہ بیدار ہو جاتا.. مجھے یہ اقرار کر لینے دیجئے کہ استاد جی نے.. جن کا اصل نام خان شبیر حسین خان کلارنیٹ والے تھا کبھی بھی اس شاگردی کے عوض مجھ سے کچھ طلب نہ کیا اور.. نہ ہی کسی بہانے، جب میں ان کے سامنے بیٹھی جپسی گیت گاتی تھی انہوں نے شاباش کہہ کر داد دینے کے بہانے میری پشت پر نیچے تک ہاتھ پھیرا.. البتہ کبھی کبھار وہ میرے دونوں ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ناتواں سینے سے لگا کر کہتے.. گوری گوری..

میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ اُن تین نوجوانوں میں سے ایک نے جو مجھ سے عمر میں کہیں چھوٹا تھا اور ریستوران میں جب کبھی میری ران اُس کی ٹانگوں سے چھو جاتی تھی تو وہ شرمندہ سا ہو جاتا تھا اُس نے کیسے میرا سراغ لگا لیا.. عین ممکن ہے کہ اُس کا کوئی دور پار کا عزیز اندرون شہر کا باسی ہو اور اُس نے کسی ایسی گوری کا تذکرہ کیا ہو جو کو چہ کماگراں کے ایک مکان میں رہائش پذیر ہے اور وہ تندور کے تھڑے پر بیٹھ کر راہگیروں کو اپنی گٹار پر جپسی گیت سناتی ہے..

وہ بے حد معذرت طلب ہوا..

اور اب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا سراغ لگانا کونسا مشکل تھا.. اُس شب میں نے ان نوجوانوں کو اپنا سیل فون نمبر جو دیا تھا.. میں بھول ہی گئی تھی..

اس لڑکے نے مجھے فون کیا اور اتنی لجاجت اور شرمندگی سے اور اپنے آپ کو مطعون کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا کہ میں پسیج گئی.. اُس نے اقرار کیا کہ یہ محض خمار تھا جس کے غلبے کے تحت انہوں نے بدتمیزی کی اور اگلی صبح جب وہ اپنے حواس میں آئے تو مارے شرمندگی کے ایک دوسرے کا سامنا نہ کر سکے.. اور پھر مجھ سے معافی مانگنے کے لئے پورے

شہر میں مجھے تلاش کرتے پھرے یہاں تک کہ اُس ریستوران میں ہر شب گئے پر میں نہ ملی تو.. میں پسیج گئی. تو کیا ایسا ممکن ہے کہ میں ایک ایسی محفل میں شامل ہو جاؤں جہاں بہت سے لوگ میری خانہ بدوش موسیقی سننے کے ازحد شائق ہوں گے.. میں انکار نہ کر سکی..

لاہور کے پیٹرن سینٹ داتا صاحب کے مقبرے کے عقب میں جہاں ایک تنگ گلی میں کاٹھ کباڑ کی دکانوں والا ایک غلیظ محلہ ہے وہاں ایک پرانے چھجے دار اور محراب دار بظاہر بوسیدہ سے مکان کی دوسری منزل پر..اور اس مکان کی درجنوں کھڑکیاں پرانی طرز کی کشش والی تقریباً ویسے ہی رنگین دانے دار شیشوں سے مزین تھیں جو میرے کمرے کی کھڑکی میں جڑے ہوئے تھے..اُس دوسری منزل تک جاتیں سیڑھیاں ایک بگولے کی مانند بل کھاتی، پر پیچ اور اتنی ناہموار کہ ان پر قدم رکھتے ہوئے باقاعدہ محسوس ہوتا کہ آپ کے پاؤں تلے جوائنٹ آ ئی ہے، وہ کھسکنے کو ہے..اور وہاں دوسری منزل پر متعدد تنگ کمرے جو آپس میں قدیم دروازوں سے ربط رکھتے تھے ایسے لوگوں سے بھرے پڑے تھے جو پیرس اور نیویارک کے معروف اور گراں ترین فیشن ہاؤسز کے ان ملبوسات اور زیورات میں تھے جو اس موسم گرما میں پہلی بار متعارف ہوئے تھے..میں نے کم از کم دولڑکیوں کو کارٹیئر اور ٹفنی ز..کے ڈائمنڈ بریسلٹس میں دیکھا..نیچے تنگ گلی میں ایک گٹر میں سے اُبل نکلنے والے سیاہ پانیوں میں..کاٹھ کباڑ کی بند ہو چکی دوکانوں کے آگے جن کے تھڑوں پر مزدور اور بیکار لوگ سکڑے پڑے تھے، ان کی جہازی سائز کی لینڈ روورز، سلور مرسیڈس کاریں اور ساتویں سیریز کی متعدد بی ایم ڈبلیوز کھڑی تھیں..ایک مختصر سے کمرے میں جس کی چھت کے شہتیر اتنے بوسیدہ تھے کہ موسیقی کی دھمک سے اُن میں سے بُرادہ گرتا تھا ایک ایسی بار سجی تھی جس میں دنیا بھر کی مشروبات کا تنوع بے انت تھا.. مجھے شک ہے کہ بوداپسٹ میں تو ہرگز نہیں، پیرس میں بھی امارت اور فیشن کی چکا چوند کا ایسا مظاہرہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہوگا..

ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تین قدامت سے بوسیدہ ہوتے کمروں میں بے فکرے نوجوان لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ سب.. بلکہ لڑکیاں حد سے بڑھتی ہوئی خمار کی اولین چلبلاہٹ میں پُرشوق اور پُرشور ہوئی جاتی تھیں..وہ تینوں جنہوں نے مجھے لوہاری دروازے سے پک کیا تھا، مجھ سے متعدد بار معافی کے خواستگار ہو چکے تھے، انہوں نے مجھے انتہائی فخر سے اس موج میں آئے ہوئے ہجوم کے سامنے پیش کیا کہ یہ ہیں جینا اسلام..

اس پر اُس مستی میں لطف لیتے ہجوم میں سے کسی نے نعرہ لگایا..اسلام زندہ باد..

مجھے یہ استقبالی نعرہ اچھا لگا کہ یہ لوگ میرے لئے ہمیشہ زندہ رہنے کی دعا کرتے ہیں.."ان کے والد لاہور کے ہیں اور والدہ ایک ہنگیرین خانہ بدوش ہیں..اگر آپ پسند کریں تو یہ آپ کو اپنی گٹار پر جپسی گیت سنا سکتی ہیں.."

اس پر سب لوگوں نے تالیاں بجائیں، کچھ نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملائے..کچھ لڑکوں نے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اور میرے گالوں پر نہایت گیلے بوسے دیئے جو ظاہر ہے ان کی جانب سے ایک محبت بھرا خوش آمدیدی اظہار ہی ہو سکتے تھے اور اس کے باوجود میرے رگ و پے میں ایک احساس تھا جو مجھے خبر کرتا تھا کہ یہ موج میلہ کرتا لاہوری ہجوم اپنے من کی موج میں ہے اور میرے جپسی گیتوں میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا، پھر بھی میں نے اپنی گٹار کی تاروں کو چھیڑنا

شروع کر دیا، اگرچہ وہ کمروں میں نصب لاؤڈ سپیکروں میں سے برآمد ہونے والی پاپ موسیقی کی دھنوں میں دفن ہوتی لگتی تھیں..

کیا آپ جانتے ہیں کہ اُس شب میں نے وہ گیت سنایا جو بلغاریہ اور رومانیہ کے طول وعرض میں مائلِ سفر خانہ بدوش جب وہ ایک مقام پر کچھ عرصہ قیام کر کے اپنے خیمے سمیٹ کر وہاں سے کوچ کرتے ہوئے اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے گاتے ہیں...

''بے شک میرے خیمے میں ہمارے وصال کی مہک ٹھہری ہوئی ہے..
تمہارے پسینے کی بُو مست کر دینے والی ہے..
وہاں تمہارے پاؤں کی تھرک بھی ہے اور بوسوں کی گیلاہٹ بھی..
لیکن..
مجھے یہ خیمہ اس مہک، بُو اور تھرک سمیت اب سمیٹنا ہے..
اس لئے کہ.. خیمے کے گرد گھاس اُگنے لگی ہے..
یہاں پڑاؤ ڈالے بہت دن ہو چکے.. ہمیں کوچ کرنا ہے..
ایک اور اجنبی سرزمین پر جا بسیرا کرنا ہے..
جو شائد مہرباں ہو یا وہ ہمیں دھتکار دے کہ..
ہمارے بخت میں دھتکار ازل سے ثبت ہے..
آخر ہم نے ان آبادیوں کا کیا بگاڑا ہے..
ہم تو بس ایک شب قیام کرتے ہیں اور کُوچ کر جاتے ہیں..
نہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں اور نہ زمین پر ملکیت جتاتے ہیں..
تو پھر ہمیں کیوں دھتکارا جاتا ہے..
ہم خیمے سمیٹ لیتے ہیں جب..
ان کے گرد گھاس اُگنے لگتی ہے...''

میں آنکھیں ایک درویش کی مانند بند کر کے ڈوب کر گائی اور جب میرا گیت ختم ہوا تو گٹار کے تاروں کو آخری بار جھنجھوڑ کر اُن سے اپنی انگلیاں جدا کر لیں..

وہ اپنی شوخیوں میں مگن تھے اور پھر وہ چونکے اور سکوت کے ایک مختصر وقفے کے بعد انہوں نے تالیاں بجا کر مجھے داد دی اور پھر.. وہ مجھ سے غافل ہو گئے.. انہوں نے مجھے اپنے دھیان سے برطرف کر دیا.. البتہ وہ کم سن نوجوان بے تابی سے پُر جوش ہو کر تالیاں بجاتا رہا..

وہ سب لاہور کے پیٹرن سینٹ داتا صاحب کے مقبرے کے پچھواڑے میں..اور کھڑکیاں اگر کھلی ہوتیں تو ان میں سے اُس صوفی کا روشن گنبد نظر آتا..وہ سب میرے وجود سے..لاتعلق ہوگئے..پُر پیچ سیڑھیوں کے آغاز میں گہرے سبز پینٹ سے لتھڑی ہوئی سیلن زدہ دیواروں والا..ایک پُر تعفن غسل خانہ تھا جہاں حاجت کے لئے کموڈ نہ تھا، انڈین بیٹھک تھی جس میں جمع شدہ گندگی فلش نہ ہوسکی تھی اور ایک بجھا بجھا سا زرد روشنی والا بلب بجھتا جا رہا تھا، وہاں میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور ایک کونے سے لگ کر اپنی گٹار کو تھپکتی دیر تک اپنی ناقدری پر آنسو بہاتی رہی..

یہ وہی شب تھی..
جب جیسا کہ بخت میں تھا مجھے دھتکار دیا گیا تھا..
میرے گیت کسی نے نہ سنے تھے..

جب..

کوچہ کمانگراں کے اُس پُر عافیت کمرے میں جس کی بجلی منقطع ہو چکی تھی اور میں روشنی کے لئے موم بتیاں جلاتی تھی، جہاں میرا باپ پیدا ہوا تھا اور بازار پر کھلتی رنگین شیشوں کے جڑاؤ والی ایک کھڑکی تھی اور میں اپنی ناقدری پر رنجیدہ اور بجھی ہوئی تھی تو اُس کھلی کھڑکی میں سے روشنی نہیں نیلاہٹ بھرے پانی نہایت دھیرے دھیرے چپ چاپ بہتے ہوئے آئے اور وہ نیلے پانی وی آنا کے والز کی نیلی دھنوں پر رقصاں اُس کھڑکی میں سے بہتے ہوئے آئے اور وہ مجھے اپنی گیلی آغوش میں لے کر میرے رنجیدہ بدن میں اترے اور میری ڈھارس بندھائی، مجھے تھپکا، مجھے دلاسا دیا..جینا دل برا نہ کرنا.. مسافتوں کے ویرانوں میں ایسے کانٹے بھرے ہوتے ہیں جو بدن میں کُھب کر تمہیں شدید کرب میں مبتلا کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ تم وہیں سے لوٹ جاؤ.. پر تم جستجو کے راستے کھوٹے نہ کرنا..اپنے ماضی سے، اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنا.. تمہارے وجود نے مجھ میں سے..ڈینیوب میں سے اپنی سانسیں کشید کیں لیکن تمہاری روح نے راوی کے پانیوں میں سے جنم لیا..وہ قدیم دریا جو کبھی پاروشنی کہلاتا تھا، اُس سے جڑی رہنا..اُس کے کناروں پر اگر مفلوک الحال اور نادار اور دھتکارے ہوئے..لیکن تمہارے قبیلے کے لوگ رہتے ہیں..ان سے رابطہ رکھنا اور نہ رنجیدہ رہنا اور نہ دل برا کرنا..کھڑکی کے دانے دار ہرے بھرے، نیلے پیلے شیشوں میں سے بھی جو پانی بہتے ہوئے آتے تھے وہ صرف ڈینیوب کے ہی نہیں، راوی کے بھی تھے..اور وہ مجھ سے فرمائش کرتے تھے کہ میں انہیں ''سبز جنگل'' نام کا جپسی گیت سناؤں اور وہ مجھے ڈھارس دیتے تھے کہ ہمارے آبی کان تمہارا گیت سنیں گے..ہمارے بہاؤ گیت کی تال کا ساتھ دیں گے..تو میں اپنی رنجیدگی سے باہر آگئی، ایک دریا مجھ سے گیت گانے کی فرمائش کر رہا تھا..

''جنگل سبز ہے..
پہاڑ بھی سبز ہیں..
بخت آتے جاتے ہیں..

ہماری راتوں کا فقیر..
ہمارے گوشت کے اندر خنجر چلاتا ہے..
دنیا کے معیار بدل چکے ہیں..
ساری دنیا ہماری دشمن ہے..
ہم مجرموں کی زندگی بسر کرتے ہیں
ہم نے کچھ بھی نہیں چرایا..
سوائے حضرت عیسیٰ کی صلیب کی چند میخوں کے..
خدا کے لئے، ہم پر رحم کرو..
تاکہ ہم خانہ بدوشوں کی بدنصیبی کا خاتمہ ہو..
تم نے ہم پر ظلم کئے..
ہمیں برباد کر کے رکھ دیا..
ہمیشہ کے لئے خانہ بدوش کر دیا..
حالانکہ..ہم نے کچھ بھی نہیں چرایا..
جنگل سبز ہے..''

●○●○●○●

آج صبح مجھے ایک دھچکا لگا اور اُس کی شدت سے میں ابھی تک سنبھل نہیں پایا..

میں نے آج صبح جمائیاں لیتے ہوئے ابھی تک نیند کی کسل مندی میں ڈوبے ہوئے اپنے چہرے کو تازہ کرنے کی خاطر اس پر خنک پانی کے چند چھینٹے برسائے اور پھر ہمیشہ کی طرح آئینے میں دیکھا تو مجھے وہ دھچکا لگا..

یہ کون ہے؟..میں نہ تھا..

میں مصطفےٰ اسلام شیخ ہوں جس نے اپنا تعارف خود کروانے کی پیشکش کی تھی کہ ایک بیٹی چاہے، وہ پچھلے دو برس سے اوجھل ہو..آپ کو یاد آ گیا ہوگا..جینا کا ایک خط آیا تھا کہ ڈیڈی میں بالآخر آپ کے شہر کی اُس گلی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں جس کی پرانی اینٹوں میں سے..میں نے خواب دیکھا تھا کہ..ان میں سے ہر یادل پھوٹتی ہے..وہ بیٹی کیسے میرے بارے میں سچ کہہ سکتی ہے، میں آج بھی..ہر شب کی طرح دسویں منزل پر واقع اپنے مختصر فلیٹ کی بالکونی میں رات کے اس پہر نشیب میں بہتے نیلے ڈینیوب کے بہاؤ پر نظریں جمائے بیٹھا ہوں..

یہ کون ہے؟..میں نہ تھا..جب میں نے چہرے پر خنک پانی کے چند چھینٹے مارے اور آئینہ دیکھا تو وہاں میں نہ تھا..وہاں ظفر وال سے لاہور منتقل ہوکر شاہ عالمی کی شو مارکیٹ میں جوتوں کا تھوک بیوپار کرنے والا مرتضےٰ اسلام شیخ تھا..وہ اکثر کنجوسی کے مارے شیو کرنے سے گریز کرتے تھے..ایک بلیڈ کو مہینوں چلاتے تھے، کند ہو جاتا تھا تو ایک سِل پر گھسا گھسا کر اُسے تیز کرنے کی سعی کرتے تھے تا آنکہ وہ باریک ہوتا بالآخر ٹوٹ جاتا تھا چنانچہ اُن کے رخساروں پر سفید بالوں کی ایک ابتری بکھری رہتی تھی..آئینے میں وہی بے ترتیب بڑھے ہوئے سفید بالوں والا چہرہ تھا..اُس کے گال ڈھیلے پڑ چکے تھے..آنکھوں کے گرد کووں کے سیاہ پنجے ثبت تھے، گردن کا ڈھلکا ہوا ماس مُردہ جونکوں کی مانند سمٹا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایک بے جان مُردنی کے آثار تھے..

تب اُس شب جب میں روجا سے ملاپ کے بعد ہوسٹل لوٹا تھا اور غسل خانے میں جا کر اپنے بدن کو ستھرا کیا تھا اور آئینے پر ایک نظر کی تھی تو وہاں میری نوخیز آنکھیں ابھی تک ہوس کے خمار میں تھیں اور میرے نوجوان چہرے پر ایک دلکش رعنائی تھی جو مجھے اپنے آپ کے عشق میں مبتلا کرتی تھی..اور اب آج صبح..یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہوگیا..ابھی کل تو ایک آئینے میں میری آنکھیں ہوس کے خمار میں سیاہ کشتیاں تھیں جو نوخیزی کے گرم مرطوب پانیوں میں ڈولتی پھرتی تھیں اور آج انہی آنکھوں میں مُردنی کے تابوت اترے ہوئے ہیں..

میں اپنے باپ جیسا نہیں ہونا چاہتا تھا..لیکن ہوگیا تھا..

اُن کی..مرتضےٰ اسلام شیخ کی شخصیت ایسی تھی کہ اگر اُس کے گرد نور کا ایک ہالہ بھی منور ہو جاتا تو بھی کوئی متوجہ نہ

ہوتا..وہ رزق روزگار کے لئے بخوشی دن رات مشقت کرتے اپنے اوپر زندگی کی ہر آسائش حرام کرتے جوتے فروخت کرتے ایک ایسے شخص تھے کہ ان کے ہوبہو ہزاروں تھے..انہی کی طرح بے ترتیب کُھردری داڑھیوں والے، چند ایک ماتھے پر محراب والے..ایسے لباسوں میں جو مسلسل استری کئے جانے سے ایک ایسی لشک لئے ہوئے تھے جیسے مردہ ہونے سے پیشتر ایک شخص کا چہرہ کچھ دیر کے لئے چمک اٹھتا ہے..ضروریات زندگی کے لئے بھی جیب میں سے رقم نکالتے ہوئے ان کے چہرے زرد پڑ جاتے..اُن سب کی شکل ایک تھی..الگ سے شناخت مشکل تھی..

میں اُن جیسا نہیں ہونا چاہتا تھا..لیکن آج صبح آئینے میں..میں نہ تھا میرے ابا جی تھے، میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب کسی بھی آئینے کے سامنے جانے سے گریز کروں گا..چلئے میں مقدور بھر کوشش تو کروں گا کہ میری نگاہ کسی آئینے پر نہ جائے لیکن میں کوچہ کمانگراں کے اُس گھر کے کمروں میں ذخیرہ شدہ جُوتوں کے کچے چمڑے کی بُو کا کیا کروں جو میرے ساتھ چلی آتی ہے..میرے بدن میں رچی ہے..

روجا نے بھی اُس شب سرد ہوتے، سانس سنبھلتے ہی پہلا سوال یہی کیا تھا..''مصطفیٰ..کہیں سے کچے چمڑے کی بُو آ رہی ہے..''

میں آپ کو الزام نہیں دوں گا اگر آپ اب تک اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ میں ایک ناکارہ اور نکھٹو شخص ہوں..جو یونہی ہر شب بے سبب اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھا رہتا ہے..ایسا ہرگز نہیں ہے..روجا جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں بوداپسٹ یونیورسٹی سے ابلاغیات کی ڈگری حاصل کر کے ایک اخبار میں فیچر رائٹر کے طور پر کام کیا کرتی تھی..مجھے بھی..اس کے باوجود کہ میری فلسفہ کی تعلیم اس لئے ادھوری رہ گئی تھی کہ میں واپس لاہور نہیں گیا تھا مجھے مشرقی علوم پر تحقیق کرنے والے ایک پروفیسر کے نائب کے طور پر مناسب ملازمت مل گئی تھی....اس کے بعد مختلف نوعیتوں کی نوکریوں کا ایک سلسلہ ہے جس کی تفصیل میں جانے سے کچھ فائدہ نہیں لیکن ہم دونوں بخوبی گزر اوقات کرتے رہے..کمیونسٹ حکومت بھی کسی حد تک میرا دھیان رکھتی تھی..پھر یکدم بساط الٹ گئی..کمیونزم اور روس کے خلاف بہت سے دلوں میں ایک لاوا اُبل رہا تھا جو ہنگری میں بغاوت کی صورت میں پھٹ پڑا تھا لیکن روسی فوجی قہر اور سینکڑوں ٹینکوں نے اُسے کچل کر رکھ دیا..یہ میری یہاں آمد سے پہلے کے قصے ہیں..تو جونہی کایا پلٹ گئی، ہنگری بھی یکدم یوں آزاد ہو جانے پر ششدر رہ گیا..تو ہم دونوں..اگرچہ روجا کبھی بھی کمیونسٹ نہیں رہی تھی اور میں تو رہا تھا لیکن اس کے باوجود ہم دونوں ہی گویا سڑک پر آ گئے..بے آسرا اور بیکار ہو گئے..تقریباً دو برس خاصی تنگی ترشی میں گزرے اور پھر روجا کی بدترین حالات میں بھی بددل نہ ہونے اور زندہ رہنے کی..دنیا کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہو جانے کی خانہ بدوش خصلت نے ہمیں بے سروسامانی اور عُسرت کی اس دلدل سے نکال لیا..

کمیونزم سے نجات حاصل کرنے والے دیگر ملکوں کی مانند ہنگری میں بھی اور خاص طور پر بوداپسٹ میں یورپی اور امریکی سیاحوں کی یلغار شروع ہو گئی اور ان کے چہروں پر اپنے سرمایہ دارانہ نظام کی فتح کا ایک تکبر ہوتا..وہ پہلے دو تین برس تو جھجکتے رہے، احتیاط کرتے رہے کہ وہ ہمیں اپنی طرح کے انسان نہ سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ کمیونسٹ نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے سب لوگ میکانکی روبوٹ ہیں اور ان کا کچھ اعتبار نہیں..پھر آہستہ آہستہ انہیں شک ہونے لگا کہ نہیں یہ بھی ہم جیسے ہیں..بچے پیدا کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں، خوش ہوتے ہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور ان میں سے بیشتر سیاح

ہنگری کی قدیم ثقافت اور رواجوں کی نشانیاں حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے..جن میں سرفہرست جپسی لوگوں کے ملبوسات، زیورات اور دستکاریاں تھیں..ہم دونوں نے تھوڑا بہت جو پس انداز کیا تھا اسے ڈینیوب کے کنارے سیاحوں کی ایک مرغوب گلی..میں ایک چھوٹی سی دوکان حاصل کرنے کے لئے داؤ پر لگا دیا..روجا ایک کھٹارا ویگن میں سوار رومالوگوں کی ہنگری بھر میں پھیلی خیمہ بستیوں اور عارضی رہائش گاہوں کی خاک چھاننے لگی..خانہ بدوشوں کو ہم نسل ہونے کا یقین دلاتی رہی، اگرچہ وہ اسے قبول نہ کرتے تھے کہ وہ متحرک نہ تھی، پڑھی لکھی اور بوداپسٹ میں دائمی قیام رکھتی تھی..پھر بھی وہ دیگر سفید فام ہنگیرین کی نسبت کہ وہ بھی ان بستیوں کے پھیرے لگاتے تھے، اس سے زیادہ تعاون کرتے تھے..روجا نے ان لوگوں سے..گھریلو دستکاریاں..ٹوکریاں، شالیں، گٹاریں، زیورات، پرانے برتن، قسمت کا حال بتانے والے زائچے اور گلوب، غالیچے، ان کی بھڑکیلی پوشاکیں بلکہ زیر جامہ بھی خریدے اور وہ بھی ازحد بھڑکیلے تھے..یہ سب کچھ اس دوکان میں آراستہ ہوا جسے ہم نے ''جپسی جیولز'' کا نام دیا اور وہاں ہمہ وقت خانہ بدوشوں کی اداس گٹاروں کی دھنیں بجتی رہتیں..روجا دوکانداری کے دوران ایک گھیرے دار گھاگھرے اور پھولوں والے بلاؤز میں ملبوس ہوتی اور میں..کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ مجھے بھی ایک جپسی کا روپ دھارنا پڑتا، ایک دھاری دار چوغہ پہنے اور سر پر ایک پھندنے والی ٹوپی اور ہاتھ میں ایک گٹار جسے میں بجا بھی نہ سکتا تھا..کیا ان زمانوں میں جب میں پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت کے پُرغضب کارکنوں کے سامنے سرخ پھریرے لہراتا اُن سے بھڑ جاتا تھا، یہ تصور بھی کر سکتا تھا کہ آئندہ زمانوں میں مجھے ایک تماشا دکھانے والے بندر کی مانند ٹوپی اوڑھ کر اپنا رزق کمانا پڑے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اس نوعیت کے بہروپ تو بھرنے پڑتے ہیں۔اُدھر روجا جس نے کبھی بھی قطعی طور پر قسمت کا حال بتانے والے گلوب کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا وہ اکثر سیاحوں کی فرمائش پر آنکھیں بند کر کے ایک گلوب پر جھک جاتی اور گہری آواز میں کچھ انٹ شنٹ بول کر انہیں مستقبل کی خبریں سناتی رہتی..

ہمارا یہ کاروبار دنوں میں چل نکلا..

میں یہاں آپ کو ایک نہایت خفیہ کاروباری راز سے آگاہ کرتا چلوں..''جپسی جیولز'' میں برائے فروخت جتنی بھی خانہ بدوش دستکاریاں اور نوادرات سجے تھے اُن میں سے کچھ تو واقعی ہم نے براہ راست خانہ بدوشوں سے خرید کئے تھے لیکن بیشتر ''نوادرات'' دراصل ''میڈان چائنہ'' تھے..قسمت کا حال عیاں کرنے والے گلوب..خانہ بدوش ویگنوں کے قدیم چوبی پہیے..چمڑے کے بوسیدہ سُوٹ کیس..لکڑی کے قدیم صندوق، زیورات، ملبوسات یہاں تک کہ وہ بوسیدہ خیمے جن میں خانہ بدوش قیام کیا کرتے تھے، گھاگھرے، گٹاریں..سب کے سب ''میڈان چائنہ''۔

یہی کاروبار اس لمحہ موجود تک ہمیں ایک پرآسائش زندگی مہیا کرتا ہے..

اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ ابھی کچھ روز پیشتر میری اکلوتی بیٹی جینا کا خط آیا تھا..مجھے ٹیلی فون کے رابطے سخت زہر لگتے ہیں کہ انہیں نہ تو دوبارہ سنا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں سینت سینت کر رکھا جا سکتا ہے..وہ پل بھر میں ہواؤں میں زائل ہو جاتے ہیں تو میری فرمائش پر جینا مجھے کبھی کبھار ایک تفصیلی خط تحریر کر دیتی ہے..اس کا کہنا ہے کہ اس نے اس کمرے میں جس کی رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے کبھی ایک سرخ روشنی بہتی ہوئی داخل ہوتی تھی جو کہ ایک شگون تھا، وہ وہاں بسیرا کر چکی ہے اور وہ اس محلے میں ''گوری گوری'' کے نام سے پکاری جاتی ہے، وہ بہنوں اور بھائیوں سے بھی مل چکی ہے جن

کی شکلیں مجھے بھول چکی ہیں..

اس حیات سے مجھے کیا حاصل ہوا..؟

روجا کے خراٹوں کی آواز آج کچھ زیادہ ہی بلند ہے..تھک جاتی ہے..

میں جو مذہبی جماعتوں کے باریش کارکنوں کے سامنے سینہ سپر ہوکر سرخ ہے سرخ ہے ایشیا سرخ ہے کے نعرے لگایا کرتا تھا..اپنے باپ، خاندان اور مٹی کو ترک کر کے اس اجنبی شہر میں ایک سرخ اور درخشاں مستقبل کے چاؤ میں آن بسا تھا..پلٹ جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا تو اب بالآخر میرے پلّے میں کیا ہے..ناآسودگی، آزردگی اور مایوسی کے سوا اور کیا ہے..ثروت مند ہوکر پُرآسائش حیات گزارنا تو میرا آدرش نہ تھا..

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھ میں خودکشی کا کوئی رجحان نہیں ہے..نوخیزی کے ایام میں جب ہر نوجوان خواہ مخواہ خودکشی پر مائل رہتا ہے، ذراسی رومانی شکستگی، والد کی ایک جھڑکی، امتحان میں ناکام ہونے پر..خودکشی کے منصوبے بنانے لگتا ہے اور سب سے پہلے اس آخری خط کی عبارت کے بارے میں غور و خوص کرتا ہے جو اس ظالم اور بے دید دنیا میں وہ اپنی آخری نشانی کے طور پر چھوڑ جائے گا..میرے اکثر دوست کسی نہ کسی وجہ سے خودکشی کرنے کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اگرچہ کرتے کبھی نہ تھے..لیکن میں واحد شخص تھا جو ان کے اس خبطِ پران کا مذاق اڑاتا تھا کیونکہ میرے دل میں کبھی بھی یہ خواہش نہ جاگی کہ چاہے صدمہ کتنا ہی ناقابل برداشت کیوں نہ ہو، میں اپنے آپ کو ہلاک کرلوں، کبھی نہیں! اپنے آپ کو اس خودکشی کے رجحان سے بری الذمہ قرار دینے کی خاطر اگر میں نے یہ تمہید باندھی ہے تو اس کا ایک استدلال ایک جواز ہے..

میرے دل میں ان دنوں ایک بے کلی ہے جو مجھے نیند سے دور رکھتی ہے..

اگر وہ خواب جس پر میری حیات کی بنیادیں استوار تھیں..اشتراکیت کے غلبے کا..عدل اور مساوات کے ایک بے مثال نظام کا..مزدوروں اور کسانوں کی حکمرانی کا..میری ذات کے گرد مسمار ہوکر دفن ہو چکا ہے تو پھر یہاں رہنے کا میرے وجود کا کوئی جواز باقی رہ گیا ہے..مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ ایک خودکش تبدیلی رونما ہونے والی ہے، کسی شب مجھے اس بالکونی سے اٹھ کر..خوابیدہ اور خراٹے لیتی ہوئی روجا کے قریب سے دبے پاؤں گزر کر، اپنے دسویں منزل پر واقع فلیٹ سے لفٹ کے ذریعے نہیں کہ وہ کمیونسٹ دور میں ناکارہ ہوگئی تھی اور اسے سرمایہ دارانہ نظام بھی حرکت میں نہیں لا سکا تھا، سیڑھیوں کے راستے نیچے اترنا ہے، شفیق الرحمٰن کے نیلے ڈینیوب کے پانیوں کے قریب ہو بیٹھنا ہے، اُن کے کنارے بیٹھ کر کچھ دیر اپنے کھوچکے خوابوں کا ماتم کرنا ہے اور پھر...اُن میں ڈوب جانا ہے..

●○●○●○●

تمام روشنیاں گُل ہو چکی تھیں..

اُس وسعت سے عاجز آتے ہوئے اتنے وسیع لونگ روم کی صرف ایک دیوار جو اُس کی پشت پر تھی، نابینا تھی، فلارنس کی چٹانوں میں سے نکالے گئے اُس سنگ مرمر سے تراشیدہ تھی جس میں سے مائیکل انجلو اپنے مجسمے نکالتا تھا.. بقیہ تینوں، دائیں بائیں اور عین سامنے جو دیواریں تھیں وہ دیکھ سکتی تھیں یا اُن کے پار دیکھا جا سکتا تھا کہ فرش سے چھت تک بیلجیم میں ساختہ اُس دبیز شیشے کی تھیں جس پر اگر ایک چٹان بھی آ گرے تو شاید ایک آدھ دراڑ نمودار ہو جائے پر اُن کے مسمار ہونے کا امکان نہ تھا..

ابھی ابھی.. اُس کی بیوی اینا جس کی رفاقت اُسے اس امارت تک لانے میں معاون ثابت ہوئی تھی اور دونوں بیٹے نصرت اور رانجھا اُسے شب بخیر کہہ کر، اُس کے رخساروں پر بوسے ثبت کر کے اپنے اپنے ذاتی گھروں میں جا چکے تھے..

یہ ذاتی گھر اُسی.. ماسکو سے صرف سو کلومیٹر پر واقع اُس کے ڈاچا کے رقبے میں ہی تعمیر شدہ تھے.. یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ فرصت کے ان قلیل ایام میں ہر شب اپنی بیوی کی خوابگاہ میں ہی بسر کرے.. وہ تنہا اس وسیع لونگ روم میں اپنے آپ میں گم رات گئے تک بیٹھا رہتا اور پھر یہیں کسی صوفے پر دراز ہو کر نیند پوری کر لیتا..

اُس نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنے لیل پور کے لاڈلے بُدھا نصرت فتح علی خان کا نام دیا تھا اور وہاں سے جھنگ اتنی دور نہ تھا کہ اُس تک ہیر کی پکار نہ آتی اور وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو رانجھا نہ پکارتا..

بہت دن نہیں گزرے تھے جب بے نظیر بھٹو اور اُس کا مونچھوں تلے مسکراتا شوہر آصف زرداری اُس کے ڈاچے میں مہمان ہوئے تھے.. وہ ایک دوسرے سے ناخوش لگتے تھے.. کس کے چہرے پر ناخوشی زیادہ تھی، وہ اس کا فیصلہ نہ کر سکا تھا..

پیوٹن اُس کا پڑوسی تھا..

اگرچہ اُس سے ملاقات ایک دو بار سرسری سی ہوئی تھی کہ وہ جنگل میں چہل قدمی کے لئے بھی نکلتا تو اُس کے ہمراہ اُس کے کے جی بی کے زمانوں کے جانثار محافظوں کی ایک فوج ہوتی لیکن وہ اپنے اس پاکستانی ہمسائے کی موجودگی سے آگاہ تھا اور نئے روس کی تعمیر اور ترقی میں اُس کی بھرپور شمولیت کا معترف تھا..

بہت دنوں بعد بلکہ ایک طویل عرصے کے بعد اُسے ایک ایسی شب نصیب ہوئی تھی جب وہ نہ تو کسی شاندار دعوت کا میزبان تھا اور نہ ہی مہمان.. نہ ہی کسی جیٹ طیارے میں دور دراز کی کسی کاروباری منزل تک پہنچنے کے دوران اپنی نیند پوری کر رہا تھا اور نہ ہی اُس کی قائم کردہ صنعتوں اور جائیدادوں کے اہلکار اور مشیر اُس کا گھیراؤ کرتے اپنی رپورٹیں پیش کرتے، تازہ ترین منافع بخش اعداد و شمار کی گردان کرتے تھے..

نیم تاریک ہو چکے لونگ روم کی تینوں شیشہ دیواروں میں سے وہ جنگل گھنے اور پراسرار جو اُس کی ملکیت میں

تھے وہاں تک جہاں ایک ندی کے پار پیوٹن کا علاقہ شروع ہوجاتا تھا..اوران شیشہ دیواروں کی شفافی میں سے وہ جنگل گھنے اور پُراسرار اُمڈے چلے آ رہے تھے اور اپنے ہمراہ اپنی ٹہنیوں اور شاخوں پر جو برف انبار تھے، اُنہیں بھی ساتھ لئے آتے تھے کہ برفباری کا آغاز ہو چکا تھا..لونگ روم کے سراپے میں ایک حدّت بھری آسودگی ایسی تھی کہ وہ اپنی پسندیدہ چار خانوں والی دھوتی باندھے بیٹھا تھا اور گلے میں ایک ملتانی کڑھائی والا ململ کا کُرتہ تھا..

ظہیرالدین کا شکوہ بجا تھا..

اگر وہ شکائت کرتا تھا کہ ماسکو میں یہ موسمِ سرما شدید ہوتا چلا آیا تھا اور رگوں میں گردش کرتے خون کو برف کے سُرخ ذرّوں میں منجمد کرتا تھا تو شاید وہ درست کہتا تھا..وہ تو ایک آسودہ حدّت کے کوکون میں بند زندگی کرتا تھا..اس سے باہر نکلتا تو موسم اُس پر اثر کرتا..

وہ کبھی بھی شراب کا رَسیا نہ رہا تھا..

اُن ایام میں..انقلاب کے سحر میں گرفتار، مذہب سے بیگانہ، سٹالن کو عظیم باپ ماننے کے زمانوں میں جب اس کی جیب میں جہانگیری پلاؤ کی نصف پلیٹ خریدنے کے لئے بھی مناسب رقم نہ ہوتی تھی تو اُس کے کچھ کامریڈ ادیب اور شاعر اور وہ بھی سرخ سویرے کے ڈسے ہوئے اپنے آپ کو معاشرے کی تمام قدروں سے بغاوت کرنے اور اپنے آپ کو ترقی پسند ثابت کرنے کے لئے نزدیکی دیہات سے چنگڑ اور سانسیوں کی کشید کردہ رُوڑھی برانڈ دیسی شراب خرید کر لاتے تھے اور پھر اوندھے ہوتے ہوئے بھی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے..وہ اُن کے اصرار پر ایک آدھ گھونٹ بھر لیتا تھا لیکن یہ اُس کے مُنہ کو نہ لگی، اُسے اس آتش سیال سے رغبت نہ ہو سکی..ان زمانوں میں وہ اپنی کاروباری مجبوریوں کے تحت میزبانی تو کرتا تھا لیکن ممکن حد تک شراب سے اجتناب کرتا تھا..

اور اُس کا سب سے قابل اعتماد دوست اشوک کوہلی..اُس کی رگوں میں تو خون نہیں شراب گردش کرتی تھی، وہ اتنا رسیا تھا..اور جانے کیوں نابالغ روسی لڑکیوں کی رفاقت کا بھی شراب سے بڑھ کر رسیا تھا..

اشوک کوہلی..کی خصلت میں فریب اور دھوکا دہی کی آمیزش ہی نہ تھی، لین دین کا کھرا..ایماندار اور دوستوں پر نچھاور ہو جانے والا شخص تھا..ماسکو میں صرف وہ تھا جس پر اُسے اتنا اعتماد تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے ہر اُس کاروباری دستاویز پر دستخط کر دیتا تھا جو اشوک کوہلی کی جانب سے اُس کی میز پر منتظر ہوتی تھی..

اور اس کے باوجود..ایک شب جب وہ ایک نئی دریافت کے ساتھ، ایک کچے بدن کی لولیٹا کے ساتھ جو ابھی لولی پاپ چُوسنے کی عمر سے باہر نہ آئی تھی اور وہ کچے امرود کی مہک لئے ہوئے مسرت سے سرشار ہوئی جاتی تھی کہ اُس کا اگرچہ بوڑھا لیکن ایک ارب پتی بوائے فرینڈ اُسے ایک ایسے ڈاچا میں شب گزارنے کے لئے لے جا رہا ہے جس کے برابر میں صدر پیوٹن کا ڈاچا ہے تو وہ..وارث چودھری حائل ہو گیا تھا..نہیں اشوک تم اِسے بے شک ہمارے مشترکہ ملکیت کے کسی فائیوسٹار ہوٹل کی پریذیڈنشل سویٹ میں لے جاؤ لیکن یہاں نہیں..میں اس کی جانب دیکھتا ہوں تو یہ لولیٹا، مجھے اپنی وہ بیٹی دکھائی دیتی ہے جو میرے نصیب میں نہ آسکی..

اگرچہ وہ رسیا نہ تھا لیکن آج کی بیش قیمت شبِ تنہائی میں جب کہ تینوں شیشہ دیواروں میں سے برف بھرے

جنگلوں کی سفیدی اُمڈتی آتی تھی تو برابر کی تپائی پر رائل سیلوٹ وہسکی کا گلاس دھرا تھا جس کے شفاف کرسٹل میں ایک زرد آگ جھلملاتی تھی۔رات کے اُس پہر میں جب روشنیاں گُل ہو چکی تھیں، شیشہ دیواروں میں سے برف بھرے شجروں کی سفیدی یوں یلغار کرتی تھی کہ وارث چوہدری جس کی رنگت گندمی تھی، وہ بھی اُس کے زیر اثر چٹا سفید ہو رہا تھا..

اگر اُس کی ملکیت کے اُن جنگلوں میں پوشیدہ کچھ غزال تھے..اور وہاں تھے..تو وہ بھی رائل سیلوٹ کے متعدد گھونٹوں کے بعد لگتا تھا کہ چوکڑیاں بھرتے لونگ روم میں داخل ہو رہے ہیں..اے غزالِ شب..اے غزالِ شب..

اُس نے اپنی چارخانہ دھوتی کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنے تقریباً ناکارہ ہو چکے چپکے ہوئے مقامات کو ذرا بدن سے جدا کیا اور ظہیر الدین کے لئے رنجیدہ ہو گیا..وہ ایک معصوم شخص تھا، اس بڑھاپے میں بھی اپنے خوابوں سے باہر آ کر مفاہمت پر راضی نہ ہوتا تھا، سمیل کے درختوں میں سے پھوٹنے والی مائی بوڑھیوں کا تعاقب کرتا رہتا تھا..اور اپنے آپ کو مطعون کرتا رہتا تھا کہ اُس نے کیوں..اُس کا وارث چوہدری کا کہا مانا اور لینن کے مجسّموں کو ڈھال کر صلیبیں ڈھالنے کا مذموم کاروبار کیا..اگرچہ اس مذموم کاروبار کے نتیجے میں وہ زندگی میں پہلی بار قدرے خوشحال ہو رہا تھا..وہ ایک نوتعمیر شدہ وسیع فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا جس کے تینوں بیڈ رومز میں غسل خانے ملحقہ تھے..کھڑکیوں میں ماسکو کے آسمانی منظر تصویر ہوتے تھے اور ابھی پچھلے ہفتے اپنی کھنڈر ہو چکی ماسکووچ کار ایک کباڑیے کے ہاتھوں فروخت کر کے اب ایک نئی نویلی سوزوکی میں سفر کرتا تھا، اپنے بچوں کا محتاج نہ رہا تھا..لیکن اُس کی کڑواہٹ نہ جاتی تھی..وارث، میں جب کسی بھی کلیسا کے ماتھے پر یا اُس کے اندر ایک صلیب آویزاں دیکھتا ہوں اور وہ بے شک لینن کے کسی مجسّمے سے نہ ڈھالی گئی ہو تو بھی وہ صلیب میرے سینے پر داغی جاتی ہے..جیسے ایک بیل یا گائے کا مالک اُس کے پُٹھے کو داغ دیتا ہے..وارث ہم جو درخشاں مستقبل کے نقیب تھے، طوائفیں ہو گئے ہیں، سرمایہ داری نظام کے دلال بن گئے ہیں..

کیا ظہیر الدین کا استدلال درست تھا کہ ہم طوائفیں ہو گئے ہیں، ہمارے اندر سُرخ سویرے کے جو چراغ جلتے تھے، ہم نے انہیں بجھا دیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو اندھیرا اترا اُس میں من مانی کرنے لگے..کہ وہ سب روسی جو کل کٹڑ کمیونسٹ تھے اگر انہوں نے اپنے چولے تبدیل کر لئے تھے تو کیا ہم غیر ملکیوں کی اشتراکیت سے وابستگی اُن سے جو اس سرزمین کے باشندے تھے، بڑھ کر ہے..جنہوں نے ہمیں مائل کیا تھا وہ تو تائب ہو گئے اور ہم ابھی تک ایمان رکھتے ہیں..

گھنے شجر لونگ روم میں اپنی شاخوں پر برف بوجھ کئے چلے آتے تھے..بنا کسی اشتیاق اور خواہش کے اُس نے بے زاری سے رائل سیلوٹ کے چند گھونٹ مزید بھرے..اُس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو سیدھا کیا..دبیز شیشے سے چپکا ہوا ایک دھندلا سا چہرہ، اُسے شکائت بھری نظروں سے اور اُس چہرے پر ایک مایوسی اور نامرادی رقم تھی، تکتا جا رہا تھا..وہ اُس کا اپنا چہرہ لگتا تھا..یہ اُس کا اپنا عکس ہے جو شیشے میں جھلکتا ہے..لیکن اُس کے پہلو بدلنے اور چہرے کا رُخ پرے کرنے کے باوجود وہ چہرہ ایک تصویر کی مانند بے حس و حرکت شیشے سے چپکا رہتا تھا..

تم نے بھی تو مفاہمت کر لی ہے وارث چوہدری..

کہاں گئی وہ تمہاری انقلاب کے لئے جان قربان کر دینے والی خصلت..جب تم لیل پور کے نواح میں ایک گاؤں کے غریب ترین فاقوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے، ذلتوں کے مارے کسان کی کچی کوٹھڑی میں رہائش پذیر ہو گئے

تھے صرف اُس سے اظہار یک جہتی کی خاطر، یہ تجربہ کرنے کے لئے کہ ان لوگوں کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں..تم وہی روکھی سوکھی کھاتے تھے جو اُس کسان کے نصیب میں تھی اور اُس کی مانند منہ اندھیرے کھیت کی جانب نکل جاتے تھے اور چونکہ اُس کے پاس بیلوں کی جوڑی تو کیا ایک گدھا بھی نہ تھا تو وہ اپنے گلے میں پنجالی ڈال لیتا تھا اور اُس کی لاغر بیوی ہل کی ہتھی تھام کر اُسے ایک بیل کی مانند ہانکتی تھی..تب تم نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس کسان اور اس کے خاندان کی تقدیر بدل ڈالو گے..اپنے آپ کو ایک ایسے نظام کے لئے وقف کر دو گے جس میں یہ کسان راج کرے گا..تم تاج اچھالو گے اور تخت گراؤ گے اور اس کسان کو چاہے اس جدوجہد میں جان چلی جائے، تخت پر بٹھاؤ گے..

تم نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا وارث چوہدری لیل پوری..

وہ وعدہ کیا ہوا..

تمہارے آبائی وطن میں تو اب بھی بندۂ مزدور کے اوقات بہت سخت ہیں..وہاں اب بھی وہ کھیت ہیں جن سے دہقان کو روزی میسر نہیں ہوتی اور اگر وہ کسان مشقتوں اور ذلتوں کے کولہو میں پس کر رزق خاک نہیں ہو گیا تو اب بھی اُس کے گلے میں پنجالی ایک طوق کی مانند اُس کا دم گھونٹتی ہے اور وہ اب بھی ایک بیل ہے..ایک ایسا بیل جس کے بخت میں ہل میں سارا دن جُتے رہنے کے بعد منہ مارنے کے لئے چارہ بھی نہیں ہے..اور تم..تمہاری ایک دعوت پر اتنا خرچہ اٹھتا ہے کہ تمہارے لیل پور کے ارد گرد جتنے بھی پسماندہ دیہات ہیں، وہاں سکتے ہر کسان کو دو بیل نصیب ہو سکتے ہیں، وہ اگلے کئی برسوں تک دال روٹی کھا سکتے ہیں اور ان کے بچے دودھ کا ایک کٹورا پی سکتے ہیں..کئی برس تک صرف ایک شب کے اخراجات کے عوض..لیکن تم کو اس سے کیا..سرمایہ دارانہ نظام کے ایک وفادار کل پُرزے اور ایک دلال کی حیثیت سے تم کو کیا غرض..

''نہیں..'' وہ نہ تو خمار میں تھا اور نہ ہی مدہوشی میں..بلکہ مکمل حواس میں تھا، اُس چہرے سے مخاطب ہوتا تھا جو شیشے سے چپکا اُسے کٹہرے میں کھڑا کر کے اُس کی تکذیب کئے جاتا تھا ''نہیں..میں مفاہمت کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، میں منحرف نہیں ہوا..لیکن میرے ارد گرد جو سماجی ڈھانچہ لیڈروں کی کوتاہ اندیشی، جبر، ظلم اور معاشی بدحالی کے باعث مسمار ہو گیا تھا تو میں اُس کے کھنڈر میں ماتم کرنے کی بجائے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اُس سرخ خواب سے کنارہ کش ہو گیا جس کی تعمیر کے امکانات اُن کھنڈروں میں دفن ہو گئے تھے..اختیار کرنے کے لئے میرے پاس دو ہی راستے تھے..ایک ظہیر الدین کا..کہ میں اپنے اُس سرخ سویرے کے خواب سے باہر نہ آتا، مارکس اور لینن کے ارشادات کو ہی زندگی کی آخری تفسیر جان کر انہیں گلے سے لگائے رکھتا اور..اُس کی طرح آج کڑواہٹ سے بھرا، دوسروں کا محتاج ہوتا، سمبل کے درختوں میں سے پھوٹنے والی مائی بوڑھیوں کے تعاقب میں بھاگتا پھرتا اور دوسرا راستہ جسے میں نے اختیار کیا، بقاء کا، کسی حد تک صلح کر کے بچ جانے کا راستہ تھا..شطرنج کی جو نئی بساط روس میں بچھ گئی تھی جس کے ہر مُہرے پر چچا سام کی فرنچ کٹ داڑھی اور ستاروں سے مزّین مسخروں والا ہیٹ تھا، میں اس کھیل میں شامل ہو گیا اور بقیہ کھلاڑیوں کے بادشاہ مات کر دیئے..میں نے تو صرف اتنی ہی صلح کی جتنی فتح مکہ کے بعد قریش کے سرداروں نے اپنی بقاء کے لئے کی تھی..یوں تہہ دل سے میں نئے نظام پر ایمان نہ لایا..میں اپنے خواب سے ابھی تک دستبردار نہیں ہوا..''

دبیز شیشے پر چپکے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیلی جو کہتی تھی..سب بہانے..سارے حیلے..اپنے آپ کو فریب

دیتے ہو..اور وہ چہرہ دھندلا کر گھنے جنگلوں کی برف میں دفن ہو گیا..لیکن اُن جنگلوں کی نیم تاریکی میں سے کہ برف کی سفیدی اُنہیں مدھم مدھم اجالتی تھی، کچھ اور چہرے ظاہر ہوئے اور وہ سب شناسا نہ تھے..

اُس نے اپنے آپ کو ڈھارس دی....یہ اس شراب کی خباثت ہے۔جس کی الفت میں تم کبھی بھی نہیں رہے جو تم پر اثر کر گئی ہے اس لئے اُس کی خمار آلود اثر انگیزی تمہیں ایسے آشنا اور نا آشنا چہرے دکھا رہی ہے..یہ محض پر چھائیاں ہیں جن پر تمہیں چہروں کا گمان ہوتا ہے، جیسے ساون کی گھنگھور گھٹاؤں میں، اڈتے بادلوں میں اگر اپنے آپ کو ایک تصوراتی فریب میں مبتلا کر لیا جائے تو کیسی کیسی شکلیں جنم لینے لگتی ہیں..دندناتے سیاہ ہاتھی، سیاہ شجر، عجیب انجانے سنجیدہ چہرے.. بادشاہ اور جوکر..تو یہ..وارث چوہدری تمہیں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، وہ سب ایک تصوراتی فریب ہے ورنہ دبیز شیشہ اپنی شفافی میں بے جان پڑا ہے..

لیکن اس تصوراتی فریب کے نظریئے کو اُس کا چہرہ باطل کرتا تھا..اُس کا..ظہیر الدین کا چہرہ..وہ موجود تھا..سفید بالوں والا شکست خوردہ دبیز شیشے سے ناک لگائے اُسے شکایت آمیز نظروں سے تکتا..پھر وہ پل بھر میں معدوم ہوا اور اُس کی جگہ ایک کرشن کا جو سانولا سلونا نہ تھا، گورا چٹا روپ رکھتا تھا اور اُس کے سر کے گرد ایک سرخ ہالہ گردش کرتا تھا اور وہ لکھنؤ کی ایک سٹیج پر انقلاب کی سرخ مُرلی بجاتا تھا، نمودار ہوا..اور وہ شناسا نہ تھا..جانے کون تھا..

یہ اس آتشِ سیال کے دھوکے تھے جو اُسے فریب نظر میں مبتلا کرتے تھے اور اُسے دبیز شیشے میں سے جھانکتے اُسے تکتے انجانے چہرے نمودار ہوتے دکھائی دیتے تھے..اور وہ آخری چہرہ نہ تھا..کرشن معدوم ہوا تو ایک اور اجنبی شکل دھند میں سے ظاہر ہوتی ہے دبیز شیشے میں تصویر ہونے لگی..یہ محض اُس کا گمان تھا لیکن اُسے اپنے لونگ روم میں گائے کے کچے چمڑے کی ناگوار بُو آنے لگی..اور یہ شکل ایک مصطفیٰ اسلام کی تھی جو ایک مذہبی جماعت کے تشدد پسند پُر غضب کارکنوں کے سامنے گلا پھاڑ پھاڑ کر.. سرخ سرخ ہے..کے نعرے لگاتا تھا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایمان رکھتا تھا کہ وہ اُس سرخ سویرے کا استقبال کرے گا جو محض چند قدموں کے فاصلے پر برپا ہونے کو ہے..اور وہ اپنی بیٹی جینا اسلام کی اُلفت میں گم تھا جو کوچہ کمانگراں میں واقع اُس کے آبائی مکان کے اُس کمرے میں جس کی کھڑکیوں میں رنگین دانے دار شیشے جڑے تھے اور جہاں وہ پیدا ہوا تھا، وہاں اُس کی جینا شب کے گہرے سکوت میں گٹار پر جھکی اُس کی تاریں چھیڑتی..اور اُس کے سفری تھیلے میں خانہ بدوشوں کا وہ پرچم لپٹا پڑا تھا..سرخ، سبز، نیلے اور سیاہ رنگوں کا جس کے درمیان میں ہندوستانی پرچم کی مانند ایک چکر تھا..اور وہ اُس شب کی تنہائی میں گٹار کی تاروں کو چھیڑتی، کبھی کبھار اپنی ناک سکیڑتی جیسے وہ ایک جنسی عروج پر ہو اپنے آپ میں مگن ایک گیت گاتی تھی..

آخر ہم خانہ بدوشوں نے ان بستیوں والوں کا کیا بگاڑا ہے..
ہم تو پل دو پل ٹھہرتے ہیں اور کُوچ کر جاتے ہیں..
نہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں اور نہ ہی زمین پر اپنی ملکیت جتاتے ہیں..
تو پھر یہ کیوں ہمیں دھتکارتے ہیں..
ہم تو اپنے خیمے سمیٹنے کو ہیں..
جن کے گرد گھاس اُگنے لگی ہے..

●○●○●○●

''آریف..''

بلنڑڈ کے چہرے کی سپیدی یکدم زردی میں اترنے لگی..وہ بیڈروم سے نکل کر اپنی سلیپنگ گاؤن جو اب بھی، اس کہولت زدگی میں بھی عارف کی خواہش کے مطابق اتنا باریک تھا کہ اُس کا ڈھل چکا بدن اُس میں سے نمایاں نظر آتا تھا..وہ سلیپنگ گاؤن سمیٹتی سنبھالتی اُس پر جھکی تو اُس کا قالین پر پڑا بدن بے جان سا لگتا تھا، آنکھیں نیم وا مردہ سی تھیں.. قریبی صوفے پر اُس کی ایک پرانی تصویری البم جس کے بخیے اُدھڑ چکے تھے اور گرد پوش کا گتا پھسپھسا ہو چکا تھا، کھلی پڑی تھی..وہ چند بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں بھوری ہو چکی تھیں جن میں وہ ایک کرشن کے روپ میں سجا سجایا ایک کرشن سے بھی بڑھ کر حسین نظر آ رہا تھا کہ اُس کا رنگ کرشن کی مانند سانولا نہ تھا، گورا تھا..

واڈکا کی خالی بوتل لڑھکتی ہوئی ٹیلی ویژن ٹرالی کے نیچے پہنچ کر تھم گئی تھی..

ابھی دو برس پیشتر وہ اُس قلبی واردات کا شکار ہوا تھا جسے دل کا دورہ کہتے ہیں لیکن وہ دورہ شدت پسند نہ تھا.. ڈاکٹر بھی فکر مند نہ تھے کہ ان کے مطابق اس عمر میں یہ ایک معمول تھا اور مناسب دیکھ بھال، خوراک میں احتیاط، تناؤ سے گریز اور دوائیوں کے باقاعدہ استعمال سے وہ ایک نارمل اور مناسب حد تک طویل زندگی بخوبی گزار سکتا تھا..البتہ اس نوعیت کے بے ربط ہو چکے دل کے مریضوں کے بارے میں ایک خدشہ بہرطور موجود رہتا ہے کہ سوتے ہوئے انہیں دورہ پڑ سکتا تھا اور اگلی سویر جب آپ اس خیال میں ہوتے ہیں کہ پچھلی شب دیر سے سونے کے باعث وہ اپنی نیند پوری کر رہے ہیں تو دراصل وہ پورے ہو چکے ہوتے ہیں..

بلنڑڈ کے چہرے پر اتری زردی زائل ہونے لگی جب اس نے ذرا جھک کر اُس کے سینے کے ساتھ اپنا کان لگایا تو وہاں معمول کی دھڑکن موجود تھی اور وہ ایک مطمئن سانس بھر کر سیدھی ہو گئی..

بلنڑڈ کو یہی خدشہ لاحق رہتا تھا..کہ کہیں وہ سوتے میں چلا نہ گیا ہو۔

اپنے اس غیر ملکی خاوند کے ساتھ پورے بیالیس برس بسر کرنے کے باوجود کیا یہ ایک تعجب انگیز حقیقت نہ تھی کہ اُس کی محبت میں ان تمام برسوں کے دوران ایک تسلسل رہا تھا، کچھ کمی واقع نہ ہوئی تھی..وہ کبھی اُس سے غافل نہ ہوئی تھی اور اس کے باوجود وہ اسے سمجھ نہ سکی تھی..اُس کے اندر جو ایک پاتال پوشیدہ اور سربمہر تھا اُس تک نہ پہنچ پائی تھی..کیا اُس مشرق کی روح میں..جو ہرمن ہیسے اور نطشے کو مسحر کرتا تھا، کوئی ایسا بھید ہوتا ہے جس تک رسائی حاصل کرنا مغرب کے بس میں نہیں ہوتا..کوئی ایسی دیوار ہوتی ہے جس کے پار ایک بیوی..بھی نہیں جا سکتی..کوئی ایسا اجتناب ہوتا ہے ایک مشرقی روح میں جو ایک عشق میں مبتلا عورت کو بھی پرے دھکیلتا رہتا ہے..اُسے اپنی پہنائیوں میں اترنے نہیں دیتا..

بلٹر ڈ دوبارہ اُس پر جھکی اور اُس کے کندھے کو جھنجھوڑا.''آ ریف..'' اور اُس نے اپنی مردہ لگتی نیم وا آنکھیں کھول دیں اور مسکرانے لگا'' آج بھی تم یہی سمجھی تھیں کہ..میں مر گیا ہوں۔''

یہ فلیٹ..ان دونوں کی ضروریات کے لئے کافی..محفوظ اور ایک سرسبز ماحول میں اُن کی ذاتی ملکیت تھا، اُنہیں صرف روزمرہ کے اخراجات کا بندوبست کرنا ہوتا تھا جو ہو جاتا تھا..جب وہ غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر سے ایک مترجم کی حیثیت سے ریٹائر ہوا تو اُسے ایک معقول رقم عطا کی گئی تھی جو دیگر ذرائع سے حاصل کردہ اور پس انداز کی گئی رقم میں جمع ہو کر اتنی معقول ہو گئی تھی کہ اُسے سینئر سٹیزن اکاؤنٹ میں جمع کروانے سے اُنہیں ہر ماہ اتنا منافع وصول ہو جاتا تھا کہ وہ کسی حد تک بخوبی گزارہ کر سکتے تھے..

بلٹر ڈ کے خون میں رچی جو جرمن تنظیم تھی وہ اُسے بیکار نہ بیٹھنے دیتی۔کبھی وہ غیر ملکی سیاحوں کے لئے ایک گائیڈ کی خدمات سرانجام دینے لگتی کہ وہ انگریزی میں خاصی رواں تھی..کبھی کسی تُرک شوارما ریستوران میں ویٹرس کی ملازمت کر لیتی کہ تُرکوں کی انا تسکین پاتی تھی اگر ایک جرمن عورت اُن کی ملازمہ ہو..ایک بار وہ ایک بڑے سُپر سٹور میں محض جھاڑ پونچھ کرنے پر معمور ہو گئی..یوں گزر اوقات میں سہولت ہو جاتی تھی..اور عارف نقوی جو ایک زمانے میں جرمنوں کی اسی خصلت کا مداح اور پرستار تھا، اب اُسے یہی سرد اور میکانکی تنظیم خلجان میں مبتلا کرتی تھی..ایک گھر کو، ایک ہسپتال تو نہیں ہونا چاہئے کہ ہر شے اپنے مقام پر ہمہ وقت ایک قرینے سے رکھی ملے..کسی میز..ٹیلی ویژن سکرین، بُک شیلف یا گلدان پر دُھول کا ایک ذرّہ بھی نہ ہو..آپ نے پانی کا ایک گھونٹ بھر کر گلاس تپائی پر رکھا ہے اور ذرا دوسری جانب دھیان کر کے پھر سے تپائی کی جانب دیکھا ہے تو گلاس مفقود..بلٹر ڈ اُسے اٹھا کر باورچی خانے میں لے جا کر، کھنگال کر کپ بورڈ میں سجا چکی ہے.. اگر وہ شاعری کی کوئی کتاب رات دیر تک پڑھتا رہا ہے اور اُسے الٹا کر میز پر دھرا ہے تو اگلی صبح وہ میز پر نہ ہوتی، شیلف کی کتابوں میں کہیں گم ہو چکی ہوتی..

اُسے اب بدنظمی کی شدید خواہش ہوتی تھی..

اور بدنظمی کی یہ خواہش اور شراب سے وابستگی اور اُس پرانی البم میں آویزاں بھوری تصویروں پر پہروں نظریں جمائے رکھنا..یہ غیر متوقع تبدیلیاں تھیں جو دیوار برلن کے گرا دئے جانے کے چند برسوں بعد اس کے اندرون میں رونما ہونے لگیں..

وہ اپنی من مرضی سے، نظریاتی وابستگی اور ایک خواب کے حصول کی آرزو میں جلاوطن ہوا تھا پر ان دنوں اپنی مٹی سے جدائی اُس کا کلیجہ کاٹتی رہتی..اور اُس نے اپنی مٹی کی قربت میں جا کر بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ بھی اُسے نہ پہچانتی تھی اور نہ ہی اُسے قبول کرنے پر آمادہ محسوس ہوتی تھی۔تو وہ کدھر کا رُخ کرے، کہاں جائے..

کمیونسٹ نظام کے غیر متوقع خاتمے پر وہ ایک ایسا ملاح تھا جس کی نظریاتی کشتی کے گرد اشتراکیت کا جو سرخ سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا وہ یکدم آنکھ جھپکتے ہی سمٹ کر پرے ہوتا گیا..اُس کی لہریں اِک عالم شکستگی میں کروٹیں بدلتی دور ہوتی گئیں اور پھر وہ سمندر اِک خواب ہوا یہاں تک کہ ہر جانب ریت ہی ریت تھی اور اُس کی کشتی ریت کے اُس صحرا میں تنہا، بے آسرا اور متروک پڑی تھی..اُس نے جن ملاحوں کی بے لوث نظریاتی لگن سے متاثر ہو کر اُن کے لئے اپنی زندگی وقف کر

دی تھی جو اس کشتی کے کھیون ہار تھے..راہنما سوویت یونین اور اُس کے نقشِ آب سے اپنی راہوں کا تعین کرتے..کچھ صدق دل سے اور کچھ مجبور کر دئے جانے پر، جرمن، یوگوسلاوین، چیک، بلگارئن، رومینین، پولش، ہنگیرین..سب کے سب ملاّحوں نے اپنے چپّو کھینچ لئے تھے اور اب وہ تنہا تھا..ریت میں دھنس چکی کشتی کے ریت میں پھنس چکے چپوؤں کو اب وہ کیسے چلا سکتا تھا، ہمت ہار بیٹھا تھا..اس کشتی کو کھینے کی جستجو میں اُس نے اپنی پوری حیات داؤ پر لگا دی تھی اور وہ.. ہار گیا تھا..

تب اُس کی کتنی قدر و منزلت تھی کہ یہ کرشن صورت پاکستانی نوجوان اپنے وطن کی مٹی ترک کر کے صرف ہمارے پہلو بہ پہلو انقلاب برپا کرنے کے لئے آ گیا ہے..سرخ سویرے کو حقیقت کا روپ دینے کی خاطر اپنے پرایوں کو تیاگ آیا ہے اور اس سرزمین کی ایک بیٹی کو قبول کر لیا ہے..کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے منعقد کردہ سیمیناروں اور ادبی اجتماعات میں وہ منظورِ نظر ہوتا اور اس کے برابر میں بیٹھی ہلٹر ڈ دلوں پر برق گراتی چلی جاتی..اور اب..اس عمارت کے مکین جو اُس کے کمیونسٹ ماضی سے آگاہ تھے کترا کر نکل جاتے..وہ اپنے فلیٹ سے اتر کر نیچے شاہراہ پر آتا تو اُس پر رواں ٹریفک کی جانب سے ہارن بجا بجا کر اُس کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا کہ تم ایک غیر ملکی، شائد ایک غیر قانونی شخص ہمارے وطن میں یوں دن دہاڑے پھرتے ہو.. یہاں کیا کر رہے ہو..اپنے غربت زدہ وطن واپس کیوں نہیں چلے جاتے..

اور انہی دنوں جب اپنی مٹی سے جدائی اُس کا کلیجہ کاٹتی رہتی وہ روزانہ اخباروں کے ورق کھنگالتا رہتا، سراغ لگاتا رہتا کسی ایسی خبر کا جس میں پاکستان کا کوئی واجبی سا حوالہ ہو..وہ اتنا عرصہ اپنے ہم وطنوں سے جدا رہا تھا کہ اپنے آپ کو ایک لسانی ثقافتی حوالے سے بھی جرمن سمجھنے لگا تھا اور اب اسے احساس ہوا تھا کہ کوئی بھی مٹی کسی غیر مٹی کے بیٹے کو گود نہیں لیتی، اگر حالات اُسے مجبور کر دیں تو وہ گود لے بھی لیتی ہے لیکن کبھی نہ کبھی اُسے اپنی گود سے اُتار بھی دیتی ہے اور تب اُسے اپنی آبائی سرزمینوں کی پکار سنائی دینے لگتی ہے..اُس نے کچھ عرصہ محض اس لئے کہ وہ مسلمان تھے اور مشرق کے تھے، تُرکوں سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی جو برلن میں کثرت سے تھے.. ہر چوک میں اُن کے ڈونر کباب اور سلاد کے کھوکھے نظر آتے لیکن وہ ان کے قریب نہ ہو سکا..اُن کی خوراک میں چٹخارے نہ تھے اور نہ ہی اُن کی خصلتیں اُسے راس آئیں اور نہ ہی وہ اسے ایک پاکستانی کی حیثیت میں اپنے برابر کا سمجھتے کہ..یہ وہ لوگ تھے جن کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، کبھی عربوں کے قدموں میں لوٹتے پُر تقدس آنسو بہاتے اور کبھی سلطنت عثمانیہ کے زوال پر سینہ کوبی کرتے ہوئے خلافت کی تحریک کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کرنے لگتے اور پھر کمال اتاترک پر جاں نثار کرنے لگتے..یہ.. پاکستانی مسلمان دنیا کی سٹیج پر اکثر زبردستی داخل ہوتے ایکسٹرا اداکار تھے جن کا اپنا کوئی کردار نہ تھا..تو وہ ترک بھی..عارف نقوی کو ایک پاکستانی کے طور پر ایک ایکسٹرا اداکار کی حیثیت میں اپنے برابر کا نہ سمجھتے..

اور برلن میں پاکستانی کم کم تھے..

اور وہ سُراغ میں رہتا..

وہ ایک مختصر لیکن جرمن کاملیت کے مظہر ہوٹل کا ایک کمرہ تھا..

سنورے ہوئے شفاف بستر کے برابر میں تپائی پر دو سرخ پھولوں سے مزین ایک گلدان کے علاوہ ایک ٹیبل

لیمپ روشن تھا..اس کے سوا غسل خانے کے بند دروازے کے نیچے سے اندر روشن ٹیوب لائٹ کی ایک لکیر کمرے کے فرش پر پھیلتی مدھم ہوتی تھی..تین کرسیاں تھیں اور ایک مستطیل کھڑکی تھی جو برلن کے ایک پرسکون رہائشی علاقے پر کھلتی تھی..

ٹیبل لیمپ کی روشنی میں عارف نقوی کے قدرے خم کھاتے سفید بال، سپید ابھی تک دل کش چہرے پر براجمان موٹے شیشوں کی عینک اور بے وطنی کی بے چارگی اور بچھڑ جانے کی کسک نمایاں ہوتی تھی..

نہایت لجاجت سے..بے چارگی کی نظروں سے اُسے تکتے ہوئے عارف نقوی نے اپنی جیب میں سے چند کاغذ نکالے، اُن کی ترتیب درست کرنے میں اسے کچھ وقت لگا..اگر آپ پسند کریں تو میں..میں کسی زمانے میں جب میں لکھنؤ سے کراچی منتقل ہوا تھا تو اچھے خاصے افسانے لکھا کرتا تھا تو..کیا آپ میرا ایک افسانہ سننا پسند کریں گے، آپ ظاہر ہے مجھے نہیں جانتے ہوں گے لیکن میں آپ کو آپ کی تحریروں کے حوالے سے جانتا ہوں بلکہ ایک مداح ہوں تو..اجازت ہے؟''

منتظر صہبائی چونکہ شب بھر گھونٹ بھرتا رہا تھا صرف اس لئے اُس نے اُس کی بے چارگی پر ترس کھا کر ایک منافقت بھرا ''کیا کہنے'' کہا اور ہاتھ اٹھا کر رضامندی کا اظہار کر دیا..

برلن میں ایک سرکاری ادبی تنظیم کے تحت ایک ایشیائی ادبی سیمینار ہر دو چار برس کے بعد منعقد کیا جاتا تھا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے چیدہ چیدہ سینئر ناول نگار اور اُن کی بوریت کم کرنے کے لئے کچھ رائج الوقت شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا..اس برس منتظر صہبائی کو برصغیر کی تقسیم کے حوالے سے لکھے جانے والے ایک..کلاسیک قرار دیئے جانے والے ناول کے مصنف کے طور پر بلایا گیا تھا..آج صبح کے سیشن میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوب مشرقی شعبے کی ایک پروفیسر اور اردو ادب میں ایک ڈاکٹریٹ کی حامل محقق نے منتظر صہبائی کے اُس ناول پر ایک تفصیلی تنقیدی مضمون پڑھا تھا اور اُسے ایک نمائندہ ناول قرار دیا تھا..اُس ناول کے دو باب جو جرمن میں ترجمہ شدہ تھے ایک نہایت جنسی آواز والی خاتون نے سٹیج پر نہایت موثر انداز میں پیش کیے تھے جس کے دوران سیمینار میں شریک جو قلیل لوگ تھے، اُن کا دھیان تخلیقی ادب سے بھٹکتا اُس خاتون کی بدنی رکاوٹوں پر جا مرکوز ہوتا تھا..

بجا طور پر منتظر صہبائی اس شام ساتویں آسمان پر تھا..ان میں دو تین آسمان تو اپنی توصیف اور مداح سرائی کی وجہ سے اُس کی پہنچ میں آئے تھے اور بقیہ کے لئے وہ شواز ریگل کی اُس نصف ہو چکی بوتل کا مرہون منت تھا جو روشن ٹیبل لیمپ کی زد میں آ کر اپنے نصف پن پر سوگوار تھی۔

عارف نقوی اس ادبی سیمینار کا سراغ لگا تا اب اُس کمرے میں تھا جہاں منتظر صہبائی کا قیام تھا..

اُس نے نہایت دل جمعی سے..اگرچہ اپنی جمائیوں پر قابو پاتے ہوئے اور اپنی اُکتاہٹ کو وہسکی کے گھونٹوں میں ڈبوتے ہوئے..اُس کا افسانہ سُنا..

اپنی گھنی عینک میں پوشیدہ آنکھوں سے جب وہ اُس افسانے کے ورق پڑھتا تھا تو خمار کے باوجود منتظر صہبائی ایک گھاگ نثر نگار، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے..اُس بے چارگی کا چہرہ لئے شخص کا تجزیہ کر رہا تھا..وہ اپنی زمین سے بچھڑنے کے علاوہ اپنے تخلیقی اظہار سے بھی بچھڑ چکا تھا..اُس کا لسانی پیرایۂ اظہار کب کا متروک ہو چکا تھا..زبان زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی ساخت اور بناوٹ بدل چکی تھی..کہانی کہنے کا انداز ایک نئی لفاظی اختیار کر کے عہد جدید سے زیادہ

نزدیک ہو چکا تھا..نہ صرف وہ زبان اور لہجہ متروک ہو چکا تھا بلکہ اُس کا افسانہ ایک ایسا جذباتی اور نظریاتی نعرہ تھا جس کے زمانے کب کے گزر چکے تھے..اور اُس کے سامنے بیٹھا ہوا اپنے افسانے پر جھکا ہوا عارف نقوی آگاہ ہی نہیں تھا کہ پُلوں کے نیچے سے بہت سے پانی بہہ چکے ہیں...وہ ابھی تک اُنہی خس وخاشاک ہو چکے زمانوں میں سانس لیتا تھا...نیند سے باہر نہ آیا تھا..

افسانہ اختتام کو پہنچا تو عارف نقوی نے اپنی محویت سے باہر کر عینک کے گھنے شیشوں میں سے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اُسے درخواست گزار داد طلب نظروں سے..اور بے چارگی سے دیکھا..

منتظر صہبائی نے اُس کے افسانے کے متروک ہو چکے انداز کو نظرانداز کیا کہ وہ اپنے نظریئے پر ابھی تک مستحکم اور معصوم تھا ''نقوی صاحب..میں نے ایک عرصے کے بعد اتنا حقیقت پسند..جذباتی اور ایک خواب کی تعبیر کے حصول کے لئے لکھا جانے والا افسانہ نہیں سُنا..آپ کیا ہی خوب لکھتے ہیں..''

اور اُس شب اُس توصیف کی سرخوشی میں کہ اُس میں ابھی تک تخلیق کے جرثومے کلبلاتے تھے اپنی ادھیڑ عمر ہو چکی رفیقۂ حیات کو جو جانے کب کی نیند میں اتر چکی تھی اور خراٹے لے رہی تھی، جگایا اور اُس کے بوڑھے بدن کو وہ جو کسی زمانے میں ایک پرجوش اور بے مہار ہیجان ہوتا تھا اُس کی لذت سے آشنا کر کے اُسے بھر دیا..

●○●○●○●

آرک اینجل کیتھڈرل جو کریملن کے کلیساؤں کے لئے مخصوص احاطے میں اپنے سنہری گنبدوں کی الوہی خوشنمائی میں سربلند ہوتا تھا اور جس کے اندر زار روس اور زارینہ قدم رنجا فرما کر خالص سونے سے ساختہ ہیروں کے جڑاؤ والی بقیہ عبادت گزاروں سے بلند کرسیوں پر براجمان ہو کر عیسیٰ کی مصلوبیت کے سوگ میں بہرصورت چند آنسو بہاتے تھے تو اُس آرک اینجل کیتھڈرل کے آرچ بشپ تقدس مآب یُوری کراموزوف جب اپنے چار بانکے پادریوں کی جلو میں.. ایک مخروطی کلاہِ زریں اور ایک ایسی زرق برق پوشاک میں جو کسی زار کے معیار سے بھی کہیں شاندار اور پُرجلال تھی، قادر قریشی کی نئی رہائش گاہ کے وسیع ہال میں داخل ہوئے تو اُن کی پوشاکِ فاخرہ پر جہاں کہیں زریں دھاگوں کی پُرپیچ کڑھائی تھی، وہ ان موم بتیوں کی روشنی کی زد میں آ کر دمکنے لگی جو اس وسیع ہال کے طول وعرض میں..شمع دانوں میں.. فرانسیسی میزوں پر اور طاقچوں میں ہولے ہولے موم کے آنسو گراتی تھیں..

اُس لمحے تقدس مآب کے پُرتقدس نتھنوں میں ایک عجیب انجانی روحانی سی مشرقی مہک آئی اور انہوں نے اپنے گلے میں لٹکی بھاری صلیب کو ایک بوسہ دیا کہ اس روحانی مہک نے ان کے تن بدن میں ایک الوہی سرشاری پھونک دی تھی..یہ مہک اُن سینکڑوں اگر بتیوں میں سے اٹھ رہی تھی جو ہال میں روشن موم بتیوں کے شانہ بہ شانہ سلگ رہی تھیں..

لپکتا ہوا، قدرے سرنگوں، سیاہ شیروانی اور لٹھے کی کلف زدہ شلوار میں اپنی گز بھر کی تسبیح کے دانے پھرولتا اپنی لومڑ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کے لئے قادر قریشی لپکتا ہوا آیا ''تقدس مآب میرے پاس اس انمول عزت افزائی کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں ہیں کہ آپ میرے اس غریب خانے میں ایک محفلِ نعت کے انعقاد پر تشریف لے آئے..''

آرچ بشپ یوری کراموزوف نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ قادر قریشی نے پھر سے سلسلۂ کلام شروع کر دیا ''روس میں کون ہے جو آپ کی عظمت کے سامنے سر نہیں جھکاتا..آپ ہی نے کمیونزم کے بے دین اور لعنتی زمانوں میں بھی عیسائیت کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دیا..مذہب کو افیون قرار دینے والے لامذہب جہنمیوں کے سامنے ایک سیسہ پلائی دیوار بن گئے، خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے..اور ان زمانوں میں یہ آپ ہی ہیں جن کی جدوجہد کے نتیجے میں رومانوف خاندان کے معصوم اور بے گناہ افراد کی ہڈیاں ایک باقاعدہ مذہبی تقریب کے بعد اعزاز کے ساتھ ایک کلیسا میں دفن کی گئیں اور یہ سراغ بھی آپ ہی نے لگایا کہ کمیونسٹ دہریوں نے بے چارے زار نکولس اور اُس کے پورے خاندان کو بیدردی سے ہلاک کر کے اُن کی لاشیں ایک گڑھے میں دبا دی تھیں..مجھ سے پوچھیئے تو وہ وحشی لوگ، روس کی تاریخ کا سیاہ ترین باب رقم کرنے والے..اس میں کیا شک ہے کہ وہ جہنم کی آگ کا ایندھن ہیں..اور تقدس مآب نہ صرف عیسائیت کے لئے بلکہ تمام مذاہب کی سربلندی کے لیے..خدا پر یقین رکھنے والے ہر مذہب کے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کر دی..اور

یوں آپ ہم مسلمانوں کے بھی محسن ہیں۔۔اگر آج سمرقند اور بخارا کی کھنڈر ہو چکی مساجد میں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی ہے تو صرف آپ کی لازوال جدوجہد کے نتیجے میں۔۔اور تقدس مآب آپ یقیناً آگاہ ہوں گے کہ جیسے آپ کنواری مریم اور یسوع مسیح جن کا تذکرہ قرآن پاک میں سب پیغمبروں سے زیادہ ہے، اُن کی شان میں گیت گاتے ہیں تو اسی طور ہم مسلمان بھی اپنے پیغمبرؐ۔'' قادر قریشی نے شتابی سے اپنی اُنگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگائیں اور پھر رواں ہو گیا'' کی شان میں گیت گاتے ہیں، ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور ہم ان گیتوں کو نعت شریف کا نام دیتے ہیں یعنی اُن کی مدح کرتے ہیں۔۔آج اس غریب خانے کے افتتاح کے موقع پر میں نے نہ صرف پاکستان بلکہ ازبکستان، تاجکستان اور داغستان کے نعت خواں حضرات کو بھی خصوصی طور پر بلایا ہے۔۔اُن کے آنے جانے کا خرچہ، یہاں رہائش کے علاوہ ان کی خدمات میں زرِنقد پیش کرنے کا بھی مناسب بندوبست میرے ذمے ہے۔۔مجھے یقین ہے کہ آپ اس روحانی اجتماع سے سرشار ہوں گے اور۔۔ اس پُرتقدس محفل کی صدارت قبول فرمائیں گے۔۔مجھ پر کرم کیجئے، میں احسان مند ہوں گا۔۔''

تقدس مآب یوری کراموزوف قادر قریشی کی اس طویل استقبالیہ تقریر کے دوران شدید بور ہوتے رہے اور بمشکل اپنی جمائیوں کو روکتے رہے، پوشاک میں پوشیدہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو بے چینی اور بے زاری سے سکیڑتے رہے اور جب بالآخر وہ چپ ہوا تو انہوں نے قادر قریشی کو ایک پُرنور شفقت آمیز مسکراہٹ سے سرفراز کیا ''یسوع ہمارا گڈریا ہے اور ہم اُس کے گلّے کی بھیڑیں ہیں۔۔وہ یقیناً ہم پر برکت نازل کرے گا۔۔''

سینکڑوں سلگتی اگربتیوں کی مہک، قادر قریشی کی وارث چوہدری کی رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر نئی رہائش گاہ کی کھلی کھڑکیوں میں سے آوارہ ہوتی آس پاس کے گھنے جنگلوں میں اترتی تو وہ بھی ایک روحانی سرشاری کے کیف میں آکر جھومنے لگتے۔۔

وہاں بے شک چھتوں سے لٹکتے متعدد کرسٹل کے فانوس ابھی جگمگاتے نہ تھے لیکن قادر قریشی نے خصوصی طور پر زرِکثیر بہا کر اہتمام کیا تھا کہ وہ وارث چوہدری کے فانوسوں کی نسبت حجم اور پھیلاؤ میں کم از کم دو گنے ہوں۔۔اُنہیں اس پُرتقدس محفل کے اختتام پر یکدم روشن کر کے مہمانوں کی آنکھوں کو چندھیا دینا تھا اور قادر قریشی کی شدید خواہش تھی کہ ان میں وارث چوہدری کی دو آنکھیں بھی ہوں۔۔لیکن ابھی وہ فانوس بجھے ہوئے تھے اور سارے میں بے انت موم بتیوں کی جھلملاہٹ اور اگربتیوں کی مہک اس محفل نعت کو ایک دل پر اثر کرنے والی روحانی خوشی سے ہمکنار کرتی تھی۔۔

صدر دروازے پر قادر قریشی کے پہلو میں مہمانوں کے استقبال کے لئے اپنے بدن کو مکمل عریانی کی سرحد سے ذرا ادھر روکتی اُس کی ذاتی سیکرٹری۔۔الیگزانڈرا بھی تھی جسے عرف عام میں امریکی محاورے کے مطابق سیکس کِٹن یا جنسی بلّی بھی کہا جاتا تھا اور یہ عُرفیت قادر قریشی کی عطا کردہ تھی۔۔

جو بھی مہمان اس مہک آور نیم روشن ماحول میں داخل ہوتا اُس کی توجہ بھٹک جاتی۔۔الیگزانڈرا۔۔کے ابھاروں پر ٹھہر جاتی اور پھر فوراً ہی خجل ہو کر قادر قریشی کی لومڑ مسکراہٹ پر جا رُکتی۔۔اور تو اور۔۔جب عزت مآب تشریف لائے تو وہ بھی اس کڑے امتحان سے بخوبی نہ گزرے۔۔بھٹک گئے۔۔

وارث چوہدری کی یہاں اس محفل میں موجودگی ایک مجبوری تھی، وہ غیر حاضر رہ کر یہ تأثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ

اپنے سے کہیں وسیع اور شاندار گھر کی وجہ سے قادر قریشی سے حسد کرنے لگا ہے.. یوں بھی وہ ایک نئے ہمسائے کی دعوت کو اخلاقی طور پر رد نہ کر سکتا تھا.. البتہ ظہیر الدین کو اُس نے اپنے دام میں یوں پھانسا تھا کہ ظہیر صاحب.. وارث چوہدری بہر طور آ رہے ہیں اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آپ کو بھی بہر صورت اپنے ہمراہ لائیں گے.. میں اقرار کرتا ہوں کہ میں بھی ارباط سٹریٹ کے تہہ خانے میں متروک شدہ لینن کے مجسموں کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن آپ کے جگری دوست نے مجھے ٹھکرا کر اُن کا ٹھیکہ آپ کو عطا کر دیا.. اگر آپ نہ آئے تو میں سمجھوں گا کہ یہ صرف کاروباری رقابت کی وجہ سے ہے.. ویسے بھی مجھے اِدھر اُدھر سے خبریں پہنچتی رہتی ہیں کہ آپ الحمدللہ مذہب کی جانب مائل ہو گئے ہیں.. جب سے لینن کے مجسموں کو ڈھال کر صلیبیں بنانے کا کاروبار شروع کیا ہے، تب سے ماسکو میں تعمیر ہونے والی مساجد کے لئے دل کھول کر نہ صرف چندہ دیتے ہیں بلکہ دبے لفظوں میں چیچنیا کے مجاہدین اور طالبان کے لئے بھی ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے ہیں.. چلئے میرے لئے نہ سہی ایک محفلِ نعت میں شرکت کے لئے آپ تشریف لے آئیے..''

اشوک کوہلی کو بھی قادر قریشی نے اپنی چرب زبانی سے مائل کر لیا اور قدرے سرگوشی میں کہا کہ کوہلی صاحب.. آپ اپنی موجودہ کم سن لولیتا کو بھول جائیں گے.. آپ آئیے تو سہی.. لیو سرنوف نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی تو اُس کا داماد سردار قالب یہ دعوت کیسے قبول نہ کرتا کہ وہ اپنے سُسر کا پیشاب خانوں کی آمدنی جمع کرنے والا فرمانبردار داماد تھا..

وہ تین پاکستان سے درآمد شدہ نعت خواں قادر قریشی کے محل نما گھر سے ملحقہ پُر آسائش مہمان خانے میں تقریباً حواس باختہ بیٹھے اپنی اپنی اُن داڑھیوں کو.. کہ ان کے پاس اس کے سوا کرنے کو اور کچھ نہ تھا.. سنوار رہے تھے.. جنہیں انہوں نے ابھی ابھی عطر پھلیل کی تیز خوشبو سے معطر کیا تھا.. اُن پر اس رہائش گاہ کی امارت، آرائش اور آسائش کا غلبہ ہو چکا تھا.. ان میں سے دو ایسے تھے جو مساجد میں، ذاتی محفلوں میں اور کبھی کبھار ٹیلی ویژن کے نعتیہ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور وہ اس لئے خوش الحان تھے کہ موسیقی اُن کے خاندان کی میراث تھی یعنی وہ جدی پشتی میراثی تھے.. وہ کلاسیکی موسیقی کے رموز سے آشنا تھے.. گلوکار ہوا کرتے تھے لیکن مردِ مومن کے عہد میں اس نوعیت کی لغویات کی کچھ گنجائش نہ تھی تو انہوں نے پیٹ بھرنے کی خاطر نعت خوانی کو اپنا روزگار بنا لیا.. ان دونوں نے روس آنے سے پیشتر اپنی داڑھیوں کو ایک پُڑیا میں ملنے والے دیسی خضاب سے ایسے رنگا تھا کہ اُن پر خضابِ الٰہی کا گمان ہوتا تھا.. البتہ تیسرا نعت خواں ان دونوں کو بجا طور پر حقیر سمجھتا تھا کہ وہ ذات کا سیّد تھا اور محض اپنے شوق کی خاطر نعت خوانی کرتا تھا.. اُس کے گلے میں قدرت نے ایک ایسا سوز پنہاں کر دیا تھا کہ وہ بھرے پنڈال کو آبدیدہ کر دینے پر قادر تھا.. وہ یوں بھی اپنے آپ کو دیگر نعت خوانوں سے محض اس لئے افضل نہ جانتا تھا کہ وہ سیّد ذات کا تھا بلکہ وہ برتر اس لئے بھی تھا جنت مقام مردِ مومن اُسے اپنے ہمراہ نیویارک لے گیا تھا جہاں اُس نے یو این او کی تاریخ میں پہلی بار اللہ اکبر کی صدا بلند کی تھی..

وہ تینوں قدرے اضطراب میں منتظر تھے کہ کب اُنہیں بلاوا آتا ہے، اُس وسیع ہال سے جہاں موم بتیاں روشن ہیں اور اگربتیوں کی مہک روحانی دھوم مچاتی ہے اور وہ آرچ بشپ عزت مآب کی صدارت میں ہدیۂ نعت پیش کرتے ہیں..

قادر قریشی ان دنوں پھر غیر شادی شدہ تھا..اُسے شادی کرنے کی حاجت بھی نہ تھی کہ وہ اپنے ہر مال کو جو وہ برآمد کرتا تھا ''چکھ'' کر برآمد کرتا تھا..

مہمانوں کا تانتا بندھا تھا..بہت سی موم بتیاں اپنے آخری دموں پر پھڑ پھڑاتی دھواں دیتی تھیں اور اگر بتیاں سلگ سلگ کر راکھ ہونے کو تھیں..جونہی وہ ڈرائنگ روم یا وسیع ہال اُن موم بتیوں سے جن میں وہ ہولے ہولے دمکتا تھا، تاریک ہونے لگا..موم بتیاں اپنے آخری مومی آنسو بہانے کو تھیں تو کہیں غیب سے درجن بھر دوشیزائیں..ازبک، قزاق، یوکرینین، تاجک اور وہ سب کی سب موقع کی مناسبت سے حجاب میں تھیں، مکمل طور پر ڈھکی ہوئیں پردے میں تھیں ظاہر ہوئیں اگرچہ اُن کے نشیب بھی اور فراز بھی اُن کی پوشاکوں کی قید میں سے باہر آنے کے لئے زور لگاتے تھے، انہوں نے ہاتھوں میں پروئی ہوئی ٹوکریوں میں سے نئی موم بتیاں نکال کر اُنہیں طاقچوں وغیرہ میں ایستادہ کیا، روشن کیا، نئی اگر بتیاں سلگائیں اور پھر نہایت پاکیزہ چال چلتیں پھر سے روپوش ہوگئیں..

وہاں..جو نصف ایکڑ پر محیط ایک نفاست اور ترتیب کے ذوقِ جمال کا حامل لان تھا جس کے ایک کونے میں ایک آبشار کے پانی ایک ایسے تالاب میں گرتے تھے جس میں سرخ مچھلیوں کے پرے کے پرے کبھی اڈتے اور کبھی زیرِ آب جاتے تھے اُس آبشار کے پانیوں کی دھار تلے ایک ایسی پُرتعیش پناہ گاہ تھی جس پر ایک خصوصی نائٹ کلب کا گمان ہوتا تھا..

بار کاؤنٹر کے پیچھے ایک سٹول پر ٹانگیں ہلاتی شکل سے سولہ سترہ برس کی لگتی ایک لڑکی قطعی طور پر اپنی مکمل برہنگی سے بے خبر بے حجاب بیٹھی تھی..

''آپ..'' اُس لڑکی نے بلکہ اُس کے عریاں بدن نے ان سب کو مخاطب کیا ''کیا پینا پسند کریں گے؟''

ان دونوں نے وارث چوہدری اور ظہیر الدین نے اپنی نظریں نیچی کر لیں لیکن اشوک کوہلی کی کم سن آرزوؤں کی تمام تر حسیں بیدار ہو کر قدرے مشتعل ہوگئیں، اگرچہ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ جال خصوصی طور پر اُس کے لئے پھیلایا گیا ہے..

''نہیں..شکریہ!'' وارث نے انکار میں سر ہلا دیا..

''مجھے بھی فی الحال خواہش نہیں۔''

لیکن قادر قریشی احتیاط کرنے کے باوجود کہ ایک میزبان کو ہمیشہ اپنے حواس میں رہنا چاہیے، ترنگ میں تھا، وہ غسل خانے میں جا کر وہاں پوشیدہ ایک بوتل کا نصف حصہ براہ راست حلق میں اتار چکا تھا ''لیکن کیوں نہیں برادر..کیا آپ میرے غریب خانے کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ مجھے شرف شراب نوشی عطا کریں..چوہدری صاحب آپ تو اجتناب نہ کیجئے..پلیز..''

بظاہر قادر قریشی اپنی پوری توجہ وارث چوہدری اور ظہیر الدین کی پذیرائی پر مرکوز کئے ہوا تھا لیکن اُس کا ہدف اشوک کوہلی تھا..وہ ایک شکرے کی مانند اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اُس کے موٹے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تیری کہ اشوک کوہلی کو زیر بار کرنے کی منصوبہ بندی کامیابی سے ہمکنار ہوتی لگ رہی تھی، اشوک کوہلی کی آنکھوں میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی وہ ٹین ایج لڑکی براجمان ہوگئی تھی..وہ بار بار ایک انجانے تصور میں اپنے ہونٹوں کو گیلا ہوتا محسوس کرتا

تھا..اُس کی بلوغت ابھی ابتدائی اور کچے مراحل میں تھی اور اُس کے تناسب میں تجربے سے بھر جانے کی خاصی گنجائش تھی..

بے شک وہ فی الحال اشوک اور وارث کی بے پناہ ثروت سے کہیں نچلے درجے پر تھا..اور جس برآمدی کاروبار میں وہ ماسکو کا سب سے بڑا بیوپاری تھا، اُس میں منافع کی شرع آسمانوں کو چھوتی تھی، اس کے باوجود وہ ان دونوں کی مانند ایک معزز اور پروقار مقام پر فائز ہونے کا شدید طور پر آرزومند تھا..کسی نہ کسی طور پر کاروباری حوالے سے اُن سے منسلک ہو کر اُن کی برابری کی سطح پر آنا چاہتا تھا اور اشوک کوہلی کے پاس وہ بے پناہ وسائل اور اختیارات تھے جو اُس کے ارادے کی تکمیل کے لئے معاون ثابت ہو سکتے تھے..اُس کے ذہن میں تمام ممکنات تھے..مثلاً سینٹ پیٹرز برگ کی امپیریئل پورسلین فیکٹری جہاں کسی زمانے میں زارِ روس اور اُس کے شاہی خاندان کے لیے خصوصی طور پر پورسلین کے برتن، گلدان، سامان آرائش اور ڈنر سیٹ وغیرہ تشکیل دیئے جاتے تھے جن کا فارمولا چینی کاریگروں سے مستعار لیا گیا تھا کہ تاریخ میں پہلی بار یہ چینی تھے جنہوں نے چینی کے یہ برتن اپنی بھٹیوں میں ساخت کیے..یہ فیکٹری جس کے نئے گاہک زاروں سے بھی زیادہ دولت رکھنے والے اور اس دولت کو بے دریغ خرچ کرنے والے ماسکو کے ارب پتی تھے..اشوک کوہلی کی ملکیت تھی..

اُسے خبر پہنچ چکی تھی کہ وہ ان دنوں کسی ایسے شراکت دار کی تلاش میں تھا جو کم از کم تیس ملین ڈالر کی سرمایہ داری کر سکے اور اس فیکٹری کا انتظام سنبھال سکے، اُس کے دیگر بکھیڑے اتنے تھے کہ وہ محض ایک پورسلین فیکٹری پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا..اُس کے رابطے دنیا بھر میں لوہے کے سب سے بڑے بیوپاری خاندان متل سے استوار ہو چکے تھے اور اُس کے پاس اس معمولی فیکٹری کی دیکھ بھال کے لئے وقت نہ تھا..قادر قریشی کو اگرچہ تیس ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کے لئے کچھ تردد کرنا پڑتا..لیکن وہ ایسا کر سکتا تھا..اشوک کوہلی کا کاروباری شریک کہلانے کے لئے وہ اس نئی رہائش گاہ کو بھی فروخت کر دینے کے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا..

اُس کی ابرو کے ایک خفیف اشارے سے وہ کچی پکی برہنہ لڑکی اپنے سٹول سے اٹھی اور کاؤنٹر سے باہر آ کر اشوک کوہلی کے برابر میں یوں آ بیٹھی کہ اُس کے کچے بدن کی حدت اُس کے سُوٹ کے بخیے ادھیڑنے لگی، اُسے سلگاتی اُس کے بدن میں ایک جلتے ہوئے سگریٹ کی مانند بجھنے لگی..

امپریئل پورسلین فیکٹری میں شراکت کا ناممکن خواب ممکن کی حدوں میں داخل ہونے لگا..بات چل نکلی تھی..

اور اُس نازک موڑ پر ایک ناگوار دخل اندازی ہوگئی جسے قادر قریشی نے قطعی طور پر پسند نہ کیا..

اُن حجاب آلود دوشیزاؤں میں سے ایک جنہوں نے ابھی ابھی موم بتیاں جلائی تھیں، اگربتیوں کو روشن کر کے پھونکیں مارتے ہوئے اُن کے شعلوں کو بجھا کر انہیں سلگنے پر آمادہ کیا تھا لیو سمرنوف اور اس کے برخوردار داماد قالب کی راہنمائی کرتی ہوئی اُس نیم پوشیدہ پناہ گاہ میں لے آئی..اُس کا حجاب اور بقیہ ستر پوش لباس گیلا ہو چکا تھا کہ آبشار کے قریب سے گزرتے ہوئے قدرے بے احتیاط ہوگئی تھی اور وہ اب سب کہاں کچھ کچھ نمایاں ہوگئی تھی..

قالب اپنی برخورداری میں ٹھٹک گیا..

سمرنوف پر البتہ اُس کچی لڑکی کی برہنگی کا کچھ اثر نہ ہوا جو اشوک کوہلی سے جُڑی بیٹھی تھی، اُس کے لبوں پر ایک بھالو مسکراہٹ پھیل گئی کہ وہ قدرے پستہ قد اور ڈیل ڈول والا ایسا شخص تھا جس کا چہرہ فراخ تھا اور فروغِ مے سے مزید

فراخ ہوا جاتا تھا..

''شائد ہم مخل ہوئے ہیں۔'' سرنوف، گزر چکے نظام کا آئیون خوفناک اور وہ جانتا تھا کہ اس سراسر اخلاقی معذرت کا کیا جواب آئے گا، گویا ہوا..

اور وہی جواب آیا جب قادر قریشی نے اپنی نشست پر سے اٹھ کر کہا ''سر.. اگر میں نے اپنی سیکرٹری الیگزانڈرا کو خصوصی طور پر یہ ہدائت سختی سے کی تھی کہ وہ تمام مہمانوں میں سے صرف آپ کو میری اس ذاتی خلوت میں پہنچا دے تو آپ کیسے مخل ہو سکتے ہیں.. سرماسکو کے کوچہ و بازار میں اگر آپ کے پیشاب خانے نہ ہوں تو ہم سب کے مثانے پھٹ جائیں.. پلیز..''

لیوسرنوف کو اس پیشاب خانے حوالے سے قدرے ہتک تو محسوس ہوئی لیکن وہ اپنے خمار میں یہ طے نہ کر سکا کہ آیا اُس نے جان بوجھ کر اس کی تکذیب کی خاطر ان کا تذکرہ کیا ہے یا وہ اپنے تئیں مجھے محظوظ کرنے کی خاطر ایک خوشگوار مزاحیہ فقرہ ادا کر رہا تھا.. ویسے یہ معمولی سا سیاہ رنگت کا باریش پاکستانی یہ خطرہ کیسے مول سکتا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ صدر پیوٹن کے ایک وفادار حواری کے ساتھ اس نوعیت کا ہتک آمیز مذاق کرے.. اپنے سر کے پہلو میں ایک وفادار سپاہی کی مانند کھڑا اسردار قالب ایک پاکستانی ہونے کے ناطے سے ایک برادر پاکستانی کی کمینگی سے البتہ آگاہ ہو گیا۔

''ہماری مشروبات کی مختار یہ معصوم سی بچی تھی۔'' قادر قریشی دل و جان سے معذرت خواہ ہوا ''اور یہ اپنے محترم اشوک صاحب پر ایسی ریجھی ہے کہ اُن کے پہلو سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی.. تو سر سرنوف میں ذاتی طور پر صرف آپ کے لئے ایک ویٹر کے فرائض سرانجام دینے میں فخر محسوس کروں گا.. آپ کیا پینا پسند کریں گے؟''

سرنوف نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں سے چاندی کی بنی ہوئی ایک چپٹی منقش فلاسک نکالی.. اُس کا ڈھکن گھما کر اُسے کھولا اور ایک طویل گھونٹ بھر کر کہنے لگا ''قریشی صاحب.. میں کبھی بھی کسی بھی پارٹی میں اپنے میزبان کی شراب نہیں پیتا.. مجھے نہ وہسکی مطلوب ہوتی ہے اور نہ ہی شیمپئن یا وائن.. مجھے صرف یُوکرین کی سرخ مرچوں والی واڈکا مرغوب ہے اور اس کا ذخیرہ میں اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں.. اس لئے نہیں بہت بہت شکریہ..''

''اور بیٹے آپ..'' سرنوف کی بے اعتنائی کو قادر قریشی نے اپنے چہرے سے ظاہر نہ کیا اور محض اُس کا دل جیتنے کی خاطر اُسے بیٹا کہہ دیا اگرچہ ان کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا ''اگر یہ آپ کا داماد ہے تو پھر میرا بیٹا ہی ہوا ناں..''

''نہیں سر..'' قالب نے ہڑ بڑا کر کہا.. ''شکریہ۔''

''بزرگوں کا احترام کرنے والا بچہ ہے..'' سرنوف نے پیار سے قالب کے گال پر ایک ہلکی سی تھپکی دی ''میری موجودگی میں شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا.. ہاں آپ اسے ہلکی سی کسی وائن کا ایک گلاس دے سکتے ہیں تاکہ یہ ایسی محفل میں بے وقوف نہ لگے.. قریشی..'' قادر قریشی فوراً آگے ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا ''یہاں قریب ہی کوئی غسل خانہ ہے قریشی؟'' سرنوف نے سرگوشی کی اور پھر فوراً ہی اُس کے حلق سے ایک قہقہہ برآمد ہو گیا ''ماسکو بھر میں میرے.. ٹائلٹ ایستادہ ہیں لیکن یہاں نہیں ہیں.. اس کا مطلب ہے کہ مجھے تمہارے غسل خانے میں داخل ہونے کے لئے دو روبل ادا کرنے پڑیں گے..''

وہی حجاب آلود لڑکی جو اُن دونوں کی راہنمائی کرتی انہیں یہاں لائی تھی لیوسرنوف کے آگے جان بوجھ کر اپنے

بدن کو لچکاتی اُسے آبشار کے دوسرے سرے پر ایک چٹان میں پوشیدہ غسل خانے تک لے گئی۔ سمرنوف نے خواہش کی کہ شائد یہ میرے ساتھ اندر چلی آئے اور میری پتلون کے وہ بٹن جو جھکنے اور جھانکنے سے بھی نظر نہیں آتے، انہیں کھولنے میں میری مدد کرے، پر وہ باہر ہی ٹھہر گئی..

اشوک کوہلی مہیا کردہ لولیتا کے نخرے اٹھانے میں مشغول ان کی موجودگی سے بیگانہ ہو چکا تھا.. قادر قریشی دوسرے مہمانوں کی آؤ بھگت کے لئے معذرت کر کے جانے کو تھا کہ پھر ایک کونے میں جا بیٹھا۔

''وارث..'' ظہیرالدین جو پوری شب ایک اکتایا ہوا، مہمانوں کے ساتھ گھل مل نہ جانے والا تنہا انسان تھا، اُس کے قریب ہو کر بولا..'' کیا تم نے کبھی اُن زمانوں کو یاد کیا ہے جب تمہاری جیب میں جہانگیری پلاؤ کی نصف پلیٹ خریدنے کے لئے بھی رقم نہ ہوتی تھی اور کیا میں ان وقتوں کو یاد کرتا ہوں جب میں اپنے باپ شمس الدین انقلابی کے عسرت زدہ کوارٹر کی دیواروں پر چسپاں لینن، مارکس اور عظیم باپ سٹالن کی تصویروں کو عقیدت سے تکتا جاتا تھا اور کیا ہم دونوں تب یہ تصور بھی کر سکتے تھے کہ اپنی عمر کے زوال میں ہم ایک لومڑ مسکراہٹ والے کائیاں قادر قریشی کی محفل میں..'' اور اُس نے ایک دزدیدہ نگاہ ادھر کی جدھر قادر قریشی اشوک کوہلی کو اپنے پھیلائے ہوئے جال میں کسمساتے دیکھ رہا تھا..'' سرمایہ دارانہ نظام کی تمام خباثتوں میں شریک انقلاب کے خوابوں سے مکمل گریز کر چکے.. سرخ سویرے کی تمناؤں سے پہلوتہی کر چکے ایک ایسی محفل میں موجود ہوں گے.. اور میں لینن کے مجسموں کا بیوپاری ہو جاؤں گا.. صلیبوں کو گلے سے لگا لوں گا.. کیسی بلندی اور کیسی پستی.. شاید پستی وہ تھی اور اب بلندی ہے اور تم فائز ہو بلندی پر..''

''میں کچھ بھی نہیں بھولا..'' وارث چوہدری بھی لمحۂ موجود میں ایک کٹا ہوا اور تنہا انسان ہو گیا.. اور اس تنہائی میں صرف ظہیرالدین تھا جو اُس کا رفیق تھا۔'' میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اگر اس نظام سے مفاہمت نہ کرتا تو کُچلا گیا ہوتا.. اگر واپسی کا سفر اختیار کرتا تو اب بھی میری جیب میں جہانگیری پلاؤ کی نصف پلیٹ خریدنے کے لئے رقم نہ ہوتی اور اگر یہیں رہتا تو کسی کلیسا کے داخلے پر ہاتھ پھیلائے ایک گداگر ہوتا..''

''نہیں نہیں۔'' ظہیرالدین نے بہت شدت سے انکار میں سر جھٹکا'' میں ہرگز تمہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہا.. اگر تم انہیں شکست نہیں دے سکتے تو اُن کے ساتھ شامل ہو جاؤ کی حکمت عملی سے میں انکار نہیں کر رہا.. لیکن میرے اندر ابھی حال ہی میں ایک تبدیلی رونما ہونے لگی ہے اور میں اپنے آپ کو بہت مطعون کرتا ہوں، لعن طعن کرتا ہوں لیکن میں اس سے اپنا دامن چھڑانے میں ناکام رہا ہوں...''

وہ ذرا رُک کر چپ ہو گیا.. ان کے درمیان چپ کا وقفہ اتنا طویل ہو گیا کہ خاموشی کی مکڑی نے جالے بُن دیئے..

''ہاں ظہیر..''

ظہیر نے بمشکل وہ جالے پرے کیے اور پھر اعتراف جُرم پر مائل ہوا'' میں ان دنوں نہ چاہتے ہوئے بھی.. طالبان کے لئے ہمدردی محسوس کرنے لگا ہوں..''

''طالبان؟'' وارث کو جو دھچکا لگا اُس سے سنبھلنے میں اُسے کچھ دیر لگی..اور ظہیر الدین کا چہرہ اُسے خبر کرتا تھا کہ وہ بیان سنجیدگی سے دے رہا ہے..

''ہاں وہی..جنہوں نے بامیان کے عظیم الشان بدھ مجسمے مذہبی پاگل پن کے بارود سے اڑا دیئے..جنہوں نے..اس کے سوا تم جانتے ہی ہو کہ انہوں نے کیسے کیسے ظلم ڈھائے اور اُن کی رگوں میں سوائے جاہلیت کے مذہبی تعصب کے اور کچھ گردش نہیں کرتا.تم جاننا چاہتے ہو کہ میں کیوں اُن کے نزدیک محسوس کرنے لگا ہوں وارث..وہ بھی ایک مقصد کی خاطر..چاہے وہ عہد جدید میں کتنا ہی ناقابل حصول اور قابل مذمت ہو،ایک بے راہ رو ہی سہی لیکن ایک آئیڈیل کے حصول کے لئے برسرِ پیکار ہیں،نہ خریدے جا سکتے ہیں اور نہ زیر کیے جا سکتے ہیں،کیا ہمیں اُن میں اپنے ماضی کی کچھ جھلکیاں محسوس نہیں ہوتیں؟''

''نہیں..'' وارث نے بمشکل اپنی آواز کو بلند کرنے سے گریز کیا ''تمہارا دماغ چل گیا ہے.تم اُن ان پڑھ اور دورِ جدید کی حقیقتوں سے بے خبر صرف داڑھیوں کی لمبائی ماپ کر ملک چلانے والوں کے لئے ہمدردی محسوس کرتے ہو..''

''میرا باپ اپنے عقیدے کا برملا اعلان کرتا اپنے آپ کو صرف شمس الدین نہیں..انقلابی قرار دیتا تھا..ایک بدبخت اور لوگوں کو غربت کی چکی میں مسلسل پیسنے والے نظام کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے فلاح اور مساوات پر مبنی ایک نظام کے لئے جدوجہد کرتا تھا.تو اُسے بھی لوگ جاہل اور دورِ جدید کی سرمایہ دارانہ حقیقتوں سے بے خبر قرار دیتے تھے..اب یہ جاہل طالبان اگر اپنے خود ساختہ اور بھٹکے ہوئے سہی..ایک نظریئے کی تکمیل کی خاطر اپنے بدنوں پر بارود باندھ کر اپنے آپ کو اڑا دیتے ہیں تو وہ بے شک بھٹکے ہوئے سہی اپنے خواب کے حصول کے لئے پُرخلوص اور نیک نیت تو ہیں..جو کہ ہم بھی تھے..یاد ہے،ہم سب بھی چینی،امریکی،جنوبی امریکی اور ایشیائی.مختلف نسلوں اور رنگوں کے لوگ ترقی پسندی کی ایک ہی ڈور میں بندھے اپنا ترانہ انٹرنیشنل گایا کرتے تھے..مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے تھے اور ماؤ کہتا تھا کہ انقلاب بندوق کی نالی میں سے جنم لیتا ہے اور اب..اگرچہ چینی،سوڈانی،مصری،اردنی،ازبک یہاں تک کہ برطانوی اور امریکی بھٹکے ہوئے ہی سہی،مسلمان ایک خواب کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں،دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کے ساتھ ماتھا لگائے کھڑے ہیں محض ایک نظریئے کی خاطر جو قابل عمل نہ سہی لیکن نظریہ تو ہمیشہ قابل عمل نہیں ہوتا ثابت نہیں ہو گیا.تو پھر ہم میں جو ماضی میں تھے رنگ و نسل سے ماورا نتیجے سے بے پرواہ اور جان ہتھیلی پر لئے ہوئے..اور ان میں کیا فرق ہے..'' ظہیر کے ماتھے کی سلوٹیں ایک مسکراہٹ جو اُس کے لبوں پر آئی اُس کے زیر اثر ہموار ہونے لگیں ''تمہیں مزید صدمہ ہو گا جب میں اقرار کروں گا کہ کبھی کبھار میں آمادہ ہو جاتا ہوں کہ تمہارا عطا کردہ لینن کے مجسموں کو ڈھالنے کا منافع بخش کاروبار ترک کر کے ان تنگ نظر اور داڑھی کے آگے نہ دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والے جاہلوں سے جا ملوں..کہ میں مفاہمت نہیں کر پا رہا..مجھے انقلاب کا ایک خواب پھر سے چاہئے چاہے وہ تنگ نظری اور تعصب کی بُو ہی کیوں نہ دیتا ہو۔''

وارث چوہدری بھی اپنے اس دوست کو نادان اور بھٹکا ہوا جان کر مسکرا دیا۔

''اکیلے نہ جانا..ہم دونوں مشترکہ طور پر خودکشی کریں گے۔''

قادر قریشی ان دونوں کے بحث مباحثے سے بے خبر اپنے شکار پر نظر رکھے ہوئے تھا.اُس کچی عمر کی برہنہ لڑکی کو

اپنی کُنڈی میں ایک کینچوے کی مانند پرو کر اشوک کوہلی مچھلی کو مُنہ مارنے کی ترغیب دے چکا تھا اور آثار نظر آ رہے تھے کہ وہ منہ مارنے پر راغب ہو چکا ہے..اور تب اُس نے ڈوری کھینچ کر اُسے شکار کرنے کی جستجو کا آغاز کر دیا ''اشوک صاحب.. میں مخل ہونے کی جسارت نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ یہ نابالغ اور نادان بچی دل و جان سے آپ پر مرمٹ چکی ہے، فدا ہوگئی ہے آپ کی مردانہ وجاہت پر، نثار ہوگئی ہے آپ کی سحر انگیز شخصیت پر..یہ اتنی فدا ہو چکی ہے کہ نہ تو آپ کو اس کا سیل فون پوچھنے کی حاجت ہے اور نہ ہی کوئی مزید ملاقات کی درخواست کرنے کی ضرورت..یہ حاضر ہو جائے گی..سر کے بل چلتی آپ کے قدموں میں نثار ہونے کے لیے..حاضر ہو جائے گی..''

بین الاقوامی معیشت کی بساط پر اگر اشوک کوہلی دوسروں کے بادشاہوں کو اپنے جوکروں کے ہاتھوں مات دے چکا تھا تو وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا اگرچہ یہ کچے بدن کی لڑکی تھی جو وہ اُس کی دونوں گولیوں کو بھڑکاتی انہیں سلگاتی تھی، اور اس نے ایک شکر گزار نظر سے قادر قریشی کو دیکھا اور وہ فوراً جان گیا کہ لوہا اتنا گرم ہو چکا ہے کہ اُسے ایک ضرب لگا کر اپنی طے شدہ منصوبہ بندی کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔''اشوک برادر..اور میں جسارت کر رہا ہوں آپ کو ایک برادر کہنے کی.. مجھے یونہی کہیں سے ایک غیر مصدقہ اطلاع ملی ہے..سینٹ پیٹرز برگ میں جو امپیریئل پورسلین فیکٹری ہے جو 1794ء میں قائم ہوئی تھی، رومانوف خاندان اور شاہی دربار کے لئے خصوصی طور پر ڈنر سیٹ، گلدان، شراب کے پیالے اور آرائشی مرتبان تخلیق کرنے کے لئے تو وہ کل جہان جانتا ہے کہ ان دنوں آپ کی ملکیت میں ہے، اس فیکٹری کے بھاگ..اور میں مجھے معاف کیجئے گا، کثرت مطالعہ کا شکار ہونے کی وجہ سے یہ جان چکا ہوں کہ اس فیکٹری کے بھاگ کیتھرائن دے گریٹ کے عظیم عہد میں جاگ اٹھے..وہ زارینہ مصوری، مجسمہ سازی، تھیئٹر اور ظروف سازی کی شیدائی تھی اور ان تمام فنون کی پشت پر اپنا شاہانہ ہاتھ رکھ کر اُنہیں تھپکی دیتی تھی تو اُس زارینہ کے زرّیں عہد میں اس فیکٹری کی صنائع میں پورسلین کے عجوبے اور معجزے تخلیق ہونے لگے..حیرت انگیز خوبصورتیوں نے جنم لیا..تو اشوک جی..'' وہ قدرے جھجکا اور پھر رواں ہوگیا ''تو مجھے ایک غیر مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ آپ اس امپیریئل پورسلین فیکٹری میں کسی ایسے شراکت دار کے آرزومند ہیں جو اس میں کم از کم تیس ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کر سکے۔'' اس کی لومڑ مسکراہٹ عروج پر تھی ''تو اس خاکسار کو شراکت کے اعزاز میں شامل کر لیجئے۔''

''نہیں..'' کوہلی نے اُس کم سن نازک اندام کی دریافت کے مرحلے یکدم موقوف کیے اور قادر قریشی کو ایک غیر جانبدار مسکراہٹ سے نوازا..

اُس نے بہت جبر کیا کہ اپنی لومڑ مسکراہٹ جوں کی توں برقرار رکھ سکے لیکن وہ خفیف سی سمٹ گئی..''کوہلی صاحب..''

''نہیں..'' وہ غیر جانبدار مسکراہٹ دریا میں سے اچھلنے والی ایک مچھلی کی مانند ابھی تھی اور ابھی اُس کے چہرے میں ڈوب گئی ''اگرچہ تم میرے میزبان ہو لیکن تم اس قابل نہیں ہو..تم میرے شراکت دار..قادر قریشی، میں ایک کچی عمر کے بدن کی باس سے اتنا بھی مست نہیں ہوا کہ..اور اب مجھے جانا ہے..مہمان نوازی کا شکریہ..''

اشوک کوہلی کی یوں یکدم رخصتی پر وارث چوہدری دھیما سا مسکرایا..ظہیر الدین بے اثر رہا..قالب نے اپنے سر

کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واڈکا کا تیسرا گلاس خالی کر دیا.. لیوسرنوف ابھی تک غسل خانے سے نہیں لوٹا تھا، شائد وہیں گر پڑا تھا اور فرش پر بے سدھ خراٹے لے رہا تھا.. چند لمحوں کی شرمندہ چُپ کے بعد قادر قریشی ایک پرندے کی مانند چہکا.. ''کوہلی صاحب شائد اس لئے مائنڈ کر گئے ہیں کہ میں نے بھری بزم میں امپیریئل پورسلین فیکٹری کی ملکیت کا راز افشا کر دیا ہے اور وہ اسے خفیہ رکھنا چاہتے تھے.. مجھے معلوم ہے کہ وہ کل صبح سب سے پہلا فون مجھے کریں گے..'' اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اپنی ہیروں سے شعاعیں برساتی گھڑی پر ڈالی، گز بھر لمبی تسبیح کو بار کاؤنٹر سے اٹھایا کہ وہ مے نوشی کے دوران ایک اچھے مسلمان کی مانند اُس کے دانے گرانے سے گریز کرتا تھا..ایک اور نگاہ گھڑی کی جانب کی اور اُس کی لومڑ مسکراہٹ پھر سے عروج پر آ گئی ''میرا خیال ہے اوپر کی منزل میں محفلِ نعت برپا ہونے کو ہے..نعت خواں حضرات ہمارے منتظر ہوں گے، نہ صرف وہ بلکہ ماسکو کے آرچ بشپ تقدس مآب یوری کراموزوف بھی ہمارے انتظار میں ہوں گے تو آیئے اپنی رُوح کو مُصفّٰی کرنے کی خاطر اس محفل میں شریک ہو جائیں..''

وہ جو کم سن برہنہ دوشیزہ تھی اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اب کیا کرے.. یوں مکمل برہنگی میں وہ ایک محفلِ نعت میں شریک تو نہیں ہو سکتی تھی..

●○●○●○●

ار باط سٹریٹ کی قدامت میں سرگوشیاں کرتے، ریستورانوں اور قہوہ خانوں کے باہر چہل قدمی کرتے غیر ملکی سیاح اطمینان سے فٹ پاتھ پر آویزاں ہر ریستوران کے مینو کا جائزہ لیتے۔ آج دوپہر کے کھانے کے لئے ان میں کسی ایک ریستوران کا انتخاب کرتے..اس لئے بھی اطمینان سے چلتے چہل قدمی کرتے کہ ار باط سٹریٹ میں کسی نوعیت کی بھی میکانکی ٹریفک کا داخلہ ممنوع تھا اس لئے نہیں کہ کبھی کچھ مدت کے لئے یہاں کے ایک خوش نظر مکان میں پوشکن کا قیام رہا تھا اور کسی نقاد نے کہا تھا کہ اگر پوشکن کی رگوں میں سیاہ خون کی آمیزش نہ ہوتی تو وہ ہرگز اتنا عظیم شاعر اور نثر نگار نہ ہوتا.. جسے روسی ادب کا باوا آدم کہا گیا اور چیخوف، دوستووسکی اور ٹالسٹائی نے اسے اپنا گورو مانا..اور نہ ہی وہ اتنا جوشیلا، رومانی اور بے دریغ ہوتا کہ عین جوانی میں ایک خواہ مخواہ کی دعوتِ مبارزت یا ڈوئل میں اپنی جان گنوا بیٹھتا..اگر اس کے خون میں سیاہ رنگت کی آمیزش نہ ہوتی..ار باط سٹریٹ کے عین درمیان میں پوشکن اور اس کی بیوی کے معصوم اور بھلے لگتے مجسمے آویزاں تھے اور آج بھی ان کے قدموں میں مداحین کے بھینٹ کیے ہوئے پھولوں کے گلدستے پڑے تھے..

ماسکو کے اس سوہو..لینن کوارٹر یا گرین اِچ ولیج میں موسیقی اور مصوری کی بوقلمونیاں نظر نواز اور سُریلی ہوتی تھیں..فٹ پاتھ پر نہایت میلے کچیلے اور بے ترتیب بالوں والے ناکام موسیقار اپنے اس فن کا مظاہرہ گٹاروں اور اکارڈین سے کر رہے تھے جس کی قدر نہ ہوئی تھی اور یہاں انہیں بھیک میں چند رُوبل نصیب ہو ہی جاتے تھے..ار باط سٹریٹ کے عین درمیان میں اس کی آخری عمارت تک جاتی دستکاریوں، جھونپڑیوں ابتدائی مصوری کی اوپن ایئر نمائشوں اور سیاحوں کی دلچسپی کے طرح طرح کے نوادرات کی کی ایک عارضی بستی آباد تھی جو سیاحوں کی منظورِ نظر تھی اور وہ اس میں بھٹکتے پھرتے تھے..ان کھوکھوں، نوادرات کی دوکانوں، فٹ پاتھ پر سجے مجسموں اور تصویروں، پرانے روسی سازوں اور افغان جنگ کے اوورکوٹوں، سمور کی ٹوپیوں اور متروک ہو چکے بہادری کے تمغوں کے عین درمیان میں ول ادے میر لینن کا ایک پرشکوہ مجسمہ منظر پر اُمڈتا اُس پر سایہ فگن تھا..وہ حسب معمول اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی واسکٹ ٹٹول رہا تھا اور دایاں ہاتھ اٹھا کر مزدوروں اور کسانوں کی متوقع جنت کی جانب اشارہ کر رہا تھا اور پوری ار باط سٹریٹ پر یوں حاوی ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی کوہ طور سے اترا ہو اور نہ صرف روس بلکہ دنیا بھر کے ذلتوں کے مارے لوگوں کے لیے دس سے کہیں زیادہ احکام لے کر آیا ہو..ار باط سٹریٹ میں داخل ہونے والا ہر سیاح بلکہ عام روسی بھی یکدم اسے سامنے پا کر بھونچکا سا رہ جاتا کہ گم شدہ سوویت یونین کے چپے چپے میں ایستادہ کامریڈ لینن کے مجسمے تو کب کے ہٹا دیئے گئے تھے، منظر سے رخصت ہو چکے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ جو ہزاروں کی تعداد میں تھے، کہاں چلے گئے، کدھر منتقل ہو گئے..اگر وہ سیاح اور روسی غور کرنے والوں میں سے ہوتے تو وہ اُس ایک مشرقی شباہت کے سفید بالوں والے شخص کی جھجک پر غور کرتے جو ار باط سٹریٹ کی

ایک بغلی گلی کے آخری مکان کے برابر میں ایک تہہ خانے تک جاتی سیڑھیوں پر اتر رہا تھا..تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ماسکو کے قلب میں واقع ارباط سٹریٹ کے عین وسط میں ابھی تک..راندۂ تاریخ لینن کا ایک مجسمہ ہوا اور وہ موجود تھا..یہ آنکھوں کا دھوکا نہ تھا، کامریڈ لینن کا یہ اکلوتا مجسمہ کسی معجزے کے طفیل ابھی تک موجود تھا..

''آپ مجھے قائل کرلو ڈیڈی کہ..کیوں نہیں۔'' بورس نے طیش میں آکر اپنا اکلوتا بازو ظہیر الدین کے آگے لہرایا اور وہ اس باپ سے عاجز آچکا تھا..اُس کا دماغ کسی مشرقی چمڑے سے بنا ہوا تھا جس پر مغربی منطق کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا..

''بس نہیں..''

حالات بدل چکے تھے..وہ اب ایک نسبتاً بڑے فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے جس میں ایک نہیں اکٹھے تین غسل خانے تھے اور اُن کے نلوں میں بھاپ چھوڑتا گرم پانی مسلسل برآمد ہوتا تھا اور کھڑکیوں کے نیچے دریائے ماسکو بہتا تھا اور اس میں رواں سٹیمروں کے بھونپو سنائی دیتے تھے..گالینا اپنی جرمنی سے درآمد شدہ نئی نکور فلّی آٹومیٹک وہیل چیئر میں متحرک ہوتی پھرتی تھی اور وہ دن گئے جب گالینا بڑبڑاتی مخمور حالت میں اپنے خاوند کو کوسا کرتی تھی اور ایک ہی پیراہن میں گزر اوقات کرتی تھی..وہ اب آئے دن اپنے لباس بدلتی رہتی تھی جو بے شک ''میڈان چائنہ'' تھے لیکن اُن کے لیبل فرانس اور امریکہ کے مشہور عالم فیشن ہاؤسز کے پُرتو قیر ناموں سے مرصع تھے..سویٹ لانا کی بدتمیزی بھی رخصت ہو چکی تھی اور وہ نہ صرف اپنے باپ کے ساتھ الفت سے پیش آنے لگی تھی بلکہ فلیٹ سے باہر جاتے اور پھر واپس آتے اُس کے رخساروں پر ''آئی لو یو ڈیڈی'' کا بوسہ ثبت کرنا نہ بھولتی کہ ڈیڈی..فرسودہ، ناکارہ برسوں سے ایک بیکار وجود یکدم ہوش میں آ گئے تھے.. انہوں نے اپنے انقلاب کے احمقانہ خوابوں میں گم رہنے کی بجائے پہلی بار زمینی حقیقتوں کا سامنا کیا تھا اور اپنے دوست وارث چوہدری کی منت سماجت پر کہیں شہر میں کامریڈ لینن کے مجسمے جو انہی کی مانند ایک عرصے سے بیکار پڑے تھے، انہیں ڈھال کر نئی نکور صلیبوں میں منتقل کرنے کا کاروبار کرنے لگے تھے اور مانگ پوری نہ ہوتی تھی..

اُدھر بورس بھی ایک مدت کے بعد باقاعدہ باروزگار ہوا تھا..

افغانستان کی جنگ..جسے وہ ہر شب اپنے خوابوں میں دوبارہ لڑتا...اس کے سامنے وہ وحشی داڑھیوں والے مجاہدین اس پر امریکی سٹنگر میزائل چلاتے اُسے ذبح کرتے تھے جس کے نتیجے میں ہر شب اُس کے بائیں بازو کے پرخچے اڑ جاتے اور وہ چیخنے لگتا...ماں مدہوش اور باپ کہیں مائی بوڑھیوں کے تعاقب میں اور بہن کسی نائٹ کلب میں برہنہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہوتی۔اس کی چیخیں کوئی نہ سنتا..لیکن آج وہی افغان جنگ اُس کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو رہی تھی، اس کے روزگار میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔

ارباط سٹریٹ کے عین درمیان میں دستکاریوں، نوادرات اور سیاحوں کی دلچسپی کے جو سامان تھے، وہیں ڈیڈی سے کچھ رقم مستعار لے کر اس نے ایک کھوکھا حاصل کرلیا تھا اور وہاں اس نے اپنے تلخ ماضی اور گم شدہ بازو کو نمائش پر رکھ کر برائے فروخت کر دیا...سمور کی روسی ٹوپیاں جن پر سرخ ستارہ آویزاں تھا..افغانستان کی جنگ میں استعمال شدہ اور پھر ہلاک کر دیئے جانے والے فوجیوں کے بوٹ..ان کی وردیاں جن پر بہادری کے سرخ تمغے سجے تھے..مجاہدین کی تصویریں،

ناکارہ پستولیں، ٹھس ہو چکے ہینڈ گرنیڈ..اونٹوں کے کجاوے چائے خانوں کی پیالیاں..افغان پگڑیاں..اور پیتل کے لمبوترے راکٹ شیل..اور بامیان کے بدھ مجسموں کی تصویریں.....وہاں ارباط سٹریٹ میں اگرچہ کچھ اور لوگ بھی افغان جنگ کے نوادرات سجائے بیٹھے تھے لیکن بورس کو اُن پر اپنے گم شدہ بازو کی برتری حاصل تھی..وہ فوقیت رکھتا تھا۔

وہ قریب سے گزرتے سیاحوں کو متوجہ کرنے کی خاطر اپنی آستین میں پوشیدہ دائیں بازو کا ٹُنڈ ظاہر کرتا اور ایک سوگوار لہجے میں اُن سے مخاطب ہوتا..آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں افغان جنگ میں شامل رہا ہوں جس کے نتیجے میں مجھے اپنا ایک بازو کھونا پڑا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں..

یہ بریدہ بازو..کٹ چکا..کسی دھماکے میں اڑ چکا..گمشدہ بازو گویا صداقت کی آخری مُہر تھا..

اکثر سیاح ٹھہر جاتے..

اور بورس ان سیاحوں کی قومیت اور نفسیات کی پرکھ کر کے اپنے عظیم بدنی نقصان کی داستان میں ردوبدل کرتا رہتا..جب ہم دریائے آرمو کے پار افغانستان میں داخل ہوئے ہیں تو نزدیکی پہاڑیوں میں سے ایک راکٹ ہم پر فائر ہوا جو..میں کابل کے ایک قدیم قہوہ خانے میں مخمور تھا جب ایک سفید داڑھی والے پادری دکھائی دینے والے بزرگ نے جو ایک چوغے میں ملبوس تھے، انہوں نے اپنے چوغے کی جیب میں سے ایک ہینڈ گرنیڈ نکالا، میری قہوہ کی پیالی میں رکھا اور خود رفو چکر ہو گئے..یا پھر ایک سٹنگر میزائل شُوکتی ہوئی ہمارے ہیلی کاپٹر کا پیچھا کرنے لگی اور وہ آگ کے شعلوں میں بھڑکتا گرتا چلا گیا..

ان قصوں کی اثر انگیزی میں دم بخود سیاح اس کے لئے اتنا رنجیدہ ہوتے کہ وہ بہرطور کوئی نہ کوئی سووینئر خرید لیتے۔

وہ ہر سیاح کے چہرے کو پرکھ کر اپنے بازو کے کھو جانے کے قصے میں حسب منشا ردوبدل کرتا رہتا..

''آپ مجھے قائل کر لو ڈیڈی کہ..کیوں نہیں۔''

''بس نہیں...''

''میں کبھی بھی آپ کو سمجھ نہیں سکا ڈیڈی..میں نے ایک سادہ سی قابل فہم کاروباری تجویز آپ کے سامنے رکھی ہے اور آپ یوں انکار میں سر ہلاتے ہیں جیسے میں نے کسی کو پھانسی دینے کے لئے آپ سے رسّہ مانگ لیا ہو..آپ کے پاس اُس تہہ خانے میں اب بھی سینکڑوں کے حساب سے مجسمے موجود ہیں تو آپ ان میں سے ایک مناسب معاوضے کی ادائیگی پر میرے ہاتھ کیوں فروخت نہیں کر دیتے..مجھے معلوم ہے کہ میں ارباط سٹریٹ میں اسے آسانی سے نہایت معقول رقم کے عوض کسی امریکی سیاح کو بیچ سکوں گا..''

''تم..لینن کے ایک مجسمے کو بھرے بازار میں فروخت کرنا چاہتے ہو'' ظہیرالدین نے بے چارگی کی کیفیت میں اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور پھر سر جھٹک کر انہیں گود میں سمیٹ لیا'' جس طرح..جیسے..کوئی گل دان یا ٹی شرٹ فروخت کرتے ہیں، صرف منافع کی خاطر..''

''آپ بھی تو یہی کچھ کر رہے ہیں۔''

''میں..'' وہ گویا ایک دیوار کے ساتھ جا لگا اور پسپائی اختیار کرنا بھی چاہے تو پیچھے ہٹنے کی کچھ گنجائش نہ تھی ''میں انہیں بر سرِ عام رسوا تو نہیں کرتا.. میں انہیں ڈھال کر.. وارث چوہدری کی فاؤنڈری میں.. اور مارکیٹ اکانومی کے اصولوں کے مطابق مجبوراً ان سے صلیبیں ڈھالتا ہوں.. میں انہیں..'' اسے اپنے دفاع کے لئے کچھ نہ سوجھ رہا تھا..

''ڈیڈی.. میں بھی آپ ہی کی طرح مارکیٹ اکانومی کے اصولوں کے مطابق ان مجسموں کو فروخت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی مانگ ہے.. آپ اپنے بیٹے کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے.. آپ نہیں چاہتے کہ میں لاکھ دو لاکھ روبل کما کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکوں..''

نہ اُس کے پاس بورس کی اس مناسب کاروباری تجویز کو رد کرنے کا کوئی جواز تھا اور نہ ہی وہ ایک پتھر دل باپ ہونا چاہتا تھا کہ ایک باپ کے طور پر وہ یوں بھی اتنا پسندیدہ نہ رہا تھا چنانچہ..

ارباط سٹریٹ کے عین درمیان میں، سرخ چوک کی قربت میں.. وہاں اس کا بدن حنوط شدہ حالت میں پڑا تھا اور یہاں اُس کا مجسمہ سربلند ہوتا تھا..

صرف وہی ایک مجسمہ نہیں، اس کی فوری فروخت کے بعد متعدد لینن وہاں آویزاں ہوئے کہ امریکی سیاح ان کے حصول کے لئے مرے جاتے تھے، منہ مانگی قیمت ڈالروں میں ادا کر کے انہیں جہازی سائز کے کریٹوں میں پیک کر کے بیک ہوم شِپ کر دیتے تھے اور یوں کامریڈ لینن جس کا نظام جیتے جی تو اُن ساحلوں کے نزدیک نہ آ سکا اب مردہ ہو کر مجسموں کی صورت میں زرد شیطان کے اس ملک امریکہ میں پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر داخل ہونے لگا.. اُسے عالیشان گھروں کے سوئمنگ پولز کے کناروں پر.. وسیع گھریلو باغوں میں، کہیں نواڈا اور کہیں فلوریڈا میں زیبائش کے طور پر ایستادہ کیا جانے لگا.. ٹیکساس کے ایک کروڑ پتی نے اسے اپنی رہائش گاہ کے صدر دروازے کے باہر نصب کر کے اس کے سینے پر ایک تختی آویزاں کر دی.. ''یہاں کمیونزم اور کتوں کا داخلہ منع ہے.. ایک چوکیدار کے طور پر میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں.. ازطرف ولاڈے میر لینن..'' لاس ویگاس کے ایک قمار خانے کے باہر رنگین فواروں اور زرق برق روشنیوں میں وہ ایستادہ تھا اور تماش بینوں کو اندر آ کر جوا کھیلنے اور طوائفوں کے ساتھ کھل کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ نیویارک کی ایک بلند عمارت کی چھت پر وہ بازو پھیلائے کھڑا تھا ایک تضحیک آمیز زیبائش کی صورت.. وہ جس نظام کے خلاف اُسے ملیامیٹ کر دینے کی جدوجہد کرتا رہا تھا وہ اسی نظام میں اب ایک بیکار آرائش ہو چکا تھا.. اور اس تہذیب یافتہ سرمایہ داری کی سلطنت میں بھی وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست نہ کر سکا.. وہ ڈھیلی اور بدوضع ہی رہی..

بورس دیکھتے ہی دیکھتے اتنا خوشحال ہو گیا کہ اب وہ ارباط سٹریٹ کے داخلے پر اپنی سیاہ مرسڈیس سے اترتا.. وہ ایک مناسب رقبے کا ڈاچا بھی خرید چکا تھا.. اُسے اپنے گمشدہ بازو کا کچھ غم نہ رہا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ کبھی اتنا خوشحال نہ ہوتا.. افغانستان کی جنگ کم از کم اس روسی کے لئے سودمند ثابت ہوئی تھی..

●○●○●○●

آج اُسے دریائے راوی کے پار جانا تھا..اپنے کچھ گم گشتہ قریبی عزیزوں سے ملاقات کرنے...

وہ اب بھی کسی ایک شب اُسی خواب میں چلی جاتی..

ایک تنگ گلی..ایک دوسرے کا سہارا لیتے مشرقی قدامت میں گم، اداسی اور وقت کی پہنائیوں میں ڈوبے ہوئے مکان..شکستہ جھروکے، جن کی چھتوں کی گولائی میں سے اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور دھوپ ان شگافوں میں سے تاریک گھروں کے اندر سرائت کرنے کی کوشش میں دم توڑ جاتی تھی اور وہ تنگ گلی..اُس کی موسموں اور زمانوں کی ماری ہوئی اینٹیں جن میں سے اس کی نظروں کے سامنے بوٹے پھوٹتے تھے، شاخیں نمودار ہو کر ہرے پتوں سے بھر جاتی تھیں اور وہاں ایک مکان کی رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے ایک الوہی سرخ روشنی بہتی چلی آتی تھی اور اُس کے خوابیدہ بدن کے پور پور میں رچ کر اسے سرخی میں نہلا دیتی تھی۔

تو آج اسے راوی کے پار اپنے گمشدہ عزیز و اقارب سے ملاقات کے لئے جانا تھا..

وہ تو گمان بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ اب تک ہزاروں برسوں بعد بھی..اسی شہر لاہور کے گدلے اور غلیظ ہو چکے دریائے راوی کے دوسرے کنارے پر خیمہ زن ہیں، ان کی موجودگی کی خبر اسے ابھی دو روز پیشتر ہوئی تھی...اس کے سفری تھیلے میں اگرچہ خانہ بدوش گیتوں، زبان کے مآخذ، ان کی جڑوں کی دریافت کے بے انت قصے محفوظ تھے لیکن ابھی دو روز پیشتر اُس کم سِن نوجوان نے اسے فون کر کے اطلاع کی تھی کہ آپ آج کا انگریزی اخبار ''ڈان'' دیکھ لیجیے گا اس میں آپ کی دلچسپی کا کچھ سامان ہے..یہ سامان ایک تحقیقی مضمون کی صورت میں تھا جو کسی پاکستانی مجید شیخ نے ''اے واک وِد جپسی ہسٹری'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا اور اسے پڑھتے ہوئے وہ ایسے ہیجان اور لذت آمیز جذبوں سے دوچار ہوئی تھی جو صرف جنسی انبساط کی صورت میں ہی جنم لیتے ہیں..یہ تحقیقی مضمون جو اس کے آباؤ اجداد کے حوالے سے تھا، قدرت کی جانب سے ایک اشارہ تھا..اگرچہ اس کا مصنف شیخ تو آگاہ نہ تھا کہ وہ انجانے میں شہر لاہور میں قیام پذیر بوداپسٹ کی ایک جپسی کے لئے ایک تحریری نقشہ تخلیق کر رہا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے گم گشتہ عزیزوں سے ملاقات کے لئے کوچہ کمانگراں سے نکل کھڑی ہو گی۔

بابو صابو اور محمود بوٹی کے بند کے پہلو میں کسی زمانے کا پاروشنی اور ایراوتی، اور آج کا دریائے راوی ان دنوں ایک مختصر گندے نالے کی صورت اختیار کر چکا تھا جو ریت پر شاید بہتا نہ تھا، تھما ہوا لگتا تھا اور شائبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ برسات کے دنوں میں یہی نالہ ایک منہ زور دریا کی صورت اختیار کر جاتا ہے..اپنے اوپر ایستادہ پلوں کے ستونوں کو ڈبوتا ان پلوں پر

سے گزرتی ٹریفک پر چھلک جانے کو ہوتا ہے..

اس کے ریتلے پھیلاؤ کو پار کرتے ہوئے..اُس ریت میں سے بمشکل اپنے جوگرشدہ پاؤں کھینچ کر نکالتے ہوئے جینا اسلام کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ وقت کی غار میں الٹے قدموں چلی جاتی ہے..

مقامی لوگ ان خانہ بدوشوں کو چنگڑوں کا نام دیتے تھے اور اس شہر میں چنگڑوں کا ایک محلّہ ابھی تک چلا آتا تھا..

جہاں کہیں بھی خانہ بدوش مقامی آبادی سے کٹے ہوئے سینکڑوں برسوں سے اپنی الگ تھلگ دنیا میں حیات کرتے تھے، مشرقی یورپ اور ہسپانیہ میں ان کے بارے میں حتمی تحقیق ہو چکی ہے کہ ان کا آبائی وطن راجستھان، ملتان، سرگودھا، شیخوپورہ اور لاہور تھا اور وہ پانچ دریاؤں کی سرزمین کے باشندے تھے..درحقیقت یہی ذلتوں کے مارے دھتکارے ہوئے لوگ تھے جن کے ساتھ اب بھی ہندوستان، پاکستان، ایران، ترکی اور جرمنی وغیرہ میں جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا..انہیں ہر برائی کی جڑ گردان کر ان کی جڑیں اکھاڑنے کی کوشش کی جاتی تھی اور اس کے باوجود ان کی جڑیں پھر سے پھوٹنے لگتی تھیں..یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ جہاں نازیوں نے یہودیوں کو نابود کیا، وہاں ایک اندازے کے مطابق ان سے بڑھ کر مشرقی یورپ کے خانہ بدوشوں کو بے دردی سے ہلاک کیا لیکن ان کا تذکرہ جنگی مظالم کی فہرست میں کم ہی ملتا ہے کہ جپسی لوگوں میں ان کے اپنے تاریخ نویس نہ تھے، جو اس قتل عام کا حساب درج کر کے دنیا بھر سے ہمدردی کے خواہاں ہوتے..اور نہ ہی وہ مالی طور پر اتنے آسودہ تھے کہ میڈیا پر اثر انداز ہو کر دن رات اپنے اوپر کئے جانے والے مظالم کی تشہیر کرتے یا اپنے ہلاک شدگان کے لئے شاندار یادگاریں تعمیر کرتے۔ چنانچہ وہ تاریک راہوں میں مارے گئے اور گمنام رہے۔

بے شک مغرب ان سے گریز کرتا رہا..انہیں ہر برائی اور بدمعاشی کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا لیکن اس کے باوجود وہ ہولے ہولے یورپی نسل میں اپنا خون یوں داخل کرنے لگے کہ آج بھی بہت سے انگریز نام ان کے خون کی سرائت کی گواہی دیتے ہیں، جوسویل، بک لینڈ، ہیرن، لی، لوول، ینگ، ڈُڈ اور سمتھ ایسے ناموں کا سرچشمہ جپسی خون ہے..صرف یورپ میں ہی نہیں بیشتر ترک نام بھی خانہ بدوشوں کی نسل کا تسلسل ہیں..ایک برطانوی تحقیقی ادارے ''رومانے اینڈ ٹریول فیملی ہسٹری آف برٹن'' نے ابھی حال ہی میں برسوں کی تحقیق پر مبنی ایک چونکا دینے والی رپورٹ مرتب کی ہے..راوی کے کنارے پر خیمہ زن چنگڑوں کے خون کے سیمپل حاصل کیے گئے، ان کا تجزیہ کیا گیا تو وہ روم کے نواح میں آباد جپسیوں کے خون سے سوفیصد میچ کرتا تھا..وہ..ایک ہی نسل کے لوگ تھے..

اس سویر جب جینا اسلام راوی کی خشک ہو چکی گزرگاہ کی ریت میں سے بمشکل اپنے پاؤں نکالتی پار گئی تو وہاں چیتھڑوں اور غلیظ دھجیوں سے بنے ہوئے سراسیمہ کچھوؤں کی مانند کناروں پر ایستادہ چنگڑوں کے خیمے صبح کی دھوپ میں تھے اور ان کی ساخت ایران، ترکی اور مشرقی یورپ میں آباد جپسی خیموں سے مکمل مشابہت رکھتی تھی..

اُن عُسرت زدہ رنگا رنگ دھجیوں کے پیوندوں سے بنائے گئے خیموں پر جب اس کی نظر پڑی تو جینا کے میوہسپتال کے باہر ایک ریڑھی سے تیس روپے میں خریدے ہوئے سیکنڈ ہینڈ بریزیئر کے اندر جو دل تھا، وہ بری طرح دھڑکا..جیسے ایک مدت کی مسافتوں کے بعد اُسے وہ گھر نظر آ گیا ہو جہاں سے سینکڑوں برس پیشتر وہ نکلی تھی، دربدر ہوتی

رہی تھی اوراب واپس آ گئی تھی.. جیسے اُن میں سے کسی ایک چیتھڑا خیمے کے اندر اُس کی ماں.... منتظر ہو..

نہ صرف یورپ اور پاکستان کے خانہ بدوشوں کا خون ایک تھا بلکہ ان کی بے دریغ اور مسلسل بچے پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ایک تھی.. ان درجنوں پیوند زدہ خیموں کے اردگرد بے شمار بچے جن میں سے بیشتر ننگ دھڑنگ تھے، ادھم مچاتے، چیختے چلاتے، کبھی کوڑے کے ڈھیروں میں سے کچھ دریافت کر کے اسے منہ میں ڈالتے اور کبھی انگلیاں غلیظ ناکوں میں گھماتے بھاگتے پھرتے تھے.. ایک میم صاحب کو خیموں کی جانب آتے دیکھ کر وہ سب متوجہ ہو کر اس کے اردگرد منڈلانے لگے..

''ہیلو..'' جینا نے جھک کر ان میں سے ایک جو سیاہ کیوپڈ کی مانند برہنہ اور دل کش تھا، اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور وہ اس التفات سے گھبرا کر بھاگ نکلا..

وہاں بیس کے لگ بھگ پھٹے پرانے اور خاصے غلیظ ہو چکے خیمے ایستادہ تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو وہ ایک ہی قبیلے کے افراد ہیں کہ چنگڑوں میں بھی مختلف ذاتیں اور گوتیں پائی جاتی تھیں اور یا پھر وہ سب ایک ہی خاندان کے تھے جو اجتماعی طور پر حرکت کرتے تھے.. ان خیموں سے ذرا فاصلے پر کچھ چنگڑ مرد نہایت کسرتی آبنوسی بدنوں والے پٹ سن کی پرانی استعمال شدہ بوریوں کو قینچیوں سے کاٹ کر.. ان کے ٹکڑوں سے چھوٹے چھوٹے ٹاٹ کے تھیلے سی رہے تھے.. اگرچہ ٹاٹ کے یہ تھیلے کسی زمانے میں ہر سائیکل کے ہینڈل سے لٹکتے اُس کا لازمی جزو ہوا کرتے تھے اور گوشت، سبزی، پھل فروٹ وغیرہ بازار سے لانے کے لئے استعمال ہوتے تھے لیکن ان دنوں یہ شہر میں تو کسی حد تک متروک ہو چکے تھے البتہ دیہات میں ان کی اب بھی مانگ تھی.. اُن کے برابر میں ایک خشخشی داڑھی والا بوڑھا چنگڑ کسی چیتھڑے سے بنائی ہوئی ابتدائی نیکر میں ملبوس بکرے کی جھلجی اور ابھی تک پھولی ہوئی اوجھڑی میں سے گند بلا نکال رہا تھا.. وہ اوجھڑی اپنے اندر جمع پچھلے کئی روز سے کھائی جانے والی خوراک کے بدبودار ملغوبے سے خالی ہونے سے پچک رہی تھی.. اس بوڑھے چنگڑ کی شکل شباہت آسٹریلیا کے آبائی ابورجینز باشندوں سے بہت ملتی جلتی تھی..

درجن بھر غل کرتے بچوں کے جلو میں اور ان میں وہ سیاہ کیوپڈ پھر سے آ شامل ہوا تھا، جینا اسلام اُس بوڑھے چنگڑ کی جانب بڑھنے لگی.. کسی ایک بچّے نے اسے ڈھیرو کے نام سے پکارا تو وہ اپنی جانب آتے اس ہجوم اور اس کے درمیان میں آویزاں حرکت کرتی اس سفید فام عورت کی جانب متوجہ ہو گیا جو مسکراتی چلی آتی تھی.. اس نے اوجھڑی کے ملغوبے سے لتھڑے ہوئے ہاتھ اپنی نیکر پر پونچھے۔ پھر انہی ہاتھوں سے اپنی خشخشی داڑھی کو سنوارنے کی کوشش کرتے دانت نمایاں کرنے لگا اور اکڑوں کھڑا ہو گیا۔

''فوٹو فوٹو..'' اس نے جینا کو پیشکش کی۔

''نو نو..'' جینا نے سر ہلایا ''نو فوٹو..''

یہ پیشکش مسترد کیے جانے پر اُس نے اپنے دانت فوراً سمیٹ لئے اور اس کی گھنگھریالی داڑھی میں اس کا چہرہ قدرے افسردہ ہو گیا۔

وہ لاہور میں جہاں کہیں بھی جانکلتی اور کسی دلچسپ دکھائی دیتے کردار سے سوال جواب کرنے کی آرزومند ہوتی

تو فوری طور پر متعدد مترجم حضرات نمودار ہو کر اپنی خدمات پیش کر دیتے..اس کے ساتھ فلرٹ کرتے ہوئے وہ کردار پنجابی میں جو کچھ کہہ رہا ہوتا اس کا بری بھلی انگریزی میں ترجمہ کرتے جاتے لیکن یہاں..یہ سہولت میسر نہ تھی..کہنا تو اسے یہ تھا کہ اے بابا میں بہت دور کے دیسوں سے آئی ہوں، اپنے بزرگوں کی جنم بھومی کی زیارت کرنے، اس چوکھٹ پر سر جھکانے جس کے اندر سے ہم نکلے اور پورے جہان میں بکھر گئے، اور تم سے ملاقات کرنے کہ تم میرے سگے ہو..میرا خون اور میرا قبیلہ ہو لیکن یہ سب کچھ اشارے کنائے میں بیان کرنا تو ممکن نہ تھا تو اس نے ذرا جھجک کر ایک قدم آگے ہو کر بوڑھے کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا ''السلام علیکم..''

یہ طلسمی منتر ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتا تھا اور یہاں بھی اس نے اپنا کام دکھا دیا، بوڑھے چنگڑ کی مایوسی اور بیگانگی رخصت ہو گئی اور اس نے پھر سے اپنے دانت نمایاں کر دیئے ''وعلیکم السلام..''

اُسے محسوس ہوا کہ یہ بوڑھا چنگڑ ابھی تک جنسی طور پر توانا ہے کہ وہ اس کی ہوس کو اپنی ہتھیلی میں سرائت کرتے محسوس کر رہی تھی اور وہ اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا..

بمشکل اس نے اپنا ہاتھ اس کے سیاہ پنجے کی گرفت سے الگ کیا اور ادھڑی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا ''یہ..یہ..کیا ہے؟'' اپنی اردو کی ٹوٹ پھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ..'' بوڑھے چنگڑ نے نہایت الفت سے دانے دار اوجھڑی کے لجلجے ماس پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے وہ ریشم کا کوئی لبادہ ہو..''وری گڈ..وری گڈ..'' اور بوڑھے ڈھیرو نے اپنا ایک ہاتھ اکڑا کر مظاہرہ کیا کہ اس کے کھانے سے کیا وری گڈ ہو جاتا ہے..

''ڈرٹی اولڈ مین..'' جینا بڑبڑائی..لیکن وہ شکائت نہ کر سکتی تھی کہ اس کے اپنے روما جپسی بوڑھے بھی بیشتر ڈرٹی اولڈ مین تھے..ایک اور ثبوت کہ نسل واقعی ایک تھی..

اس دوران ٹاٹ کے تھیلے بنانے میں مصروف متعدد چنگڑ یہ تماشا دیکھنے کے لئے ان کے گرد ہجوم کرنے لگے..

وہ کسی ایک خیمے میں جھانکنا یا جانا چاہتی تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے آباؤ اجداد کے گھر کیسے تھے..

''گھر..تمہارا گھر..'' جینا نے اسی مخرب الاخلاق بوڑھے سے استفسار کیا اور وہ فوراً اس کا مدعا جان گیا ''گڈ..وری گڈ..'' اوجھڑی کو ایک غلیظ چادر پر پھیلا کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی داڑھی کو سنوارا اور اسے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے خیموں کی جانب چلنے لگا..ٹاٹ کے تھیلے بنانے والے چنگڑ بابا ڈھیرو کی جانب کچھ فحش اشارے کرتے ہنستے ہوئے واپس اپنی بوریوں کی جانب چلے گئے البتہ بچوں کا شور و غل بدستور ہمراہ چلا آیا..

اُس کا ڈھیرو چنگڑ کا گھر بھی تراشے ہوئے بانسوں کی قوسوں پر مڑا ہوا چیتھڑوں کا ایک خیمہ تھا اور اس میں بھی جا بجا سوراخ تھے..

''میں..'' جینا رک گئی..''اندر..چلی جاؤں۔''

ڈھیرو چنگڑ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اپنا بازو اس کے راستے میں حائل کر دیا اور جینا جھجک کر پیچھے سرک گئی کہ شائد وہ دوبارہ سے اس کا ہاتھ جکڑنا چاہتا ہے لیکن ڈھیرو چنگڑ کی سیاہ آنکھوں میں ہوس کی سرخی نہ تھی، غرض تھی..

''سوروپے..سوروپے۔''
یہ لوگ کیوں ہر سفید فام کی چمڑی ادھیڑ لینا چاہتے ہیں..اسے بہر طور بہت امیر سمجھتے ہیں اور اس سے پیسے بٹورنا چاہتے ہیں..وہ اس حکمت عملی سے خوب آگاہ تھی اور اس سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتی تھی..''نو..دس روپے..او کے؟''
ڈھیرو چنگڑ نے فوراً دس کا نوٹ دبوچ لیا ''او کے..''
یہ کیسے خون کے رشتے ہیں..جینا دل ہی دل میں مسکرائی..جو اپنے گھر کے اندر آنے کے لئے رقم کا تقاضا کرتے ہیں..
دھجیوں بھرے خیمے کے داخلے پر ٹاٹ کا ایک پردہ گرا ہوا تھا جسے نوٹ وصول کرنے کے بعد ڈھیرو بابا نے بخوشی اٹھا دیا..جینا کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر جانے کا عندیہ دیا اور اس ہاتھ کو ذرا دیر اُس کی پشت پر رہنے دیا..
وہ جھک کر اندر داخل ہوئی اور وہاں صرف چیتھڑوں کی غلاظت کی مہک ہی نہ تھی ایک اور متلی آور بُو بھی تھی جس میں سانس لینا مشکل ہونے لگا..ایک میلے کچیلے..میل سے سیاہ ہو چکے گدیلے پر..مٹی سے اٹے ہوئے بھورے غلیظ بالوں والی فربہ، موٹے ناک نقشے والی ایک نیم سیاہ عورت پھسکڑا مارے ہوئے سلور کی ایک پچکی ہوئی پرات پر جھکی بند مٹھیوں سے آٹا گوندھ رہی تھی..
جینا کا دل..ایک مرتبہ پھر..اُس میو ہسپتال کے فٹ پاتھ کی ریڑھی پر سے تیس روپے میں خریدے گئے سیکنڈ ہینڈ بریزیئر کے اندر نہ صرف دھڑکا بلکہ تھمنے کو آیا..ماما رَوجا..
اگر اس کی چُر مُر میلی کچیلی، ادھڑتی ہوئی، پیوند زدہ پھولدار شلوار قمیض کی جگہ ایک گلابی بلاؤز اور سیاہ گھیرے دار سکرٹ ہوتا..اُس کی نیم سیاہ رنگت کو نچوڑ کر اس میں کچھ سفیدی گھول دی جاتی اور یہ یہاں نہ ہوتی بابو صابو سے پرے محمود بوٹی کے بند کے پار راوی کے کناروں پر..ڈینیوب کے کناروں پر ہوتی تو..ماما روجا ہوتی..
یہ مماثلت نہ تو تصوّراتی تھی اور نہ ہی اس میں کسی ایسی تمنا کا پرتو تھا کہ اس نے بہر صورت اپنے ڈینیوب اور اس راوی کے کناروں پر عارضی طور پر خیمہ زن ان چنگڑوں سے بہر طور رشتہ جوڑنا تھا کہ یہ مماثلت وہاں تھی..
''نوٹو..'' اس نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھولیں جن پر گیلا آٹا لیپ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی پیسے کی ایک حرص تھی..
''نو فوٹو..'' جینا ہنس دی..''ماما..نو فوٹو۔'' اور ہنستے ہنستے اس سے لپٹ گئی، نہ تو اسے اس کے غلاظت بھرے سراپے سے کچھ گھن آئی اور نہ ہی اس کے میل بھرے بدن میں سے اٹھتی ہوئی کوئی بُو آئی..وہ عورت ڈھیرو چنگڑ کی عورت جس کا نام شانی تھا، جینا کی غیر متوقع لپیٹ میں آ کر قدرے خوفزدہ ہو گئی کہ یہ گوری جانے کیوں ایک چڑیل کی مانند مجھ سے چمٹی جا رہی ہے اور اس نے اسے اپنے آٹے بھرے ہاتھوں سے ذرا پرے دھکیل دیا۔
جینا ہنستے ہنستے ابھی تک دوہری ہوئی جاتی تھی۔
چنگڑ لوگ تو اہمات کے اسیر ہوتے ہیں اور بے چاری شانی کے تو ہوش ہوا ہوئے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی سفید بھوت پریت ہے جو مجھ سے چمٹا جاتا ہے اور سرک کر خوف سے چوڑی ہو چکی آنکھوں سے اُسے دیکھتی خیمے کے کونے میں جا دبکی..
وہ دن بھر مقبرہ جہانگیر کے گرد و نواح میں گداگری کرتی رہی تھی اور پلاسٹک کے ایک شاپر میں باسی چاولوں اور

مختلف سالنوں کا ایک ملغوبہ سا تھا جو اسے گھروں کے باہر صدائیں دینے پر ملا تھا..ڈھیرو کو چاول پسند نہ تھے اس لئے وہ رات کے کھانے کے لئے آٹا گوندھ رہی تھی۔اب اُسے اِس سفید بلا نے آلیا تھا..یہ نہ تو اس کی فوٹو اتارتی تھی اور نہ کچھ کہتی تھی، بس ہنستی چلی جاتی تھی..اس نے دہشت زدہ ہو کر گلا پھاڑ کر ڈھیرو کو پکارا اور وہ خیمے کے باہر گویا اسی پکار کا منتظر تھا.. جھپ سے اندر چلا آیا۔

''او کے..او کے..'' جینا نے اسے ڈھارس دینے کی خاطر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے لیکن اس کی الفت بھری ہنسی تھمنے میں نہ آتی تھی ''میں جاتی ہوں۔''

وہ جانے کے لئے ایک قدم آگے ہوئی اور پھر یکدم پلٹ کر کونے میں سہمی شانی کے سیاہ بدبودار میلے گالوں پر ایک پرشور اور گیلا بوسہ دے کر بلند آواز میں ''ماما'' کہا اور ہنستی ہوئی خیمے سے نکل گئی۔

اُس شب..اُس کے جوگرز کے تلوؤں سے ریت کے ذرّے چمٹے ہوئے تھے اور جبین پر گوندھے جانے والے آٹے کے سفید خشک ہو چکے دھبّے تھے اور رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے نیچے قدیم شہر کی بستی کہما گہمی میں قلچوں والے تندور میں سے کسی پنجابی لوک گیت کے بول ہوا کے دوش پر چلے آتے تھے۔قمیض تیری کالی تے سوہنے پُھلاں والی..تو وہ یکدم پھر سے ہنسنے لگی اور اپنی ریتلی تھکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی یادداشت کی تختی پر خانہ بدوشوں کے انداز میں ایک گیت رقم کرنے لگی..

''تم کہاں ہو ماما زوجا؟
بوداپیسٹ میں ڈینیوب کے نیلے کناروں پر..
یا راوی کی ریت پر..اپنا چیتھڑا خیمہ تانے..
آٹا گوندھتی ہو..
خانہ بدوشوں کے مقدر بھی خانہ بدوش ہوتے ہیں..
سب کی مائیں کسی ایک بستی میں..ایک دریا کنارے ہوتی ہیں..
جب کہ میری ماں..یہاں بھی ہے راوی کی ریت پر..
اور وہاں بھی ہے ڈینیوب کی نیلاہٹ کے قریب
اگرچہ یہ والی نہیں جانتی کہ اُس نے مجھے کبھی..
زمانوں پہلے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا..
نہیں پہچانتی..
پر میں تو اُسے پہچان گئی کہ اُس کے سیاہ بدن میں سے..
مجھے کچے دودھ کی مہک آتی تھی..

خانہ بدوش عورتوں کے سینے فراخ ہوتے ہیں..
اُن کی چھاتیاں منہ اٹھائے درجنوں بچوں کو دودھ پلا سکتی ہیں..
تو وہ راوی کی ماں بھی ایسی ہی تھی..
اگرچہ وہ مجھے پہچان نہ سکی..
پر اس میں اُس کا کچھ دوش نہیں..
ہمارے درمیان صدیوں کی جدائی ہے اور چہرے..
صدیوں کی مسافت پار کر کے کہاں تک جا سکتے ہیں..
رشتوں کی ڈوری چاہے اُس میں کتنی ہی لچک کیوں نہ ہو..
زمانوں کی گزران کو کہاں تک سہار سکتی ہے..
ٹوٹ جاتی ہے..
ڈینیوب کی نیلاہٹ راوی کی گدلاہٹ میں..
گھُل رہی ہے..
اور میری دونوں مائیں ان میں گھُل رہی ہیں..
اور اُس کے سیاہ بدن میں سے مجھے اُس کچے دودھ کی مہک آتی ہے..
جو ماما رَوجا کی چھاتیوں میں سے کبھی پھوٹتا تھا..
اور میں اُن پر مُنہ مارتی تھی..''

●○●○●○●

وہاں اُس تہہ خانے کے اندھیارے پن میں جس کی منقطع ہو چکی بجلی ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھی.. ارباط سٹریٹ کی ایک گلی کے آخری مکان کے پہلو میں سے زیر زمین اترتی سیڑھیوں کے اختتام پر اُس تہہ خانے میں جہاں ابھی پچھلے برس تک کامریڈ لینن کے سینکڑوں مجسمے ہجوم کرتے تھے، کچھ اوندھے پڑے تھے، کچھ اپنی بنیادوں پر قائم تھے اور ان میں سے ہر ایک مجسمے کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی اور بھدی تھی.. کامریڈ لینن کو لاکھوں مجسموں میں ڈھل کر بھی ان میں کسی ایک مجسمے کی خاطر اپنی ٹائی کی گرہ کھول کر اسے دوبارہ باقاعدگی سے باندھنے کا خیال تک نہ آیا.. کیسا بدذوق انسان تھا..

وہاں اس وسیع اندھیارے پن کی ٹھنڈک میں جہاں ابھی پچھلے برس تک سینکڑوں مجسمے ہجوم کرتے تھے، اب اس کی سرد ویرانی میں کامریڈ لینن کا صرف ایک اور آخری مجسمہ اب بھی پرامید کھڑا تھا کہ شاید مزدوروں اور کسانوں کی وہ سلطنت جو میں نے پوری دنیا سے ٹکر لے کر لاکھوں جانوں کے نذرانے دے کر تخلیق کی تھی اور میرے بعد میرے پیش رووں نے ظلم اور جبر کو بھی اس کی تخلیق میں شامل کر لیا اور وہ ایک صدی بھی قائم نہ رہ سکی، اپنے پاؤں پر مسمار ہو گئی.. تو شائد وہ میرے اس مجسمے کے فضا میں بلند ساکت ہاتھ کے سحر سے دوبارہ زندہ ہو جائے.. اس کی ڈھے چکی عمارت کی ہر اینٹ اپنے کھنڈر سے جدا ہو کر خود بخود ایک حسرت تعمیر کی صورت پھر سے بلند ہوتی چلی جائے اور وہ سلطنت پھر سے وجود میں آ جائے.. کامریڈ لینن کا وہ آخری مجسمہ اُس سرد اندھیارے تہہ خانے میں تنہا نہ تھا..

اُس کے قدموں میں ظہیرالدین ایک پجاری کی مانند بیٹھا تھا اور اس کے سفید بال تاریکی میں بھی ظاہر ہوتے تھے..

اس نے ابھی کچھ دیر پہلے کارنیشن کے سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ لینن کے ساکت پاؤں کے قریب رکھا تھا.. لینن کے پاؤں میں جو بوٹ تھے وہ بھی نہایت معمولی درجے کے تھے بلکہ ان کے تسمے بھی اس کی ٹائی کی گرہ کی مانند ڈھیلے اور بے جان تھے.. وہ یقیناً ایک بدذوق انسان تھا..

اس تہہ خانے کی تاریک وسعت میں جہاں ابھی پچھلے برس تک اتنی گنجائش بھی باقی نہ رہی تھی کہ عظیم باپ سٹالن کے متروک شدہ مجسموں میں سے کسی ایک کو بھی وہاں جگہ نصیب ہو جاتی وہاں اب ایک بھائیں بھائیں کرتا خاموش سرد ویرانہ تھا جس کے درمیان میں ولاڈی میر لینن کا آخری مجسمہ ایک ہاتھ سے واسکٹ کے بٹنوں کو چھوتا، دوسرا ہاتھ فضا میں بلند کیے ساکت کھڑا تھا.. اور کامریڈ لینن جو زمانوں کی نبض پہچانتا تھا اس مجسمہ حالت میں بھی جان چکا تھا کہ اس کا بے جان وجود بھی اب کچھ دنوں کا مہمان ہے، اسے بھی اپنے سینکڑوں مجسموں کی مانند بالآخر ڈھل کر دو چار صلیبوں کو جنم دینا ہے، کسی نئے نکور کلیسا کے ماتھے کا جھومر ہو جانا ہے۔

اور ہاں یہ راز صرف وارث چوہدری اور ظہیرالدین کے درمیان پوشیدہ تھا کہ ان مجسموں کے ڈھالنے سے جو

صلیبیں بنائی جائیں گی انہیں مارکٹ کرتے ہوئے قطعی طور پر ان کے مآخذ کا تذکرہ نہیں کرنا کہ یہ کبھی کامریڈ لینن کا فرنچ داڑھی والا چہرہ تھیں، کلیساؤں کے رکھوالے اور متولی یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے کلیسا کے اندر عبادت گزاروں کے سامنے جو صلیب آویزاں ہے وہ دراصل اس بدروح کا چہرہ ہے جس نے اس مقدس ملک کو کمیونزم کے عفریت کے سپرد کر دیا تھا.. یوں وہ عبادت گزار اپنی معصومیت میں پھر سے لینن کے حضور سربسجود ہونے لگیں گے۔ آپ کعبے کے کسی بُت کو ڈھال کر حجر اسود کی صورت تو نہیں دے سکتے..

ظہیر الدین تب، جب وہ پہلی بار اس تہہ خانے میں اتر کر لینن کے مجسّموں کے میلے میں آیا تھا تب ایک شدید کرب میں مبتلا ہوا تھا کہ میں محض مالی منفعت کی خاطر.. اپنے اس نظریئے کے لئے جس کے لئے میں نے عمر گنوا دی، کیسے اس نظریئے کے خدا کے مجسّموں کا بیوپاری ہو جاؤں..اور آج.. جب اس تہہ خانے میں لینن کا آخری مجسّمہ رہ گیا تھا..اور وہ اس کے بھائی بندوں کو فروخت کرتا ایک پُرآسائش حیات سے پہلی بار آشنا ہوا تھا..وہ پھر سے ایک شدید احساسِ جرم کا شکار ہو گیا تھا..

اُس آخری مجسّمے کے پاؤں میں رکھے کارنیشن کے سرخ پھول گویا اُس کے احساسِ جرم کی تلافی کرنے کی خاطر رکھے گئے تھے..ظہیر الدین معافی کا خواستگار تھا..

وہ اس ایک برس میں کامریڈ لینن کے طفیل اپنے خاندان کی نظروں میں بھی محترم ہو گیا تھا..

وہ اپنے نئے اور کسی حد تک پُرتعیش فلیٹ میں داخل ہوتا تو گالینا اپنی جرمنی سے درآمد شدہ خودکار وہیل چیئر میں ایک بیلے رینا کی دبے پاؤں نزاکت کے ساتھ اُس کے قریب آ کر اس کے رخساروں پر ایک بوسہ ثبت کرتی..اور وہ پھر سے ان زمانوں میں سفر کر جاتا..ایک پھولدار فراک..سائیکل کی نشست پر اُس کی پشت انگیختہ..برچ کے جنگلوں میں معدوم ہوتی اور پھر یکدم وہ آج کی گالینا کو اپنے سامنے پاتا.فربہ، مخمور اور بے محبت..اور بے کشش..

ادھر بورس صرف درجن بھر لینن امریکیوں کے ہاتھوں فروخت کر کے اتنا آسودہ ہو گیا تھا کہ اپنے ذاتی فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا..علاوہ ازیں اب وہ ایک ایسا نہایت متحرک اور کارآمد..نقل بہ مطابق اصل جیسا ایک مصنوعی بازو افورڈ کر چکا تھا جو اتنا اصل تھا کہ نہ صرف اُس کی پلاسٹک کی ہتھیلی پر قسمت کی لکیریں تھیں بلکہ انگلیوں کے ناخن بھی قدرے بڑھے ہوئے لگتے تھے..البتہ ارباط سٹریٹ میں کاروباری اوقات کے دوران وہ اپنے اس بازو کو چمڑے کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے ایک بھاری اوورکوٹ کے نیچے پوشیدہ کر دیتا تا کہ وہ اپنے اُس کندھے کی فخریہ نمائش کر سکے جس سے منسلک جو بازو تھا، وہ افغانستان کی جنگ میں کھو گیا تھا..اُس کے سٹال پر افغان جنگ کے فرضی قصّے سننے کے شائق اتنے سیّاح جمع ہو جاتے کہ ارباط سٹریٹ کے دیگر دکاندار بھی خواہش کرنے لگتے کہ کاش ان کا بھی ایک بازو کسی حادثے میں ہی سہی کٹ چکا ہوتا اور وہ اس کی گمشدگی کو افغان جنگ کے پلّے باندھ کر ڈالروں میں خوب کھیلتے۔

ایک امریکی سیّاح لڑکی جو جہاد افغانستان سے بے حد متاثر تھی بورس کی حالت زار سے اتنی دل گرفتہ ہوئی کہ اس نے از خود شادی کی پیشکش کر دی..کوئی دن جاتا تھا جب شمس الدین انقلابی کا سگا پوتا اس امریکی لڑکی کے سہارے ایک امریکی شہری ہو جانے کو تھا..

سویٹ لانا کا ایکٹنگ اور ماڈلنگ کا ملا جلا کیریئر بھی تسلی بخش جا رہا تھا..

سبھی لوگ اپنی اپنی تمناؤں کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو رہے تھے..صرف وہ تھا جو بے یقینی اور لاحاصلی کے سمندروں میں بھٹکتا پھرتا تھا..

صرف وہی تھا جو خسارے میں رہا تھا..

اکثر اُس کے خوابوں میں ہر جانب سفیدی اور نرماہٹ کی پریاں سینکڑوں آک کی بوڑھیاں ڈولنے لگتیں..اُن میں سے کچھ کٹی ہوئی پتنگوں کی مانند اس کی نیم خوابیدہ آنکھوں میں اترنے لگتیں اور ان کے باریک ریشہ وجودوں میں کامریڈ لینن کا حنوط شدہ چہرہ متشکل ہونے لگتا..جیسے وہ کریملن کی دیوار کے سائے میں شیشے کے ایک صندوق میں پڑا تھا اور پھر وہ..کامریڈ لینن یکدم ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا، اسے شکایت بھری..ناراض نظروں سے دیکھتا ہولے سے سرگوشی کرتا..

یُو ٹُو بروٹس..اور ظہیر الدین بھی ہڑ بڑا کر بیدار ہو جاتا..

وہ ایک بجھ چکا دِیا تھا جس میں روشنی بکھیرنے کے لئے نظریات کے تیل کی ایک بوند بھی نہ بچی تھی..اُسے کب کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ اس نئے نظام میں لینن کے مجسموں کی مانند متروک اور بیکار ہو چکا ہے۔ نہ تو اس نظام کو اور نہ ہی اس کے خاندان کو اُس کی ضرورت رہی تھی..وہ ایک استعمال شدہ کنڈوم کی مانند ناکارہ ہو چکا تھا..

وہ ذلت کی آخری حدیں تب عبور کر گیا تھا جب اس نے کامریڈ لینن کو فروخت کرنے کا کاروبار اختیار کر لیا تھا..

اور اب اگر وہ ان آخری سرحدوں کے پار کہیں بھی جانا چاہتا تھا.تو ان کے پار بُورے والا تھا..

●○●○●○●

چائے کی پیالی اُس کی بغیر کسی اشتیاق کے سُرکیوں سے نصف ہو چکی تھی جب اُس نے مسلسل دو تین گھونٹ بھر کر اُسے رکابی میں رکھا تو اُس میں باقی ماندہ چائے ساکت ہونے سے پیشتر ذرا تھرتھرائی اور اُسے ابکائی آنے لگی جسے اُس نے بمشکل مُنہ پر ہاتھ رکھ کر دانت بھینچ کر روکا کہ چائے کی پیالی کا پیندہ بھی گول تھا اور اُس میں دودھ اور پتّی کا ایک مرکب سا نظر آ رہا تھا..اور..نیلے اِگلو پیشاب خانوں کے اندر جو کموڈ تھے اُن کے پیندے بھی ایسی ہی گولائی میں تھے اور اُن میں بھی..

قالب کی زندگی ایک مخصوص طے شدہ منظم ضابطے کے مطابق پچھلے کئی برسوں سے بنا کسی ردوبدل کے بسر ہوتی چلی جاتی تھی..اُس میں خال ہی کوئی معمولی سی تبدیلی ہوتی..وہ دن چڑھے تک اگرچہ اس کے بیڈروم کے گھنے پردوں کے اندر روشنی کا ایک شائبہ بھی نہ گزر سکتا..سوتا رہتا..یوں بھی اُس کی بیشتر راتیں بے خوابی میں بسر ہوتیں..برابر میں بے سُدھ پڑی تانیا کے بے تحاشا پھیل چکے بدن میں سے اٹھنے والی عجیب سی زوال کی بُو..جیسے ایک مُردار کے دھوپ میں سڑتے ہوئے پنجر سے اٹھتی ہے..اُسے سونے نہ دیتی....صرف اُس کے خمیرے آٹے ایسے اپنا مقام چھوڑ چکے گوشت کے اُس تودے میں سے اکثر خاموش اور کبھی با آواز خارج ہونے والی زوال کی بُو ہی اُسے سونے نہ دیتی بلکہ تانیا کے پچکتے کھلتے خرخر کرتے نتھنوں اور کھلے منہ میں سے واڈکا کی بوسیدہ ہو چکی جو سڑاند برآمد ہوتی تھی وہ بھی اُس کی نیند اچاٹ کر دیتی.. واڈکا اپنے اصل میں تو کوئی خاص بُو رکھنے والی شراب نہ تھی لیکن جب وہ تانیا کے تھل تھل کرتے بدن میں اتر کر اُس کے زوال پذیر نظام میں گھل مل کر اُس کے کھلے منہ اور نتھنوں میں سے باہر آتی تو اُس کی بوسیدگی اور ناگواری برداشت سے باہر ہو جاتی..وہ تب اطمینان سے نیند میں جاتا جب وہ صبح سویرے حاجت سے مجبور واش روم میں جاتی اور پھر فارغ ہو کر کچن میں اپنے لئے چار پانچ انڈوں اور پاؤ بھر پنیر پر مشتمل ناشتہ تیار کرنے میں مشغول ہو جاتی..

وہ پچھلے پہر تین بجے کے لگ بھگ اپنے بستر سے الگ ہوتا..دوپہر کا کھانا بھی ترک کر دیتا کہ اُسے کچھ اشتہا نہ ہوتی اور پھر چار بجے کی طے شدہ چائے کے لئے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھتا جہاں اُس کے دونوں بچے بلال اور لیلیٰ تو منتظر ہوتے اور تانیا اور اُس کا سسر سرنوف گفتگو میں اتنے مگن ہوتے کہ اُس کی آمد پر بھی صرف ایک ''ہیلو'' کہنے کے لئے توقف کرتے اور پھر سے سلسلۂ کلام جاری کر دیتے..جیسے ایک پالتو جانور کے نمودار ہونے پر اُس کی پُشت تھپکنے کی خاطر قدرے توقف کرتے ہیں..

وہ بے دلی سے بغیر کسی چاہت کے ڈائننگ ہال پر جو کچھ بھی موجود ہوتا..پین کیک، فرنچ ٹوسٹ، پنیر آملیٹ،

آلو کے قتلے یا ٹھنڈا چکن.. جو بھی.. اپنے حلق میں سے اُتارتا اُس کے ذائقے سے نا آشنا.. محض پیٹ بھرنے کی خاطر.. یہ ناشتہ کرتا اور پھر ایک بے دام غلام کی مانند سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر جا بیٹھتا اور ڈرائیور کی نشست پر دیر سے منتظر جارجین سے کہتا ''چلو..''

اور وہ جارجین جانتا تھا کہ کہاں چلنا ہے.. کہ برسوں سے سمرنوف کے گھرانے میں ملازم تھا اور برسوں سے وہ اُن کے پاکستانی داماد کو ہر دوپہر وہاں وہاں لے جاتا تھا جہاں جہاں اُسے جانا ہوتا تھا..

وہ جانتا تھا کہ پورے ماسکو میں.. تاریخی مقامات پر.. بڑے چوکوں کے کنارے.. سیاحوں کی جہاں کہیں آمدورفت ہوتی ہے.. تقریباً سو کے لگ بھگ ایسے مقام تھے جہاں سمرنوف کے پیشاب خانے اِگلو گھر ایستادہ تھے جن کے باہر براجمان بیشتر بہت فربہ روسی عورتوں سے اُن کے داماد نے دن بھر کی کمائی کا حساب لینا تھا اور یہ وصولی رات گئے تک جاری رہتی تھی..

یہ کوئی مشقت بھرا بدن توڑ کام نہ تھا.. لیکن برس ہا برس سے یہ اکتا دینے والا تسلسل قالب کے حواس پر اثر انداز ہوتا، اُس کے اندر کڑواہٹ بھرتا چلا جاتا تھا اور جب وہ رات گئے.. رُوبلوں سے لدا ہوا.. اپنے سُسر کے ڈاچا میں لوٹتا تو وہ بوڑھا.. کے جی بی کا کبھی کے زمانوں کا آئیون دے ٹیریبل ایک نیم مدہوشی کے عالم میں اُس کا منتظر ہوتا.. ایک شائیلاک کی مانند پائی پائی کا حساب چیک کرتا اور پھر وصول شدہ رقم کو احتیاط سے شمار کر کے اپنے تکیے تلے رکھ کر اُسے اشارہ کرتا کہ ہاں.. تم جا سکتے ہو..

برسوں سے یہی تسلسل چلا آتا تھا..

ماسکو جو اشتراکیت کے زمانوں میں کہیں نہ کہیں تو ختم ہو جاتا تھا اور اُس کے آگے کُھلے کھیت کھلیان، جنگل اور سبزہ زار شروع ہو جاتے تھے، نئے نظام کی اقتصادی برکت سے کہیں بھی ختم نہ ہوتا تھا، پھیلتا چلا جاتا تھا.. بہر حال وہ جہاں کہیں بھی اختتام کو پہنچتا تھا وہاں سے آگے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر صدر پوٹن نے اپنے کے جی بی کے وفاداروں کے لئے سرکاری خزانے سے درجنوں ڈاچا.. فارم ہاؤس یا دیہاتی رہائش گاہیں کہہ لیجئے.. خصوصی طور پر تعمیر کروائے تھے.. جنگلوں میں اِدھر اُدھر بکھرے.. کچھ پوشیدہ، بیشتر عیاں، یہ گھر کچھ زیادہ ذی شان تو نہ تھے لیکن ان زمانوں میں جب کہ ماسکو دنیا کا سب سے مہنگا ترین شہر قرار دیا جا چکا تھا، جہاں صرف ایک کمرے کی چھت کے حصول کے لئے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی تنخواہ بھی ناکافی ثابت ہو رہی تھی.. تو یہ ڈاچا گھر نسبتاً ایک شاہانہ رہائشی سامان تھے.. قالب اور تانیا کی ایک الگ اور نہایت وسیع خوابگاہ تھی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کچن بھی منسلک تھا.. تانیا کے پچھلے خاوند سے جو بچے تھے اور وہ دونوں بیٹیاں تھیں، وہ کب کی شادی شدہ ہو کر رخصت ہو چکی تھیں اور صرف کرسمس کے موقع پر یا یوم مئی کے تہوار پر ایک مشترکہ کھانے میں شریک ہونے کے لئے اپنے خاوندوں اور بچوں کے ہمراہ آ جاتیں.. بلال اور لیلےٰ کے اپنے اپنے خودمختار رہائشی حصے تھے..

قالب نے دوبارہ چائے کی پیالی کے گول پیندے کو دیکھنے سے اجتناب کیا.. وہ بمشکل اپنی ابکائیاں روک سکا تھا کہ اُسے وہ کموڈ دکھائی دینے لگتا تھا جس کا پیندہ یونہی گول اور لبریز تھا..

وہ برسوں سے چپ چاپ، اطاعت گزار اس معمول کے آگے سر جھکائے، اس پر عمل پیرا چلا آیا تھا اور اُسے کچھ شکائت بھی نہ تھی کہ ذاتی طور پر اُس کے پاس نہ کوئی تعلیمی قابلیت تھی اور نہ ہی کوئی ایسی اہلیت جس کے بل بوتے پر وہ کوئی معمولی سی ملازمت بھی حاصل کر سکتا.. یہ سب تانیا سے شادی کرنے کے ثمرات تھے اور وہ اپنے حال پر اب تک قانع اور کسی حد تک مطمئن شخص تھا..

لیکن کل..

ایک وقوعہ ہو گیا..

اُن دس بارہ گھنٹوں کے دوران جب وہ سیاہ مرسیڈس کی پچھلی نشست پر براجمان پیشاب گھروں کی آمدن کی وصولی کرتا تھا، ظاہر ہے اُسے بھی تو حاجت ہو جاتی تھی تو وہ اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی خاطر یا تو انٹرنیشنل سنٹر کے غسل خانوں میں چلا جاتا لیکن کے ایف سی اور میکڈونلڈ کے ٹائلٹ اُس کی ترجیح اول ہوتے کہ ان امریکیوں میں کوئی اور خوبی ہو نہ ہو اُن کے غسل خانے نہایت ستھرے اور بے بُو ہوتے تھے.. شاید کمیونزم کے زوال کی ایک وجہ اُس دور کے غلیظ اور بدبودار غسل خانے بھی تھے لیکن آپ صرف کمیونزم کو الزام نہیں دے سکتے، یہ گندگی اور بدبُو روسی مزاج میں شامل تھی.. وہ پہلو بہ پہلو ایستادہ درجنوں کموڈز پر بیٹھے آپس میں چُہلیں کرتے اپنے آپ کو اکثر با آواز فارغ کرنے میں کچھ قباحت نہ سمجھتے تھے..

لیکن کل..

جب وہ سرخ چوک کے داخلے کے قریب اپنے سُسر کے ایستادہ اِگلو غسل خانوں کی آمدنی وصول کر رہا تھا تو اُس کے مثانے بوجھل ہونے لگے.. اُس نے سوچا کہ ارباط سٹریٹ میں واقع میکڈونلڈ تک جانے کی بجائے کیوں نہ اپنی ذاتی سہولت سے استفادہ کیا جائے.. زندگی میں پہلی بار.. اور وہ فربہ اور یقیناً ٹکٹوں میں ہیر پھیر کرنے والی موٹی روسی عورت جو اُن متعدد اگلو پیشاب خانوں کی نگہبان تھی، اپنے مالک کے داماد کو اُسے نظر انداز کرتے تیسرے نمبر پر جو پیشاب خانہ تھا اُس میں داخل ہوتے دیکھ کر نہایت معتبر محسوس کرنے لگی اور نہایت چابکدستی سے اُس کے اندر داخل ہوتے ہی پلاسٹک کا دروازہ احترام سے بند کر دیا.. نیلے اِگلو گھر کے اندر.. جب دروازہ بند ہو گیا تو اُس کی توقع سے بڑھ کر ایک گھنی تاریکی اتر آئی جس میں اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا.. اور وہاں ایک قے آور بُو اُٹھتی تھی..

قالب نے اُس نیم تاریکی میں اندازہ لگایا کہ کموڈ کہاں واقع ہو سکتا ہے، پتلون کی زِپ نیچے کی اور پھر بہت گہرائی میں اُسے اپنی فراغت کے پانیوں کے گرنے کی.. ملفوف سی گونج سنائی دی..

اُس کے ہونٹوں میں سے اطمینان کی ایک آہ برآمد ہوئی کہ بوجھ دھیرے دھیرے ہلکا ہو رہا تھا..

قالب کی آنکھیں اُس نیم تاریکی سے آشنا ہو کر اشیاء کو پرکھنے کے قابل ہونے لگیں.. پتلون کی زِپ چڑھاتے ہوئے جب اُس نے نیچے نگاہ کی تو کموڈ کا پیندا گولائی میں تھا.. اُس کے نشیب میں آج کے دن جتنے بھی لوگ فارغ ہوئے تھے، اُن میں سے خارج ہونے والے تیزابی آبی مادے اور غلاظتیں نہایت گھنی حالت میں بھری ہوئی تھیں کہ اُنہیں فلش کرنے کا اگر کوئی انتظام تھا تو وہ کام نہ کرتا تھا.. قالب اپنی اُس قے کو روکنے کی سعی میں ناکام ہو گیا جو اُس کے تن بدن میں

کلبلاتی، اُبلتی اُس کے حلق میں سے باہر آنے لگی تھی اور وہ قے اُس غلاظت کے گھنے ڈھیر پر گرنے لگی.. چونکہ وہاں انسانی فضلہ کی بھربھری.. پانی میں گھلتی ایک دبیز تہہ کموڈ کے پیندے میں جمع شدہ تھی اور اُس پر گرتی اُبلتی ہوئی قے کی آواز بھی ملفوف اور مدھم تھی..

چائے کی پیالی کو نظر جھکا کر قالب نے اس لئے دوبارہ نہ دیکھا کہ اُس کا پیندا بھی اُسے کموڈ کی صورت غلاظت سے بھرا نظر آیا تھا.. یہاں بھی ایک بدبودار مرکب دکھائی دیا تھا جس نے اُس کے اندر ایک ابکائی کی اتھل پتھل کو جنم دیا تھا جسے اُس نے بمشکل منہ پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا..

''قالبوف..'' سمرنوف نے اسے مخاطب کیا۔''وصولی کے لئے نکل جانا چاہیے، دیر ہو رہی ہے بیٹے..وقت ہو چکا ہے۔'' وہ جب کبھی اُس پر اپنی سسرانہ شفقت نچھاور کرنے کے موڈ میں ہوتا تو اُسے قالب سے قالبوف کے بلند مرتبے پر فائز کر دیتا..

بلال بظاہر ایک دھیمے مزاج کا نوجوان ہوتا لڑکا تھا لیکن اُس کے رگ و پے میں ایک سرکش گھوڑے کی بے مہار وحشی آزادی کا خون دوڑتا تھا..وہ اپنے نانا کا چہیتا تھا اور اُس کا مزاج بھی رُوسی خصلت میں ڈھلنے لگا تھا..وہ اُس کی قربت میں بے آرام محسوس کرتا شاید اس لئے کہ اُسے ایک ایسا باپ پسند نہ تھا جو خود مختار نہ تھا، اُس کے نانا پر انحصار کرتا تھا..البتہ لیلیٰ اپنے بھائی سے عادت واطوار اور ذہنی سوچ کے حوالے سے کوسوں دور تھی، وہ ہمیشہ اپنے باپ کی قربت کی خواہش مند رہتی..رات گئے جب وہ اپنے وصولی پھیروں سے لوٹتا تو اکثر وہ منتظر جاگ رہی ہوتی.. بیت چکے زمانوں میں جو اُس کا انقلابی شاعر دادا تھا اُس کے قصے سنتی نہ تھکتی اور قالب اپنے باپ کی اولاد کے حوالے سے مجرمانہ غفلتوں اور بے اعتنائیوں کا تذکرہ تک نہ کرتا، صرف اُس کی لاکھوں کے ہجوم میں برق دوڑا دینے والی آتش انگیز شاعری کی کہانیاں سناتا..لیلیٰ میں نہ اپنے حُسن کو نمایاں کرنے کا کوئی رُوسی جذبہ تھا اور نہ ہی وہ آسانی سے دعوتوں کے دوران نوجوانوں میں گھل مل جانے کی صلاحیت رکھتی تھی..اُس کے پورے کردار میں ایک شرماہٹ، جھجک اور اجتناب تھا..وہ اکثر اُس سے لاڈ کرتی ہوئی فرمائش کرتی کہ ڈیڈی کیا کبھی آپ مجھے کبھی اپنے وطن لے جائیں گے..اپنے شہر لاہور لے جائیں گے جس کے بارے میں آپ نے ایک بار ایک عجیب سی بات کہی تھی کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا..اور وہ اُس سے لپٹ کر ہنستے ہوئے کہتی، ڈیڈی..پلیز آپ مجھے پیدا کر دیں..

قالب اُسے کس لاہور میں اور کہاں لے جاتا.. جہاں اُس کی ماں فریادیں کرتی، حکومتی امداد کی طالب ہوتی، اپنے خاوند کی سیاسی جدوجہد اور اُس کی انقلابی شاعری کے واسطے دیتی، کب کی مر چکی تھی..بہنیں جانے کہاں کہاں بیاہی گئی تھیں..اور صرف ایک بھائی تھا..

سردار غالب جو شاید الیکٹریشن تھا یا کیا تھا..

ہر ڈھور ڈنگر کا ایک ٹھکانہ ہوتا ہے جہاں وہ دن بھر اپنا پیٹ گھاس چارے سے بھرنے کے بعد لوٹتا ہے..کہیں نہ کہیں بندھ جاتا ہے..قالب کا ایسا کوئی ٹھکانہ نہ تھا...کوئی ایسی کوٹھڑی نہ تھی جس میں داخل ہو کر وہ دن بھر کی تھکن بھول جاتا کہ میں گھر آ گیا ہوں..ایسا کوئی زمین میں گڑا ہوا چوبی کھونٹا نہ تھا جس کے ساتھ بندھ کر وہ ایک اطمینان بھرے سکون میں

چلا جاتا.. تو وہ لیلے کو کہاں لے جاتا..

''قالبوف..'' اس بار سرنوف کی یاددہانی میں ایک بے صبری تھی ''تم جاتے کیوں نہیں..''

چائے کی پیالی ایک کموڈ تھا جس کے پیندے میں اسے وہی دبیز اور گھنی غلاظت تیرتی نظر آرہی تھی اور اُس نے اس غلاظت کے اخراج سے جمع شدہ رقم کو وصول کرنے کے لئے پچھلے کئی برسوں کی طرح آج بھی جانا ہے.. ''نہیں..'' وہ اِک حالت نافرمانی میں نہیں، قدرے شرمندگی سے اٹھ کھڑا ہوا ''نہیں ڈیڈی..''

سرنوف کی گھنی بھنووں کے کچھ بال تن گئے اور جو اپنے مقام پر رہے اُن میں ایک تشویش تھی..

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں..''

جواب میں قالب نے صرف سر ہلایا اور ایک مجرم کی مانند سر جھکائے کھڑا رہا..

''تو پھر..''

''نہیں ڈیڈی.. آپ مجھ سے کوئی اور خدمت لے لیں.. مجھ سے اپنے ڈاچا کے لان کی گھاس کٹوا لیں.. جس ٹرائیکا گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر آپ سرما کی برفوں میں اپنے ہمسایوں کے ہاں واڈکا پینے جاتے ہیں اُس میں مجھے ایک رُوسی دہقان مزارع کی مانند دو گھوڑوں کے درمیان جوت لیں.... لیکن میں.. آپ کے سینکڑوں اگلو پیشاب گھروں کی آمدنی وصول کرنے کے لئے اب نہیں جاؤں گا.. میں آپ کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں، شکرگزار ہوں لیکن.. نہیں.. کبھی نہیں..''

وہ اِک حالت نافرمانی میں نہیں، قدرے شرمندگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا.. اُس نے پشیمانی میں سر جھکایا اور واپس اپنے بیڈروم میں چلا گیا..

یُوری سرنوف نے بے یقینی میں اپنے سر کو جھٹکا.. یقیناً اُس نے کچھ اور کہا تھا اور وہ کچھ اور سمجھا تھا.. ورنہ یہ اُس کا ناکارہ کسی نہ کام کا داماد جو کولہو میں جُتے بیل کی مانند سر ہلاتا، شکرگزار ہوتا، اُس کے احکام کی پابندی کرتا، کبھی شکائت کا ایک لفظ مُنہ سے ادا نہ کرنے والا.. چلتا جاتا تھا.. تو آج کیا واقعی یہ سرکش ہو گیا ہے یا اس کے دماغ میں کچھ خلل واقع ہو گیا ہے.. اُس نے ایک مرتبہ پھر اُسی بے یقینی میں نہ صرف اپنے سر کو جھٹکا بلکہ ڈائننگ ٹیبل پر اپنی دونوں ہتھیلیاں مار کر کہا ''تانیا.. تمہارے اس خاوند کو کیا ہوا ہے.. یہ کیا واہی تباہی بکنے لگا ہے.. انکاری ہو رہا ہے.. کیا یہ نہیں جانتا کہ اگر وہ ماسکو میں یُوری سرنوف کا داماد نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے.. میرے پیشاب خانوں میں رینگتا ایک لال بیگ بھی نہیں ہے..''

اُسے تانیا کو بھی اپنا پانچواں فرنچ ٹوسٹ کھاتے ہوئے یکدم دھچکا سا لگا تھا کہ قالب یہ کیا کہہ رہا ہے لیکن وہ سنبھل گئی اور جن نظروں سے اُس نے ''میرے پیشاب خانوں میں رینگتا ہوا ایک لال بیگ بھی نہیں'' کے ردعمل میں اپنے باپ کی جانب دیکھا تو یُوری سرنوف نے اُس کی آنکھوں میں اپنی.. آئیون خوفناک کی ایک جھلک دیکھی کہ وہ اُس کی بیٹی تھی ''وہ میرا خاوند ہے ڈیڈی.. ایک لال بیگ نہیں ہے.. اور نہ ہی وہ آپ کے گم شدہ کے جی بی ہیڈکوارٹر کے تاریک تہہ خانوں میں پابند سلاسل ایک مجرم ہے کہ آپ ہمیشہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک ہی کرتے آئے ہیں..''

یُوری سرنوف گُنگ ہو گیا.. بلکہ وہ اپنی بیٹی کے اتنے یکدم شدید ردعمل سے قدرے خوفزدہ ہو گیا.. وہ اُس سے

کہیں بڑھ کر خوفناک لگ رہی تھی۔

یکم مئی کی وہ شب تو آج بھی اُس کے بے ڈول ہو چکے بدن میں کہیں نقش تھی جب وہ دونوں اکارڈین کی رُوسی سرشت میں رچی ہوئی اداسی میں لپٹی ہوئی ایک دُھن پر سرخ چوک کے بیچ رقص کرتے تھے..کریملن کے قدآور شجروں میں سے سائیں سائیں کرتی ابھی تک مئی کے پہلے دن کی سرد ہوا اُن کے پسینہ آلود چہروں پر پھیلتی اُنہیں ٹھنڈک کے بوسے دیتی تھی اور اگلی شام وہ شرمیلا مشرقی لڑکا جس کی رنگت گندمی اور نین نقش مدھ بھرے تھے، اُس کے باپ کے سامنے.. ڈائننگ ٹیبل کی ایک کُرسی پر بیٹھا سکول کے ایک بچے کی مانند گھبراہٹ بھرا مضطرب ہو رہا تھا...اور تب تانیا اور اُس کے باپ کے درمیان ایک خاموش سازش نے جنم لیا..اُس مشرقی لڑکے کی ناتجربہ کاری اور بھولپن کا استحصال کیا جا سکتا ہے، فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے..اُسے تانیا کو..دو بچوں کی ماں کو ایک طلاق یافتہ عورت کو ایک فرمانبردار خاوند میسر آ سکتا ہے اور اُس کے باپ کو ایک سر جھکا کر چلنے والا مددگار..اگرچہ یہ سراسر ایک سہولت کی سازشی شادی تھی جسے چالیس برس ہونے کو آرہے تھے لیکن پچھلے دو تین برسوں میں تانیا اپنی اُس کٹھور سازش کے کانٹے اپنے دل میں چبھتے محسوس کرتی اُس کی جانب واقعی مائل ہوتی چلی گئی تھی کہ وہ کیسا اطاعت گزار، ہمدرد اور معصوم سا انسان تھا اور وہ اُس کے پچھلے بچوں کے لئے کیسا پُرخلوص باپ ثابت ہوا تھا تو وہ مُجرم محسوس کرنے لگی تھی، اُس کے قریب آنے لگی تھی..اگر وہ اس بڑھاپے میں اُس کے لئے ایک شفقت بھری محبت کو اپنے اندر جنم لیتے محسوس کرتی تھی تو اُس کے احساسات ایک ماں سے ملتے جلتے تھے..قالب گویا ایک اور بیٹا تھا..اگرچہ وہ ہمیشہ اپنے باپ کے کہے کو حرفِ آخر سمجھتی لیکن جب کبھی قالب کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ اُس کے دفاع کے لئے کمر بستہ ہو جاتی..

یُوری سمرنوف ایک سیانا شخص تھا، وہ کب سے اپنی بیٹی کی اس ماہیتِ قلب کو محسوس کر رہا تھا لیکن آج اُسے اتنے شدید ردِعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ طیش جو قالب کے انکار اور تانیا کے بھڑک اٹھنے پر اُس کے اندر لاوے کی مانند اُبلا تھا، صورتِ حال کو قابو میں لانے کے لئے اور اپنی بیٹی کی محبت کے باعث یکدم سرد پڑ گیا۔"شائد تم دونوں کو فراغت کے کچھ دن درکار ہیں..تاکہ تم سنبھل سکو..بحیرہ کیسپئن کے ساحلوں پر کچھ روز..بچوں کو میں سنبھال لوں گا۔"

بلال نے کندھے سکیڑ کر..کہ وہ اس چخ چخ سے عاجز آ چکا تھا، اپنے اُس ابلے ہوئے انڈے کو دیکھا جو اس بحث مباحثے کے دوران اپنی نیم حدّت سے رخصت ہو کر ایک سفید پتھر میں تبدیل ہو چکا تھا..

لیلیٰ نے کافی کا آخری گھونٹ بھرا جو یخ ہو چکی تھی اور وہ معذرت کئے بغیر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر اپنے باپ کے پیچھے چلی گئی..

اُس چوڑے اور وسیع فرانس سے درآمد شدہ شاہانہ پلنگ جس کے ہر پائے پر سنہری کیوپڈ کے نقش تیر چلاتے ابھرتے تھے، اُس پر بچھی چینی ریشم کی دبیز منقش..پھولدار چادر پر اُس کی ناک سُبکیاں بھرتی پچکتی اور پھیلتی تھی..وہ اوندھا پڑا سسکیاں لے رہا تھا اور اس کا بدن ہولے ہولے یوں ارتعاش میں تھا جیسے اُس کی جان نکل رہی ہو..

باہر اگرچہ دوپہر ڈھل رہی تھی لیکن بیڈ روم کی کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے دھوپ کی ایک کرن کو بھی

سرائیت کرنے کے راستے میں حائل تھے..

''ڈیڈی..'' اس کے اوندھے پڑے..سسکیاں بھرتے وجود پر ایک بیٹی کی اُلفت اور لاڈلے پن کا ہاتھ رکھا گیا ''میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

وہ ہاتھ گویا ابن مریم کا تھا..وہ کروٹ بدل کر سیدھا ہو گیا، اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری سُرخ ہو رہی تھیں..

لیلےٰ نے اپنے باپ کو ہمیشہ ایک مطیع اور سر جھکائے ہوئے شخص کے رُوپ میں دیکھا تھا اور اب وہ اُس کے چہرے پر جھکی جاتی تھی تو اُس کے زوال میں اب بھی نوخیزی کی جھلکیاں خوشنما ہوتی تھیں، اگر آج وہ اتنے دل کش ہیں تو اس میں حیرت کہاں کہ اُن دنوں وہ کیسے ہوں گے اور ماما کیوں اُن پر مرمٹی تھیں..

''میں آپ کے ساتھ ہوں ڈیڈی..''

''لیلےٰ..'' اُس نے اپنے آپ پر جھکے ہوئے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اُس کے ماتھے کو چوما ''جانے تم سمجھ سکتی ہو یا نہیں..ذلّت کے پاتال کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور اگر اُس پاتال میں گندگی گھنی ہو رہی ہو اور آپ اُس میں ڈوبتے ابھرتے، لتھڑے ہوئے زندگی کرتے رہیں تو کبھی نہ کبھی اپنے ہی بدن میں سے اٹھنے والا تعفّن آپ کی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے..مجھ میں اور تمہارے نانا کے سینکڑوں پیشاب گھروں کے کموڈوں میں کچھ فرق نہیں..تم جانتی ہو کہ میں آج کیوں انکاری ہو گیا..میں احسان فراموش نہیں ہوں لیکن..'' قلب نے کراہت سے اُس ایک کموڈ کی اندرونی غلاظت کو بیان کیا..

''میں نے کہا ناں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں..'' وہ اُس کے گیلے رخساروں کو صاف کرتے ہوئے ایک ماں کی طرح اُس کے لئے رنجیدہ ہوتی ہوئی بولی ''میں آپ کے لئے گرم اور بہت کڑوی کافی کا ایک مگ بنا کر لاتی ہوں۔''

وہ اٹھنے لگی تو قالب نے اُس کے بازو کو تھام لیا ''نہیں..کافی سے زیادہ اس لمحے مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے..تم جانتی ہو کہ میں نے تمہارا نام لیلےٰ کیوں رکھا تھا لیلےٰ؟''

''میں کیا جانوں..آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔'' لیلےٰ کے تنے ہوئے اعصاب قدرے آسودگی میں ہوئے کہ وہ بھی اس تلخ موضوع کو بدلنا چاہتی تھی..''آپ کے مشرق کا کوئی قدیم رومان ہے..لیلےٰ شاید کوئی جولیٹ تھی..''

''ہاں یہ توجیہہ بھی درست ہے۔'' قالب کے بھیگے ہوئے رخساروں پر ایک نم ناک مسکراہٹ کے آثار پھیل گئے ''لیکن نہیں..یہ ایک لطیف خیال تھا جو دفعتاً تب دل میں آیا جب تم پیدا ہوئی تھیں..جب میں ایک نوخیز اور تب بھی ناکارہ نوجوان ہوا کرتا تھا..تمہارا دادا..اور تمہارے ذہن میں جو ایک تصور ہے میں اُس میں دراڑیں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن وہی براہ راست باعث تھا میرے ناکارہ پن اور ذہنی پس ماندگی کا..وہ گئی رات جھومتا جھامتا باغبان پورہ کے اُس تنگ مکان کی سیڑھیاں چڑھتا ہمارے کمرے میں داخل ہوتا تھا اور اُس کمرے میں ہم بہت تھے کیڑے مکوڑوں کی مانند کلبلاتے ایک دوسرے سے جھگڑتے اُس شب سونے کے لئے مناسب جگہ پر قبضہ کرنے کی خاطر اور وہ ہمیں گرج کر اپنے اردگرد جمع ہونے کو کہتا اور پھر جب ہماری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہوتیں اپنا لیکچر شروع کر دیتا..بدبختو تمہیں احساس ہی نہیں ہے

تم کیسے عظیم شاعر کی اولاد ہو..آج پھر میں نے ہزاروں کے ہجوم میں اپنے زور بیان سے آگ لگا دی.. یاد رکھو تم نے کل میرے نام سے پہچانا جانا ہے، میرے حوالے سے معتبر ہونا ہے.. میری قدر کرو..اس دوران اکثر وہ فرش پر اوندھا ہو جاتا، لحوں میں مدہوش بے خبر بلند آہنگ خراٹے لینے لگتا اور اُس کے خراٹوں میں سے خارج ہوتی شراب کی متلی آور بُو..جیسے ایک اگلو پیشاب خانے کے کموڈ میں پیندے میں سے اٹھ رہی ہو......اور لیلےٰ اُس نے کبھی ہم بچوں سے دریافت نہ کیا کہ کیا ہم نے آج رات بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں.. پوری دنیا میں ننگ اور بھوک مٹا دینے والے انقلاب کا داعی، باغبان پورہ کی اُس کوٹھڑی میں بھوک سے نڈھال بچوں سے غافل تھا..اور لیلےٰ اگر نیشنل عوامی پارٹی کا ایک ہمدرد راہنما میری مدد کو نہ آتا تو میں بھی اپنے بہن بھائیوں کی مانند در بدر ہو رہا ہوتا..تو اُن زمانوں میں جب ہر جانب میرے لئے بھوک اور پھٹکار تھی، ریڈیو پر زبیدہ خانم کا شائد..ایک گیت گونجا کرتا تھا..لیلےٰ او لیلےٰ..جس کے بول اردو اور فارسی میں مجھے ایک عجیب سے خوابناک سُکھ سے آشنا کرتے تھے..وہ گیت باغبانپورہ کے اُس عُسرت زدہ فاقوں کے مارے ہوئے تنگ مکان سے فرار ہو کر میرے پیچھے پیچھے ماسکو چلا آیا..چنانچہ جب تم پیدا ہوئیں تو تم وہی لیلےٰ تھیں..''

''آپ کو اُس گیت کے بول یاد ہیں؟''

قالب لمحۂ موجود کی تلخیوں اور ذلتوں سے ماورا ہو کر سب کچھ بھلا کر مسکرانے لگا تھا..اور پھر اُس نے زیر لب گنگنا کر اُس بھولی بسری نغمگی کے سحر کو اپنے ذہن میں پوشیدہ ہو چکے ماضی میں سے تلاش کرنے کی جستجو کی ''بہت عرصہ ہو گیا ہے'' وہ گنگناتا اُس کے بولوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا..''ہاں..شائد..ذرّے ذرّے میں دھڑکتا ہے قیس کا دل..ہر بگولے میں.....لیلےٰ کا محل..اور..لیلےٰ او لیلےٰ..بس یہی یاد آ رہا ہے۔''

لیلےٰ کی آنکھیں ابھی خشک ریت تھیں اور ابھی اپنے باپ کی معصوم اُلفت کی تاب نہ لا کر ایسے بھیگنے لگیں جیسے اُس ریت پر ایک پیار بھری ہتھیلی یوں رکھی گئی ہو کہ اُس کے دباؤ سے ریت کے پاتال میں جتنی بھی نمی تھی وہ پھوٹ نکلی ہو..

''میں آپ کے ساتھ ہوں ڈیڈی جان..''

''تم میرے ساتھ پاکستان چلو گی؟''

''جی..'' وہ ٹھٹک گئی..

ڈیڈی میں یہ تغیر کیسے یوں یکدم رونما ہو گیا ہے..کہ جب کبھی میں اُن سے فرمائش کرتی تھی کہ ڈیڈی آپ کبھی مجھے اپنے لاہور لے چلیں تو وہ ہمیشہ موضوع بدل کر مجھ سے میری پڑھائی اور ہم جماعتوں کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے پوچھنے لگتے تھے..اور اب وہ خود پیشکش کر رہے تھے..یہ صرف آج کی شام تھی جس میں ایسی تبدیلیاں جنم لے رہی تھیں..

سردار قالب نے بہ قائمی ہوش وحواس یہ استفسار کیا تھا کہ..تم میرے ساتھ پاکستان چلو گی..یہ جانتے ہوئے کہ وہاں اُس کی ماں فریادیں کرتی..حکومتی امداد کی بھیک مانگتی..اپنے خاوند کی انقلابی شاعری کے واسطے دیتی جس کی شعلہ بیانی سے حکومت وقت کو بہت سے ووٹ حاصل ہوئے تھے..کب کی مر چکی تھی..اُس نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد اپنی بیٹیوں کو جو بھی بَر ملا..بیاہ دیا..جہیز میں نہ تو اُن کے باپ کی انقلابی شاعری اور نہ ہی صدر مملکت، وزیر اعظم اور ملک بھر کے اشترا کی لیڈروں اور ادبی تنظیموں کی جانب سے جاری کردہ سوگواری بیان..جہیز میں تو نہ دیئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ وہ خالی

ہاتھوں رخصت ہوئیں..اور تقریباًان پڑھ خاوندوں کے عسرت زدہ صحنوں میں اتریں..قالب کے علاوہ کم از کم تین بھائی ایسے تھے جن کی تعلیم اُس کی مانند نامکمل رہی اور وہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے..محنت مزدوری کر کے گزراوقات کرتے۔جو نہ بھی جاننا چاہتا اُسے بھی بتاتے کہ ہم سردار سیماب کے بیٹے ہیں..کہ اُن کے باپ نے کیا ہی پیغمبرانہ پیش گوئی کی تھی کہ تم..کل میرے نام سے معتبر ہو گے..قالب مسلسل رابطے میں تو نہ رہا تھا لیکن اُسے ایک موہوم سا اندازہ تھا کہ کون کہاں ہے..تو اگر اُس نے لیلےٰ سے یکدم یہ سوال کیا تھا کہ تم میرے ساتھ چلوگی تو اُس کے در پردہ برسوں کی اپنے سُسر کے ٹکڑوں پر پلنے والی زندگی کی ذلت آمیزی..اپنی مٹی سے دُوری..اس سرزمین کی بیگانگی اور اجنبیت کے نشتر تھے جو ایک کموڈ کے پیندے میں جھانکنے سے اُس کے تن بدن کو کاٹتے تھے..اُس پُرتعیش آلودہ حیات..اتنی آلودہ کہ لوگ اُس پر رشک کرتے تھے..وہ اسے ترک کر کے وطن لوٹ جانا چاہتا تھا..بے شک وہاں اُسے عُسرت اور بھوک کے اژدھے نگل جائیں لیکن وہ اُسے نگلتے ہوئے کم از کم اُس کی عزت نفس اور غیرت کا احترام تو کریں گے اور ہولے ہولے نگلیں گے..وہاں اپنے وطن میں اُس کے بدن سے اِنگلو پیشاب خانوں کے کموڈوں کے پیندوں میں بھری غلاظت کی بُو تو نہ آ رہی ہوگی..

''ہاں..میں چلوں گی۔''

●○●○●○●

اُس شب بھی..اور ابھی یہ ستمبر کے آخری دن تھے..ہوا ابھی سے کٹیلی سان پر تیز کی گئی ایک ایسی چُھری تھی جس کی دھار کا اندازہ لگانے کے لئے اُس کی جانب بڑھتی انگلی کا پپوٹا..اُسے چُھونے سے پیشتر ہی خراش آلود ہو کر خون کی ایک بوند کے ٹپکنے کا منتظر ہو جاتا ایسی کٹیلی سان پر تیز کی گئی چُھری ایسی ہوا تھی..اور ابھی ستمبر کے آخری دن تھے لیکن وہ دن وارث چوہدری کے وسیع لونگ رُوم کی تین شیشہ دیواروں کے باہر کے دن تھے اور ڈاچا کے باہر کے جنگلوں کا ہر شجر اُس تیز سرد ہوا کے سندیسے اپنے پتوں اور شاخوں میں ملفوف کرتا نہایت متجسس کہ لونگ روم کے اندر کیسے موسم ہیں اور وہاں کون ہے، امڈا چلا آ رہا تھا اور وہاں لونگ رُوم کی حدت بھری آسودگی میں یہ اور کون تھا، ظہیرالدین ایک صوفے میں دھنسا بیٹھا تھا اور اُس کے سامنے وارث چوہدری کی آنکھوں میں اپنے ہمدمِ دیریں کی تصویر نقش تھی اور اُس تصویر میں بکھرے ہوئے سرنگوں شکست خوردہ خواب تھے اور تشویش کی سیاہ ندیاں موجزن تھیں..

''میں تمہیں روکوں گا نہیں ظہیر..اگر سچ پوچھو تو میں تم پر رشک کرتا ہوں کہ اگر مئے انقلاب کی سرخ شراب جس کے ہم رسیا اور مخمور تھے، نہ صرف یہ کہ اُس میں خمار کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہی، سادہ پانی ہو چکی ہے بلکہ اُس میں سرمایہ دارانہ نظام کے فربہ کیڑے مکوڑے بھی کُلبلاتے پھرتے ہیں تو پھر ایسی بیکار ہو چکی مے سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ..تم جیسے جی دار ہی کر سکتے ہیں ظہیر..کہ میں..اُس کبھی کی مَست الست کرنے والی شراب جو کہ اب پانی ہو چکی ہے، میں اُس میں کلبلاتا ہوا ایک کیڑا ہو چکا ہوں..اور اس متمول کلبلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں..تو میں تم پر رشک کرتا ہوں.. میں تمہیں روکوں گا نہیں..واپسی کے بارے میں تمہارے بال بچوں کا کیا ردِعمل ہے؟''

''میرے بال بچے مجھ سے ماورا ہو چکے ہیں..آمنا سامنا ہوتا ہے تو اُن کے چہروں پر ایک حیرت نمودار ہوتی ہے کہ اچھا یہ ابھی زندہ ہے..ہم تو اسے کب کا دفنا چکے تھے..میں نے گالینا کے اپاہج پن کو آخری سانسوں تک قابلِ برداشت بنانے کی خاطر اُس کے ذاتی اکاؤنٹ میں خاصی رقم جمع کروا دی ہے..کم از کم تین چار درجن کامریڈ لینن کے مجسموں سے ڈھالی جانے والی صلیبوں کے عوض کی رقم..اور اس کا ماہانہ منافع اتنا ہے کہ وہ اپنی جرمن وہیل چیئر ترک کر کے ایک شاہانہ رتھ پر بھی سوار ہو سکتی ہے... بورس نے لینن کے مجسمے فروخت کر کے اتنی دولت حاصل کر لی ہے کہ اُس نے اپنے کھوکھے کو ترک کر کے ارباط اسٹریٹ میں ایک افغانی ریستوران کھول لیا ہے..اور سویٹ لانا اکثر اُس ریستوران میں ایک افغان لڑکی کا روپ دھار کر نیم برہنہ حالت میں رقص کرتی ہے اور کچھ شرمندگی محسوس نہیں کرتی..تو وہ سب مجھ سے ماورا ہو چکے ہیں وارث..''

''تم نے اپنے لئے بھی کچھ پس انداز کیا ظہیر..''

''وارث تم نے مجھ سے یہ کیسا بے رحم سوال پوچھا ہے..'' اُس نے برابر کی تپائی پر دیر سے ان چھوئے واڈ کا کے گلاس کو گرفت میں لے کر ایک ہی سانس میں بغیر کسی چاہت کے حلق میں اتار لیا..اُس نے یہ عمل کسی مسرت کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ اپنے آپ کو اذیت دینے کے لئے کیا تھا..اُس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں طنز کی برچھیاں لشکتی تھیں اور خود رحمی کے کینچوے سرسراتے تھے۔''ولا ڈی میر لینن نے تمہارے توسط سے مزدوروں اور دہقانوں کے راج کا وعدہ میرے لئے تو پورا کر دیا ہے..نظریات کی شکستگی اور مسمار پن اپنی جگہ لیکن اُس نے اپنے مجسموں کے ذریعے مجھے تو راج کروا دیا ہے ناں.. ہاں میرے پاس بقیہ حیات آسودگی سے گزارنے کے لئے بہت کچھ ہے..میرے جتنے بھی برس رہ گئے ہیں..دو چار یا زیادہ سے زیادہ آٹھ دس تو اُن میں اگر حاتم طائی بھی ہو جاؤں اور ہر شب ماسکو کے گلی کوچوں میں بھٹکتے ، بیکار ہو چکے موسیقاروں اور دانشوروں ،فٹ پاتھ پر آ چکے ادیبوں اور شاعروں..کلیساؤں کے باہر ہاتھ پھیلائے کھڑے کلاسیکی گلوکاروں اور فاقوں سے مزید دبلی ہو چکی کبھی بالشوئی تھیٹر میں مرکزی بیلے رینا کے پس منظر میں رقص کرتی بیلے ریناؤں میں کھلے دل سے روبلوں کے پلندے بانٹتا رہوں تو بھی مقدس صلیبوں سے حاصل ہونے والی اور تمہارا شکریہ..وہ آمدنی ختم نہ ہوگی...اور پاکستان میں اتنی رقم سے میں نہ صرف بقیہ زندگی عیاشی سے گزار سکتا ہوں بلکہ سیاست میں نمایاں ہونے کی خاطر کچھ جج ، بیوروکریٹ اور مولانا بھی خرید سکتا ہوں ، اگر خریدنا چاہوں تو..''

''وہاں تمہارا کوئی نہیں ظہیر..ان چالیس برسوں میں وہ لوگ جو کبھی تمہارے قریب تھے، دور پار کے عزیز و اقارب تھے اُن میں سے بیشتر مر کھپ چکے ہوں گے اور جو زندہ ہوں گے وہ تمہیں کہاں پہچانیں گے..نہ وہ گلیاں ہوں گی جن میں تم پلے بڑھے اور نہ وہ کوٹھے ہوں گے جہاں تپتی دوپہروں میں تم ایک گوری چٹی نابالغ لڑکی کے عشق میں مبتلا ، اُس کے منتظر ، اپنے ننگے پاؤں جھلساتے تھے..اور نہ ہی وہ شجر موجود ہوں گے جن کے سائے میں تم چاندنی راتوں میں بے وجہ اُس لڑکی کا انتظار کرتے آنسو بہاتے تھے.. ہاں برگد تو شائد کوئی ایک آدھ ابھی تک چھتنار ہو لیکن نہ تو شیشم کے درختوں کی اتنی عمر ہوتی ہے اور نہ ہی کیکر چالیس برسوں کی مسافتیں طے کر کے زرد پھولوں کو کچے راستوں پر ٹپ ٹپ گرا کر اُنہیں ایک پیلی اوڑھنی کی مانند بچھا سکتے ہیں..وہاں کوئی بھی نہ ہوگا۔''

''ہاں..'' ظہیر الدین نے شرارت سے سر ہلایا کہ وہ وارث کے بیانیے کے تعاقب میں ابھی ابھی اُس گوری چٹی نابالغ لڑکی کے انتظار میں پاؤں جھلسوا کر واپس آیا تھا۔''برگد ہوں نہ ہوں..کیکر اور شیشم بھی نہ ہوں لیکن وارث بورے والا کے ایک ویرانے میں یقیناً آک کے وہی بُوٹے ابھی تک موجود ہوں گے..اور اگر وہ نہ ہوئے تو ان کی کوکھ میں سے پھوٹنے والے اُن کے بچے ہوں گے اور وہ بھی جب بلوغت کو پہنچیں گے تو اپنی نسل آگے بڑھانے کی خاطر اپنے ڈوڈوں کے مُنہ کھول دیں گے جن میں سے سفید ، باریک ریشوں سے بُنی بے وزن مائی بوڑھیاں جنم لیں گی اور گرم ہوا میں اٹھ کر ڈولنے لگیں گی..اور میں..ان کا تعاقب کروں گا۔''

''ظہیر..'' وارث چوہدری نے صرف اتنا کہا اور پھر اُس کے نوخیز دِکھتے چہرے پر ایک بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اُس پر قابو نہ پا سکا تو وہ پھیل کر ایک قہقہے کی صورت اختیار کرتی لونگ رُوم میں اُمڈ کر آنے والے جنگلوں کی ٹہنیوں اور پتوں میں یوں گونجنے لگی کہ اگر اُن کے ساتھ لونگ روم میں کوئی بے خبر پرندہ بھی چلا آیا ہوتا اور وہ خوابیدہ ہوتا تو

پر پھڑ پھڑا کر.. ہڑ بڑا کر چونچ کھول کر کہتا ''کون ہے؟''..

''ظہیر..اگر میں تمہیں پچھلے چالیس پینتالیس برسوں میں جان نہیں سکا..تو اور کون ہوگا جو تمہارے اس مائی بوڑھیوں کے تعاقب کے پاگل پن تک رسائی حاصل کر سکے..کیا واقعی صرف..''

''ہاں وارث..واقعی..'' اور اب ظہیر الدین کی باری تھی..وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور اُس کی ہنسی قہقہوں میں بدلتی گئی اور بے شک لِونگ رُوم میں اڈتے ہوئے جنگلوں کی ہر شاخ خالی ہوتی، اُس پر کوئی ایک پرندہ بھی خوابیدہ نہ ہوتا پھر بھی کہیں نہ کہیں سے ایک پرندہ ضرور ظاہر ہو کر سوال کرتا ''کون ہے؟''

اور اگر جواب میں کوئی کہتا کہ تو کون ہے؟ تو پرندہ پَر پھیلا کر جواب دیتا.. میں..میں وہ ہوں جس کی تمہیں خبر نہیں..

''ہاں وارث..واقعی..بے شک وہ گوری چٹی نابالغ لڑکی کب کی بالغ ہو کر بوڑھی ہو چکی ہو گی لیکن وہ مائی بوڑھیاں ابھی تک نوخیز ہوں گی، وہ میری منتظر ہوں گی..مجھے جانا ہے..''

●○●○●○●

رات کا وہی پہر ہے..

جب ڈینیوب کے پانی ایک سیاہ چادر کی مانند بودا اور پسٹ کے شہروں کے درمیان مدھم سوگواری سے بہتے اُنہیں ایک شہر کرتے ہیں.. وہ تھک چکے ہیں حالانکہ اُنہیں تو ابھی ایک طویل بہاؤ کی مسافت درپیش ہے.. جرمنی کے بلیک فارسٹ سے جنم لے کر یونے دو ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے اُنہوں نے ابھی تو بحیرہ اسود میں جا گرنا ہے اور وہ ابھی سے تھک گئے ہیں.. روجا کا کہنا ہے کہ جپسی لوگ ڈینیوب کو ایک ''بے گرد و غبار راستہ'' کہتے ہیں..

خانہ بدوش سفر کی دھول سے پہچانے جاتے ہیں..

انجان اور اجنبی راستوں پر اُن کی لڑکھڑاتی گھوڑا گاڑیوں جن میں اُن کی کُل متاع اور اُن کے بچے بوڑھے لدے ہوتے ہیں اُن کے پہیّوں تلے سے وہ دُھول اٹھتی ہے جو ایک خانہ بدوش کے چہرے پر اترتی اُس کی سب سے دل پسند سجاوٹ ہوتی ہے.. یہ ایک عجیب انہونی سی بجھارت ہے کہ جو بھی سفر میں ہوتے ہیں اُن کے قدموں میں سے گھوڑوں کے سُموں میں سے یا اُن کی گھوڑا گاڑیاں کے پہیّوں میں سے جو دُھول اٹھتی ہے اُسے بہت فاصلوں سے افق پر بلند ہوتے دیکھ کر مسافت کرنے والوں کی نیّت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تو تمہیں مفتوح کرنے کی خاطر آنے والوں کے گھوڑوں کے سُموں میں سے اٹھنے والی دُھول ہے... یا انہیں صرف امن یا پناہ درکار ہے، مذہب یا نسل کے تعصب سے فرار ہونے والوں کا کوئی مظلوم قافلہ ہے..کوئی ایسا قافلہ ہے جس میں صرف بہتّر افراد ہیں جو پیاسے ہونے اور سر کٹانے کے لئے نکلے ہیں..آپ شائد کربلا کے اس حوالے سے قدرے پریشان ہو گئے ہوں کہ مذہب کو افیون جاننے والے ایک شخص کو ایسے مذہبی حوالوں سے کیا غرض لیکن آپ کو میں حیران ہونے کی..میں مصطفٰے اسلام جو مذہبی جماعتوں کے پُر تشدد کارکنوں کے سامنے سینہ تان کر سُرخ نعرے لگایا کرتا تھا حیران ہونے کی مہلت نہ دوں گا کہ میں نے نہ صرف مارکس، اینگلز اور لینن کے ارشادات کو ہی حفظ نہ کیا تھا بلکہ سیرت نبویؐ کا بھی عرق ریزی سے مطالعہ کیا تھا کہ یہ میرا ثقافتی ورثہ تھا.تو جیسے ایک نئے مساوات پر مبنی مذہب کی پھوٹتی کونپل کو کچل دینے کی خاطر قریش کے سرمایہ دار اور متکبر سرداروں کے گھوڑے میدان بدر یا اُحد کے پہاڑ کی جانب بڑھتے تھے تو اُن کے سُموں سے اٹھتی دُھول دور سے پہچانی جاتی تھی کہ ان کے سواروں کی نیت درست نہیں..ان پر بھروسہ نہ کرو.. یہ انتقام کی آگ میں سلگتے اُس نئی کونپل کو راکھ کر دینے کی خاطر چلے آتے ہیں جو بلال حبشیؓ ایسے غلام کو اُن کے برابر میں جگہ دینے والے نظام کو رائج کرنا چاہتی ہے..اور جب اپنی محبوب اونٹنی قصویٰ کا سوار اپنے اُس یار کے

ساتھ جو غار میں اُس کا رفیق تھا، قریش کے قہر سے فرار ہوتا، لق و دق صحرا میں بھوکا پیاسا یثرب کی جانب چلا آتا تھا تو ان دونوں کی اونٹنیوں تلے آنے والی ریت اور دُھول جو اُن کی لامبی ٹانگوں کی سرعت کے نتیجے میں اٹھتی تھی تو اُسے دور سے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کھری نیت والے ہیں، صرف پناہ اور امن کے طالب ہیں..تو کچھ اسی طور خانہ بدوشوں کے قافلے جب سفر میں ہوتے ہیں تو اُن کے قدموں اور گھوڑا گاڑیوں کے پہیّوں میں سے جنم لینے والی گرد کو دور سے جو کوئی بھی دیکھتا ہے وہ یہ جان جاتا ہے کہ یہ نہ تو کسی کو مفتوح کرنے کی خاطر بڑھتے ہیں، نہ ہی دائمی پناہ کے طالب ہیں، محض بگولے ہیں، پل دو پل ساکت ہوں گے اور پھر سے حرکت کر کے کُوچ کر جائیں گے..

چنانچہ خانہ بدوش اگر ڈینیوب کو ایک ''بے گرد و غبار راستہ'' کہتے تھے تو اس لئے کہ اُس میں سے دُھول نہ اٹھتی تھی..اور اُنہیں ایک ایسے راستے سے کیا غرض جس پر سے دُھول اٹھ کر اُن کی نیت کی درستگی کا پتہ نہ دے..

جی ہاں..میں مصطفیٰ اسلام..رات کے اُسی پہر میں، دسویں منزل پر واقع اپنے مختصر فلیٹ کی بالکونی میں..سفرِ حیات کے راستوں میں سے اٹھنے والی دُھول کے قصّے بیان کر رہا ہوں..

اُس کے..رَوجا کے بھاری خراٹوں کی خرخراہٹ یہاں تک چلی آ رہی ہے..

ترقی پسندی کو ایک مذہب جانتے ہوئے اُس پر عمل پیرا..اشتراکیت سے مُخلص..اتنے کہ اُن کے گلے سے لپٹا گلوبند یا سوٹ کے ساتھ بندھی ہوئی ٹائی بھی ہمیشہ سُرخ رنگ کی ہوتی تھی..پان سے کچھ زیادہ رغبت نہ رکھنے کے باوجود اُس کی سرخی سے ہونٹ رنگے رکھتے تھے، عسرت زدہ حالت میں بیڈن روڈ کے ایک کمرے میں مر گئے کہ وہ دیگر اپنے نظریات کو فروخت کر دینے والوں میں سے نہیں تھے..رَوجا کے خراٹے مجھے اُسی ظہیر کاشمیری کی یاد دلاتے تھے..

ے ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

نہیں اُنہیں ہرگز خبر نہ تھی کہ..اُن کے بعد بھی اُجالا نہ ہوا..اندھیرا رہا..اچھا ہوا وہ اس خواب کے منتشر ہو جانے سے پیشتر ہی مر گئے..

لیکن آج کی شب مجھے چراغ آخر شب کی یاد نہ ستاتی تھی بلکہ اُن کا ایک سراسر غیر انقلابی اور جوانی کی سرشاری میں بھیگا ہوا شعر یاد آ رہا تھا..

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے
شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے

مجھے مصطفیٰ اسلام کو عہدِ جنوں کی جانب لئے جاتا تھا..

وہ جو شباب تھا اور میری آنکھوں میں سُرخ ستارے جھلملاتے تھے تب رَوجا..کیسے دل کی باگیں کھینچ کر اُس پر سوار ہو جانے والی، پورے بدن کو بخار زدہ کر کے، حواس معطل کر دینے والی وحشت بھری، دنگ کر دینے والی لڑکی تھی..اُس میں وہ دل کش مقناطیسیت تھی جو میرے خون میں لوہے کے جتنے بھی ذرّے گردش کرتے ہیں اُنہیں

اپنے ساتھ چمٹا لینے والی صلاحیت رکھتی تھی اور کسی حد تک ایک کامریڈ تھی..تو یہ کیسا انجام ہے کہ اب..وہ ایک بے کشش فربہ وجود ہو چکی ہے جس کے بلند آہنگ خراٹے یہاں بالکونی تک چلے آتے ہیں..

میں نے آج پھر..کہ میں نے ایک عجیب دل کو مٹھی میں لے کر اُسے اتنا بھینچنے والی کہ اُسے سانس لینے میں دشواری ہو ایسی اداسی سے دوچار ہو کر آج پھر شفیق الرحمٰن کے ''ڈینیوب'' کا مطالعہ شروع کر دیا۔اگرچہ وہ مجھے تقریباً ازبر ہو چکا ہے لیکن ہر بار یہ تحریر مجھے آسودہ کرتی ہے..اپنے نظریات کی ناکامی اور لاحاصلی کے باوجود مجھے قلق اس لئے نہیں کہ چلو میں نے اسی بہانے کم از کم چالیس برس شفیق الرحمٰن کے نیلے ڈینیوب کے کناروں پر بسر کر لیے..

''ٹرین کی کھڑکی میں سے ایک دریا نظر آیا جو گھوم کر پہاڑیوں میں چھپ گیا..آگے چل کر پھر سامنے آ گیا..کچھ دور ساتھ دے کر پھر مڑ گیا..''

''یہ کون سا دریا ہے؟''مُجّد ہی نے''زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد'' گنگناتے ہوئے پوچھا..

''ڈوناؤ..''جرمن لہجے میں جواب ملا..

''استروس..''یونانی بولا۔

''ڈونا ریا..''ایک طرف سے آواز آئی..

ہیمل نے عینک اتاری، ریلوے ٹائم ٹیبل بند کر کے وی آنا کا نقشہ سمیٹنے لگا''جانتے نہیں یہ وہی مشہور بین الاقوامی دریا ہے، کسی کا ڈونا، کسی کا ڈوناؤ اور سب کا بلیو ڈینیوب..''

میں نے نوخیزی کے ان زمانوں میں شفیق الرحمٰن کو ایک مداح کے طور پر پرستش کا ایک خط لکھا تھا اور حیرت در حیرت اُن کا جواب آ گیا اور مسرت سے میرا حلق خشک ہو گیا..اُن کے رائٹنگ پیڈ اور لفافے کا رنگ بھی نیلا تھا اور اُس پر نیلی روشنائی میں اُن کی نسوانی نزاکت والی تحریر تھی..نیلے ڈینیوب کی طرح..ایک پاکستانی دوست جو اُن کی تحریر کے ساتھ میری وابستگی سے آگاہ تھا اُس نے کچھ برس پیشتر مجھے خبر کی کہ وہ مر چکے ہیں..وہ اپنے بڑے بیٹے جس کو وہ ''جُو'' کہتے تھے، اُس کی ریل کی پٹڑی پر مسخ ہو چکی لاش کو سہہ نہ سکے..اُن کی خوبرو اہلیہ کو کینسر کھا گیا اور دوسرا بیٹا خودکشی کی کوشش میں ناکام ہو کر دونوں آنکھوں سے محروم ہو گیا اور کچھ عرصے بعد اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے اپنے آپ کو شُوٹ کر لیا..البتہ اُن کا بینکر بیٹا لندن میں عافیت سے ہے لیکن اُن کا راولپنڈی کے ویسٹ رِج میں واقع گھر اب برائے فروخت ہے..

ایسے لوگ..اور یہ سوال زچ کرتا ہے..جو خلق خدا کے رنج زائل کر کے اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں، وہی کیوں ایسے الم ناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر..وہ کیسا منصف ہے..وہ نہیں ہے...

چلئے وہ نہ سہی، خلق خدا تو منصف ہے..جو میں بھی ہوں..

شائد میں تذکرہ کر چکا ہوں، اپنا دفاع پیش کر چکا ہوں کہ مجھ میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنے کا کوئی رجحان

نہیں ہے..نہ ہی میں کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہوں تو پھر مجھے کیوں خدشہ ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ میں دسویں منزل پر واقع اپنے اس فلیٹ سے نیچے اتروں اور پھر ڈینیوب کے پانیوں میں اتر جاؤں..

جینا کے آخری خط نے بھی مجھے تشویش سے بھر دیا ہے..

وہ لکھتا ہے کہ اپنی طویل خانہ بدوشی اور اجنبی مسافتوں اور دربدری سے تھک ہار گئی ہے اور گھر واپس آنا چاہتی ہے..اور میں آپ کو اپنی موجودہ کیفیت میں شریک کرنا چاہتا ہوں کہ..وہ آنا چاہتی ہے اور میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں..ہر شخص پر..چاہے وہ ایک مدت سے کسی اجنبی دیار میں حیات کرتا ہو..وہاں پرائی دھرتی پر بے شک میری طرح اپنے وطن کی نسبت زیادہ برس گزار چکا ہو..اپنے موسموں، شجروں اور مٹی کی مہک کو بھلا بیٹھا ہو..ہمیشہ بڑھاپے کی دہلیز پر ایک ایسا وقت آ جاتا ہے جب وہ سارے موسم، شجر اور مٹی کی مہک گمشدگی میں سے ظاہر ہو کر اُس کے اندر پھوٹنے لگتے ہیں اور اُسے اپنی قبر بُلاتی ہے..

اور وہ قبر..بے شک کسی ہول بھرے گرد آلود ویرانے میں، کیکر کے درختوں اور آک کے بُوٹوں اور خودرو کانٹے دار جھاڑیوں میں..کسی جھاڑ جھنکار قبرستان میں ہو..وہ اُسے صدائیں دینے لگتی ہے..

مجھے وہ بلاوا..وہ صدائیں سنائی دینے لگی ہیں..

جینا نہ صرف ایک رقت آمیز گہری بدن کو درد سے بھر دینے والی آواز کی مالک ہے بلکہ وہ ایک ایسی گیت نگار بھی ہے جس کے بولوں کے مول نہیں پڑے..اُس کے جس آخری خط نے مجھے تشویش میں مبتلا کیا، اُس کے آخر میں ایک گیت مجھے اُس کی موجودہ ذہنی حالت سے آگاہ کرتا ہے..اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لاہور میں قیام کے دوران کسی نے اُسے میاں محمد بخش کے کلام کا ترجمہ سنایا ہے کہ اس گیت میں اُن کی صوفیانہ شاعری کے عکس جھلکتے ہیں..

''خانہ بدوشوں کے دھول آلود پاؤں سدا حرکت میں نہیں رہتے..
سفر کی دیوانگی بالآخر زوال پذیر ہوتی ہے..
ہر اُس سرزمین پر جہاں تمہارے خیمے نصب ہوتے ہیں..
طے تو نہیں کہ وہاں کی مٹی تمہیں قبول کر لے..
جیسے باغوں میں سدا بلبل نہیں بولتی..
نہ ماں باپ سدا رہتے ہیں اور نہ حُسن جوانی..
اور نہ ہی بہار کے موسم سدا ساتھ دیتے ہیں..
اور نہ ہی بالی عمر کی لڑکیوں کی بانہوں میں..
سدا کنگن کھنکتے ہیں..
اور میری بانہیں تو کب کی ویران ہو چکیں..
ان میں کوئی کنگن نہیں جو کھنک سکے..

میرا پیراہن تار تار ہے اور..

جُوتے ادھڑ چکے ہیں..

بالوں میں سفر کی دھول ہے جو دھلتی ہی نہیں ہے..

مجھے کسی بھی مٹی نے پناہ نہیں دی..

میں اب تھک چکی ہوں..

اپنے ڈینیوب کی جانب..

اپنی مٹی کی جانب لوٹ جانا چاہتی ہوں..

اگر وہ مجھے قبول کر لے..''

●○●○●○●

میں اپنے باپ کو ڈوبنے سے بچانا چاہتی ہوں..

میرا خیال تھا کہ مجھے داؤد اکبر کے روپ میں اپنی روح کا ساتھی مل گیا ہے..مائی سول میٹ..

مجھ سے بہت فریب ہوئے..

اور میں اقرار کرتی ہوں کہ کچھ ایسے فریب تھے جن میں میں اپنی رضا سے مبتلا ہوئی..میں ان خانہ بدوش آوارہ گردیوں کے دوران بہت سے ایسے لوگوں سے ملی جن کی شخصیت اور بدن نے میرے اندر خواہش کے اضطراب کو جنم دیا اور میں نے جان بوجھ کر اُنہیں اپنے قریب آنے دیا..میں بتا چکی ہوں کہ ایک نارمل یورپی لڑکی ہونے کے حوالے سے میں نے جنس سے بے وجہ اجتناب نہیں کیا کہ نسوانی اُبال کو دھیما کرنے کی خاطر اس قدرتی جذبے کی آبیاری نہ کرنا ذہنی پسماندگی کے سوا کچھ نہیں۔

یورپی لڑکوں کے علاوہ کچھ تُرک تھے..

تُرک قدرے گھمنڈی ہوتے ہیں..اپنے آباؤ اجداد کے حرموں میں کنیزوں کی تعداد بیان کر کے اپنی مردانگی کے چرچے کرتے ہیں..ویسے وہ بہت تشفی بخش محبت کرنے والے ہوتے ہیں..اُن میں حسد کی جاہلیت عروج پر ہوتی ہے.. اگر آپ کسی اور سے ہنس کر بات کر لیں تو مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں..عارضی طور پر پُرخلوص ہوتے ہیں..

ایرانی ادب آداب پر یقین رکھتے تُرکوں کی مانند بے دریغ نہیں ہوتے..صرف ایک ایرانی آقا یزدانی سے میری قربت ہوئی جو ایرانی انقلاب کی ترویج کے لئے دستاویزی فلمیں بناتا تھا، اُس نے مجھے اپنی ایک فلم میں ایک ایسی امریکی لڑکی کا کردار دیا جو ایرانی ملائیت اور مذہبی حکمرانی سے شدید نفرت کرتی ہے..اور جب وہ ایک صحافی کے رُوپ میں ایران آتی ہے تو وہ نہ صرف اس کی قدیم ثقافت، تاریخ، زبان کی شیرینی، ایرانیوں کی میزبانی اور معاشرے کی پاکیزگی سے متاثر ہوتی ہے بلکہ بالآخر اسلام قبول کر لیتی ہے اور باپردہ لباس اختیار کر لیتی ہے۔اگرچہ میں نے اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر بے تحاشا امریکی فلمیں دیکھ کر امریکی لب ولہجے کی نقل کرنے کی حسبِ مقدور کوشش کی لیکن میری انگریزی میں مشرقی یورپ کا لہجہ جھلکتا رہا..آقا یزدانی کا کہنا تھا کہ یہ فلم ایرانی تماشائیوں کے لئے ہے اور وہ تمہارے لب ولہجے سے کچھ غرض نہیں رکھتے اُن کے لئے یہی بات متاثر کرنے والی ہے کہ تم ایک سفید فام ہو اور انگریزی بولتی ہو..

اس آقا یزدانی کی فلموں کے مداحین میں سے کچھ آیت اللہ بھی تھے..

وہ ایک نہایت بنیاد پرست شیعہ مسلمان تھا..لیکن اُس کے ذاتی فلیٹ میں جو اُس کی فلم کمپنی کا آفس بھی تھا..اور اُس کے اُس گھر سے خاصے طویل فاصلے پر واقع تھا جس میں اُس کی ادھیڑ عمر..ہمہ وقت ایک سیاہ چادر میں لپٹی نہایت فربہ

ایرانی بیوی اور میں جتنے بھی گن سکی، کم از کم چھ بچے رہتے تھے..وہاں اُس فلیٹ کی دیواروں پر امریکی فیشن ماڈلز کی نیم برہنہ اور ہیجان خیز اندازوں کی تصویریں اور پوسٹر چسپاں تھے..

فلیٹ کی ایک دیوار گویا انواع واقسام کی شراب کی بوتلوں کی ایک بین الاقوامی نمائش تھی..لیکن وہ ایک پاکیزہ رُوح تھا.. باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا، ہاتھ کھول کر آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتا تھا تا کہ دیواروں پر آویزاں برہنگی اُس کی عبادت میں دخل انداز نہ ہو سکے..ویسے ہماری قربت کو قانونی تحفظ دینے کی خاطر اُس نے مجھے متعہ کی پیشکش بھی کی..جو میں نے اس لئے رد کر دی کہ صرف باہمی ملاپ کے لئے اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے لیکن میں اس مذہبی گنجائش کی روشن نظری سے بے حد متاثر ہوئی..

میرا خیال ہے کہ میں آقایزدانی پر کچھ زیادہ ہی اٹک گئی ہوں..

ایک افغان تھا جس کی ایک ٹانگ روسیوں کی بچھائی ہوئی بارودی سرنگوں کی زد میں آ کر اُڑ گئی تھی..اور اس کے باوجود اُس کے ملاپ کی حرکت میں کچھ کمی نہ آتی تھی اور وہ مجھے ہمیشہ..بعد میں پسینہ پونچھتا ایک پھول پیش کیا کرتا تھا..

اور پھر ہندوستانی.. بہت چال باز اور باتوں کے فریب میں مبتلا کرنے والے..وعدے کر کے نہ نبھانے والے..اور اُن کے بدنوں میں مشرقی مصالحوں کی..خاص طور پر ہلدی کی بُو آتی تھی..

یہ تمام بین الاقوامی تجربے اپنی جگہ..اور پاکستانی بہت محبت کرنے والے ان سے جُدا.. بہت منت سماجت کرنے والے..اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے قدموں میں بچھ جانے والے..اکثر اوقات اپنی محبت کے اظہار میں رو دینے والے اور ہمیشہ یہ اعلان کرنے والے کہ تم اُن کی زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو..وہ ہیجان میں اتنے مبتلا ہو جاتے کہ اکثر تشفی کرنے کے قابل ہی نہ رہتے..نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنی بدنی تجربوں کی خودنوشت آپ کے سامنے عیاں کر دی ہے کہ یہ مختلف قوموں کی جنسی نفسیات اور ثقافتی ردعمل کا ایک تقابل ہے اور یوں بھی مجھے بالآخر داؤد اکبر تک پہنچنا تھا جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ میرا سول میٹ ہے..مجھے میری روح کا ساتھی مل گیا ہے..

اس لمحۂ موجود میں جب کہ میں اپنی جنسی حیات کے کچھ دلچسپ پہلو بیان کر رہی ہوں، میں مکمل برہنگی کی حالت میں ایک بلند سٹول پر ایک ٹانگ اپنی دوسری ٹانگ پر جمائے بیٹھی ہوں اور میرے سامنے ایک کینوس کی پُشت ہے جس کے کناروں سے کبھی کبھی داؤد اکبر جھانکتا ہے..ایک نظر دیکھ کر میرے بدن کے ابھار اپنی یادداشتوں میں محفوظ کر کے پھر سے کینوس کے پیچھے روپوش ہو جاتا ہے کہ وہ میری نیوڈ پورٹریٹ پینٹ کر رہا ہے..

یہاں لاہور میں زمزمہ کی توپ کے سامنے فنونِ لطیفہ کا ایک قدیم ادارہ ہے جس کی بنیاد رڈیارڈ کپلنگ کے باپ نے رکھی تھی، جی ہاں وہی زمزمہ توپ عجائب گھر کے سامنے جس پر کپلنگ کا کردار ''کم'' بیٹھا کرتا تھا.. مجھے اس ادارے میں جو این سی اے کہلاتا ہے، بغیر معاوضے کے اپنے خانہ بدوش گیت گانے کے لئے مدعو کیا گیا اور وہاں داؤد اکبر تھا، اُس کی رنگت سانولی تھی اور وہ ایک فرنچ کٹ داڑھی کے باوجود زیادہ پُرکشش نہیں لگ رہا تھا.. مجھے بتایا گیا کہ وہ وہاں پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہے اور ملک بھر میں نیوڈ پینٹنگ میں یکتا اور بے مثل ہے..ظاہر ہے مذہبی شدت پسندی کے اس ملک میں برہنہ تصویروں کی نمائش کرنا خودکشی کرنے کے مترادف ہے، ایک بار اُس نے ایک ڈھکی چھپی کوشش کی لیکن

ایک مذہبی جماعت کے کارکنوں کو خبر ہو گئی جنہوں نے نمائش گاہ پر حملہ کر کے اُس کی تصاویر پھاڑ ڈالیں اور وہ بمشکل ایک دو پسلیاں تڑوا کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا..تب سے وہ صرف اپنی لگن کی خاطر یہ تصویریں بنا کر چند قریبی دوستوں کو دکھا کر اُنہیں تلف کر دیتا ہے..البتہ میں اپنی تصویر تلف نہیں ہونے دوں گی، اسے جب کبھی بھی گھر لوٹی ساتھ لے جاؤں گی..اُسے نیوڈ پوز کرنے کے لئے ماڈل کہاں سے ملنے ہیں چنانچہ وہ اپنی بیوی کو سامنے بٹھا کر اُسے ہی پینٹ کرتا رہتا ہے..اور اب میں ہوں..

بے شک یہ میری روح کا ساتھی ہے لیکن میں اسے کبھی حاصل نہ کر سکوں گی کہ داؤد شادی شدہ ہے، میری عمر کی دو بیٹیوں کا باپ ہے..

دراصل یہ قصہ میری حماقت سے شروع ہوا..اُس نے مجھے اگلی شام اپنے سٹوڈیو میں مدعو کیا جہاں میں نے اُسے کچھ گیت سنائے اور ہم نے وائن کے کچھ گھونٹ بھرے..پھر میں نے جانے کونسی ترنگ میں آ کر..ہلکے خمار میں یہ کہہ دیا کہ ایک عام یورپی لڑکی اور ایک جپسی لڑکی کے رنگ روپ اور نین نقش کے سوا چھاتیوں کا بھی فرق ہوتا ہے..جپسی عورتوں کا حجم بڑا اور رَس بھرا ہوتا ہے تو داؤد نے اور نہ اُس کے چہرے پر کوئی طلب تھی اور نہ ہوس محض ایک نصابی نوعیت کا تجسس تھا، جب اُس نے کہا کہ..کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں..

قصہ یہیں سے شروع ہوا..

آپ ایک مشرقی ہیں، جو کچھ آپ کے دل میں ہوتا ہے، اُسے ظاہر کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، اس لئے بھی اجتناب کرتے ہیں کہ کہیں دوسرے فریق کا دل نہ دکھ جائے اور جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں، نہیں پوچھتے..یہی کہ..آخر یہاں میری گزر اوقات کیسے ہوتی ہے..مجھے کبھی کبھار اسلام آباد میں کسی غیر ملکی سفارت خانے کی جانب سے بلاوا آ جاتا ہے، عام طور پر اپنے یوم آزادی کے موقع پر منعقد کردہ تقریب میں وہ مجھے پرفارم کرنے کے لئے مدعو کر لیتے ہیں اور اتنی ادائیگی کر دیتے ہیں کہ میں اُس سے بخوبی ایک ماہ گزارہ کر سکتی ہوں..یا کبھی کسی پرائیویٹ پارٹی میں شمولیت کا دعوت نامہ آ جاتا ہے لیکن وہاں مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ یورپ سے بھی بڑھ کر شراب نوشی کرتے ہیں، بدمست ہو کر اور وہ بڑے بڑے بیوروکریٹ اور سیاستدان ہوتے ہیں، انڈین گانوں پر زنخوں کی مانند ناچنے لگتے ہیں اور پھر مرغن غذاؤں پر جھپٹ پڑتے ہیں، یہ کوئی مہذب طریقہ تو نہیں..اور جب میں گٹار پر گیت گاتی ہوں تو اُن کی توجہ میری رانوں پر ہوتی ہے، تانوں پر نہیں..پھر وہ مجھ پر کرنسی نوٹوں کی بارش کر دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ پرفارمنس کے بعد میں اُنہیں سمیٹ لوں..اور میں ایسا نہیں کر سکتی کہ میں کوئی بھک منگی تو نہیں ایک فنکارہ ہوں..وہ میرے فن کو سراہتے ہوئے اس کے عوض میں مناسب ادائیگی کیوں نہیں کر سکتے..مجھ سے ان کا چھچھورا پن برداشت نہیں ہوتا اور اب میں کم ہی ایسی محفلوں میں شرکت کی دعوت قبول کرتی ہوں..

یوں بھی میری ضروریاتِ زندگی بے حد مختصر ہیں، مجھے کھانے پینے سے کچھ زیادہ رغبت نہیں..ویسے بھی محلہ کمانگراں کے آس پاس نہایت ارزاں اور ذائقے دار خوراک آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے..کپڑے لتے کا مسئلہ میو ہسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر نمائش کردہ سیکنڈ ہینڈ اُترن سے حل ہو جاتا ہے..جی ہاں یہ بریزیئر میں نے وہیں سے صرف

تیس روپے میں حاصل کیا تھا.. چنانچہ میری گزر اوقات بخوبی ہو جاتی ہے..لیکن.. میں اب آپ کو اپنی اُس بے کلی میں شریک کرنا چاہتی ہوں جو پچھلے چند روز سے میرے اندر جڑیں پکڑ رہی ہے..میں اپنے آپ کو بوسیدہ ہوتے محسوس کرنے لگی ہوں..میرے معمولات میں اتنی یکسانیت آنے لگی ہے کہ وہ جو اجنبی سرزمینوں میں زندگی کرنے کا پُرمسرت ہیجان تھا، وہ دھیما پڑنے لگا ہے..ایک ایسا ٹھہراؤ آ گیا ہے کہ میرے وجود میں گردش کرتا خون اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تھم گیا ہو اور اُس پر ایک ایسے تالاب کی مانند جس میں مدت سے تازہ پانی نہ داخل ہوئے ہوں، کائی جمنے لگی ہے..وہی چند خانہ بدوش گیت گاتے جن کی کچھ پذیرائی نہیں ہوتی، وہی شہر لاہور کی گلیاں اور بازار، وہی ''گوری گوری'' کی صدائیں، خوراک کے وہی ذائقے، جیسے ایک مونوکرام تصویر میں ایک ہی سیاہی اور سفیدی کی یکسانیت کی پرچھائیاں ہوتی ہیں..

اور ہر ویک اینڈ پر یونہی اُسی ایک سٹول پر برہنہ بیٹھے، پوز کرتے، داؤد کے سٹوڈیو میں، بے حس و حرکت بیٹھے بیٹھے مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں اس بلند سٹول پر ازل سے بیٹھی ہوئی ہوں اور جب اس سے اتر کر فرش پر پاؤں رکھوں گی تو بوڑھی ہو چکی ہوں گی..اس حیات کی یک رنگی کا تسلسل مجھے آزار دینے لگا ہے..

یہ جو بے کلی ہے جس کے آثار میرے وجود میں ایسے پھوٹتے ہیں جیسے اُس خواب میں ایک قدیم گلی کی بوسیدہ اینٹوں میں سے ہریاول پھوٹتی تھی، اس کا جواز شائد میرے خانہ بدوش خون میں مضمر ہو..میرے خیمے کے گرد گھاس اتنی بلند ہو چکی ہے کہ وہ اس میں روپوش ہونے کو ہے اور خانہ بدوش تو گھاس اُگتے ہی اپنے خیمے سمیٹ کر پھر سے مائلِ سفر ہو جاتے ہیں اور میں ٹھہری ہوئی ہوں..اپنے ڈینیوب کے پانیوں کے لئے اداس ہو گئی ہوں..بے شک میرے باپ کا وجود راوی کے پانیوں سے سینچا ہوا ہے اور اس کے کناروں پر چیتھڑا خیموں میں سے ایک میں میری ایک ماما آٹا گوندھتی ہے لیکن..یہ پانی اتنے آلودہ اور غلیظ ہو چکے ہیں کہ میں ان کے کناروں پر ہمیشہ کے لئے بس جانے کی آرزو نہیں رکھتی۔ پھر میرے اندر ایک ہول سا اٹھتا ہے کہ اگر ایک خانہ بدوش اپنے گھر کو لوٹ جانے کی آرزو میں مبتلا ہو جائے..تو وہ خانہ بدوش تو نہ ہوا، اپنے گھر کے کنویں کا مینڈک ہوا..

اس ماہیت قلب کی..لوٹ جانے کی خواہش کی ایک توجیہہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایک خانہ بدوش پر بھی، عمر گزرنے سے وہ وقت آ جاتا ہے جب وہ کسی ایک مقام پر ہمیشہ کے لئے ٹھہر جانا چاہتا ہو..اُدھر لوٹ جانا چاہتا ہو جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا..مجھ پر شائد وہی وقت آ گیا ہے..

میں داؤد اکبر کے لئے پوز کرتی ایک بلند سٹول پر برہنہ ازل سے بیٹھی ہوں اور میں اب نیچے اتر کر زمین کو محسوس کرتے اُس پر چلتے چلتے اپنے گھر جانا چاہتی ہوں..صرف مجھے داؤد اکبر کی محبت جو یک طرفہ ہے، وہی روکتی ہے ورنہ میں کب کی کوچ کر گئی ہوتی..اور پچھلی شب جب کہ گرمی مجھے پسینہ آلود اور نڈھال کرتی تھی، میں اپنے زیر جامہ میں بھیگتی تھی تو اُس بے کل نیم غنودگی میں مجھے ایک مرتبہ پھر اُس رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے ڈینیوب کے پانی اندر آتے اٹڈتے آتے محسوس ہوئے جو کسی خواب میں یا خیال میں تھے..یہ خواب تو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی لیکن پچھلی شب رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے جو پانی بہتے ہوئے چلے آتے تھے، اُن میں ایک چہرہ تھا..ڈوبتا ابھرتا، کبھی روپوش اور کبھی ظاہر ہوتا ایک بوڑھے کا چہرہ تھا جس پر حسرتوں کی ناتمامی اور یاسیت کے رنج کی شکنیں تھیں..میں یکدم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، میں پسینے سے

تربتر تھی کہ ڈینیوب کے خواب ناک پانیوں میں ڈوبتا ابھرتا چہرہ میرے باپ مصطفےٰ اسلام کا تھا..شاید یہ بے کلی جو پچھلے چند روز سے میرے بدن میں واپسی کے کانٹے بوتی تھی..اپنے باپ کو ڈوب جانے سے بچانے کے لئے مجھے واپسی کے سفر کے لئے اُکساتی تھی..

داؤد..ایک تخلیقی خمار میں گم کینوس پر میرے بدن کے تناسب منتقل کرنے میں گم تھا اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ میں اس سٹول پر بےلباس بیٹھی کہاں گم ہوں..

اور جب پورے چھ گھنٹوں کی بے حس وحرکت اور چپ نشست کے بعد میں اُس بلند سٹول سے اتری تو میرا جوڑ جوڑ اکڑ چکا تھا..

وہ میرے لئے الفت کا ایک ذرہ بھی نہ رکھتا تھا..اُس کے لئے میں ایک محض شجر، ایک عمارت، سرسوں کا ایک کھیت یا ایک بے جان گلدان تھی..ایک سٹل لائف تھی..اُس نے ایک بار بھی مجھے چھو کر نہ دیکھا کہ مجھ میں زندگی ہے یا نہیں..جیسے ایک گلدان، ایک سیب یا ایک گلاس کی سٹل لائف کو پینٹ کرتے ہوئے آپ اُسے چھو کر تو نہیں دیکھتے کہ یہ زندہ ہیں..

میں نے اپنے آپ کو بمشکل ملبوس کیا کہ میرا بدن اکڑاہٹ سے جمود میں آ چکا تھا اور ذرا سی حرکت درد کا سبب بنتی تھی ''داؤد..میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ بے اعتنائی سے کینوس پر ایک آخری سٹروک لگا کر بولا ''میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں داؤد..تم مجھے گھر نہیں چھوڑ سکتے..''

اس نے ابرو چڑھا کر شائد پہلی بار مجھے ایک عورت کے طور پر دیکھا ''میں کیوں تمہیں تمہارے گھر نہیں چھوڑ سکتا.تم کوچہ کمانگراں میں رہتی ہو..میں جانتا ہوں..میں تمہیں چھوڑ آؤں گا..''

''تم مجھے گھر چھوڑنے کے لئے نہیں جا سکتے پیارے شخص..اتنی دور نہیں جا سکتے کہ میں کوچہ کمانگراں میں نہیں، راوی کے کناروں پر نہیں، بوداپسٹ، نیلے ڈینیوب کے کناروں پر رہتی ہوں..تو کیا تم مجھے وہاں تک چھوڑنے جاؤ گے؟ مجھے خدشہ ہے کہ تمہاری پرانی کار وہاں تک نہ جا سکے گی..تو مجھے جانے دو..میرا باپ ڈوبنے کو ہے اور میں اُسے بچانا چاہتی ہوں..''

●○●○●○●

اُس مرتبان میں اُس کی جان تھی..

وہ اسے ایک بچے کی مانند سینے سے لگائے جیسے اُس کی دل کی دھڑکن سنتا تھا، اپنے آپ کو روپوش رکھنے کی خاطر شام ہی سے ایک تنگ گلی کی اوٹ میں ایک کوڑے دان کے ساتھ جڑا منتظر تھا اور ہوا کی یخ بستگی رات کے اترنے کے ساتھ ہی کنکناتی چلی آئی تھی اور بھاری اونی سویٹر اور سمور کی جیکٹ کے اندر سرائت کرتی اُس کی تھک چکی زوال آشنا ہڈیوں پر اپنے سرد لبے ہونٹ رکھتی اُسے ہولے ہولے کپکپانے پر مجبور کرتی تھی اور وہ نہایت چوکنا ہو کر اپنے ہاتھوں تک پہنچتی لرزش پر قابو پانے کی سعی کرتا تھا کہ کہیں اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھاما وہ مرتبان اُس کی گرفت سے چھوٹ نہ جائے اور اُس میں محفوظ راکھ فٹ پاتھ پر بکھر نہ جائے..

اُسے وہاں اس پوشیدہ حالت میں کھڑے، بہت عرصہ بیت گیا تھا.. رات کی تاریکی شہر کی برقیلی بھڑک اور نیون سائنز کی روشنیوں پر اترنے سے جھجکتی تھی کہ وہاں اُس نے اپنا تاریک وجود اُس چکا چوند میں گم کر بیٹھنا تھا تو وہ صرف شہر کے اُن حصوں پر ہی اترتی تھی اور زیادہ شدت سے اترتی تھی جہاں پارک اور رہائشی علاقے تھے اور روشنیاں مدھم تھیں..

ابھی تک دیوار کے آس پاس کچھ لوگ تھے..

وہ اُن کی موجودگی میں اُس کی راکھ دیوار کی اینٹوں پر نہیں بکھیر سکتا تھا..

دیوار برلن کا وہ ایک مختصر حصّہ جو آئندہ تاریخ میں جبر کی ایک علامت، اشتراکیت کے قہر اور شخصی آزادی پر ایک کاری وار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا تھا.. اُسے مسمار نہ کیا گیا تھا تا کہ اُس کے آثار آئندہ نسلوں کے لئے عبرت کا سامان بن سکیں، اہل برلن کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی کا حامل نہ تھا.. البتہ یہ ایک سیاحتی کشش ضرور تھا، سیاح اور اُن میں سے بیشتر امریکی سیاح برلن میں وارد ہوتے ہی ''دے برلن وال'' کے باقیات کا رُخ کرتے جیسے وہ ایک درگاہ ہو جس کی زیارت اُن پر فرض تھی.. وہ اُس کے پس منظر کے ساتھ تصویریں اترواتے.. ذرا مسخرے پن سے اداکاری کرتے کہ جیسے وہ مشرقی برلن سے فرار ہو کر دیوار عبور کرنے کی کوشش میں شوٹ کر دیئے گئے ہوں.. زبانیں باہر نکالے، آنکھیں چڑھائے مردہ ہو جانے کی اداکاری کرتے.. وہ دیوار کے محفوظ کر لئے گئے حصّے کے قریب ایستادہ سیاحتی سٹالوں سے اس خونی دیوار کی تاریخ کے کتابچے خرید کر اُن میں شائع شدہ مشرقی برلن سے فرار ہونے کی کوشش میں ہلاک کر دیئے گئے افراد کی تصویریں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے.. وہ جو ایک آزاد دنیا میں داخل ہونے کی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے.. دیوار کی کچھ اینٹیں بھی قدرے مہنگے داموں حاصل کی جا سکتی تھیں اگرچہ اب تک سیاحوں کے ہاتھوں اتنی اینٹیں فروخت ہو چکی تھیں جتنی اُس پوری دیوار میں بھی استعمال نہ ہوئی تھیں..

دیوار کے بھاری پتھروں کے سائے میں دو تین درجن گلدستے رکھے ہوئے تھے اور اُن میں آرائش شدہ پھول ایک ہی نسل کے اور بیشتر سُرخ رنگت کے تھے لیکن ان کی نیّت میں فرق تھا..ان میں سے کچھ گل دستے اُن جرمنوں کی سوگواری کی نمائندگی کرتے تھے جن کے عزیز و اقارب یا تو مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے اور یا وہ دیوار عبور کرنے کی کوشش میں مارے گئے..لیکن..اُن میں سے کچھ گُل دستے یا سرخ فیتوں میں بندھے ہوئے چند پھول وہ بوڑھے جرمن بھینٹ کر جاتے تھے جو اب بھی اپنے کمیونسٹ ماضی پر فخر کرتے اُس کے رخصت ہو جانے پر رنجیدہ تھے..ان کے لئے دیوار کا یہ حصّہ گویا ہیکل سلیمان کی باقیات میں سے ایک ایسا کھنڈر تھا جو اُن کے درخشاں ماضی کی ایک یادگار تھا جس کے ساتھ لپٹ کر وہ رونا تو چاہتے تھے پر رو نہ سکتے تھے۔

دن کی روشنی میں دیوار کے اُسی باقی ماندہ حصّے کے پتھروں پر راکھ کو بکھیرنا بہت سے لوگوں کو متوجہ کر سکتا تھا.. اُس لئے وہ پچھلے تین گھنٹوں سے اُس مرتبان کو سینے سے لگائے ایک کوڑے دان سے جُڑا اپنے آپ کو نظروں سے اوجھل رکھنے کی خاطر، ایک مفرور کی مانند، بوڑھی ہڈیوں میں رچی جاتی یخ سے کپکپاتا لیکن اپنے ہاتھوں کو لرزش سے روکتا، منتظر تھا کہ کب دیوار کا دیدار کرنے والا آخری سیّاح رخصت ہو اور کب وہ اپنی پوشیدگی سے باہر آ کر اُس پر..بلتر ڈ کی راکھ کو بکھیر دے..

عارف نقوی کی آنکھیں خشک تھیں..اگر کبھی اُس کی یاد میں..جس کی خوش آثار دیدہ زیب رعنائی لوگوں کی آنکھوں میں سما کر اُن میں گھر کر لیتی تھی، اُنہیں اپنی گرفت میں لے کر اسیر کر لیتی تھی، جس کے قدموں میں چاہت بھری آرزوؤں کی درخواستیں روزانہ ڈھیر ہوتی تھیں اور جس کی نظریں بین الاقوامی ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں شامل کراچی پاکستان سے آنے والے ایک شعلہ بیان، خوش رُو نوجوان ادیب پر یوں ٹھہر گئی تھیں کہ اُس کی وجاہت سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں..اور جس کے حُسن کا آفتاب ڈھلتے ہوئے بھی دل پر اثر کرنے والا تھا..اور وہ جو کمیونزم کی بین الاقوامیت، رہتی دنیا تک قائم رہنے والے انصاف پسند اور مساوات کے علمبردار فلسفے پر دل سے یقین رکھتی تھی..اگر کبھی اُس کی یاد میں.. وہاں ایک کوڑے دان سے جُڑے اُس برفیلی رات میں منتظر عارف نقوی کی خشک آنکھوں میں کچھ نمی آتی تو رات کا سرد ٹھہراؤ اُسے رخساروں پر بہنے نہ دیتا، منجمد کر دیتا..

وہ اُسی بلتر ڈ کو سینے سے لگائے کھڑا تھا اگرچہ وہ راکھ ہو چکی تھی، ایک کرشن اپنی رادھا کے پھول سینے سے لگائے اُنہیں گنگا کے پانیوں میں بہا دینے کی خاطر منتظر تھا..

وہ اکثر خواب گاہ سے باہر آ کر..اپنا گاؤن ابھی تک اپنے متناسب بدن کے گرد کستی، اُسے صوفے پر خوابیدہ، مدہوش پڑا دیکھتی تو اُس کا دل تھم جاتا کہ آریف کی آنکھیں نیم وا کیوں ہیں، اس کے چہرے پر زردی کیسی ہے اور سانس لیتا نہیں لگ رہا تو وہ فوراً تشویش میں مبتلا ہو کر جھکتی، اُس کے سینے پر اپنا کان رکھ کر غور کرتی اور پھر مسکرا دیتی..اُسے پیار سے جھنجھوڑ کر مصنوعی غصّے سے کہتی..''آریف..''اور وہ آنکھیں کھول دیتا..

اُس صبح بھی..وہ اپنی نیم غنودگی کی آغوش میں نیم خوابیدہ بلتر ڈ کے اپنے آپ پر جھکنے اور سینے کے ساتھ کان لگا

کر اُس کے دل کی دھڑکن سننے کا منتظر بہت دیر تک رہا.. جب کبھی اُسے خلجان ہوتا، کوئی نامعلوم بدنی بے چینی اُسے سونے نہ دیتی، آنکھیں کھلی رہتیں اور اُن میں نیند سا جانے سے انکاری ہو جاتی تو وہ نیند کی نصف گولی نگل لیتی اور پھر دن چڑھے تک بے سُدھ سوئی رہتی.. اُس کا خیال تھا کہ اُس کی آج صبح کی غیر حاضری کا سبب نیند کی وہی نصف گولی تھی.. پر وہ مر چکی تھی..

وہ اپنی ٹانگیں پیٹ کے ساتھ سکیڑے جیسے ایک بچہ ماں کی کوکھ میں سمٹا ہوتا ہے، بستر پر پڑی تھی.. عارف نے اُس کے کندھے تھام کر اُسے سیدھا کیا اور اُس کے سینے کے ساتھ کان لگا کر.. مسکراتے ہوئے کہ آج وہ اُسے چھیڑے گا کہ بلٹر ڈ.. لیکن وہاں خاموشی تھی، ایک ازلی سناٹا تھا جیسے موم کے ایک مجسمے کے سینے کے اندر ہوتا ہے، وہاں اُس خواب گاہ میں جس میں کبھی.. بستر کی چادر میں، تکیوں میں، کھڑکیوں کے پردوں میں یہاں تک کہ تپائی پر رکھے سائیڈ لیمپ کے شیڈ میں بھی وصال اور محبت کی نم مہک موجود رہتی تھی، وہاں.. موت کی بُو تھی.. اُسے کسی بھی موت کا اور خاص طور پر کسی قریبی عزیز کی موت کا آج تک کوئی براہ راست تجربہ نہ تھا اس لئے وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کا ردِعمل کیا ہونا چاہیے۔ ایک لاش کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے.. اُسے کہیں منتقل کرنا ہے یا وہیں پڑا رہنے دینا ہے، کیا کرنا ہے اُسے کچھ اندازہ نہ تھا.. اُس کی آنکھیں صحرا میں پڑی سُوکھ چکی ایک لکڑی کی مانند خشک رہیں، اُن میں سے ایک آنسو بھی نہ پھوٹا اور وہ ایک بے یقین سناٹے میں غیر متحرک حالت میں اُس کے.. بلکہ اپنے بستر کے کنارے پر بیٹھا رہا، یہاں تک کہ ابھی تک کھڑکی کے آگے کھنچے ہوئے پردوں میں دن کی جو روشنی تھی، وہ تحلیل ہونے لگی اور شام ہو گئی..

یہ پہلا موقع تھا پچھلے پینتالیس برس میں کہ صبح سے شام تک بلٹر ڈ نے اُس کے ساتھ بات نہ کی تھی..

اس دوران نہ تو اُسے واش روم جانے کی حاجت ہوئی، نہ پیاس محسوس ہوئی اور نہ ہی بھوک نے ستایا.. جیسے وہ بھی بستر پر پڑی بلٹر ڈ کی مانند موم کا ایک بے جان مجسمہ ہو چکا ہو.. جب وہ اُس کی دن بھر کی خاموشی کی تاب نہ لا سکا.. تو اُس نے اِنگے کو فون کیا.. اُس کی بیٹی کے ہاں شاید دوستوں کی کوئی دعوت جاری تھی کہ پہلے اُسے پُر شور گفتگو کی بھنبھناہٹ سنائی دی اور پھر اپنی ہنسی بمشکل روکتی اِنگے کی ''ہیلو'' سنائی دی..

''اِنگے..''

''ہیلو ڈیڈی..'' اُس کی آواز میں ایک خمار بھری الفت تھی ''آئی لَو یُو ڈیڈی..''

''اِنگے.. تمہاری ماں صبح سے مجھ سے نہیں بولی.. اور اب رات ہو رہی ہے..''

آسٹریلیا.. دنیا جہان سے الگ تھلگ.. یورپ سے چاند کے فاصلوں پر.. اتنے طویل فاصلوں پر کہ وہاں سے برلن پہنچنا اور وہ بھی فوری طور پر.. چاہے تمہاری مردہ ماں منتظر ہو.. مشکل تھا..

وہ روئی تو بہت.. بلکتی رہی.. پر آ نہ سکی.. اُس نے کوریئر سروس کے ذریعے پورے پانچ ماتمی گلدستے سیاہ ربن میں بندھے ہوئے بھجوا دیئے کہ ڈیڈی انہیں میری ماں کی قبر پر رکھ دینا.. کہ میں اُس سے بے حد محبت کرتی تھی..

وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی اس خواہش کو پورا کرنے سے قاصر رہا کہ بلٹر ڈ نے اپنے آپ کو مٹی میں دفن ہو جانا پسند نہ کیا.. وہ اُس کی لاعلمی میں وصیت کر چکی تھی کہ موت کے بعد مجھے دفن نہیں کرنا.. میری لاش کو نذرِ آتش کر دینا ہے.. راکھ کر

دینا ہے تو جس مرتبان میں اُس کی راکھ محفوظ ہو، اُس کے سامنے پورے پانچ ماتمی گلدستے کیسے رکھے جا سکتے ہیں..

وہاں.. جب اُسے.. اور تب بھی اُس کے نیم وا ہونٹ اگرچہ برف سفیدی میں تھے لیکن اس روز کی مانند دل کش لگ رہے تھے جب اُس نے اُسے پہلی بار چُوما تھا.. اُس کے چہرے کی خوش آثاری پر موت اثر انداز نہ ہوئی تھی.. وہاں.. جب اُسے برلن کی ایک آتش گاہ میں لے جایا جا رہا تھا تو اُس کے تابوت کے پیچھے چلنے والا وہ واحد سوگوار تھا.. نہ کوئی اُس سے تعزیت کرنے والا تھا اور نہ دلاسہ دینے والا.. ابھی تک وہ اُس کے لئے رویا نہ تھا اور اگر رو دیتا تو اُس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا.. ایک خاص مقام پر پہنچ کر.. اور اُسے اُس مقام سے آگے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو کھل جانے کو تھا اُس کے مردہ بدن کو آتش گاہ کے اہلکاروں نے اپنی تحویل میں لے لیا.. آپ یہاں سے آگے نہیں جا سکتے.. وہ اُس کے تابوت کو دھکیلتے جیسے سبزی یا پھلوں سے لدے ایک ٹھیلے کو دھکیلتے ہیں، اُس کھل چکے دروازے کے اندر لے گئے..

شاید پورے برلن شہر میں اس آتش گاہ کا علاقہ سب سے پرسکون اور چپ سناٹے میں تھا..

اُسے انتظار کرنا تھا..

یہ انتظار طُول کھینچنے لگا..

بلٹر ڈ کا مردہ بدن راکھ ہو جانے میں اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے.. اُس لمحے آتش دان میں اُس کے جسم کا کونسا حصہ جل رہا ہے اور کون سا حصہ جل جانے سے انکاری ہو رہا ہے.. اُس کی آنکھیں، ہونٹ یا اُس کے وہ ہاتھ جو اُس کے ماتھے پر آ جاتے تھے کہ آریف.. تمہیں بخار تو نہیں..

کچھ نہ کچھ تھا جو جلنے سے انکاری ہو رہا تھا ورنہ اتنی دیر کیوں لگتی.. چلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا.. اُس آگ کی تپش بلٹر ڈ نے کہاں محسوس کی ہوگی کہ وہ تو مردہ ہو چکی تھی کہ وہ مجھ سے پوچھے کہ آریف تم تو زندہ ہو، تمہیں اس میں جلنے سے کتنی اذیت ہو رہی ہوگی..

ایک سادہ سا مرتبان اُسے تھما دیا گیا اور اُس میں بلٹر ڈ کی راکھ تھی..

ایسی راکھ کبھی گنگا یا سندھ میں بہا دی جاتی ہے، کبھی دبا دی جاتی ہے اور کبھی محفوظ کر لی جاتی ہے.. بلٹر ڈ کی وصیّت میں یہ شق بھی درج تھی کہ جلا دینے کے بعد اُس کی راکھ کو دیوارِ برلن کے آثار پتھروں پر بکھیر دیا جائے کہ یہ دیوار بلٹر ڈ کے عقیدے کے مطابق آزادی اور غلامی کے درمیان ایک حصار تھی.. اشتراکیت کی آزادی اور سرمایہ داری نظام کی غلامی کے درمیان.. اُس نے بلٹر ڈ کی وصیت سے تھوڑا سا انحراف کیا.. آج دوپہر یہاں آنے سے پہلے اُس نے مرتبان کھول کر تھوڑی سی راکھ پلاسٹک کے ایک پیکٹ میں ڈال کر اُسے اپنے بٹوے میں بند کر لیا تھا.. اندرونی جیب میں رکھتے ہی اُسے بٹوے کے اندر سے بلٹر ڈ کے بدن کی ہلکی تمازت اپنے سینے میں سرائت کرتی محسوس ہوئی..

رات مزید گہری ہوگئی.. جب دیوار کے آس پاس کوئی سیاح نہ رہا، ویرانی ہوگئی تو وہ اپنی پوشیدگی سے باہر آیا.. ایک مُجرم کی مانند اِدھر اُدھر نگاہ کر کے اطمینان کیا کہ کہیں کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا اور پھر مرتبان کا ڈھکن کھول کر وہ راکھ

دیوار کے پتھروں پر بکھیر دی..راکھ کے سرمئی ذرّے نیم سیاہ پتھروں کے مساموں پر نمایاں ہوتے تھے..بلٹرڈ کی شباہت اُن ذرّوں میں جھلکنے لگی، وہ جھکا اور پتھروں سے چمٹے ہوئے چند ذرّوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے..

دن بھر وہ اپنے آپ کو بے وجہ مصروف رکھتا..کبھی جھاڑ پونچھ کرنے لگتا اور کبھی کچن کیبنٹ میں سے کراکری نکال کر اُسے دھونے لگتا..تعزیت کے لئے کوئی بھی نہ آیا..اوپر آتے، نیچے جاتے لفٹ میں اُسی عمارت میں مقیم کوئی شناسا چہرہ اُس سے بلٹرڈ کی غیر موجودگی کے بارے میں دریافت کرتا تو اکثر وہ کہہ دیتا کہ وہ بویریا میں اپنی بہن کے ہاں گئی ہوئی ہے کہ برلن کے سرد موسموں میں اُس کا سانس رکتا تھا اور کبھی مسکراتے ہوئے کندھے سکیڑ کر اُس کے مرنے کا اقرار کر لیتا..تعزیت اتنی دیر ہوتی جتنی دیر میں اُس شناسا چہرے کے فلیٹ والی منزل پر لفٹ رُک نہ جاتی..

دن گزر جاتا لیکن راتوں کو فلیٹ کی سیاہ تنہائیوں میں اُسے خواب آتے..وہ لکھنؤ کی سٹیج پر کرشن کا رُوپ دھارے کھڑا ہے اور اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے جو رادھا کھڑی ہے، ہو بہو بلٹرڈ کی شکل کی ہے اور جب وہ اُس کا من جیتنے کے لئے اپنی بانسری کو اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہے تو اُس میں کوئی لے برآمد نہیں ہوتی اور وہ رادھا اُس کی نظروں کے سامنے راکھ ہوتی چلی جاتی ہے..

اُس رات دیوار برلن سے واپسی پر سونے سے پیشتر بیڈروم میں آویزاں ایک آئینے کے سامنے اُسے اپنا چہرہ نظر آیا تو اُس کے ہونٹوں پر ابھی تک راکھ کے کچھ ذرّے چپٹے ہوئے تھے..بلٹرڈ کے ہونٹ اُس کے ساتھ چلے آئے تھے..

اگلی سویر وہ دوبارہ اُس مقام پر گیا..رات کی اوس نے بلٹرڈ کی راکھ کو چاٹ لیا تھا اور اب اُن پتھروں پر اُس کے کوئی آثار نہ تھے..

اِنگے ابتدائی ایام میں تو اُسے باقاعدگی سے فون کرتی رہی لیکن دن گزرنے سے فون کے وقفے طویل ہونے لگے اور وہ ہمیشہ اُسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے پوچھتی ''ڈیڈی..آپ ممی کو زیادہ مِس تو نہیں کرتے..اُن کے بغیر زندگی کیسی گزر رہی ہے۔'' اور وہ ہنستے ہوئے کہتا'' اِنگے..کسی نہ کسی نے تو پہلے جانا تھا، وہ چلی گئی..میں اپنے دن بہت مزے سے بسر کر رہا ہوں..میں صبح سیر کے لئے نکل جاتا ہوں..میں نے پارک میں ایک السیشن سے دوستی کر لی ہے اور میں اُس کے لئے روزانہ کچھ نہ کچھ کھلانے کے لئے لے جاتا ہوں اور اُس کا مالک بالکل معترض نہیں ہوتا..کیا یہ حیرت ناک بات نہیں کہ وہ کتا پنیر بہت شوق سے کھاتا ہے..واپسی پر میں اورنج جوس کے ایک گلاس کے بعد یہ پرواہ کیے بغیر کہ زردی میں کولیسٹرول کی مقدار بہت ہوتی ہے، دو فرائی انڈے کھاتا ہوں..کتابیں پڑھتا ہوں، ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں..نصرت فتح علی خان کی قوالیاں سنتا ہوں اور اُن میں سے ایک ''کسے دا یار نہ وچھڑے'' میری بہت پسندیدہ ہے..شام ہوتی ہے تو میں..ہاں..اُسی پرانی لکھنؤ کے زمانوں کے تصویری البم کی ورق گردانی کرتا ہوں..تو میں بہت مزے میں ہوں..میرے لئے تمہیں فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں..ہاں کبھی کبھار تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے..نہیں نہیں اِنگے تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت نہیں، کیا میں آگاہ نہیں ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان کتنے

طویل فاصلے حائل ہیں..تو میں..مزے میں ہوں..''

نہ وہ نظام قائم رہا تھا جس کی خاطر وہ اس ملک میں ٹھہر گیا تھا اور نہ بلٹر ڈ رہی تھی تو یہاں بسیرا کرنا کیسا بے سُود اور بے وقعت تھا..وہ مکمل طور پر دھتکارا جا چکا تھا..اس بڑھاپے میں اُس پر کیسا دھتکار پن نازل ہو گیا تھا..وہ اپنے آپ کو اس اجنبی مٹی کے سپرد نہیں کرنا چاہتا تھا..اپنی مٹی جانے اُسے قبول کرتی ہے یا نہیں..

عارف نقوی نے ایک شب یہ فیصلہ کر لیا کہ اُسے بہر طور لوٹ کر اپنی مٹی سے قبولیت کی درخواست کرنی ہے..

●○●○●○●

میرا نام شوکی جھوٹا ہے..

میں نے آج تک شعوری طور پر کبھی جھوٹ نہیں بولا..

اور اس کے باوجود میں عمر بھر جھوٹا کہلایا..شوکی جھوٹا..صرف اس لئے کہ گئے زمانوں میں میرے بزرگ دادے یا پڑدادے نے کسی مصلحت کے تحت، کوئی راز پوشیدہ رکھنے کی خاطر یا ہوسکتا ہے کسی منفعت کی ہوس میں جھوٹ بولا تھا جو ظاہر ہوگیا..چھوٹے اور دور افتادہ دیہات میں ہر شخص اپنی برادری سے جُڑا ہوتا ہے..اگر کوئی نوجوان گلی میں سامنے سے آتی دوشیزہ کو دیکھ کر کھانس دے تو اُس کھانسی کی خبر گاؤں کے ہر فرد بلکہ کھیتوں کے پتے پتے بوٹے بوٹے کو ہو جاتی ہے..کچھ بھی مخفی نہیں رہتا تو وہاں برادری کے کسی ایک فرد سے کوئی لغزش ہو جائے تو وہ ایک تہمت بن کر نہ صرف اُس کے نام سے بلکہ آئندہ نسلوں سے بھی چپک جاتی ہے..وہ لغزش، کوئی معذوری یا خوبصورتی بھی اُس کے خاندان سے منسلک ہو کر اُن کے ناموں کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔

مثلاً کوئی ڈیڑھ سو برس پیشتر گاؤں کے کسی بزرگ کا گلا پیدائشی طور پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ جب بھی بات کرتے تو گلے کی قدرتی خراش کے باعث گھگھیا کر بات کرتے۔ چنانچہ اگر وہ محض حاکم بخش تھے تو حاکم بخش گھگیھا ہو گئے..ازاں بعد موصوف کی جتنی بھی آل اولاد ہوئی اور اُن کی آل اولاد ہوتی چلی گئی وہ سب کے سب کیا مرد کیا عورتیں سب کے سب گھگیھا کہلائے اور وہ اس لقب اس پہچان کو قبول کرتے اپنے نام کا ایک حصّہ بناتے کچھ قباحت محسوس نہ کرتے تھے بلکہ نام کی بجائے پُر فخر انداز میں اپنا تعارف ایک گھگیھا کے طور پر کرواتے تھے، یہاں تک کہ جب انہوں نے اپنی آبائی زمین پر کہ آبادی اُس کے نزدیک آتی گئی تھی، ایک رہائشی کالونی تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کی تو اُسے ''گھگیھا ٹاؤن'' کا نام دیا..گھگیھا فلور مِل..گھگیھا سُپر سٹور کے علاوہ گھگیھا فاسٹ فوڈ بھی اُن کے طرۂ امتیاز تھے..

یا پھر..گئے زمانوں میں ہماری برادری کے کسی بڑے کو طوطے پالنے کا جنون تھا..اُنہیں باتیں سکھانے پڑھانے اور ان کے ساتھ پہروں مغز ماری کرنے کا سودا تھا یہاں تک کہ بال بچوں سے غافل ہو کر اپنے کنویں پر درجنوں طوطوں کے ساتھ ایک باتونی زندگی گزار دی اور وہ طوطا جی کہلائے..اور آج اُن کی آل اولاد اپنے نام کے ساتھ بہر طور طوطا جی کا اضافہ کرتی ہے۔طوطا جی ٹرانسپورٹ..طوطا جی کولڈ سٹوریج..طوطا جی دارالعلوم..وغیرہ..میں نے یہ قدیم قصے اس لئے بیان کئے ہیں تا کہ آپ لوگ جو شہروں کی ثقافت کے پروردہ ہیں اور اپنے اردگرد پھیلے دیہات کے رسوم و رواج سے غافل ہیں، یہ جان سکیں کہ ایک جھوٹا کہلانے میں کچھ حرج نہیں..تو یہ نصیب کی کرامت ہے کہ میرے کسی گمنام بزرگ نے دانستہ یا نادانستہ جھوٹ بولا تو ہم اُن کی آل اب تک جھوٹے کہلاتے ہیں اور ہمیں اس میں کوئی پشیمانگی ہرگز نہیں..میری ہمشیرگان

اپنے تعارف میں بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ جی ہم جھوٹے ہیں..بلکہ میری بہو بھی بہت ناز کرتی ہے کہ میں جھوٹوں میں بیاہی گئی ہوں..

تو میں ایک جھوٹا ہوں..شوکی جھوٹا..

لیکن یہ قدرت کے کھیل ہیں کہ وہ ایک جھوٹے کو سچ پرکھنے کی صلاحیت عطا کر دے..جو کچھ غیب میں ہے اُسے آنکھیں بند کر کے دیکھ لینے کا معجزہ بخش دے..جو اپنے آپ کو سچے کہتے ہیں، اُن پر غالب آ کر انہیں جھوٹا ثابت کر دے..یہ محض مولا کے کرشمے ہیں..کہاں میں جھوٹا اور کہاں میری بند آنکھوں میں غیب کے منظر..جو پوشیدہ ہے وہ نہاں ایک تصویر کی مانند..

یہ کیسا کھیل تماشا ہے..میں عرض کرتا ہوں..

میں ایک معمولی ہل کی ہتھی پر اپنی توانائی کا بوجھ ڈال کر زمین کو ادھیڑ کر اُس میں سے اپنا رزق کشید کرنے والے کاشتکار کا بیٹا..نہ پڑھا نہ لکھا..ذرا ہوش سنبھالی تو بھینسوں کا دودھ دوہتا..مویشیوں کے لئے چارہ کاٹ کر اُسے گتاوے میں گوندھ کر اُن کے آگے رکھتا..انہیں نہلاتا ستھرا کرتا..ان کا بھاپ دیتا گوبر ہاتھوں سے سمیٹتا..کھیتوں کو پانی لگاتا..معمول کی حیات بسر کرتا تھا..پھر وہی حیات تنگ ہونے لگی..میرے باپ کی ملکیت چند بیگھے زمین اُس کے زور آور بھائیوں نے پٹواری کی ملی بھگت سے ہتھیا لی اور فاقوں کی نوبت آنے لگی..

مجھے پیٹ پالنے کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا پڑا..

اُن دنوں سیالکوٹ میں کھیلوں کے سامان..کٹلری..چمڑے کی جیکٹوں..دستانوں..آپریشن کے اوزاروں اور خاص طور پر فٹ بال بنانے کی صنعت زوروں پر تھی..مجھے وہاں ایک فیکٹری میں روزگار مل گیا..جہاں کسی آئندہ کے ورلڈ کپ کے لئے خصوصی طور پر فٹ بال بنائے جا رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ وہاں لاہور سے پی ٹی وی کی جانب سے ایک خرد ماغ شخص کنور آفتاب احمد نام کا آیا تھا جس کے بارے میں دُھوم تھی کہ وہ اپنے شعبے میں کاریگر مانا جاتا تھا اور اُس نے اپنی ڈاکومنٹری ''اے بال نیمڈ ٹینگو'' بناتے ہوئے کیمرہ میری انگلیوں پر مرکوز کیا تھا جن میں سے ایک فٹ بال جنم لے رہا تھا..

اگرچہ میں ایک ان پڑھ کاشتکار کا ان پڑھ بیٹا تھا، میرے ہاتھوں میں لوہاروں، ترکھانوں، موچیوں، جولاہوں یا کمہاروں کی مانند کوئی ہُنر نہ تھا..لیکن اس کے باوجود رزق کے حصول کی تگ و دو نے میری انگلیوں میں ایسی مشاقی اور کاریگری بھر دی تھی..اور یہ مولا کا کرم تھا..کہ جب میں چمڑے کے اُن بتیس ٹکڑوں کو ایک سوئی کے دھاگے میں پروتا ٹانکے لگاتا جن کے جوڑنے سے ایک فٹ بال وجود میں آتا ہے تو میرے پرونے اور ٹانکے لگانے میں ایسی کاملیت ہوتی کہ گمان گزرتا کہ یہ فٹ بال بغیر کسی ٹانکے اور گانٹھ کے یونہی مکمل حالت میں پیدا ہوا ہے..

البتہ کبھی کبھار ایک مسئلہ درپیش ہو جاتا..

ہم وہاں کوئی درجن بھر کاریگر تھے جن میں سے بیشتر ذات کے موچی تھے اور پیدائشی طور پر گانٹھ لگانے اور چمڑے کو سینے پرونے کے ماہر تھے..جب ہم میں سے کوئی ایک اپنا فٹ بال چمڑے کے ٹکڑوں کو ایک تناسب سے گانٹھیں لگا کر تیار کر لیتا تو وہ اُسے درمیان میں رکھی ایک پلاسٹک کی ٹوکری میں ڈال دیتا..مسئلے نے اسی ٹوکری میں سے جنم لیا..کبھی کبھار

اُس میں پڑے دو تین فٹ بال اپنی پچکی ہوئی حالت میں ہولے ہولے پھولنے لگتے..اُن میں جانے کیسے ہولے ہولے ہوا بھر جاتی اور پھر وہ ٹوکری میں سفید مینڈکوں کی طرح اچھلنے لگتے..تمام کاریگر ہاتھ روک کر ان خود بخود اچھلتے اور یکدم پھر سے بے جان ہو کر پچک کر ٹوکری میں گرتے فٹ بالوں کو ایک ڈری ہوئی حیرت سے تکتے..وہ فٹ بالوں کی اس اچھل کود کو کسی جناتی عمل کا ردِعمل سمجھتے اور کچھ اسے آنکھوں کا دھوکا جانتے..کچھ نہ کہتے چپ رہتے..ایک بار فیکٹری کے کبڑے مالک جنہیں فورمین نے اس وقوعے کی خبر کر دی تھی، قدرے پُرتشویش ہمارے سیکشن میں آئے اور خاصی دیر تک ٹوکری میں پڑے فٹ بالوں کو ٹکٹکی باندھے تکتے رہے لیکن مجال ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی اپنے مقام سے سرکا ہو..سب کے سب مردہ پڑے رہے اور کُبڑے مالک نے فورمین کو سرزنش کی کہ تم نے خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کیا.تمہارا وہم ہے ورنہ کبھی فٹ بال بھی خود بخود اچھلے ہیں، جونہی وہ واپس جانے کے لئے پلٹے ہیں تو ٹوکری میں سے ایک فٹ بال اچھلا اور فیکٹری کے فرش پر لڑھک گیا۔ میں بقیہ کاریگروں کی مانند دم سادھے منہ کھولے حیرت زدہ رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے..لیکن اتنے برسوں بعد میں آپ کو اس راز میں شریک کر سکتا ہوں کہ اس ٹوکری میں سے جتنے بھی فٹ بال پھول کر اچھلنے کودنے لگتے تھے وہ سب میرے ہاتھوں کے سِلے ہوتے تھے..تب میں چپ رہا کہ اعتراف کرنے سے میرا روزگار منقطع ہو سکتا تھا..ویسے مجھے اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا کہ میرے ہاتھوں میں کیا کسی بھوت پریت کا بسیرا ہے کہ ان کے بنائے ہوئے فٹ بالوں میں جان پڑ جاتی ہے..

میں اس روزگار کے دوران اپنے آبائی گاؤں آتا جاتا رہتا تھا اور جو کماتا تھا اپنے عُسرت زدہ ماں باپ کے قدموں میں رکھ دیتا تھا..

تو ایک ایسا دن تھا جب میں اپنے گاؤں میں چھٹی کے دو چار روز بسر کر کے سیالکوٹ واپس جا رہا تھا اور اس دن غضب کا حبس تھا، چڑیوں کے بھی یوں دم رُکتے تھے کہ وہ درختوں سے گرتی تھیں، میں بھی گرمی اور حبس کی شدت سے ہانپتا نڈھال ایک برگد کی چھاؤں میں گھڑی دو گھڑی ستانے کی خاطر بیٹھ گیا اور اپنا وہ ٹرانزسٹر ریڈیو جو میری سب سے قیمتی متاع تھی اور جسے میں ہر دم سینے سے لگائے پھرتا تھا، اپنے پہلو میں رکھ کر آن کر دیا..کوئی بہت ہی ناپختہ بھدی آواز والا گلوکار حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کا کوئی حصّہ گا رہا تھا..نہ مجھے اُس کے متن کا ادراک تھا اور نہ ہی اُس کے معانی میرے جہل کے اندھیروں میں اُترتے تھے لیکن..وہ اُس کی لَے تھی یا کیا تھا کہ مجھے ایک مجذوب کی مانند حال پڑ گیا..میں اپنے آپ میں نہ رہا.خلقِ خدا سے الگ ہو کر میں کسی ایسے جہان میں اتر گیا جہاں پوشیدہ بھید مجھ پر ظاہر ہونے لگے..وہ سب کچھ نظر آنے لگا جو روپوش تھا..اُس لَے نے میرے اندر کسی ایسی صلاحیت کو آنچ دی جس کی موجودگی سے میں بے خبر تھا اور مجھے ایک صاحبِ کرامات کر دیا..میں اُن تمام اشیاء کے مقام سے آگاہ ہونے لگا جو کہ گمشدہ تھیں اور اسرار کے پردوں میں چھپی تھیں..

میں اس قصّے کا اہم کردار نہیں ہوں..اپنا تعارف کرواتے ہوئے اپنی حیثیت سے بڑھ کر طوالت اختیار کر لی ہے تو اسے مختصر کرتا ہوں..

میں نے فٹ بال بنانے کی وہ ملازمت ترک کر دی کہ اب میں گمشدہ اشیاء..چاہے یہ زیور گہنے ہوں، رقم ہو،

مال مویشی ہوں یا زرعی آلات یا پھر بچے، میں ان کا سراغ لگا سکتا تھا..میری اس عجوبہ صلاحیت کا چرچا دنوں میں پھیل گیا اور لوگ جوق در جوق میرے گھر آنے لگے اور میں کوئی صوفی منش درویش تو نہ تھا دنیادار تھا تو اپنا پیٹ پالنے کی خاطر میں اُن سے صرف ایک سو روپے اُن کے مسائل حل کرنے کے عوض وصول کرتا..کاروبار چل نکلا..میں ہر صبح ایک چارپائی پر دراز ہو کر اپنے اوپر ایک چادر اوڑھ لیتا اور میرا کوئی مددگار ٹیپ ریکارڈر پر شاہنامہ اسلام کی ایک کیسٹ چلا دیتا جسے سن کر میں اُس جہان میں سفر کر جاتا جہاں مجھے سب گمشدہ اور بچھڑے ہوئے لوگ اور زیور گہنے نظر آنے لگتے اور وہ مقام دکھائی دینے لگتے جہاں وہ موجود ہیں یا چھپائے گئے ہیں، میں چادر اوڑھے آنکھیں بند کیے اپنے مراقبے میں گم اپنا دایاں ہاتھ چادر میں سے نکال کر طالب سے کہتا کہ اگر تو مرد ہے تو اپنی قمیض یا بنیان اور اگر عورت ہے تو اپنا دوپٹہ مجھے تھما دے..میں اپنی چادر کی روپوشی میں وہ پیراہن سونگھتا اور مجھ پر ایک منظر منکشف ہونے لگتا..میں ایک موٹی عورت کو ایک بڑے پلنگ پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہا ہوں..اُس کا ناک نقشہ اس نوعیت کا ہے.تمہاری نزدیکی عزیز ہے،تمہارے گمشدہ گہنے زیور جو اُس نے چرائے ہیں ایک سبز رنگ کی الماری میں رکھے ہیں جس کا ایک پٹ بند نہیں ہوتا..ایک صحرا ہے..ڈاچی والوں کا ایک ڈیرہ ہے تمہارا گمشدہ بچہ ایک چارپائی پر بیٹھا رو رہا ہے..اور گاؤں سے باہر شیشم کے دو تناور درخت ہیں جن کی شاخیں آپس میں الجھی ہوئی ہیں،اُن کے قریب دھوپ میں دو کچی کوٹھڑیاں ہیں.تمہارا ٹریکٹر بائیں ہاتھ کی کوٹھڑی میں موجود ہے..

کچھ عرصہ کے بعد مجھ پر کھلا کہ جب میں چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹتا ہوں تو اُس لمحے اگر شاہنامہ اسلام کی بجائے کوئی بھی لے..کوئی دُھن..کوئی چلنت فلمی نغمہ بھی میرے کانوں میں اترے..زبیدہ خانم کا ــ اَساں جان کے میٹ لئی اکھ وے.. یا نور جہاں کا،کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا.. یا..سُن وے بلوری اَکھ والیا.. یا پھر مہدی حسن کا،گُلوں میں رنگ بھرے..تب بھی میں اُس عالمِ رویا..بے خودی یا حال میں چلا جاتا ہوں جہاں مجھ پر انکشاف ہونے لگتے ہیں..مجھے اُس غیب کے جہان میں اترنے کے لئے محض ایک مترنم بہانے کی ضرورت ہوتی تھی..میری اس جان لینے کی صلاحیت کا اتنا چرچا ہوا کہ بہت سے عالم فاضل اور محقق آئے اور اُنہوں نے مجھ سے انکشاف کی اس صلاحیت کے بارے میں گفتگو کی..اور میں ایک ان پڑھ اور جاہل..ایک کاشتکار کا بیٹا کیسے جان سکتا تھا کہ اسے جدید سائنس کے حوالے سے ای۔ایس۔پی کا نام دیا گیا ہے..ایکسٹرا سینسری پرسیپشن..ایک حسّی،دماغی قیاس..ایک گمان..حواس کی فراہم کردہ معلومات پر شعور کا ردعمل..ایک ایسا ادراک جو بُوجھا نہیں جا سکتا..اور اس صلاحیت کا حتمی طور پر کسی مذہب یا عقیدے یا کسی درویشی یا پاکیزگی سے کچھ واسطہ نہ تھا..یہ کسی بھی انسان میں، بلاشک وہ مذہب سے برگشتہ یا اخلاق باختہ ہو..یہ صلاحیت نمودار ہو سکتی تھی..یہ معمول سے بڑھ کر حسّی ادراک یا شعور کا ایک کرشمہ تھا..

میں بغیر کوئی دعویٰ کیے کتنی آسانی سے ایک پیر فقیر، پہنچا ہوا بزرگ، مرشد کامل ہو سکتا تھا لیکن میرے اندر ایک کھرا کسان تھا اور وہ خلق خدا کو فریب دینے پر یقین نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس صلاحیت کو روحانی کرامت کی بجائے ایک ایماندارانہ کاروبار کے طور پر اپنایا اور خوب کمایا..میں نے اپنے رزق حلال سے چند مربعے زمینوں کے حاصل کیے اور گوجرانوالہ کینٹ میں یہ شاہانہ گھر خریدا اور یاد رہے کہ میں اپنی اس وجدانی آمدنی کو ظاہر کر کے باقاعدگی سے انکم ٹیکس بھی ادا کرتا رہا۔

بہر طور اس قصّے کا ایک مرکزی کردار نہ ہونے کے باوجود.. کہ میں صرف اپنا مختصر کردار ادا کر کے رخصت ہو جاؤں گا، اگر میں نے اپنے تعارف میں اتنا وقت صرف کیا ہے تو محض اس لئے کہ اب جو کچھ میں آپ پر ظاہر کرنے والا ہوں.. منکشف کرنے والا ہوں، آپ کو اُس پر کامل اعتبار آ جائے..

اور ہاں.. میں نہایت انکساری سے عرض کرتا ہوں کہ.. وہ جو بجھارتوں کے زمانے تھے.. گمشدہ اشیاء کے سراغ لگانے کے زمانے تھے.. وہ سب ایک قصّۂ پارینہ ہو چکے ہیں.. حواس کی فراہم کردہ معلومات پر شعور کا عمل اور وہ حسیاتی دروں بینی.. یہ کب کے ترک ہو چکے ہیں.. انہوں نے نہیں میں نے اس بڑھاپے میں آ کر ان سے جان بوجھ کر منہ موڑ لیا ہے کہ کہیں روزِ حشر اگرچہ جادو برحق ہے، مجھے ایک جادوگر کی حیثیت میں شفاعت حاصل نہ ہو.. مجھے بخشا نہ جائے.. تو میں اب توبہ تائب ہو چکا ہوں..

میری آنکھوں میں سیاہ موتیا اتر آیا ہے اور سب کچھ دھندلا رہا ہے.. پھر بھی میرا کچھ اختیار نہیں.. اگرچہ میں توبہ تائب ہو چکا ہوں لیکن میرے قیاس اور ادراک میں.. یوں جیسے میرے سامنے ایک سفید پردہ تنا ہے اور وہ چاروں اُس پر نمودار ہو رہے ہیں اور میں اُنہیں یوں دیکھتا ہوں جیسے وہ دن کی تیز دھوپ میں میرے سامنے کھڑے ہیں اور اُن سے نہ تو میری کچھ شناسائی ہے اور نہ ہی کوئی واقفیت.. وہ میرے لئے چاروں.. اجنبی اور ناآشنا ہیں..

میں.. شوکی جھوٹا.. جو گمشدہ اشیاء کے علاوہ گمشدہ لوگوں کا سراغ لگانے کی صلاحیت رکھتا ہوں.. وہ چار جو مجھے دکھائی دے رہے ہیں، ان سے زیادہ گمشدہ لوگ تو کبھی میرے دھیان میں نمودار نہیں ہوئے..

یہاں.. گوجرانوالہ کینٹ کے اس شاہانہ گھر کے اندر جب کہ میں ایک شاندار مرصع فرانسیسی گولڈن پلنگ پر ایک چینی ریشم کی نایاب چادر اوڑھے لیٹا ہوا ہوں تو وہ چاروں جو کسی شکستہ خواب کی کرچیوں سے تخلیق کردہ لگتے ہیں.. گمشدہ، میرے کشف میں ظاہر ہو رہے ہیں..

آج.. میں.. شوکی جھوٹا.. جس نے زندگی بھر شعوری طور پر کبھی جھوٹ نہیں بولا.. ایک چادر، چینی ریشم کی نایاب چادر اوڑھے لیٹا ہوا ہوں، آنکھیں کھولتا ہوں تو اِک عالم غیب نہیں، دھندلاہٹ کا ایک پردہ نظر آتا ہے کہ موتیے کا عارضہ میری بصارت کا بیری ہو چکا ہے اور یہ وہ سفید مائل کرم موتیا نہیں جو ان دنوں پانچ منٹ کے ایک معمولی آپریشن سے نہ صرف جاتا رہتا ہے بلکہ آپ کی آنکھوں میں ایسے لینز نصب کر دیئے جاتے ہیں جو ہر جانب چکا چوند کر دیتے ہیں بلکہ یہ روسیاہ کمبخت کالا موتیا ہے جو بالآخر آنکھوں کے آخری دیئے بجھا کر اُنہیں نابینائی کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔

میں... جی ہاں.. شوکی جھوٹا.. جو گمشدہ بچوں.. چوری ہو جانے والی کاروں، ٹریکٹروں.. موٹر سائیکلوں اور گہنوں کا کھوج لگا سکتا تھا، آج اپنی چینی نایاب ریشم کی چادر کے اندر آنکھیں کھولتا ہوں تو آپ بُوجھ سکتے ہیں کہ مجھے سیاہ موتیے کی دھندلاہٹ میں کیا نظر آتا ہے؟ ایک گمشدہ سرنگوں شکست خوردہ بچہ.. اُس کی حیرانی اور ڈر کھوئے جانے والے ایک بچے ایسا ہے ورنہ اُس کے بال سراسر سفید ہیں.. وہ ایک خوش شباہت بوڑھا ہے.. پس منظر میں ایک ایئرپورٹ کی گہما گہمی ہے جس میں وہاں سے اٹھنے والی یا بیٹھنے والی پروازوں کے مبہم سے اعلان ہو رہے ہیں اور میں شوکی جھوٹا اُسے اپنی چادر کے اندر ایک انکشاف کے طور پر دیکھتا جاتا ہوں.. وہ ٹرالی پر اپنا مختصر سامان لادے اُسے دھکیلتا لاؤنج سے باہر آ رہا ہے.. بہت

سے ٹیکسی ڈرائیوراور کچھ اٹھائی گیرے اُسے عرب ممالک سے آنے والا کوئی مالدار شخص جان کر اُس کا گھیراؤ کر لیتے ہیں اور پھر فوراً ہی اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ایک گُنگ شخص ہے، کسی کو کچھ جواب نہیں دیتا..بُت بنا کھڑا ہے، نہیں جانتا کہ اب کہاں اور کدھر جائے..

ایئرپورٹ کے باہر کراچی شہر..نسلی اور لسانی عداوتوں کے زہر میں پھنکارتا ایک آلودہ ہو چکے سمندر کی مانند ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور وہ اس میں اترنے سے جھجکتا ہے کہ وہاں اُس کے اتھاہ پانیوں میں سے اپنائیت اور پہچان کا کوئی جزیرہ نمودار ہوتا نہیں دکھائی دیتا..کوئی ایسا ریتلا ٹاپو نہیں اُبھرتا جو شناسائی کا بھرم رکھ لے..میں شوکی جھوٹا اپنے حواس کی فراہم کردہ معلومات پر اپنا شعور ایک عدسے کے مانند مرکوز کرتا ہوں تو مجھے اُس کی اندرونی جیب میں جرمن پاسپورٹ کے علاوہ ایک بٹوا نظر آنے لگا ہے اور اُس کے اندر پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا پیکٹ ہے اور اُس کے اندر کچھ سرمئی راکھ ہے اور وہ راکھ کوئلے یا لکڑی کی نہیں، ہڈیوں کی ہے کہ اُس کی رنگت میں ایک زندہ لگتی خوش نمائی ہے..اور یہ شخص عارف نقوی ہے..

وہ ابھی اُسی جھجک میں مبتلا اسی الجھن میں ہے کہ شہر کی سمندر آلودگی میں کیسے اتروں اور اس دوران اُس کے برابر میں ایک پُراعتماد دکھائی دیتا شخص جس کے کہولت زدہ چہرے پر نوخیزی کے کچھ بجھتے ہوئے روپ ہیں، سامان کی ٹرالی دھکیلتا اُس کے برابر میں رُک جاتا ہے..وہ اس شخص سے واجبی طور پر مل چکا تھا..ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ پی آئی اے کے بُکنگ کاؤنٹر پر لاہور روانہ ہونے والی اگلی پرواز میں ایک نشست کے حصول کے لئے لجاجت سے درخواست گزار تھا اور اُسے بے رخی سے بتایا گیا تھا کہ نہ صرف اگلی پرواز بلکہ اس کے بعد جو آخری پرواز ہے، وہ بھی مکمل طور پر بھر چکی ہے اور کچھ گنجائش نہیں..اس انکار سے جہاں وہ پژمردہ اور مایوس ہوا تھا وہاں یہی شخص جو اُس کے برابر میں آکھڑا ہوا تھا اور یہ بھی لاہور کے لئے ایک نشست کا آرزومند تھا، ازحد آزردہ ہو گیا تھا..

''ہیلو..'' عارف نقوی نے اُسے پہچان کر ایک خصوصی سرد جرمن انداز میں محض ایک فرض ادا کیا..

''ہیلو..'' وہ کسی قدر گرم جوش تھا..کہ مشرقی یورپ کے باسی اتنے سرد ہو نہیں سکتے..وہ دونوں آتے جاتے..اپنی پرواز پکڑنے کے لئے چڑھتے ہوئے سانسوں کے ساتھ آتے، ایئرپورٹ سے نکل کر اطمینان سے اپنی کسی منزل کو جاتے..پورٹروں اور ٹیکسی ڈرائیوروں کی یلغار اور لاؤڈ سپیکروں میں سے برآمد ہونے والے اعلانات کی بھنبھناہٹ اور یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اردو بولی جارہی ہے یا انگریزی میں معلومات فراہم کی جارہی ہیں، وہ دونوں پہلو بہ پہلو اپنے اپنے مخمصوں میں الجھے تا دیر کھڑے رہے اور پھر وہ..جو مصطفےٰ اسلام تھا، بولا اور جیسے اپنے آپ سے ہی مخاطب ہوا ''اب کیا کریں؟ میرا تو اس شہر میں نہ قیام کا ارادہ ہے اور نہ ہی میری یہاں کوئی جان پہچان ہے کہ کل تک اس امید پر رُکا رہوں کہ بائی ایئر لاہور چلا جاؤں گا..میں تو اپنے آپ کو ذہنی طور پر بائی ٹرین لاہور جانے کے لئے آمادہ کر رہا ہوں..''

''آپ لاہور کے ہیں؟''

''ہاں..اور آپ؟''

''میں..'' عارف نقوی نے قدرے توقف کیا کہ کیا میں اس اجنبی کے ساتھ ذرا بے تکلف ہو سکتا ہوں یا نہیں ''میں..ہوں تو کراچی کا..لیکن میں نے بھی لاہور جانا ہے..''

''ویسے تو سنا ہے کہ اب وہاں تک بسیں بھی چلتی ہیں لیکن میری ہڈیاں اتنے طویل سفر کے دھچکے برداشت کرنے کے قابل نہیں رہیں..شنید ہے کہ راستے میں ڈاکو حضرات بھی منتظر ہوتے ہیں تو..میں اپنے آپ کو ٹرین کے سفر کے ایڈونچر کے لئے تیار کر رہا ہوں..''

''مجھے بھی ساتھ لے جائیے..'' عارف نقوی نے ایک گمشدہ بچے کی مانند اُس کی جانب لجاجت بھری نظروں سے دیکھا..

باہر رات تھی..

لیکن وہ رات اپنے اندھیارے میں چُپ آرام سے نہ تھی اُس کے خاموش سینے پر لاہور جانے والی تیز رفتار ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ایک سڑک کوٹنے والے انجن کی مانند دھمک دھمک چلتی تھی..ڈبے کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں کہ وہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں نشستیں حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے..شاید باہر ہوا تھی یا نہیں لیکن ٹرین کا اژدہا جب پھنکارتا ہوا اُس رات کے اندر چلا جاتا تھا تو اُس کا آہنی بدن تیز ہوا کو جنم دیتا تھا جو شُوکتی ہوئی کھلی کھڑکیوں میں سے اندر چلی آتی تھی، ڈبے میں جو دیگر مسافر تھے اور وہ سب اونگھ میں تھے ان کے پیراہنوں کو پھڑپھڑاتی ایک مرغولے کی مانند گونجتی گھومتی مخالف سمت میں واقع کھڑکیوں کے راستے باہر چلی جاتی تھی..اور ہوا خالی ہاتھ نہ آتی تھی..سندھ کے جن ریتلے ویرانوں، کھجوروں کے جُھنڈوں، باغوں اور رات میں جذب کھیتوں کی خوابیدہ ہریاول میں سے ایک اژدھے کے مانند دھڑ دھڑ کرتی گزرتی چلی جاتی تھی اُن سب کی بُو باس اور مہک وہ اپنی جھولی میں بھر کر لاتی تھی..اور اُس میں ریت کے ذرّے باغوں کی تُرش خوشبو اور کھیتوں کی ہریاول اور ویرانوں کی مٹی بھی شامل ہوتی تھی جو وہ ڈبے میں بکھیر کر کھڑکیوں میں سے فرار ہو جاتی تھی..

ان دونوں کے چہروں پر وہ ریت اور مٹی اترتی تھی اور وہ مہکیں اور خوشبوئیں اُن کے مساموں میں رچتی تھیں..

''بوداپسٹ میں ایسی سرمست اور گرم مہک نہیں ہوتی..''

''برلن میں بھی نہیں..'' عارف نقوی ٹرین کی جھولا جھلاؤ اس حرکت کی لوری سے اونگھنے لگا تھا..

عارف نقوی کے منع کرنے کے باوجود ٹرین اُس رات جس کسی سٹیشن پر ٹھہر جاتی مصطفےٰ اسلام باگیس تڑاکر پلیٹ فارم پر اتر جاتا، واپس آتا تو اُس کے ہاتھوں میں چربی سے نچڑا ہوا اخباری کاغذ کا کوئی لفافہ ہوتا'' پکوڑے کھائیں گے؟..بیسن کے لڈو ہیں، مُولی کے قتلوں اور چٹنی کے ساتھ..چکھیں گے؟''

عارف نقوی..ہر جرمن کی مانند خوراک میں صفائی ستھرائی اور مکمل پاکیزگی پر یقین رکھتا تھا..یہاں تک کہ تُرک بھائیوں کے ریستورانوں میں بھی کھانا کھانے سے پرہیز کرتا تھا کہ وہ صفائی کے معاملے میں زیادہ احتیاط پسند نہ تھے لیکن یہاں اُس نے اپنی جان داؤ پر لگا دی اور پرہیز نہ کر سکا'' جرمن خوراک اور خاص طور پر ہیمبرگر سٹیک اور قیمہ بھرے ساسیج تو میرے من پسند ہیں لیکن وہ ایسے نہیں کہ اُنہیں سامنے پا کر تالو میں سے ذائقے کے دھارے بہنے لگیں..البتہ ان میں مرچیں بہت کثرت سے ہیں..شاید کل میں پیٹ کے خلجان میں مبتلا ہو جاؤں لیکن ایک پکوڑا اور سہی..''

''ان کے مقابلے میں ہنگیرئین گولاش کتنا بے رُوح اور بے سواد ہے..بے شک پکوڑوں میں بوسیدہ پیاز کے

لچھے ہیں اور بیسن کے لڈو غلیظ سیاہ تیل میں تلے گئے ہیں اور اُن پر مکھیاں بھی براجمان تھیں لیکن..''

اُس گہری رات کے مہک آور عجائبات، ریت اور مٹی کے چہروں پر بجھتے ذرّوں اور ان مرچیلے پکوڑوں اور بیسن کے لڈوؤں نے اُنہیں ایک دوسرے کے قریب یوں کر دیا کہ اُنہوں نے اپنی گزشتہ حیات کے قصوں کے دیوان کھول دیئے..اُن پر انکشاف ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی سُرخ خواب کے اسیر..اُس کی چاہت کے حصول میں اپنے وطن کو ترک کرنے والے، اجنبی اور سرد خطوں میں ٹھہر جانے والے اور کسی رَد جایابلٹر ڈ کے عشق میں مبتلا ہو کر وہیں خیمے ایستادہ کر دینے والے تھے جو کہ..تاریک راہوں میں مارے گئے..

''اگر زمانے وہی ہوتے انقلاب کے خواب دیکھنے والے تو میں آپ کو کامریڈ مصطفےٰ کہہ کر مخاطب کرتا..''

عارف نقوی کے خوش وجاہت چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ اب بھی کہہ سکتے ہیں کامریڈ عارف..بے شک وہ خواب بکھر کر..منتشر ہو کر عوام کی دُھند میں تحلیل ہو چکا لیکن ہم دونوں کے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم اُس خواب کو سراسر اپنی حیات سے خارج کر سکیں..کہ ہمارے لئے تو مقصد حیات ہے وہی تھا اور اُس کے بغیر ہم کھوکھلے ہو چکے ہیں لیکن ابھی ہم اپنے آپ کو فریب دیئے رکھتے ہیں، اس میں کیا حرج ہے..لاہور میں آپ کا کوئی ہے؟''

''میرا..کہیں بھی..کوئی نہیں ہے..میں کچھ راکھ لئے پھرتا ہوں اُس کے سوا..کوئی نہیں ہے۔ لاہور میں میرے لکھنؤ کے زمانوں کے ایک ہمدم دیریں آغا بابر رہتے ہیں..مدت سے رابطہ نہیں ہوا..ہم دونوں وہاں لکھنؤ میں سٹیج پر انقلابی ڈراموں میں اداکاری کیا کرتے تھے اور میں..'' عارف نقوی کے سپید چہرے پر شرمیلے پن کی ایک مسکراہٹ پھوٹنے لگی..

''اور میں..کرشن ہوا کرتا تھا اور وہ ایک ارجن..''

''ایک کرشنا..'' مصطفےٰ اسلام اس معصوم سے شخص کی چاہت میں مبتلا ہو رہا تھا..

''ایک انقلابی کرشنا جس کی مُرلی کا رنگ بھی سُرخ ہوتا تھا..تو میں وہاں پہنچ کر اپنے ارجن کا سراغ لگاؤں گا..آپ کا تو وہاں کوئی نہ کوئی ہو گا؟''

''ہاں وہاں میرے گلی کُوچے ہیں..کوچہ کمانگراں میں شہر کے اندرون میں ہمارا ایک آبائی مکان ہے جو شکست و ریخت سے دوچار ہے اور وہاں..اگرچہ میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں اطلاع نہیں کی..میری اکلوتی بیٹی جینا رہتی ہے..میں اُسے ایک سرپرائز دینا چاہتا ہوں..''

''آپ خوش نصیب ہیں کامریڈ..مجھے تو..اور میری بھی ایک اکلوتی بیٹی ہے اِنگے..اُسے سرپرائز دینے کے لئے آسٹریلیا جانا پڑے گا..''

''آپ سے ایک گزارش ہے..'' مصطفےٰ اسلام نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''بے شک لاہور سٹیشن پر اتر کر آپ اپنے دوست کا سراغ لگائیے گا لیکن اس سے پیشتر آپ میرے ہمراہ میرے گھر جائیں گے..اگرچہ ہماری ملاقات دیرینہ نہیں ہے لیکن ہم دونوں میں نظریات اور خوابوں کا رشتہ بہت پرانا ہے۔''

●○●○●○●

میں شو کی چُھو ٹا جب کہ میں اپنی چادر اوڑھے مُنہ ڈھانپے لیٹا ہوا ہوں، دھندلاہٹ کے پردے پر جو تصویریں جھلملاتی ہیں اُنہیں بیان کرتا چلا جاتا ہوں تو آپ لوگ.. یقیناً اب تک مجھ سے بدگمان ہو چکے ہوں گے کہ بے شک میں اپنے کشف کے زور پر گمشدہ چہرے دیکھ لیتا ہوں لیکن اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کیسے سن سکتا ہوں.. میں آپ سے فریب کرتا ہوں..نہیں، نہ میں نے شعوری طور پر آج تک جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی جان بوجھ کر کسی کو دھوکا دیا ہے..جیسے خاموش فلموں میں اداکاروں کے لب ہلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ایسے مجھے بھی جن کرداروں کو میں اپنے تصور میں لے آنے پر قدرت رکھتا ہوں، اُن کے لب ہل رہے ہوتے ہیں اور میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں..ویسے ہر شخص کے اندر معمول سے تجاوز کرتے حسیات کا ادراک موجود ہوتا ہے لیکن وہ اسے بروئے کار نہیں لاتا تو آپ بھی کچھ تعاون کیجیے اور اُس حس کی صلاحیت کو بیدار کیجیے تو آپ ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمے سن سکیں گے..

منظر بدلتا ہے..

عارف نقوی اور مصطفیٰ اسلام لاہور سٹیشن پر قدم رکھتے ہیں تو منظر یکسر بدل جاتا ہے..

اب میں دیکھ رہا ہوں کہ ایروفلوٹ کا ایک جیٹ اُڑان کر رہا ہے اور اُس کے انجنوں کا بے پناہ قوت بھرا شور کان بہرے کرتا ہے اور یہ جیٹ ماسکو سے تاشقند کی جانب پرواز کر رہا ہے..میری آنکھیں اس کے بظاہر مضبوط آہنی وجود اگرچہ کسی بھی معمولی دھماکے کی تاب نہ لا کر ایک باریک پلاسٹک کی مانند پچک کر بھک سے اڑ جانے والے وجود کے اندر سرائت کرتی ہیں تو وہاں اُس کے اندرون میں خاموشی ہے، ایک ہلکی سی میکانکی سرسراہٹ ہے، اس کے سوا خاموشی ہے۔

میری آنکھیں ایک لڑکی پر ٹھہر جاتی ہیں..

لیلیٰ..جس کی رنگت میں دیسی گندم اور ماسکو کی برفوں کی گھلاوٹ ایسی ہے کہ جو کوئی مسافر اُس کے پاس سے گزرتا ہے، جکڑا جاتا ہے..اُس کے پاؤں میں اُس کی رنگت کی شیرینی اور سیاہ آنکھوں کی بیڑیاں پڑ جاتی ہیں اور وہ اپنے باپ قالب کے برابر میں بیٹھی ہوئی کبھی کبھی کسی خیال کی زد میں آ کر چونک اٹھتی ہے..کیا میں اپنے فیصلے پر پچھتا تو نہیں رہی..اپنے باپ کی محبت اور شفقت سے جذباتی ہو کر یوں زیر تو نہیں ہوگئی کہ اپنی زندگی کو خواہ مخواہ داؤ پر لگا دیا ہے جب کہ مجھے جوا کھیلنے کا کچھ تجربہ بھی نہیں..میں نے اپنی ماں اور نانا کی فراہم کردہ آسودہ زندگی کو ترک کر دیا ہے..اور میں کیا جانوں کہ یہ جیٹ ہوائی جہاز مجھے کن گمنام اور تاریک خطوں میں لئے جا رہا ہے جہاں جانے کیسی عفریتیں مجھے نگل جانے کے لئے اپنے جبڑے وا کیے منتظر ہیں....کیا میں نے یہ فیصلہ درست کیا ہے اور جب وہ چونک کر برابر میں اونگھتے اپنے باپ پر

ایک نظر کرتی ہے تو اُس کے فکرمند چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل جاتی ہے.. ہاں، یہ شخص جس نے نہ صرف میری ماں بلکہ میرے نانا سمرنوف کی عمر بھر چاکری کی، بے دام غلام رہا، نہ کبھی احتجاج کیا اور نہ ہی کبھی طیش میں آیا تو اس کے لئے کچھ بھی ترک کیا جا سکتا ہے.. یہ ایسا معصوم اور میٹھا شخص ہے..نہیں مجھے کچھ قلق نہیں کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا..لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟

اُسے، ظہیرالدین کو..توقع تھی، ایک پوشیدہ آرزو تھی کہ جب اُس نے کچھ روز کے لئے پاکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا.. یونہی سرسری طور پر جیسے چائے میں کم چینی کا تذکرہ کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی معترض ہو جاتا..نہ وہ پھولدار فراک میں ایک سائیکل پر اُڑی جانے والی اپنی جرمن وہیل چیئر میں قید بیوی ذرّہ بھر مُعترض ہوئی..اور نہ ہی بورس اور سویٹ لانا نے کسی حیرت کا اظہار کیا.. بلکہ اُس کی ہمت بندھائی گئی.. ہاں ہاں ظاہیر کیوں نہیں..تمہیں یاد ہے جب میں شادی کے فوراً بعد تمہارے بوریوالہ گئی تھی تمہاری محبت کے بندھنوں میں بندھی..لیکن وہ کواٹر اور وہ بھی تمہارے باپ کی ملکیت تھا، بہت چھوٹا اور ناکافی تھا..تو تم چند روز کے لئے اگر جانا چاہتے ہو تو یہ خیال زبردست ہے..بہرطور وہ تمہارا وطن ہے.. بورس اور سویٹ لانا نے تو اسے شائبہ سا ہوا کہ اطمینان کا ایک گہرا سانس بھرا تھا..

یہ صرف وارث چوہدری تھا جو اُس کے لئے غمگین اور فکرمند ہوا تھا..

تاشقند سے لاہور جانے والی پرواز نے پورے پانچ گھنٹوں کے بعد اڑان کرنی تھی اور یہ ایک طویل اور اذیت ناک انتظار تھا..

گہنائی ہوئی عظمتِ رفتہ کا ایک پرشکوہ آثار، تاشقند ایئر پورٹ کا پسینجر لاؤنج..سنگِ مرمر کے منقش فرش جو اپنی آب و تاب کھو چکے تھے..وسیع گھیر والے لپسلی دار یونانی ستون جن پر سنہری گُل بوٹے تقریباً پچاس برس پیشتر مصوّر کیے گئے تھے اور ان کے رنگ جیسے سوویت دور کی یادیں مدھم پڑتی جاتی تھیں ایسے پھیکے ہو رہے تھے اور لاؤنج میں سے اُترتی شاہانہ سیڑھیاں جیسے اُن کے آخر میں کسی زار کی خوابگاہ ہوگی..

تاشقند ایئر پورٹ بھی سوویت دور کا ایک خصوصی ٹریڈ مارک تھا..کمیونسٹ عہد میں عوامی سہولتوں، ایئرپورٹوں، ریلوے سٹیشنوں، شاپنگ سٹورز، ورزش گاہوں اور عجائب گھروں وغیرہ کی عمارتوں کو بے جا اصراف سے نہایت پرشکوہ انداز میں تعمیر کیا گیا تھا یوں جیسے وہ انسانوں کے نہیں یونانی دیوتاؤں کے مسکن ہوں..قد آور ستون، سنہری گنبد، بلند چھتیں اور بلوریں فانوس..طرح طرح کی شوخ سنہری آرائشیں.. یہاں تک کہ ماسکو کی زیرزمین ٹرین کے درجنوں سٹیشن ایسے شاندار اور شاہانہ تھے کہ اُن میں سے کسی ایک میں ایک تک چڑھا عیاش زار بھی ذہنی طور پر مطمئن ہو کر زندگی بھر قیام کر سکتا تھا..ان سٹیشنوں کی چکا چوند سجاوٹ اور آرائش اور صفائی ستھرائی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی جب کہ لندن اور نیویارک کی زیرزمین چلنے والی ٹرینوں کے سٹیشن نیم تاریک اور کسی حد تک بھدے تھے..ماسکو کے ان انڈرگراؤنڈ محلات کے فرشوں پر جن مسافروں کے قدم پڑتے تھے اُن کے جُوتے البتہ خستہ حال ہوتے تھے، پیراہن ڈھیلے ڈھالے، عُسرت زدہ اور

بدوضع ہوتے تھے لیکن جب اُن کے زندگی کی معمولی ضروریات کے لئے بھی ترستے چہروں پر دمکتے فرشوں اور کرسٹل کے فانوسوں کی روشنیاں پڑتیں تو وہ ایک لمحے کے لئے بندۂ مزدور کے سخت اوقات فراموش کر دیتے اور وہ اس یقین کے اسیر ہو جاتے کہ ہاں اشتراکی نظام نے مجھے ایک مزدور، ایک دہقان یا ایک ٹریکٹر چلانے والے کو کیسا معتبر کر دیا ہے کہ میرے چہرے پر ایسے فانوسوں کی روشنیاں جگمگاتی ہیں جو کبھی زاروں کے محلات کی زینت ہوا کرتے تھے اور وہ وقتی طور پر اپنی تاریک حیات کو فراموش کر دیتے..

یہ ایک نفسیاتی فریب تھا..

وہ بھول جاتے کہ اُنہوں نے یہاں سے واپس اُس ایک تنگ کمرے میں جانا ہے جس کی دیواروں پر کمیونزم کی عظمت کے پوسٹر.. درانتی اور ہتھوڑا اتھامے زن و مرد ایک تابناک مستقبل کی جانب مسمور حالت میں تکتے.. کھیتوں میں کام کرنے والی مسکراتی عورتیں.. باغوں میں سیبوں کے انبار آغوش میں لئے بے وجہ مسکراتی ہوئی لڑکیاں.. چسپاں ہیں اور پوری منزل پر درجن بھر خاندانوں کے لئے صرف ایک غسل خانہ ہے.. ایک ڈبل روٹی کے حصول کے لئے اُنہیں ایک طویل قطار میں کھڑا ہونا ہے..

سوویت یونین کسی حد تک ایک طویل قطاروں والی ریاست تھی.. جرابوں کے ایک جوڑے کے لیے، کیمرے کی ایک فلم کے لیے.. ایک لباس کے لیے.. صرف ایک ٹائی کے حصول کے لیے.. تو یہ عظیم الشان چمکتی دمکتی عمارتی عظمت.. ایک سنہری سراب.. ایک جگمگاتا فریب.. اس کے سوا ایک اور توجیہہ بھی تھی.. بے شک رُوسی عوام کی ایک غالب اکثریت اپنی حیات کی ذلتوں، محرومیوں، ناانصافیوں، افلاس اور جانوروں سے بھی بدتر زندگی سے تنگ آ کر ایک نئے انصاف پسند اور برابری کے معاشرے کے حصول کے لیے.. زاروں کے قہر اور ہلاکت خیز قوت کے آگے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے، لاکھوں کی تعداد میں مارے گئے تھے لیکن اُن کے اندر بہت گہرائی میں شاہانہ شانداری اور زاروں کی شان و شوکت کی مرعوبیت کی جڑیں اب بھی موجود تھیں.. وہ اپنی غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے تھے.. در پردہ اپنے اُس عہد کے تمنائی تھے جس میں بیلوں کی بجائے اُنہیں جوت کر اُن کی پیٹھوں پر درّے برسائے جاتے تھے، اُن کی اولادیں فاقوں سے مر کر مسلسل دفن ہوتی چلی جاتی تھیں.. بے شک اُنہوں نے زاروں کے خاندانوں کو.. بال بچوں سمیت ہلاک کر کے ایک گڑھے میں دبا دیا تھا لیکن شہنشاہی نظام کی مرعوبیت اُن کے بدن میں بدستور موجود تھی.. اُن کے اندر سینکڑوں برسوں کی جو ذلت اور رسوائی تھی.. وہ تحلیل نہ ہو سکی تھی، انسان ایک بار ایک مطیع جانور میں ڈھال دیا جائے تو پھر وہ اُس سانچے سے باہر مشکل سے آتا ہے.. چنانچہ یہ شاندار پُرشکوہ عمارتیں بے شک ایک فریب تھیں لیکن روسی عوام کی ایک نفسیاتی ضرورت بھی تھیں..

تاشقند ایئرپورٹ کا لاؤنج بھی اُسی نفسیاتی ضرورت اور فریب کا ایک گہنا چکا مظہر تھا.. لاہور جانے والی پرواز کے لئے پورے پانچ گھنٹے کا انتظار ایک مجبوری تھا.. اور اس بے زارکن، تھکا دینے والے طویل انتظار کے دوران یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ظہیرالدین بے شک لاؤنج میں داخل ہونے والے ہر مسافر کے چہرے اور سامان کا جائزہ لے.. ریستوران میں کم از کم کافی کے تین پیالے اپنے اندر انڈیلے، مقامی پلاؤ کھائے، ڈیوٹی فری شاپ کے مختصر پن میں تانک جھانک کرے.. مقفل

دروازوں کے باہر تاشقند کے چند درختوں کو دیکھے اور کتنی دیر دیکھے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بالآخر قالب اُس کے سامنے نہ آ جائے..

اگر چہ وہ دونوں ایک ہی پرواز سے تاشقند پہنچے تھے لیکن ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر رہے تھے..

''سَر ...'' ابھی وہ کسی تذبذب میں، کسی اُلجھن میں ڈوبا پتھر چہرے کا تھا اور ابھی وہ اسے ظہیر الدین کو دیکھتے ہی اُس چہرے میں جان پڑ گئی، اپنی مسکراہٹ پر اختیار نہ رکھتا وہ اُس کی جانب لپکا ہوا چلا آیا..اگر چہ عمر میں وہ اُس سے دو چار برس ہی چھوٹا ہو گا لیکن جب کبھی ملاقات ہوتی تو وہ اُسے ''سَر'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا.. پاکستانی حلقوں میں یوں بھی اُس کے ساتھ برتاؤ ایک نابالغ کی حیثیت سے کیا جاتا کہ وہ اپنے سُسر سمرنوف کا اتنا تابعدار اور فرمانبردار داماد تھا''سَر ..آپ کہاں جا رہے ہیں؟ یورپ یا امریکہ کی جانب؟''

ظہیر نے اُس کی جانب ایک گرم جوش ہاتھ بڑھایا''پاکستان..اور تم؟''

''پاکستان..''

اس صورتِ حال کا متوقع ردعمل تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ مشترکہ منزل اور وہ بھی پاکستان کی منزل پر وہ دونوں خوشی کا اظہار کرتے لیکن وہ بوکھلا گئے..ذرا مُجرم محسوس کرتے نظریں ملانے سے اجتناب کرنے لگے..

ان دونوں نے وطن کے ہرے بھرے نخلستان سے جدا ہو کر ایک سرد سلطنت میں بسیرا کرنے کو ترجیح دی تھی.. سرخ خواب کی تعبیر کے لئے اپنی مٹی سے بے وفائی کی تھی تو پھر سے واپس چلے جانا ایک پشیمانی، ایک شکست کا اعتراف تو تھا..

''وہاں کتنے روز ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟'' بالآخر ظہیر گویا ہوا۔

''میرا تو ہاں..'' وہ جھجکا''ٹھہرے رہنے کا ارادہ ہے..اور آپ؟''

''شاید میں بھی نہ لوٹوں۔''

''سَر آپ بھی..'' قالب کے لہجے میں ایک سوگوار رنجیدگی کی سیاہی تھی..''آپ سے کیا پردہ..سوویت یونین میں قیام کر جانا میری مجبوری تھی..مجھے روزگار درکار تھا..لیکن ایک حد ہوتی ہے، انسان کہیں نہ کہیں چاہے وہ کتنا ہی بودا اور بیکار کیوں نہ ہو، ایک جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے کہ یہ..یہ میں کیا کر رہا ہوں..ویسے آپ تو اب خاصے خوش حال ہو چکے ہیں..تانیا کے والد یُوری سمرنوف نے مجھے بتایا تھا کہ ابھی حال ہی میں آپ نے کوئی کاروبار اختیار کیا ہے جو بے حد سودمند ثابت ہوا ہے تو آپ بھی..''

''ہاں میں بھی..'' ظہیر نے صرف اتنا کہا اور پھر اُس کی مسکراہٹ میں ایک زہر گُھل گیا جو اُس کے بدن میں پھیلتا اُسے ڈسنے لگا''اس کے باوجود کہ ہر نئے کلیسا کے ماتھے پر میری ڈھالی ہوئی صلیبیں آویزاں ہو رہی ہیں، ہاں میں بھی..تم یہی کہنا چاہتے ہو قالب؟''

''نہیں سر..'' قالب نے نہایت معصومیت سے کہا''بالکل نہیں سر..''

اُن دونوں سے کچھ فاصلے پر شاہانہ سیڑھیوں کے سنگ مرمر کے برابر میں مسافروں کی خاطر جو بے آرام

پلاسٹک نشستیں قطار اندر قطار تھیں، اُن میں سے ایک پر براجمان بار بار بے آرامی سے پہلو بدلتی لیلیٰ ان دونوں کو گفتگو میں محو دیکھتی رہی اور پھر بیزار ہو کر اٹھی اور اُن کے پاس آ گئی.. ''ڈیڈی بیٹھ بیٹھ کر میری تو ٹانگیں اکڑ گئی ہیں، لاہور کی فلائٹ میں ابھی کتنی دیر ہے؟''

''سر.. یہ میری بیٹی ہے لیلیٰ..''

ظہیرالدین اُس کے یوں نمودار ہونے پر کچھ بوکھلا سا گیا، نہایت مؤدب ہو کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پھر سوالیہ انداز میں قالب کو دیکھا..

''یہ بھی میرے ساتھ جا رہی ہے سر..''

''پاکستان؟'' ظہیر بے یقین تھا..

''ہاں.. لاہور'' یہ کہتے ہوئے اُس نے لیلیٰ کی جانب لاڈ سے دیکھا ''کیوں لیلیٰ؟''

''ہاں ڈیڈی.. میں آپ کے ساتھ ہوں..''

ظہیرالدین کے سینے میں شدید حسد کی ایک تیز دھار برچھی کُھب گئی.. یہ سردار قالب.. اپنے سُسر کے پیشاب خانوں کی آمدنی اکٹھی کرنے والا.. ایک تابعدار غلام جس کی ذہنی صلاحیت بھی محدود تھی.. مجھ سے بہتر باپ ثابت ہوا ہے.. اس کی بیٹی اور اُس کے خوش آثار چہرے پر اپنے باپ کے لئے الفت کی ایک شفق پھیلتی تھی، جب اُس نے کہا تھا کہ ''ہاں ڈیڈی.. میں آپ کے ساتھ ہوں..'' اور بورس اور سویٹ لانا نے کیسے مجھے بخوشی جانے دیا.. بلکہ اُن کے چہروں پر تو ایک اطمینان تھا.. اُن میں سے کسی نے بھی یونہی میرا دل رکھنے کی خاطر یہ بھی نہ کہا کہ ڈیڈی میں بھی چلوں..

''ڈیڈی..'' لیلیٰ نے اپنے باپ کا ہاتھ تھام کر کہا ''اگر زیادہ دیر ہے تو مجھے ایک اورنج جوس کی شدید طلب ہے.. آپ کے اُس لاہور میں اورنج جوس ملتا ہے ڈیڈی..''

وہ دونوں اُس سے معذرت کر کے جب ریستوران کی جانب بڑھ رہے تھے تو اُس نے انہیں حسرت سے دیکھا.. اور حسرت کا یہ گھاؤ نہ صرف اُس کے بدن پر کاری ہوا بلکہ اُس لاؤنج کے سنہری ستونوں، سنگ مرمر کی سیڑھیوں، پلاسٹک کی کرسیوں، بلند منقش چھتوں پر اور آرائشی پودوں کے بڑے بڑے پتوں پر بھی اُس حسرت کی یاسیت نے اثر کیا.. اور وہ جو ریستوران کی جانب بڑھ رہے تھے اُنہیں بھی محسوس ہوا کہ اُن کے پیچھے ایک محرومی کے قدموں کی چاپ ہے..

ظہیرالدین نے تصور کیا کہ اگر سویٹ لانا اُس کے ہمراہ چلی آتی، یہ کہہ کر کہ ڈیڈی میں آپ کے ساتھ ہوں تو وہ دونوں بھی اسی ریستوران کی جانب بڑھ رہے ہوتے.. یکدم تاشقند ایئرپورٹ کا وہ ماند پڑ چکی، گہنا گئی، سنہری عظمتوں کا لاؤنج اپنی پروازوں کے منتظر سینکڑوں مسافروں کے وجود سے خالی ہو کر ایک بے آب و گیاہ ویرانے کی مانند بھائیں بھائیں کرنے لگا اور ظہیرالدین اپنے پاؤں پر ایستادہ ایک مجسمے کی مانند اُس ویرانگی میں تنہا رہ گیا..

میں شو کی جھوٹا جو کبھی گمشدہ بچوں، چوری ہو جانے والی کاروں، موٹر سائیکلوں، ٹریکٹروں اور گہنوں کا کھوج لگایا کرتا تھا آج اپنی چادر کے اندر جب آنکھیں کھولتا ہوں تو دھندلاہٹ کے پردے میں سے یہ گمشدہ لوگ ظاہر ہو رہے ہیں..

میرے اس غیر معمولی حسیاتی ادراک اور کشف کی بھی تو کوئی حد ہے..اور وہ پانچوں.. عارف نقوی، مصطفےٰ اسلام، ظہیر الدین، سردار قالب اور لیلےٰ اس حد کے پار چلے گئے ہیں اور میں اس سے آگے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا.. کچھ آپ بھی تو اپنے تصور اور وہ معجزاتی ادراک جو ہر انسان میں موجود ہے، انہیں بروئے کار لائیے..کہ وہ عارف نقوی اور مصطفےٰ اسلام اگلے روز جب لاہور سٹیشن پر قدم رکھتے ہیں تو اُن دونوں کے چہروں پر طویل مسافت کی وہ دھول ہے جسے پونچھنے سے وہ اجتناب کرتے ہیں کہ یہ اُن کے وطن کی مٹی ہے جو اُن کا سنگھار ہے..ظہیر الدین، قالب اور لیلےٰ لاہور ایئرپورٹ پر اتر چکے ہیں..ظہیر الدین لاؤنج سے باہر آکر ایک گرد آلود فضا میں گہرے سانس لے رہا ہے جس میں ماضی کے سارے چہرے مدغم ہو کر چلے آرہے ہیں اور ہوا کے دوش پر سفید مائی بوڑھیاں ہلکورے لے رہی ہیں..لیلےٰ اپنی اُس نیلی جین میں، جس میں اُس کے روسی فربہی پر مائل کولہے پھنسے ہوئے ہیں اور جس کے چہرے پر جو دودھیا حلاوت ہے اُس میں سے گندم کے سنہری خوشے پھوٹتے ہیں، ماسکو کی نتھری ہوئی ہوا کے بعد ایک ایسی ہوا میں پہلا سانس لیتی ہے جو آلودہ ہے..مٹی بھری اور بوجھل ہے..تو وہ اپنے ہونٹ ناگواری سے سکیڑتی ہے اور پھر اُس کے پھیپھڑے اُسے خبر کرتے ہیں کہ ہمارے اندر جو ہوا اتری ہے اس میں زندگی کی حرارت بہت ہے، یہ ہمیں موافق آگئی ہے..

تو یہ پانچوں میرے کشف کی حد کے پار جا چکے ہیں..

اس حد کے آگے میرے غیر معمولی ادراک کے پر جلتے ہیں..

اب آپ آگے جائیے اور مجھے اپنی کالے موتیے سے نابینا ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس چادر میں روپوش رہنے دیجئے..

اگرچہ میرا نام شوکی جھوٹا ہے لیکن..میں نے آج تک شعوری طور پر کبھی جھوٹ نہیں بولا..

●○●○●○●

''کامریڈ...'' مصطفیٰ اسلام نے چیختے ہوئے اپنا بھاڑ سا منہ عارف نقوی کے اُس کان پر تقریباً چسپاں کرتے ہوئے کہا جو ایک پیلے پھٹک زرد چہرے کے ساتھ اپنے خوف پر قابو پانے کی خاطر مسکرانے کی مشقت کر رہا تھا۔ ''کامریڈ..مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں ایک ایسی روسی خلائی شٹل کے مسافر ہیں جو بجٹ کم ہونے کی وجہ سے اتنی مختصر بنائی گئی ہے کہ اس میں سانس لیتے ہم یک جان اور دو قالب ہو رہے ہیں..اور یہ ابھی مدار میں جانے کو ہے..آپ اسے فائر کرنے کے لئے پھٹ پھٹا پھٹ جو درجنوں راکٹ داغے جا رہے ہیں، اُن کی آواز تو سُن ہی رہے ہوں گے۔''

عارف نقوی نے اگر ایک مسکراہٹ گھگھیا سکتی ہے تو ایک ایسی ہی مسکراہٹ کو اپنے چہرے پر لا کر بمشکل سر ہلایا کہ اُس کا سر اس خلائی شٹل کی چھت سے جا لگا تھا..لاہور کی سڑکوں کی گھنی بھیڑ بھاڑ میں وہ رکشا جانے کیسے اپنی جگہ بناتا، دائیں بائیں جھولتا، کبھی اوندھا ہونے کو آتا اور پھر سنبھل کر اُڑا چلا جا رہا تھا..

لاہور سٹیشن سے باہر آ کر مصطفیٰ اسلام کو توقع تھی کہ عین سامنے درجنوں بانکے لاہوری اور پشاوری ٹانگے منتظر ہوں گے اور اُن کے گھوڑے ہنہنا کر اُن کا استقبال کریں گے لیکن وہاں صرف تین چار ایسے کہولت زدہ ٹانگے کھڑے تھے جن کے بوسیدہ پہیوں میں بھی لکڑی کے پیوند لگے تھے اور ان میں سے ایک کا کبڑا ہو چکا کوچوان، حصے کھجاتا، پان کی پیک پچکاری کرتا نہایت کاہلی سے اُن کی جانب آیا تو مصطفیٰ نے پوچھا ''بھائی جان لوہاری..''

تو اُس مرد درویش نے جو ایک اونگھ میں تھا، ذرا جھول کر کہا..''بھائی لوہاری کلّی سواری..''

''نہیں..'' مصطفیٰ اسلام کی لاہوری رُوح کے لئے یہ فقرہ آبِ حیات کا ایک چھینٹا تھا..اُس کے اندر سٹیشن پر آوازے لگاتے ماضی کے اُن کوچوانوں کی پکار زندہ ہو گئی جو اپنے گھوڑوں کو بے وجہ چابک رسید کرتے مسافروں کو متوجہ کرتے تھے..بھائی لوہاری کلّی سواری..''کلّی نہیں..ہم دو سواریاں ہیں، چلو گے؟''

''چلیں گے موتیاں والو..بیٹھو..''

''پر ہم نے سرکلر روڈ کے راستے نہیں..مالو مال جانا ہے..اپنے اس یار کو مال روڈ کے جلوے دکھانے ہیں..'' اُس کی انگریزی بھی قابلِ رشک تھی اور ہنگیرین تو گویا اُس کی مادری زبان ہو چکی تھی لیکن جونہی اُس نے لاہور کی فضا میں پہلا سانس لیا تھا تو یہ سب کچھ پل بھر میں زائل ہو گیا تھا اور اُس کا لاہوری لب ولہجہ جانے کس پوشیدگی میں سے یکدم باہر آ گیا تھا..''مال روڈ کے راستے جانا ہے بھائی جان..''

اُسے محسوس ہوا کہ کبڑا اور بوڑھا ہو چکا کوچوان کچھ مزید جھک گیا ہے اور وہ سر ہلا کر بولا ''جناب والا..کن زمانوں کی بات کرتے ہو..مال روڈ پر تو ہم غریبوں کی کب کی چھٹی ہو چکی..وہاں تو کاروں کو بھی رینگنے کے لئے جگہ نہیں

ملتی،گھوڑے ٹانگے کا کیا کام..لگتا ہے بہت زمانوں کے بعد لاہور آئے ہو۔''

''بھائی جان..'' مصطفٰے اسلام نے کبڑے کوچوان کو سو روپے کا ایک نوٹ جو اُسے حیران پریشان کرنے کے لئے کافی تھا، تھمایا''آپ ایک مرتبہ ذرا پھر سے کہنا کہ..بھاٹی لوہاری کلّی سواری..''

کبڑے کوچوان نے اپنی مٹھی میں بند سو روپے کے نوٹ کی حدت محسوس کرتے ہوئے مریل سی آواز میں کہا.. بھاٹی لوہاری کلّی سواری..اور مصطفٰے اسلام ماضی کی اس پکار سے مخمور ایک رکشے کی جانب بڑھنے لگا..اور عارف نقوی اُس کی ذہنی حالت کے بارے میں مشکوک ہوتا اس کے پیچھے چلنے لگا..

مصطفٰے اسلام اُس دونوں جانب سے کھلے تنگ تابوت میں اپنے آپ کو سمیٹے، سرنگوں حالت میں باہر گزرتے اُس لاہور کو تک رہا تھا جو اتنی برق رفتاری سے گزرتا جا تا تھا جیسے رکشے کی یہ خلائی شٹل پرواز کرنے کے بجائے سطحِ زمین پر شوٹ کرتی جارہی ہو.. یوں اس کبڑے پن کی حالت میں باہر کا جو منظر دکھائی دے رہا تھا، وہ بھی قدرے کبڑے اور ترچھے زاویے کا ہوتا گزرتا تھا.. پاس سے گزرتی ٹریفک اور لوگوں کے ہجوم متوازن نہ لگتے تھے..شیزان کانٹی نینٹل شاید مقفل ہو چکا تھا کہ اُس کے برآمدے میں سستے چینی جوتوں کے ڈھیر لگے تھے اور وہ رومانوی فٹ پاتھ شیزان سے چیئرنگ کراس تک جو ایک خوابناک سیر گاہ ہوا کرتا تھا.. جہاں لاہور کی ثقافت اور روایت کے سبھی دل دھڑکتے تھے، وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی..جرابیں اور عینکیں فروخت کرنے والے..نالے پراندے..مونگ پھلی کے ٹھیلے..یہ سب اُس کی پہچان سے باہر کے منظر تھے..البتہ جنرل پوسٹ آفس کا چوک کسی حد تک اُسی قدیم کیفیت میں تھا اور زمزمہ توپ پر پھڑ پھڑاتے کبوتروں کے غول بھی شناسائی رکھتے تھے..اور ان سے ذرا پہلے اُس نے اپنے آپ کو مزید سکیڑ کر کمرشل بلڈنگ کے چوک کے دائیں جانب وائی ایم سی اے کی عمارت کے پہلو میں اُس ادبی پناہ گاہ کو دیکھنے کی سعی کی جسے پاک ٹی ہاؤس کہا جاتا تھا..اُس کا چوبی دروازہ ایک بھاری قفل کو سہارنے کی کوشش میں قدرے ٹیڑھا ہو چکا تھا اور اُس کے آگے فٹ پاتھ پر ناکارہ ٹائروں کے انبار پڑے تھے..

سب کچھ مقفل ہو چکا تھا..اُس کے ماضی کے سب در بند ہو چکے تھے.. یادداشت کی البم میں جو تصویریں چسپاں تھیں، اُن پر بھاری قفل پڑے تھے..

یکدم ایک دھچکے کے ساتھ وقت تھم گیا..کائنات رک گئی..سکوت طاری ہو گیا، کانوں میں چنگھاڑتے عفریت چپ ہو گئے، رکشا رُک گیا..

بھاٹی لوہاری کلّی سواری والا لوہاری دروازہ آ گیا تھا..

وہ دونوں بہت دِقّت سے اپنے آپ کو کھینچ تان کر مخالف سمتوں میں رکشے سے باہر آئے..کچھ دیر زمین پر قدم مستحکم کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہے.. یوں ڈولتے رہے جیسے 'کِکلی کلیر دی' الاپتی لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں انگلیاں پروئے ایک دائرے میں گھومتی چلی جاتی ہیں اور پھر یکدم رکتی ہیں تو لڑکھڑانے لگتی ہیں..

اُن سے ذرا پرے پھول والوں کے کھوکھوں کے سامنے کسی جانور کی بُو دیتی اوجھڑی کو چند کتے اشتیاق سے

بھنبھوڑتے تھے..غلاظت کے ایک ڈھیر سے فضلے کی بساند اٹھتی تھی..فٹ پاتھ پر نہایت آسودگی سے اپنا چہرہ ٹیڑھا کیے دایاں کان اونچا کیے دھوتی میں ملبوس ایک پہلوان نما شخص براجمان تھا اور ایک سرخ پگڑی والا جس کی پگڑی میں مختلف قسم کے کانوں میں سے میل نکالنے والے اوزار پروئے ہوئے تھے نہایت دل جمعی سے اُس پہلوان نما شخص کے دائیں کان میں ایک سلائی گھماتا اُس میں سے میل کی گولیاں برآمد کرتا چلا جاتا تھا..اور ہر گولی کو وہ پہلے پہلوان نما شخص کے سامنے فخر سے نمائش کرتا اور پھر سے کان کُنی میں مشغول ہو جاتا..

یہاں وہ سوندھی خوشبو تو نہ تھی جو کراچی سے لاہور تک کے سفر کے دوران ٹرین کی کھڑکیوں کے اندر چلی آتی تھی، گندگی اور تعفن تھا اور بدبو کے بھبھکے تھے پر ان میں بھی غیریت نہ تھی..

ایک انسان کسی مجبوری کے تحت یا خود مختاری سے اپنی آبائی سرزمین سے جدا ہو کر بے شک ایک پرائے دیس میں..بے شک اُس دیس میں وہ اپنے وطن کی نسبت زندگی کا زیادہ حصّہ گزارے..شادی کر کے بچے پیدا کر لے، اپنے تئیں اُس معاشرے کا ایک جُز بن جائے اس کے باوجود جب وہ اس دیس کے کوچۂ و بازار میں نکلتا ہے تو اُس کے آس پاس جتنے بھی چہرے حرکت کرتے ہیں، وہ اُس کی شکل اور مہاندرے کے نہیں ہوتے، ایک الگ نسل اور زبان کے ہوتے ہیں.. اُس کے کانوں میں راہ چلتے جتنی بھی آوازیں پڑتی ہیں، آپس میں گفتگو کرتے لوگوں، سکول جاتے بچوں کی، بوڑھی عورتوں اور محبت میں مبتلا جوڑوں کی..وہ ایک اجنبی زبان میں ہوتی ہیں چاہے وہ خود اس زبان پر عبور حاصل کر چکا ہو اور یوں وہ ہمہ وقت ایک ذہنی کھنچاؤ میں مبتلا غیر محفوظ محسوس کرتے چلتا ہے..وہ اجنبی رہتا ہے..

زندگی بھر کی اس پرائی اجنبیت کے بعد بے شک وہاں گندگی اور تعفن تھا، بُو تھی لیکن اُس کے کانوں میں یہاں جو آوازیں اترتی تھیں، وہ ایک مکمل مفہوم کے ساتھ اترتی تھیں..اُسے ان کا ترجمہ کر کے سمجھنے کی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی..وہ سب اُس کی مادری زبان کی کوکھ میں سے جنم لینے والی تھیں اور وہ غیریت کی برسوں پرانی ڈھول کو اُس کے بدن سے زائل کرتی تھیں..وہ اپنائیت کے ان اگرچہ بدبودار موسموں میں سانس لیتے ہوئے اتنے عرصے کے بعد ایک سکون آور کیفیت میں مسکرانے لگا..

اُدھر عارف نقوی، ایک لکھنوی، زبان و بیاں اور محاورے کا پابند اپنی سلیقہ شعاری میں دردناک حد تک قید..پھر بھی اُس کے کانوں میں جو پنجابی لہجے اترتے تھے وہ کم از کم جرمن زبان کی درشتگی سے تو کہیں زیادہ دل کے قریب آتے تھے..

لاہور کا یہ قدیم دروازہ لوہاری البتہ ابھی تک اپنی اُنہی نانک شاہی چھوٹی اینٹوں کی سُرخ جاذبیت کے سہارے قائم تھا..اُس کی بلند محراب کی چند اینٹیں اپنا مقام چھوڑ چکی تھیں اور اُس کے نیچے سے گزرنے والے لوگوں کے بالوں میں کبھی کبھی اوپر سے ذرّہ ذرّہ گرتے سفوف کے کچھ آثار ہوتے لیکن وہ قائم تھا..اُس کے سینکڑوں برسوں کے موسم جھیلتے چوبی پھاٹک پر جڑے کوکے اور ستارے زنگ آلود تو تھے پر وہ اُس کی سالخوردہ لکڑی میں پیوست ابھی مزید کچھ برس جدا ہونے کا ارادہ نہ رکھتے تھے..

مسلم مسجد کے سائے میں لوہاری کے داخلے پر پھول والوں کے وہی کھوکھے موجود تھے، یادداشت کی البم میں

ان کی تصویر مقفل نہ ہوئی تھی..

مصطفٰے اسلام نے اپنے گمان سے دل ہی دل میں کچھ بحث کی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان چالیس برسوں میں پھول فروخت کرنے والے دکاندار نہ تو بوڑھے ہوئے ہوں اور نہ ہی ان کے لباس اور بیٹھک کے انداز میں کچھ فرق آیا ہو..وہ جوں کے توں اپنی اصلی حالت میں محفوظ تھے اور وہ مصطفٰے اسلام جو کوچہ کمانگراں میں سے نکل کر اُن پر ایک نظر ڈالتا کبھی سکول، پھر کالج اور پھر پنجاب یونیورسٹی جایا کرتا تھا..بوڑھا ہو گیا تھا..اگر وہ غور کرتا اور اُس نے کیا تو یہ پھول والوں کی اگلی نسل تھی جو اپنا آبائی کاروبار جاری رکھے ہوئی تھی..اپنے باپ کی گدی پر بیٹھنے والا بیٹا ہولے ہولے نہ صرف اُس کے انداز اختیار کر جاتا ہے بلکہ عمر بیتنے سے اُس کی شکل بھی اپنے باپ سے ہو بہو ملنے لگتی ہے..وہاں حسب معمول پرانے زمانوں کی طرح گیندے اور دیسی گلاب کی لڑیاں لٹکتی تھیں، پھولوں کی پتیاں تھیں جن پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے اُنہیں تازہ دم کیا جارہا تھا، سہرے تھے، گلے کے ہار تھے، کچھ بھی نہ بدلا تھا..لوہاری دروازے کے باہر براجمان یہ پُھلیرے وقت کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے تھے..شہر بھر میں جدید اور منظم ''فلاور شاپس'' وجود میں آ چکی تھیں جہاں گیندے اور دیسی گلاب کے پھولوں کا داخلہ منع تھا، وہاں غیر ملکی اور بے موسم کے ایسے ایسے پھول دستیاب تھے جن کا ایک ایک ڈنٹھل سینکڑوں روپوں میں فروخت ہوتا تھا..بھلا یہ گیندے اور دیسی گلاب..بوکیز اور آرائشی گل دستوں اور تھائی لینڈ اور سنگاپور سے درآمد شدہ نمائشی پھولوں کے مقابلے میں کہاں ٹھہر سکتے تھے..وہ صرف حاجیوں کے گلے کا ہار ہونے، دیہاتی دُولہوں کے سہرے کا سنگھار ہونے یا قبروں پر نچھاور ہونے کے لئے رہ گئے تھے..بلکہ اُن قبروں کو بھی کسی حد تک حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جن پر درآمد شدہ ٹیولپ اور گلیڈی اولس کے پھولوں کی بجائے گیندے کے ہار پڑے ہوں، دیسی گلاب کی پتیاں بکھری ہوں..

مسلم مسجد کی دیوار کی امان میں بیٹھے، ان پُھلیروں سے چند قدم پر دائیں جانب عینکوں، بجلی کے سامان اور سُوتی دھاگوں وغیرہ کی دکانیں تھیں..اُن کے آگے چوڑے فٹ پاتھ پر لاہور شہر کے اگرچہ جاہل اور کچھ نشئی لیکن کمال کے نسل در نسل خاندانی باورچی اپنے اپنے اڈے پر اپنی خصوصی خوراکیں جو شب بھر دیگچوں میں اپنی لذت کو گھنا کرتی رہی تھیں، سجائے بیٹھے تھے..اُن میں سے کچھ تو اپنا خورا کی سودا گیارہ بجے سے پیشتر فروخت کر کے جا چکے تھے لیکن بیشتر اپنے گاہکوں کی پرشوق زبانوں کے چٹخارے کی تسلی کرنے کی خاطر ابھی تک فٹ پاتھ پر براجمان تھے..

مصطفٰے اسلام کی ان سب سے سلام دعا ہوا کرتی تھی..

لیکن پُھلیروں کی مانند اُن کی آل اولاد نے فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر زندگی بسر کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ دیگر معزز پیشوں کو اختیار کر کے شہر کے نواح میں منتقل ہو چکے تھے..اُن میں سے صرف چاچا گام اُس کی پہچان کے فوکس میں آیا..وہ عمر رسیدہ تو ہو چکا تھا، اُس کا سر جنبش میں آ تو چکا تھا لیکن وہ ابھی تک اُسی طور بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ کو گالیوں سے نوازتا تھا..وہ شوربے دار اوجھڑی پکانے میں یکتا اور بے مثل تھا..اور جو کوئی بھی اُس کی تیار کردہ اوجھڑی کے شوربے میں ایک تلوں والے گرم قلچے کا لقمہ ڈبو کر اپنے منہ میں ڈالتا وہ ہمیشہ کے لئے اُس کے ذائقے کا غلام ہو جاتا...بہت سے اندرون شہر کے لاہوریئے..کہیں نیویارک..ٹورنٹو یا سڈنی میں ایک پُرآسائش زندگی بسر کرتے چاچا گام کے اوجھڑی

شوربے کو یاد کرتے آبدیدہ ہوتے رہتے اور وہ ایک ڈکٹیٹر ہوا کرتا تھا، اُسے اگر کسی گاہک کا طرزِ تخاطب پسند نہ آتا تھا تو وہ اسے بےعزت کر کے اٹھا دیتا تھا۔۔

''چاچا گام۔۔'' مصطفےٰ اسلام اُس کے جنبش زدہ سر کے قریب جھکا ''تمہارے دیگچے میں میرے لئے کچھ اوجھڑی شوربہ ہے؟''

گام کے لئے یہ ایک اور گاہک کی آواز نہ تھی کہ اس میں کسی قدیم شناخت کا لہجہ تھا۔۔اُس نے اپنا جھولتا ہوا سر اٹھایا اور اُس کے مقابل میں مصطفےٰ اسلام کا عمر رسیدہ چہرہ تھا جو دراصل ایک پردہ تھا جس میں سے ایک شناسا نوجوان کی شکل ظاہر ہوتی پہچان میں بدلتی تھی۔۔وہ لرزتا ہوا ہاتھ پھیلائے اٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔۔کچھ سسکیاں بھریں، آبدیدہ ہو کر گلے شکوے کیے اور پھر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔۔''بوڑھے ہو گئے ہو مصطفےٰ۔۔''

''ہاں چاچا۔۔چالیس برس پینتالیس بہت ہوتے ہیں۔۔لیکن تم ویسے کے ویسے ہی ہو۔۔''

''اتنی دیر سے تو گھر نہیں لوٹتے۔۔تمہارا وہ کیا نام ہے ڈوناؤ دریا جس کے کنارے جا آباد ہوئے ہو، ہمارے راوی جیسا تو نہیں ہو سکتا۔''

''چاچا۔۔'' مصطفےٰ نے بےیقینی میں سر ہلایا کہ چاچے گام کا جغرافیہ تو اتنا کمزور ہے کہ وہ لوہاری دروازے سے باہر کی دنیا سے بھی ناواقف ہے تو یہ ڈینیوب تک کیسے پہنچ گیا۔۔

اور وہ چاچا گام اُس کی بےیقینی سے لطف اندوز ہو کر اپنی پانچ سات دانتوں والی مسکراہٹ سے مسکرانے لگا۔۔

''پُتر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تیری گھر والی کا نام رَدجا ہے جو ایک گوری تیڑواسی ہے۔۔پر تو نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟۔۔اوئے صبر کرو بےصبرو۔۔'' اُس نے ان گاہکوں کو ڈانٹا جو اُس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔''اب تم پوچھو گے کہ میں تمہارے یہ اندر باہر کے معاملے کیسے جانتا ہوں۔۔تمہاری بیٹی نہیں ہے جینا۔۔''

''آپ اُس سے ملے ہیں چاچا۔۔اُسے جانتے ہیں؟'' ابھی تک اُس کے آبائی گھر کی قربت کی مہک نے اُسے سودائی بنا رکھا تھا اور وہ چند لمحوں کے لئے جینا کے وجود سے غافل ہو گیا تھا اور اب یکدم اُس کے فراق اور تھوڑی دیر بعد اُسے اپنے روبرو پانے کے خیال سے مضطرب ہونے لگا۔

''میں کیا شہر کی کل مخلوق اُسے جانتی ہے۔۔اور سب لوگ اُسے گوری گوری کہتے ہیں۔۔کبھی کبھار یہیں میرے سامنے چوکی پر آ بیٹھتی ہے، اپنی سارنگی گلے میں ڈالے اور کیا چٹخارے لے کر اوجھڑی شوربہ کھاتی ہے۔۔اور میں اُسے تمہارے بچپن کے قصے سناتا ہوں۔۔آئے ہو تو کب تک رہو گے۔۔''

''رہنے کے لئے آیا ہوں چاچا گام۔۔''

کراچی سے لاہور تک کے سفر کے دوران اور پھر یہاں اس لوہاری دروازے کے باہر جب تک وہ رکشے سے باہر نہیں آئے تھے، وہ دونوں ایک ہی نظریاتی وابستگی کی دنیا میں رہتے تھے لیکن رکشے کے باہر قدم رکھتے ہی وہ اُس دنیا سے نکل کر ایک اور کائنات میں چلا گیا تھا۔۔جہاں پہنچ کر وہ اس کے کامریڈ عارف نقوی کے وجود سے غافل ہو گیا تھا۔۔وہ اپنی قدیم مہکاروں میں سانس لیتا شناسائی کے مرحلوں کا مسافر ہو گیا تھا۔۔عارف نقوی کے چہرے پر ایک عجیب یاسیت جھلکنے لگی

کہ یہ شخص کیسا بخت والا ہے، لوٹا ہے تو اُس کی مٹی کی مہک اور شناسا چہرے اُس کا استقبال کرتے ہیں جب کہ میں.. میرے بخت میں تو یہ سب کچھ نہ ہوا.. تب اُس کی رنجیدہ تنہائی کے کواڑ وا ہوئے اور بلٹرڈ نے اُس کے سینے پر اپنی راکھ کا حدّت بھرا ہاتھ رکھ کر سرگوشی کی.. آریف.. مجھے بھول گئے..

یہ اُس کا فریب نظر تھا یا کیا تھا کہ اُس کے تصور میں وہ کوچہ کمانگراں جس میں اُس نے اپنا لڑکپن اور نوخیزی کے دن گزارے تھے وہ تو بہت کشادہ ہوا کرتا تھا اور اب اُس کے سامنے جو گلی تھی، وہ سکڑی ہوئی ایک تنگ گزرگاہ دکھائی دے رہی تھی، اتنی کہ سامنے سے ایک سکوٹر چلے آنے پر اُن دونوں کو ایک دیوار سے لگ جانا پڑا تھا.. اور وہ مکان.. دروازہ اگرچہ بند تھا لیکن مقفل نہ تھا کہ اُس کے اندر سوائے شکستگی اور اپنی بنیادوں پر کسی لمحے ڈھے جانے کی آرزو کے سوا اور کوئی متاع نہ تھی.. نہیں.. وہاں جینا بھی تو تھی۔ اُس کے دونوں بھائی اُس کی مانند کسی تعلیم یا نظریاتی فریب میں نہ آئے تھے اور اپنے باپ مرتضےٰ اسلام شیخ کی گدّی پر براجمان ہو کر اتنے ثروت مند ہو گئے تھے وہ کب کے شاہ عالمی کی جوتوں کی مارکیٹ سے نکل کر ایم ایم عالم روڈ پر ایک ''شُو پلینٹ'' سٹور کھول چکے تھے جہاں کچے چمڑے کے سستے جوتے داخل نہ ہو سکتے تھے.. وہاں دنیا بھر کے جانے پہچانے شُو برانڈ فروخت ہوتے تھے.. ہش پپیز.. بالی، نائکے، کیٹرپلر، کلارک اور کول ہان وغیرہ.. وہ ڈیفنس منتقل ہو چکے تھے اور اس کھنڈر ہوتے آبائی مکان کو صرف اس لئے سنبھالے ہوئے تھے کہ یہ دن بہ دن قیمتی ہوتا جاتا تھا... بہت سے لوگوں کی نظریں اس مکان پر تھیں کہ اِسے مسمار کر کے یہاں ایک سپر مارکیٹ تعمیر کی جائے..

دروازہ.. جیسے وہ ایک مدت سے اُس کے لمس کا منتظر تھا، ذرا سا دھکیلنے سے کُھل گیا.. اندر اُس قدیم مکان کے در و دیوار بارشوں سے سیلن زدہ ہو چکے تھے اور اُن کی اینٹیں یوں نمایاں ہو رہی تھیں جیسے مسوڑھوں کے سکڑ جانے سے دانت عیاں ہو جاتے ہیں.. فرش میں دراڑیں اور اُن میں سے ایک دراڑ میں برگد کا ایک چار پتوں کا بُوٹا سر نکال رہا تھا.. چھت کے شہتیر کمر خمیدہ ہوتے اور اُن میں سے گھن کا برادہ گرتا ہوا، اور پھر وہ پورا مکان آوازوں، پکاروں، سرگوشیوں سے گونجنے لگا... جب اُس کی بنیاد اٹھائی گئی تھی، در و دیوار سُرخ اینٹوں سے تعمیر ہوئے تھے، ایک چھت وجود میں آئی تھی تو اُس میں منتقل ہونے والے مکینوں نے جو کہا، جو سنا، مسرت اور شادمانی کے جتنے گیت گائے، جتنے بین کیے.. دُکھ کی آہیں، سُکھ کے سب سُر سنگیت، برہا کی سسکیاں اور وصال کی سب سرگوشیاں.. سب کی سب گونجنے لگیں، جب وہ ایک ہم جماعت لڑکی کے عشق میں سودائی ہو کر راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا تھا.. وہ رونا.. اُس کی بہنوں نے بابل کا یہ گھر چھوڑنے پر جو آہ و زاری کی تھی.. وہ آہیں.. ان میں سے بیشتر وہ آہیں، مسکراہٹیں اور سسکیاں تھیں جنہیں وہ اپنے کانوں سے سُن چکا تھا جو اُس کے ہنگری جانے سے پیشتر اس گھر کے در و دیوار نے بھی سُنی تھیں.. لیکن ان کے سوا اُس کی غیر موجودگی میں جو کچھ اس گھر کے وجود نے اپنے اندر سمویا تھا وہ بھی سنائی دے رہا تھا، اُس کی آنکھیں بھر گئیں.. اُس کی ماں کے گلے سے اُس کے آخری سانس ایک حیوانی خرخراہٹ کے ساتھ خُر خُر کرتے اُسے زندگی سے منقطع کرنے کو ہیں اور اُن کھنچے ہوئے مردہ سانسوں میں.. مصطفےٰ مصطفےٰ کی پکار ہے.. وہ اُس کی موت پر بھی نہیں پہنچا تھا.. اور یہاں اُس کے باپ کے آخری دم بھی تھے جو اُس کے بڑے بھائی کا ہاتھ اپنی موت کے شکنجے میں لے کر اُس کی منتیں کر رہا تھا.... اُسے فون کرو.. وہ پہنچ جائے گا.. اس دم کا کیا بھروسہ آئے نہ آئے.. میں نہ آنے سے پیشتر اپنے مصطفےٰ کو دیکھ لوں..

''کامریڈ..'' عارف نقوی اُسے دیر تک یوں بے حس و حرکت کھڑے دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہوا.''تمہاری طبیعت گری ہوئی لگتی ہے۔''

''ماضی کا مجرم ہونا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔'' مصطفےٰ نے اپنی آنکھیں پونچھیں''وہ کمرہ..پہلی منزل پر ہے..''

اُس لمحے عارف نقوی کی جیکٹ کی جیب میں جو مٹھی بھر راکھ تھی وہ سلگنے لگی اور اُس کے ویران سینے کو گرمانے لگی..

''ہیلو بلٹرڈ..'' اُس نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا..

''جی..'' مصطفےٰ اسلام سیڑھیاں طے کرتے رُکا اور پیچھے چلے آتے عارف کو دیکھا..

''کچھ نہیں..ماضی نے میرے دل پر بھی ایک سلگتی ہوئی دستک دی تھی..''

وہ احتیاط سے اُن سیڑھیوں پر پاؤں دھرتا تھا کہ اُن پر اُس کے بچپن اور نوخیزی کے قدم نقش تھے..سیڑھیوں کے اختتام پر ایک چوبی راہداری تھی اور اُس کے تختے اُس کے بوجھ سے چرچرائے..اور اُس کے آخر میں وہ دروازہ تھا جس میں سے کبھی ایک مسکراتی ہوئی دائی برآمد ہوئی تھی اور اُس نے راہداری میں منتظر ٹہلتے ہوئے بے چین شخص سے کہا تھا کہ شیخ صاحب مبارک ہو..پھر لڑکا ہے..

وہ دروازہ چوپٹ کھلا تھا..اندر داخل ہونے پر اُس کی آنکھوں میں زرد..نیلے اور سبز رنگ اترنے لگے جو باہر کی دھوپ کھڑکی کے رنگین شیشوں میں سے کشید کرتی اُس کی آنکھوں میں بھرتی تھی..

جینا وہاں نہ تھی..

چکناہٹ بھرے چند شاپر فرش پر مُردہ پڑے تھے،سگریٹوں کے پچکے ہوئے فلٹر تھے،ایک ادھ جلی موم بتی تھی، کھڑکی کی سِل پر موم کی چند بوندیں اوندھی پڑی تھیں اور ایک کنگھی جس کے کچھ دندانے ٹوٹے ہوئے تھے اور اُس میں چند لمبے بال اٹکے ہوئے گواہی دیتے تھے کہ یہ مقام کسی عورت کے وجود سے شناسا ہوا تھا..اُس نے اپنی شدید مایوسی کو چہرے پر عیاں نہ کیا..اُسے کامل یقین تھا کہ وہ وہاں ہوگی..اتنا یقین تھا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے اپنے دونوں بازو کمر سے ذرا بلند کر لئے تھے تا کہ اُسے آغوش میں لے سکے..ظاہر ہے وہ ہمہ وقت تو یہاں بیٹھی نہیں رہتی ہوگی..کسی موسیقی کی محفل میں شرکت کرنے یا یونہی آوارہ گردی پر نکلی ہوگی..آ جائے گی..

عارف نقوی ابھی تک ایک گداگر کی مانند چوکھٹ پر کھڑا اندر آنے سے اجتناب کر رہا تھا..

''کامریڈ..'' اُس نے اپنے آپ کو جینا کی غیر موجودگی کے جواز مہیا کر کے ذرا مطمئن کر لیا''کامریڈ..چلے آیئے..میرے معزز مہمان ہو جایئے..اگرچہ یہاں ایک شب گزارنے کے لئے مناسب سہولتوں کا فقدان ہے لیکن ہم یہاں ایک آبائی اپنائیت کی چادر اوڑھ کر گزر اوقات کر سکتے ہیں۔''

''مجھے..'' عارف نقوی نے ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے نہایت معصومیت سے کہا''بھوک لگی ہے'' وہ ٹرین کے سفر کے دوران..مختلف سٹیشنوں پر فروخت ہونے والی چکنی چپڑی اور مرچوں بھری صحت کے لئے نہایت مُضر خوراک چرتے تو آئے تھے پر آج سویرے سے اُن کے معدوں میں کچھ نہ اُترا تھا..

''سوری کامریڈ.. ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ اگر پیٹ میں نہ ہوں روٹیاں تو سبھی باتیں کھوٹیاں..اور یہی تو اشتراکیت کا فلسفہ ہے تو..''

مصطفیٰ اسلام ایک عجیب نوخیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا اور کچھ دیر بعد گرم گرم قُلچوں اور نہاری کی ایک پلیٹ سنبھالے پلٹ آیا..

وہ زرد.. نیلے اور سبز رنگوں کی کشید جو کھڑکی کے شیشوں میں سے بہتی چلی آتی تھی، مدھم ہو کر پہلے سرمئی چولے میں منتقل ہوئی اور پھر سیاہ لبادے میں یوں روپوش ہوئی کہ کمرے کے اندر اندھیرا بھٹکنے لگا..

وہ کب کے اپنے سامان میں سے برآمد ہونے والے کپڑے لتے اور جیکٹوں وغیرہ کو ننگے فرش پر بچھا کر اُنہیں اپنا بچھونا بنا چکے تھے اور اُن پر دراز ایک خاموش معاہدے کے تحت بس اپنے آپ میں گُم صدیوں بعد نصیب میں آنے والی اپنے وطن کی پہلی رات کے جادو میں چپ تھے..وہ اُس ادھ جلی موم بتی کے شکرگزار ہوئے جس کی مدھم روشنی در و دیوار پر لرزتی عجیب شکلیں تخلیق کرتی تھی..

''ہم جیسوں کے ساتھ بھی کیسے کیسے فریب ہوئے عارف نقوی۔'' وطن میں پہلی رات کے جادو سے باہر آنے والا مصطفیٰ اسلام گویا ہوا ''ہم کیسے ناممکن خوابوں کے اسیر ہو کر اپنا وطن چھوڑ گئے۔''

''نہیں مصطفیٰ..'' عارف نقوی کے سفید بال موم بتی کی جھلملاتی روشنی میں حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے اور اُس کی عینک کے شیشوں پر دھوپ اور سائے کا ایک کھیل جاری تھا..اُس کا ستواں ناک نقشہ ایک شکست خوردہ یونانی سپاہی سے مشابہ ہوتا تھا جو وطن کی عظمت کے لئے ..میدانِ جنگ میں اترا اور جب اُس نے اپنے چاروں اَور نگاہ کی تو وہ تنہا تھا.. خوابوں کے معبد آس پاس مسمار ہو رہے تھے..''یہ فریب تو نہ تھا اور نہ ہی ہم ایسے خوابوں کے اسیر ہوئے جو ناممکن تھے.. دراصل زمانے نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا، اشتراکی راہنماؤں کی نالائقی اور اُن کے جبر و استبداد نے سرمایہ دارانہ نظام کی راہ خود ہموار کی اور ہم جو معصوم نظریاتی لوگ تھے، ان چال بازیوں کے آگے مات کھا گئے..ہم جو بادشاہ تھے بساط پر جوکروں کے ہاتھوں پٹ گئے اور ان میں اشتراکیت کے علمبردار جوکر بھی تھے جنہوں نے ہماری آنکھوں میں نظریئے کی دھول ایسی جھونکی کہ ہم اُن کے ظلم و ستم کے دفاع میں جُت گئے..نظریئے کی سچائی میں کوئی شک نہ تھا، ہاں جن کے ہاتھوں میں اُس نظریئے کی تکمیل تھی وہ وفاشعار نہ تھے اور یوں ہم سب اپنے بھولپن میں تاریک راہوں میں مارے گئے..تم دیکھ لو وہی نظریہ انیس بیس کے فرق کے ساتھ سکنڈے نیویا میں رائج ہے اور اُنہیں مثالی ریاستیں بناتا ہے..کیوبا کے لوگ.. ماسوائے اُن کے جو سمندر پار میامی میں فرد کش ہیں اور جن میں سے بیشتر ڈکٹیٹر بتستہ کے باقیات میں سے ہیں اور جو امریکہ کے لئے بے آف پگز کے حملے کے لئے گنی پگز کے طور پر کام آئے..اُن کے سوا سب کیوبن آج بھی فِدل کاسترو کے غیر مشروط طور پر پرستار ہیں جس نے اُنہیں ان کی عزت نفس سے آگاہ کیا..دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کے آگے کیوبا..ایک بوند..اور یہ بوند کیسے تقریباً نصف صدی سے چنگھاڑتے آتش انتقام میں سلگتے سمندر امریکہ کے سامنے سینہ سپر ہے..دنیا میں سب سے زیادہ ڈاکٹر کیوبا میں ہیں اور وہ دنیا بھر کے لئے ہیں..ابھی حال ہی میں برطانیہ کی نیشنل ہیلتھ سروس کو کیوبا کی میڈیکل منصوبہ بندی کے نقشے پر از سرِنو ترتیب دیا گیا اور یہ وہی نظریہ ہے جس کی بنیاد پر چین کی اقتصادی ترقی کو

اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ واحد ملک ہے جس کا امریکہ بھی مقروض ہے اور مجبور ہے..آج وہ چین سے درآمد بند کر دے تو نہ صرف اہلِ امریکہ ایک شدید مہنگائی کا شکار ہو جائیں گے بلکہ اُس کا اقتصادی ڈھانچہ بھی متزلزل ہو جائے گا..صرف اس لئے بھی کہ چین نے آج کی حقیقتوں کا سامنا کیا، اُس نے نہ تو سوویت یونین کی مانند اپنے تمام تر وسائل کل دنیا کی انقلابی تحریکوں کی پُشت پناہی میں بے جا صرف کیے اور نہ کبھی چینی فوجوں نے بے وجہ اپنی سرحدوں سے پار قدم رکھا..وہ کسی دوڑ میں شامل نہ ہوا اور کچھوے کی چال چلتا سب سے آگے نکل گیا..تو برادر ہم نہ کسی فریب کے اسیر ہوئے اور نہ ہی ناممکن خوابوں کے حصول کے دھوکے میں آئے..بس ہم غلط وقت پر غلط مقام پر تھے..آپ سونا چاہتے ہیں؟''

اُسے ہرگز توقع نہ تھی کہ عارف نقوی ایسا خاموش طبع اور شرمیلا شخص یوں ایک طویل بھاشن دینے لگے گا..ویسے وہ قدرے اکتاہٹ کا شکار ہو کر کچھ جمائیاں لیتا رہا''نہیں کامریڈ..''مصطفےٰ اسلام مسکرا دیا''میں ابھی اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہوں کہ میں اتنے برسوں بعد اُسی کمرے میں ایک شب گزار رہا ہوں جس میں میں پیدا ہوا تھا..مجھے نیند نہیں آ رہی..''

''میں کچھ برس پہلے کراچی آیا تھا اور وہاں میری پہچان کرنے والا کوئی نہ تھا، سب کی آنکھوں میں ایک غیریت تھی جس نے مجھے دُکھ کے کانٹوں میں پرو دیا..میں اپنی سگی بھتیجی کی آنکھوں میں پڑھ سکتا ہوں کہ وہ میری آمد پر ناخوش ہے کہ میرا یہ گمشدہ چچا جانے کہاں سے اور کیوں نمودار ہو گیا ہے..اور اگر ہو گیا ہے تو یہ کب میرے گھر سے رخصت ہوگا..ہاں مصطفےٰ اسلام ہم تو کہیں کے نہ رہے..نہ گھر کے نہ گھاٹ کے..''

''تمہیں پتہ ہے ہمارے اصل مجرم کون ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ فریب کیا..ترقی پسند شاعر اور دانش ور..اُنہوں نے ہمیں خواب دکھلائے، انقلاب کے رومان کی آگ میں زندہ جلا ڈالا..ہم دیکھیں گے..ہم تو نہ دیکھ سکے، نہ تاج اچھالے گئے نہ تخت گرائے گئے اور نہ ہی خلقِ خدا نے راج کیا..اور چاند کو گُل کریں تو جانیں..تو چاند بھی گُل ہو گیا..''

موم بتی اپنے پاؤں تک پہنچ کر اُس کے گرد پھیلی موم میں دفن ہو کر پل بھر کے لئے پھڑ پھڑائی اور پھر چاند نے کیا گُل ہونا تھا، وہ ہو گئی..

●○●○●○●

میری رُوح کے ساتھی، میرے سول میٹ نے مجھ سے دغا کی..

مجھے تو کچھ غرض نہ تھی کہ وہ مجھ سے عمر میں دوگنا بڑا ہے، شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے اور اُسے بھی کچھ پرواہ نہ تھی لیکن ایک شب.. جب پورے چھ گھنٹے اور اس دوران میں بے چین رہی واش روم جانے کے لئے اور نہ گئی ایک سٹول پر برہنہ براجمان بے حس وحرکت بیٹھی رہی اور وہ مجھے مصوّر کرتا رہا تو میں نے اُس سے پوچھا ''داؤد.. کیا تم بھی میرے لئے کچھ محسوس کرتے ہو؟'' تو اُس نے سر ہلا کر کہا کہ ''کیوں نہیں.. جینا تم جیسی متناسب بدن کی ماڈل مجھے آج تک نصیب نہیں ہوئی. تمہاری چھاتیاں حیرت انگیز طور پر دودھ بھری اور پُر اشتیاق لگتی ہیں اور میں انہیں مصوّر کرتے ہوئے ایک تخلیقی آرگزم کا شکار ہو جاتا ہوں.. مجھے کچھ غرض نہیں کہ تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو، مجھے صرف تمہارے قابل مصوّر بدن سے غرض ہے۔''

میرا دل دکھ گیا..

پھر مجھے ایک اور دھچکا بھی لگا..

مجھے مشترکہ طور پر ریپ کرنے کی کوشش کی گئی..

وہی معصوم سا ناتجربہ کار لڑکا، مجھے اُس کا فون آیا کہ جینا میرے کچھ دوست ہیں جن سے میں نے تمہارے خانہ بدوش گیتوں کا تذکرہ کیا تو وہ تمہاری گائیکی سننے کے لئے بے قرار ہو گئے..اُن میں سے ایک ارشد آرائیں لوک موسیقی کا محقق ہے اور پاکستان کے قدیم قبائل پر ریسرچ کر رہا ہے تو وہ تہذیبوں کے موازنے کے حوالے سے آپ سے ملاقات کرنے کا متمنی ہے..اور میں اس فریب میں آ گئی اور اُنہیں اپنے کوچہ کمانگراں کے رنگین کھڑکیوں والے کمرے میں مدعو کر بیٹھی..اس قصّے کو طول دینے سے کیا حاصل، میں مختصر بیان کرتی ہوں..وہ تینوں جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو جھومتے جھامتے تھے..میں نے اُن کے اصرار پر اُن کی اندرونی جیبوں میں پوشیدہ شراب کے چند گھونٹ بھر لئے اور پھر گٹار اپنی رانوں پر رکھ کر اپنے گیت گانے لگی..اور مجھے خدشہ ہوا کہ نہ تو وہ میرے گیت سُن رہے ہیں اور نہ ہی مجھ سے کوئی تحقیقی نوعیت کی گفتگو کرنا چاہتے ہیں، وہ سرخ آنکھوں سے پاگلوں کی طرح میرے بلاؤز کو تکتے جاتے ہیں اور پھر اُن میں سے جو وہ قدیم قبائل کا محقق تھا، یکدم مجھ پر اُمڈ آیا اور اپنے بھاری وجود کو میرے بدن پر بوجھ کر کے مجھے فرش پر بچھانے کی کوشش کی تو اُس لمحے میرے حواس دفاع کے لئے چوکنے ہو گئے..

ایک مشرقی لڑکی نہایت آسانی سے کسی تجربہ کار مرد کے ہاتھوں ریپ ہو سکتی ہے کہ وہ ان معاملات کے زیروبم سے آگاہ نہیں ہوتی، ایک کچی ٹہنی ہوتی ہے جسے معمولی تگ ودو سے توڑا جا سکتا ہے اور پھر وہ ایک سہولت پسند لڑکی ہوتی

ہے جس کا بدن مشقت اور کامل تندرستی سے آگاہ نہیں بنتا اور وہ مقابلہ نہیں کر سکتی جب کہ ایک مغربی لڑکی پالنے سے باہر قدم رکھتے ہی تجربے کی کٹھالی میں ڈھلنے لگتی ہے.. آپ اُس کے جذبات کو اشتعال میں نہیں لا سکتے.. وہ جنس کے پیچ و خم کے ہر زاویے کا تجربہ کر چکی ہوتی ہے اور اُسے اُس کی مرضی کے بغیر راغب نہیں کیا جا سکتا.. مجھے خوب معلوم تھا کہ ارشد آرائیں کے نیم برہنہ ہو چکے بدن کے کس حصے کو دفاع کے طور پر اپنی مٹھی میں بھینچ کر اس شدت سے دبانا ہے کہ وہ بلبلا اُٹھے اور گالیاں بکتا ہوا میرے بدن سے اتر کر فرش پر ہونکنے لگے..

داؤد نے مجھے پہلا دُکھ دیا اور اُس کے بعد اُس شب کے آزار نے میرا دل بجھا دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا..

میں نے یہاں راوی کے کناروں تک پہنچنے کے لئے کیسی بے انت در بدر زمینی مسافتیں طے کی تھیں.. ایک عمر بتا دی تھی.. لیکن آج.. آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کہاں مخاطب ہوں؟ لاہور کی ہیرامنڈی کے اُس ریستوران کی چھت پر سے نہیں.. بلکہ اُس جیٹ کی ایک آرامدہ نشست پر سے جو مجھے براہ راست بوداپیسٹ لے جا رہا ہے..

راوی اور ڈینیوب کے درمیان نہ وہ شہر تھے اور نہ وہ ریگستان اور دریا جنہیں عبور کر کے میں برسوں میں لاہور تک پہنچی تھی، برسوں کے یہ فاصلے لمحوں میں طے ہو رہے تھے..

میری بانہیں کب کی ویران ہو چکیں..
ان میں کوئی کنگن نہیں جو کھنک سکے
میرا پیراہن تار تار ہے اور جوتے اُدھڑ چکے ہیں..
بالوں میں سفر کی وہ دُھول ہے جو دُھلتی ہی نہیں
مسافتیں تمام ہوئیں..
مجھے کسی بھی مٹی نے قبول نہ کیا تو..
میں اپنی مٹی کی جانب لوٹ رہی ہوں..
اپنے ڈینیوب کی جانب..
میں اُس کے پانیوں کو دوش نہ دوں گی اگر..
وہ مجھے قبول نہ کریں کہ..
میں اُن سے بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی..
لیکن اپنی مٹی اور اپنے پانی کبھی بے وفائی نہیں کرتے.. قبول کر لیتے ہیں..

●○●○●○●

مکّہ کالونی کی پُر پیچ، بے ترتیب آپس میں جھگڑتی ایک دوسرے سے بھڑتی ہوئی گلیاں جن کے درمیان میں ایک سیاہ گاڑھا بدبودار کیچڑ جس میں کہیں کہیں انسانی فُضلے کی زردی تیرتی تھی یوں ہولے ہولے سرک رہا تھا جیسے وہ کسی سرد آتش فشاں میں سے بہنے والا سرد اور سیاہ لاوا ہو..کہیں کوئی گٹر اپنی قوت سے یوں اُبل رہا تھا جیسے اُس میں سے سیاہ تیل برآمد ہو رہا ہو..وہاں ایک گلی میں پہلو بہ پہلو کھڑے اپنے لئے جگہ بنانے کی خاطر اک دوجے کو دھکیلتے دکھائی دیتے سپاٹ اور افلاس زدہ مکان تھے،اُن میں سے ایک کے سستے ٹین سے تیار شدہ پچکے ہوئے پھاٹک پر ''سردار غالب..الیکٹریشن'' کی تختی آویزاں تھیں جسے پڑھنے کے لئے سر کو ذرا ٹیڑھا کرنا پڑتا تھا کہ تختی میں جڑا ایک کیل اکھڑ چکا تھا اور وہ کسی متکبر شخص کی گردن کی طرح قدرے ٹیڑھی ہو چکی تھی..

گلبرگ تھری کے کسی زمانے میں پاش رہ چکے علاقے میں فردوس مارکٹ سے چند قدم کے فاصلے پر مکّہ کالونی کی بھیڑ کا بے ترتیب رہائشی مجموعہ تھا جس کے مکینوں کو گلبرگ کے رہائشی حقارت سے تکتے تھے کہ وہ نہ صرف اُن کے لئے تعمیر کردہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر چلتے تھے بلکہ اُن کے پارکوں میں بھی اُن کے غلیظ بچے ادھم مچاتے تھے...وہ یعنی گلبرگ کے رہنے والے حسرت سے اُن زمانوں کو یاد کرتے تھے جب وہاں والٹن ایئرپورٹ کا وسیع میدان اور اُس کے درمیان میں ایک مختصر رن وے ہوا کرتی تھی جس پر پنکھوں والے جہاز ڈولتے ہوئے اترا کرتے تھے..فلائنگ کلب کے انسٹرکٹر ہوابازی کے شوقینوں کو دو نشستوں والے طیاروں میں باندھ کر تربیت دیتے شہر لاہور کے اوپر چکر لگواتے تھے..پہلے والٹن ایئرپورٹ کے کناروں پر اکا دکا عارضی جھگیاں نمودار ہوئیں جن میں سے کچھ در پردہ اینٹ گارے سے تعمیر ہو کر ایک دو کمروں کے خفیہ سے گھر ہو گئیں..جتنی دیر میں حکام بالا کو خبر ہوئی یہ جھونپڑیاں اور جھگیاں اور کچھ عارضی لگتے مکان رینگتے رینگتے ایئر سٹرپ کے قریب پہنچ گئے..اس سے پیشتر کہ اس غیر قانونی تعمیر کو مسمار کرنے کے لئے کارپوریشن کے بُل ڈوزر حرکت میں آتے، روٹی، کپڑا اور مکان کے انقلابی نعروں کا دور شروع ہو گیا جو من مانی کر گزرنے کے لئے اجازت کا ایک پروانہ تھا، بے سہاروں اور غریبوں کے لئے ایک بہانہ تھا اور گلبرگ کی کوٹھیوں میں کام کرنے والے گھریلو ملازمین، چوکیدار اور خوانچہ فروش..اور کچھ دنوں بعد لاہور کے نواح سے آنے والے راج مزدور، خاکروب اور انڈسٹریل ایریا کے مزدور وہ سب بھی چل پڑے اور دنوں میں والٹن ایئرپورٹ ایک کچی آبادی سے ڈھک گیا..اس کے ساتھ ہی قبضہ گروپ بھی حرکت میں آ گئے جن میں شامل زور آوروں کی پشت پناہی مقامی کونسلر اور دو نمبر سیاست دان کر رہے تھے،اُنہوں نے بہت سے ناداروں اور مزدوروں کو دھکیل کر کم از کم نصف آبادی پر قبضہ کر لیا، پولیس بھی معاون ثابت ہوئی اور پھر وہاں پکے مکان اور رہائش گاہیں تعمیر کر کے اُنہیں اُس مڈل کلاس کے ہاتھوں فروخت کر دیا جو کسی بہتر رہائشی علاقے کی قیمتیں ادا

کرنے سے قاصر تھی..ایسے قبضہ گروپوں میں شامل افراد چونکہ چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ دین کے استحکام اور اس کی سربلندی کی کی خاطر فوری طور پر ایک مسجد کی تعمیر کا آغاز کر دیتے ہیں اور یہ مسجد ہمیشہ ایمان کی حرارت سے شب بھر میں بنا دی جاتی ہے...مذہبی جماعتیں بھی تعاون کرتی ہیں، رات کے اندھیرے میں اینٹوں سے بھری ٹرالیاں آتی ہیں، درجنوں راج مزدور اس مقدس کام میں جوت دیئے جاتے ہیں اور اگلی سویر وہاں سے فجر کی اذان لاؤڈ سپیکروں پر گونجنے لگتی ہے..اسلام کا بول بالا ہونے لگتا ہے..اب کون ہے جو ایک مسجد کو، بے شک وہ غیر قانونی ہو، کسی بیوہ کی زمین پر ہو یا کسی مڈل کلاس شخص کا عمر بھر کا اثاثہ ایک پلاٹ کی صورت میں ہو..ڈھا دینے کی جسارت کر سکتا ہے..کہ علمائے کرام کے مطابق جس مقام پر مسجد تعمیر کی جاتی ہے، اُس کی جڑیں پاتال تک اتر جاتی ہیں..اور ہاں بہت عرصہ تک اس بستی کو دھکّا کالونی کے نام سے پکارا جاتا تھا کہ جس نے دھکم پیل کی، کسی اور کو دھکّا دے کر خود قابض ہوا وہی سرخرو ہوا، لیکن پہلی مسجد کی تعمیر کے پہلے جمعے کے خطبے میں اعلان کیا گیا کہ اب اسے مکّہ کالونی کہا جائے گا..

اس مکّہ کالونی کے ایک سپاٹ اور افلاس زدہ مکان کے پچکے ہوئے ٹین کے پھاٹک پر ''سردار غالب.. الیکٹریشن'' کی قدرے ٹیڑھی ہو چکی تختی آویزاں تھی...اُس کے اندر..ایک دیواروں میں بھنچے ہوئے مختصر کچے صحن کے کونے میں ایک ہینڈ پمپ کے نیچے کچھ اَن دھلے برتن پڑے تھے اور دوسرے کونے میں ایک بے ڈھب سی تعمیر ٹاٹ کے ایک پردے کے پیچھے رفع حاجت کی سہولت پنہاں رکھتی تھی..اُس کچے صحن میں سردار قالب ابھی ابھی اپنے چھوٹے بھائی سردار غالب سے مل کر ذرا پیچھے ہوا تھا اور اپنے آنسو پونچھ رہا تھا جب کہ سردار غالب کی آنکھوں میں سراسر خشکی تھی کہ وہ مدتوں سے اپنے اس بڑے بھائی کے وجود کو فراموش کر چکا تھا جو زمانے گزر چکے جب وہ سوویت یونین میں پڑھائی کے لئے گیا تھا اور پھر اُس کی کچھ خبر نہ رہی تھی..سرِشام جب اُس کے ٹین کے پھاٹک پر کسی نے دستک دی تھی تو وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید کوئی گاہک ہے جس کے گھر میں بجلی کا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے اور وہ اسے فون کرنے کی بجائے ایمرجنسی میں خود ہی چلا آیا ہے..

اُس نے بھی سردار غالب نے بھی اپنے باپ سردار سیماب کی مانند بے دھڑک بچے پیدا کیے تھے جن میں سے کم از کم چھ عدد اُس گوری میم کو گھیرے میں لئے ہوئے دانت نکال رہے تھے جو اس گمشدہ بڑے بھائی کے پہلو سے لگی کھڑی تھی اور جب وہ اُس سے لپٹا تھا تو وہ الگ ہو کر حیرانی میں آس پاس تکتی تھی، جب اُس کے بچوں نے اُس کا گھیراؤ کر لیا..

سردار غالب کی زوجہ مختار بیگم ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے جھانکتی تھی..

ظہیر الدین جب لاہور ایئر پورٹ کے باہر آ کر اُس دھول بھری فضا میں چند گہرے سانس بھر کر فارغ ہوا تو اُس نے قالب کا ہاتھ تھام کر کہا تھا'' قالب..ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار اب ساحل پر اترے ہیں تو کیا ہم جانتے ہیں کہ اب ہم نے کدھر کا رُخ کرنا ہے..''

''سَر..مجھے صرف لوٹنا تھا، اس کے آگے میرے ذہن میں کسی راستے کا تعین نہ ہوا تھا..کیا آپ جانتے ہیں کہ

آپ نے کہاں جانا ہے؟''

''ہاں..''ظہیرالدین مسکرایا''میرے پاس میری منزل کے مکمل نقشے ہیں..میں یہاں سے نکل کر اتہ پتہ کروں گا کہ ان دنوں بوریوالا کے لئے کون سے مقام سے بسیں نکلتی ہیں..میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں اور خاص طور پر اس گھبرائی ہوئی،تم سے چپکی ہوئی ڈری ہوئی بٹی لیلیٰ کو مدعو کروں کہ تم میرے ہمراہ چلے آؤ..لیکن قالب پُلوں کے نیچے سے زمانوں کے بہت پانی بہہ چکے..مجھے قطعی طور پر علم نہیں کہ ان پانیوں کے کناروں پر میری یادداشت کے جو سنہری شجر تھے،کیا وہ اب بھی سایہ دار ہیں یا وقت کی دیمک اُنہیں کب کی چاٹ چکی تو میں چاہنے کے باوجود تمہیں دعوت نہیں دے سکتا کہ اب وہاں میرا کوئی نہیں اور نہ ہی مجھے علم ہے کہ وہ مختصر کوارٹر جس کی دیواروں پر ان پیغمبروں کی شبیہیں چسپاں تھیں جن کے صحیفوں پر میں ایمان لے آیا..ابھی تک موجود ہے..البتہ مجھے اس بات کا مکمل یقین ہے کہ ایک ویرانے میں،کم از کم آک کا ایک بوٹا موجود ہوگا جس کے ایک ڈوڈے میں سے پھوٹنے والی ایک مائی بوڑھی میری منتظر ہوگی اور میرے رخساروں پر اترتے ہوئے سرگوشی کرے گی..ویلکم بیک ظہیرالدین..

سردار قالب کے منشور میں اگرچہ صرف لوٹ جانا ہی درج تھا،اس سے آگے کی کوئی منصوبہ بندی اُس کے ذہن میں واضح نہ تھی۔بہرحال اُس کا قیاس تھا کہ وہ دونوں کسی پُرآسائش ہوٹل میں جا ٹھہریں گے لیکن ایک اور ٹھکانا بھی ہو سکتا تھا..وہ اپنے دیگر بہن بھائیوں کے بارے میں تو کچھ زیادہ علم نہیں رکھتا تھا کہ وہ سب کیا ہوئے..نہ ہی اُن سے کوئی جذباتی لگاؤ ایسا تھا کہ وہ ان کا سراغ رکھتا البتہ کبھی کبھار وہ اپنے چھوٹے بھائی سردار غالب سے رابطہ کر لیتا۔ظہیرالدین رخصت ہوا تو اُس نے سوچا کہ اتنی زندگی پرائے لوگوں میں گزری تو کچھ دن..اگر وہ قبول کر لیں..تو اپنوں کے ساتھ بھی بسر کرنے چاہئیں..

اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنے بھائی سے لپٹ کر کچھ آنسو بہا کر پیچھے ہو چکا ہے اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ اُس بھائی کی آغوش میں عزیزداری کی کچھ حدّت نہیں ہے اور ہو بھی کیسے..کہ وہ بھی تو اُس کے وجود سے تقریباً غافل رہا تھا..

اُس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لیلیٰ کی دودھیا رنگت اُس غربت زدہ کچے صحن میں ڈھلتی شام میں ایک چراغ کی مانند روشن ہوتی جاتی تھی اور اُس کے گرد کم از کم چھ بچے ہجوم کرتے دانت نکالتے تھے..

''تو پھر ڈیڈی..بس یہی ہے۔''لیلیٰ کی دھیمی مسکراہٹ میں کڑواہٹ نہ تھی،اپنے باپ کے شکستہ ہوتے چہرے کے لئے چاہت تھی..

یہ ایک شکنجہ نما تنگ سا کمرہ تھا اور جو دیواریں اس کا احاطہ کرتی تھیں،ان کی ایک ایک اینٹ الگ الگ گنی جا سکتی تھی کہ تعمیر کے بعد یہ باقاعدہ پلستر سے آشنا نہ ہوئی تھیں..انہیں آپس میں جوڑتا سیمنٹ بھی ان کے جوڑوں میں سے منجمد رالوں کی مانند پتھر ہو چکا تھا..چونکہ چھت بھی پلستر سے عاری تھی اس لئے لینٹر کا سریا بھی نمایاں نظر آتا تھا..آہنی زنگ آلود ہوتی جالی کا پابند ایک چوکور روشن دان چھت سے چھوتا تازہ ہوا کی ترسیل کا واحد منبع تھا..لیلیٰ کو اُس جھلنگا چارپائی پر بیٹھنے کی عادت نہ ہو رہی تھی جس کی ڈھیلی پڑ چکی ادوائن کو ایک چارخانوں والا پھٹا ہوا کھیس اپنے میلے کچیلے پن سے ڈھکتا

تھا اور وہ اُس چارپائی پر اتنی احتیاط سے تقریباً دم روکے بیٹھی تھی جیسے ذرا زور سے سانس لینے سے یا ذرا سی حرکت کرنے سے وہ ایک لینڈ مائن کی مانند بھک سے اُڑ جائے گی..

''ہاں..بس یہی ہے لیلے۔''

قالب اُس کے سامنے ایک ایسے تخت پوش پر بیٹھا تھا جس پر چھینٹ ایک کی چادر نہایت اہتمام سے اُس کے لئے بچھائی گئی تھی اور یہی اُس کی خوابیدگی کا بندوبست تھا.. بھابھی مختار بیگم جسے اُس نے ظاہر ہے پہلی بار دیکھا تھا، ایک جھنجلائے ہوئے مایوس ہو چکے چہرے کی عورت تھی جس کے نصیب میں بچپن سے لے کر اب تک آسودگی کا کوئی لمحہ نہ آیا تھا..بہر طور بے اعتنائی سے ہی سہی اُس نے اپنے تئیں رات کے کھانے کا خاصا اہتمام کیا تھا..مرغی اگرچہ شوربے میں غرق تھی لیکن پھر بھی مرغی تھی اور اس سے بڑھ کر ان آسمان سے ٹپک پڑے غیر ملکی رشتے داروں کے لئے اور کیا تکلف اور اہتمام ہو سکتا تھا..

کھانے کے دوران برادر غالب کے سیل فون پر مکّہ کالونی کے گھروں سے پرے گلبرگ کا جو جے بلاک پھیلا ہوا تھا، وہاں کے کسی مکین کا بلاوا آ گیا تھا جس کا گیزر کام نہیں کر رہا تھا اور وہ، بخوشی چند مزید نوالے نگل کر اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا تھا..بجلی کے کام کے علاوہ اُس کے پاس دیگر مہارتیں بھی تھیں، پانی کی ٹینکیوں کی صفائی کرنا، کموڈ جن کا پانی رِستا رہتا ہو، واشنگ مشینوں کی مرمت، ایئر کنڈیشنروں کی سروس.. یہاں تک کہ وہ گٹر ز جو کسی رکاوٹ کے باعث اُبل پڑتے ہیں، وہ اُن کو رواں کرنے پر بھی قادر تھا..

''ہم یہاں کب تک ٹھہریں گے ڈیڈی؟''

''کیا تم پچھتا رہی ہو؟''

''نہیں ڈیڈی..میں صرف آپ کے لئے فکر مند ہوں..''

''صبح تک حالات بہتر ہو جائیں گے بلکہ صبح تک میرے بھائی کے مالی حالات بہت بہتر ہو جائیں گے کہ میں اُس کی مناسب معاونت کر دوں گا اور جو کچھ سرِ دست ان کے بس میں تھا وہ انہوں نے ہمارے لئے کر دیا..''

''اور ہم کل..کل کیا کریں گے؟''

''میں.. بلکہ ہم..دونوں یہاں سے نکل کر فردوس مارکیٹ میں ناشتے کے طور پر نان اور چنوں کا تجربہ کریں گے..پھر..میں تمہیں باغبان پورہ کے اُس مکان میں لے چلوں گا جہاں میرا باپ گئی رات مداحوں کی کسی نائو نوش کی محفل میں اپنی انقلابی شاعری کی داد سے بھی مخمور لوٹا کرتا تھا اور اُسے کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ اُس شب بھی ہم تقریباً بھوکے سو گئے ہیں..وہ تو پوری قوم بلکہ کل انسانیت کی بھوک اور ناداری مٹانے کی جدوجہد کا پرچم اٹھائے ہوئے تھا..اتنا خود غرض تو نہیں ہو سکتا تھا کہ محض اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لئے اپنی جدوجہد کا رخ ہماری طرف موڑ دیتا..''

''آپ کے اندر سے وہ کڑواہٹ جاتی نہیں ڈیڈی..زمانے بیت گئے..''

''بے شک جتنے زمانے طے ہیں سب کے سب بیت جائیں میں اُسے کبھی معاف نہیں کر سکتا..بچپن کی بھوک سے میری انتڑیاں جو سکڑ چکی ہیں، وہ تمہارے نانا کے وسیع دسترخوان کے پکوانوں سے بھی زندہ نہیں ہو سکیں..اور اُس کی

میرے وجود سے بھی بے خبری نے مجھے ایک یتیم ہو چکے بچے سے بھی بڑھ کر بے چارگی سے بھر دیا تھا.. لیلیٰ یہی سکڑ چکی انتڑیاں اور بے چارگی ہیں جو مجھے یوں تمہارے نانا کے سامنے سرنگوں اور فرمانبردار رکھتی تھیں کہ میں ہر لمحے ٹھٹکتا تھا کہ کہیں مجھ سے یہ ساری آسائشیں چھن نہ جائیں اور یہ خوف مجھے ہمہ وقت سر جھکائے رکھنے پر مجبور کرتا تھا..اگر اُس ایک شب نیشنل عوامی پارٹی کا وہ نرم دل سرکردہ لیڈر میرے باپ سے یہ نہ پوچھتا کہ آپ کا یہ برخوردار کیا کرتا ہے تو لیلیٰ..مجھ میں تو بھائی غالب کی مانند ایک الیکٹریشن بننے کی صلاحیت بھی نہ تھی، میں یا تو اپنی محرومیاں فراموش کرنے کی خاطر منشیات کا عادی ہو کر کسی گندے نالے میں ڈوب کر مر چکا ہوتا اور یا پھر لاہور شہر کے فٹ پاتھوں پر بھیک مانگ رہا ہوتا..میں اُسے اپنے باپ کو کیسے معاف کر دوں!''

لیلیٰ اپنی جھلنگا چارپائی کے جھولنے سے بمشکل تمام اٹھی اور قالب کی گردن میں اپنی لامبی بانہیں حمائل کر کے اُس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے''میں آپ کے ساتھ ہوں ڈیڈی۔''

اُس لمحے یکدم اُس چوکور مختصر زنگ آلود جالی والے روشن دان کے راستے ایک اعصاب کو منتشر کر دینے والی پُرشور گلا صاف کرنے کی دل خراش آواز داخل ہوئی جس نے لیلیٰ کو دہلا دیا اور پھر عشاء کی نماز کی اذان اُس بلغم سے ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہ ہونے والے گلے میں سے برآمد ہونے لگی..

''ڈیڈی..''اُس نے قالب کی گردن میں حمائل بانہوں کو خوف سے لرز کر ایک شکنجہ کر لیا..

''لیلیٰ..'' قالب نے مسکراتے ہوئے اُسے ڈھارس دی..''میرے وطن میں مذہب کی افیون اونگھتی نہیں ہے، اتنی ہی پُرشور اور بلند آہنگ ہوتی ہے..''

●○●○●○●

شہر لاہور کے دل میں ہولے ہولے بہنے والی مٹیالی اور اکلوتی اداس نہر.. کہ جس کے ٹھنڈے پانیوں کی سست روانی میں نہ صرف اُن بھینسوں کا گوبر بہتا تھا، جنہیں اس میں نہلایا جاتا تھا، نہ صرف گھوڑوں کے بے دریغ پیشاب سے پانیوں کی رنگت زرد ہوتی تھی بلکہ متعدد نئی آبادیوں کی غلاظت بھی اس میں شامل ہو کر اسے ہولے ہولے بہنے پر مجبور کرتی تھی.. یہ وہ ندیا نہ تھی جو صرف اس لئے دھیرے بہتی تھی کہ کسی سیّاں نے اس کے پار اترنا تھا.. اور اس کے باوجود اس کے کناروں پر بلند ہوتے پیپل، سفیدے اور سُنبل کے درخت اور اس کے پانیوں میں اپنے باریک پتّے ڈبوتے بید مجنوں یوں سایہ دار ہوتے تھے کہ اہل لاہور شدید گرمیوں میں اس میں ایک آدھ ڈبکی لگانے سے پرہیز نہ کرتے تھے.. اس مٹیالی دھیرے سے بہنے والی اکلوتی اداس نہر کے کنارے.. گلبرگ کے رہائشی گھنے پن کے شور و شغب میں گھرا ہوا پچھلی صدی کی سانسوں میں اب بھی برقرار بزرگ درختوں کے گھنے ذخیرے.. سرسبز کھیتوں.. کھیل کے میدانوں اور انکسار پسند کولونیل طرز تعمیر کی عمارتوں کے مجموعے کا ایک پرسکون الگ تھلگ جزیرہ تھا جس کے اندر قائم شدہ ایک مشنری کالج کے اہلکاروں کے کواٹروں کی بستی، سٹوڈنٹ ہوسٹل اور ان سے ذرا الگ کالج سٹاف کی سادہ مگر دنیا جہان سے الگ تھلگ رہائش گاہیں روپوش تھیں جن میں سے کسی ایک میں عارف نقوی کا وہ ہمدم دیریں آغا بابر تھا جو لکھنؤ کی تھیٹر سٹیج پر جب وہ ایک کرشن کا روپ دھار کر داخل ہوتا تھا اُس کے سامنے ارجن کی شکل میں آ کر کھڑا ہوتا تھا اور کہتا تھا.. اُسے اُس کے مکالمے ابھی تک نہ بھولے تھے.. اے کرشن، میں تیرا مطیع بھائی کیسے اس مہابھارت کے یدھ میں اپنے ہی خون کے خلاف تلوار اٹھالوں.. یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا.. اپنے پیاروں سے انتقام لینے سے رنج اور غصّے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا محض فتح کا عارضی احساس ہوتا ہے..

اور وہ عارف نقوی، ایک کرشن اپنے بھائی کو بھاشن دیتا تھا کہ اے ارجن.. جب دنیا میں دھرم کم ہوتا ہے اور ادھرم بڑھتا ہے تب میں جنم لیتا ہوں، نیک لوگوں کی حفاظت کی خاطر اور ظالموں کو سزا دینے کے لئے میں عہد بہ عہد ظاہر ہوتا ہوں تو تلوار سونت..

وہ اکثر اپنے کرداروں میں ڈوبے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے ناموں سے مخاطب نہ کرتے.. وہ اسے عارف کرشن کہا کرتا تھا اور وہ اُسے آغا ارجن پکارتا تھا..

کوچہ کمانگراں میں وہ رات.. جوں توں کر کے گزر گئی تھی..

برلن میں اُس کے فلیٹ کے اندر وہ بھی کبھی کبھار رہائشی عمارتوں میں گھرے ہوئے پارک میں کھیلتے غل مچاتے بچوں کا ایک مدھم شور بلند ہو کر شیشے کی دوہری مقفل کھڑکیوں پر دستک دیئے بنا در آتا لیکن وہ بھی صرف دن کے وقت.. راتوں کو تو

برابر میں خوابیدہ ہلٹرڈ کے کروٹ بدلنے سے بستر کی چادر میں جو شکنیں پڑتیں اُن کی سرسراہٹ بھی سنائی دے جاتی لیکن اُس کے چلے جانے کے بعد وہ سرسراہٹ بھی معدوم ہوگئی، وہاں موت کی خاموشی ہوتی، کچھ خبر نہ ہوتی کہ ابھی تک رات ہے یا سویر ہو چکی ہے..اور یہ جو پچھلی شب تھی اپنے برلن کے فلیٹ سے باہر کسی اجنبی کمرے میں جو پہلی رات تھی وہاں شب بھر اُس رنگین شیشوں کے جڑاؤ والی قدیم کھڑکی میں سے ایک مدھم روشنی سرایت کرتی رہی اور پھر باہر ابھی تاریکی روپوش ہونے کے لئے رختِ سفر باندھتی تھی جب نیچے گلی میں آمدورفت کے قدموں کی سرسراہٹیں شروع ہوگئی تھیں..کمرے کے عین نیچے کوئی تندور گرم ہو رہا تھا اور ایک شخص جو آٹا گوندھ رہا تھا، وہ اپنی موج میں کوئی فلمی گیت آٹے پر اپنی مٹھیاں بھینچتا، ہولے ہولے جھومتا نہایت بےسُرے گلے میں سے برآمد کر رہا تھا..اور کچھ دیر کے بعد فجر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا..وہ ابھی نیم غنودگی میں تھا.مصطفےٰ اسلام منہ کھولے اور اُس کے کچھ دانت گر چکے تھے، نیند میں دُھت سوتا تھا.. پینتالیس برس بعد پہلی بار اُس سوتی جاگتی کیفیت میں عارف نقوی کے کانوں کے اندر اذان کی آواز اتر رہی تھی..اگرچہ وہ اب بھی کسی حد تک حالت انکار میں تھا، صرف کربلا کا مزاحمتی استعارہ تھا جسے اُس نے محض انقلاب اور انکار کے آدرشوں کے تحت سینے سے لگا رکھا تھا لیکن مدتوں بعد اذان کی یہ صدائیں اُس کے کانوں کو بھلی لگ رہی تھیں..فلاح کی جانب بلانے والے ان سندیسوں میں ایک مدھر کشش تھی..دور پار اور نزدیک کے گلی محلوں کی مساجد میں سے بلند ہونے والی اذانوں کا ایک ملا جلا شور تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہر مؤذن کی آواز کو دوسری صداؤں سے الگ کر کے اُس پر اپنا دھیان مرکوز رکھ سکتا تھا.اُن میں سے ایک مؤذن..شاید راگ راگنیوں میں شُدھ بُدھ رکھتا تھا یا غیر شعوری طور پر سُر کی مدھم لے اُس کے بدن میں گردش کرتی تھی کہ اُس کی اذان میں راگ بھیرویں کی اداسی اور راگ بہار کی بہار یہ گُلوں میں رنگ بھرتی گل رنگ مسرت کی سرمستی گھل رہی تھی..اُس کے لہجے میں کمال کی سُریلی دل نشینی اور شیرینی تھی اور وہ یوں اذان دیتا تھا کہ ہر فرد کو ذاتی طور پر مخاطب ہوتا، فلاح کی جانب بلاتا تھا..

عارف نقوی کی سوگتی جاگتی ابھی تک انکاری آنکھیں نم ہونے لگیں..ایمان رکھنا یا نہ رکھنا اس اذان کی اثر انگیزی کے سامنے کوئی معنی نہ رکھتا تھا..اُسے احساس ہوا کہ وہ نہ صرف اپنے وطن سے بلکہ اس آواز سے بھی اتنی مدت بچھڑا رہا تھا جو اُس کے نومولود کچے کانوں میں پہلی صدا تھی..اور مشرقی جرمنی میں رُک جانے سے پیشتر اُس کے شب و روز کا ایک لازمی حصّہ تھی..

قدرے بوجھل کر دینے والی لاہوری ناشتے کے بعد مصطفےٰ اسلام نے ایک بزرگانہ شفقت والی مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلا کر کہا ''کامریڈ..آپ بے شک نکلئے اس گھر سے اور پہنچئے اپنے نوجوانی کے لکھنوی دوست کے گھر برائے ملاقات لیکن گھر یہی رہے گا..یہیں لوٹ کر آیئے گا..میں انتظار کروں گا..''

وہ کھوج لگاتا پہنچ گیا تھا..

گلبرگ کی اُس بھگدڑ میں وہ جو کولونیل طرز کی عمارتوں کا ایک پرسکون جزیرہ تھا اُس کے اندر تدریسی عملے کی رہائش گاہوں میں سے ایک وکٹورین طرز کے دروازے پر ایک تختی آویزاں تھی جسے ایک قدیم بگن ولیا کی بیل کے جھاڑ جھنکار نے تقریباً ڈھانپ رکھا تھا اور اُس پر وہ نام درج تھا جس کی تلاش میں وہ ادھر آ نکلا تھا..

عارف نقوی نے گھنٹی کے بٹن پر اُنگلی کا بوجھ ڈالنے سے پیشتر اُن بھولے بسرے مکالموں کو پھر سے ذہن میں زندہ کیا جو وہ دونوں کرشن اور ارجن کا روپ دھارے، سنہری چمکیلے لنگوٹ باندھے، بدن پر بھاری زیور سجائے اور سر پر چمکیلے

کاغذوں اور گتّوں سے بنائے گئے تاج شاہی پہنے ادا کیا کرتے تھے کہ اے کرشن..میں تیرا مطیع بھائی کیسے اس مہا بھارت کے یدھ میں اپنے ہی خون کے خلاف تلوار اٹھالوں..

اگرچہ صدیاں بیت چکی تھیں اُسے دیکھے ہوئے لیکن اُسے یقین کامل تھا کہ جونہی وہ دروازہ کھولے گا..قدرے مختصر قامت رکھنے والا، گھنگھریالے بال پریشان اور دبیز شیشوں کی عینک وہ تب بھی لگاتا تھا اور جب مجبوراً ارجن کا روپ دھارنے کی خاطر اُتارتا تھا تو کم از کم دو بار وہ اُس سے مخاطب ہونے کی بجائے ایک ستون کے ساتھ ڈائیلاگ بولنے لگا تھا..اپنی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے پہچان جائے گا..

دروازہ کھلا تو وہ ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا اُس نے تصور کیا تھا..

اُس کے دل نے متعدد دھڑکنیں گم کردیں، وہ آج بھی ویسے کا ویسا ہی تھا، صرف اُس کے چہرے پر عینک نہ تھی..

''جی فرمائیے..''اُس کی آواز میں فرق تھا..

''آغا بابر؟''یہ سوال نہ تھا ایک حیرتی استفسار تھا..

''پاپا ہمیشہ آپ کا تذکرہ کرتے تھے..اور بہت گلا کرتے تھے کہ آپ نے انہیں بھلا دیا ہے..اُن کے پاس آپ کے وہ تین چار تصویری پوسٹ کارڈ محفوظ تھے جن میں سے آخری آپ نے تب لکھا تھا جب دیوارِ برلن مسمار ہوئی تھی اور آپ نے لکھا تھا، اے ارجن ہم اپنی مہا بھارت ہار گئے..وہ صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تو اُن کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزرنے لگا..وہ اکثر رات کے کھانے کے بعد کارنس پر سجی اپنی پرانی تصویروں کو تکتے رہتے، کبھی خود کلامی میں چلے جاتے اور کبھی آپ کی تصویروں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں مکالمے بولنے لگتے..جی ہاں وہی تصویریں جنہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کو متوجہ کرلیا تھا اور آپ نے بتایا تھا کہ تصویروں کے یہی پرنٹ آپ کی البم میں بھی موجود ہیں..ہمیں اکثر شک گزرتا کہ پاپا اپنے حواس میں نہیں رہے..امی کی صحت کبھی بھی قابل رشک نہ رہی تھی لیکن وہ چلی آتی تھیں اور پھر بغیر کسی عارضے کے واقعی چل دیں..پاپا نے اُن کی موت کو قطعی طور پر قبول نہ کیا اور دنوں میں اُن کے ہاں چلے گئے..''ایک گہری کھرج والی ڈرامائی آواز کا مالک گھنگھریالے بالوں والا آغا ہمایوں پور پور تک لکھنوی ثقافت اور لب و لہجے میں ڈوبے ہوئے مزاج والے باپ کا بیٹا، ایک واضح پنجابی لہجے میں گویا ہوتا تھا''میں نے تب جب ہم پاپا کو گلستانِ فردوسیہ قبرستان میں دفن کر رہے تھے، ارادہ کرلیا کہ میں اپنا خاصا کامیاب اور منفعت بخش بینکنگ کیریئر تیاگ دوں گا، میں نے ایم بی اے کے علاوہ اردو میں بھی نمایاں حیثیت میں ماسٹرز کیا تھا تو میں نے اسی کالج میں لیکچرر شپ کی آسامی کے لئے درخواست پیش کردی جو کہ میری اہلیت کے علاوہ پاپا کی تدریسی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے منظور کرلی گئی اور یہ کم بلکہ معمولی تنخواہ والی ملازمت میں نے اس لئے اختیار کی کہ میں اس گھر سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا، اس گھر میں زندگی کا تسلسل جاری رکھنے کا تمنائی تھا جس میں میں پلا بڑھا تھا اور..جس کے در و دیوار میں مجھے پاپا کی موجودگی محسوس ہوتی تھی..آپ کے سامنے جو جھولنے والی آرام کرسی ہے، یہ اُن کی پسندیدہ نشست تھی..آپ کتنے روز کے لئے پاکستان آئے ہیں..جانے سے پیشتر آپ نے میرے بال بچوں سے ضرور ملنا ہے..وہ آج یہاں موجود نہیں، میری بیوی اپنی ایک عمر رسیدہ خالہ سے ملنے گئی ہوئی ہیں..''

''میں نے جانا نہیں ہمایوں..'' اُس کی نظریں کارنس پر سجی اُن تصویروں سے جدا نہ ہوتی تھیں ''میں جانے کے لئے نہیں، اپنے آخری برس یا شاید چند مہینے کون کہہ سکتا ہے، یہاں گزارنے کے لئے آیا ہوں کہ وہاں برلن میں..اب میرا کوئی نہیں۔''

ہمایوں کو اپنے سامنے بیٹھے کسی حد تک اضطراب میں مبتلا بے چین سے شخص میں، اُس کے سفید بالوں اور پر شفقت معصوم سے چہرے میں اپنے پاپا کی جھلکیاں دکھائی دیتی گئیں..وہ انہی کے انداز میں دھیرج سے لکھنؤی لہجے کی نستعلیق چاشنی میں بات کرتا تھا۔ ''سر..میرے صرف دو بچے ہیں..اور یہ گھر اتنا بڑا ہے کہ ہم چاروں اس کی وسعت میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔اتنی گنجائش ہے تو..آپ ہمارے ہاں ٹھہر جائیے.. پاپا بہت خوش ہوں گے..پلیز۔''

ہاں اِنگے تب بہت چھوٹی تھی اور پھر جب وہ جوان ہو رہی تھی تو اُس کے لہجے میں بھی یہی الفت بھری اپنائیت ہوا کرتی تھی اور پھر وہ پرائی ہوگئی..اُس کے سامنے جو نوجوان ایک درخواست گزار رہا تھا اُس کا سگا نہ تھا، ماضی کی چند یادوں میں سے کسی ایک کا تسلسل تھا..ایک اجنبی تھا اور پھر بھی وہ اپنی الفت بھری اپنائیت سے اُسے اِنگے کی یاد دلاتا تھا..اُس کے چہرے پر ایک رنجیدہ مسکراہٹ نے جنم لیا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ پاپا بہت خوش ہوں گے..

''فی الحال..آج کی شب تو مجھے ہر صورت کو چہ کمانگراں کے ایک گھر میں اپنے ایک منتظر کامریڈ کے ہاں پہنچنا ہے اور..شائد..وہ ایک اچھی اور سادہ سی پناہ گاہ ہے جہاں میں کچھ دن تو پڑا رہوں گا..لیکن ہمایوں بیٹے تمہاری یہ پیشکش میرے دل میں محفوظ ہے..شکریہ۔''

''لیکن انکل..یہاں بہت گنجائش ہے..'' وہ دونوں اُس رہائش گاہ سے باہر آئے تو ہمایوں کے اصرار میں کمی نہ آئی تھی ''پلیز آپ چلے آئیے..'' اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انکار میں سر ہلاتا چلا جاتا تھا جب اُسے اس کولونیل طرز کے طویل برآمدوں، بلند چھتوں والے گھر جس کے در و دیوار پیلاہٹ کی قلعی میں ایک حسن رفتہ کی پرچھائیوں میں تھے..اس کے عقب میں ایک نیم اجاڑ اور وسیع لان کے ایک کونے میں خودرو گھاس میں کسی حد تک پوشیدہ ایک شکستہ ہوتا اور اُس کی چھت پر بھی گھاس اُگی تھی، ایک کواٹر نظر آ گیا..وہ بھی مُگن ولیا کی ایک کب کی مردہ ہو چکی بیل کے موٹے ڈنٹھلوں، سوکھ چکی ٹہنیوں سے تقریباً ڈھکا ہوا تھا..

''وہاں کون رہتا ہے؟''

''کوئی بھی نہیں انکل..ایک زمانے میں سٹاف کے ہر گھر کے لئے ایک الگ مالی ہوا کرتا تھا، پھر اخراجات کو کم کرنے کے منصوبوں کی زد میں یہ مالی لوگ بھی آ گئے اور فارغ کر دیئے گئے..یہ کواٹر انگریزوں کے زمانے میں اُن کے لئے تعمیر کیے گئے تھے..وہ رخصت ہوئے تو اب کئی برسوں سے وہاں کوئی بھی نہیں رہتا..سوائے چند چوہوں اور ایک آدھ سانپ کے..اس جھاڑ جھنکار کی طرف کوئی بھی نہیں جاتا..آپ کیوں پوچھتے ہیں؟''

''اگر کبھی میں نے تمہارے ہاں منتقل ہونے کا ارادہ کیا..'' عارف نقوی کے چہرے پر وہی بچگانہ سی مسرت آمیز مسکراہٹ تھی ''تو میں وہاں رہائش رکھوں گا..اور یہ شرط ہے..اگر میں منتقل ہوا تو..''

یہ شخص تو بالکل پاپا ہے..ہمایوں کو کچھ تشویش ہوئی..اُنہی کی مانند قدرے خبطی ہے..

●○●○●○●

دن بھر کی مسافتوں سے شکستہ بدن، تھکے ہارے، شام ڈھلے وہ یہاں آ بیٹھے تھے.. ملّہ کالونی کی بھیڑ، تنگدستی اور گلیوں میں ایک سیاہ لاوے کی مانند حرکت کرتے گٹروں میں سے اُبلنے والی غلاظت سے دامن بچاتے وہاں سے فرار ہو کر وہ دن بھر پُر اشتیاق سیاحوں کی مانند شہر لاہور میں گھومتے بولائے پھرے تھے۔

وہ مکان باغبان پورہ کا جس کی اُسے جستجو تھی، کب کا ڈھے چکا تھا.. وہاں ایک واہیات چھچھورے ذوق کا مختصر پلازہ تعمیر ہو چکا تھا جس کے ماتھے پر غسل خانوں میں اور وہ بھی نہایت کور ذوق غسل خانوں میں استعمال کی جانے والی چمکیلی ٹائلز کی آرائش تھی.. چند وڈیو سنٹر، پان سگرٹ کے کھوکھے اور ایک باغبان پورہ فاسٹ فوڈ ریستوران جس پر سبز رنگ کا ایک نیون سائن یہ اعلان کرتا تھا کہ یہاں.. برگر نہیں بگرز ملتے ہیں.. وہ لیلے کو اپنے شہر لئے پھرا اور اب بہت تھک چکے وہ اُسی ریستوران کی چھت پر بیٹھے تھے جس کے کسی نشست پر براجمان جینا اسلام نے اپنا ابتدائی تعارف کروایا تھا۔ بادشاہی مسجد کے منور گنبد، قلعے کا عالمگیری دروازہ اور رنجیت سنگھ کی مڑی کے سنہری آثار.. وہی منظر تھا..

یہ ریستوران صرف اپنی لوکیشن کی کھٹی کھاتا تھا، سامنے کے پُر جلال روشن منظر کو کیش کرواتا تھا ورنہ یہاں پیش کی جانے والی خوراک بمشکل گلے میں سے اُترتی تھی..

''ڈیڈی.. ماسکو کی صفائی ستھرائی کی نسبت آپ کا یہ شہر.. آپ برا تو نہ مانیں گے.. مجھے خاصا دھول آلود، بے ترتیب اور آلودہ سا لگا۔ اگرچہ اس کے باشندے مجھے خودغرض نہیں لگے.. ہاں، وہ خاصے گندے ہیں اور اُن کی آنکھیں ہمہ وقت مجھ پر ٹھہری رہتی ہیں.. لیکن آپ کے اس شہر کی یہ شانداری جو میری آنکھوں کے سامنے منور ہے، مجھے مُگنگ کرتی ہے.. ہمارے ہاں سوائے سرخ چوک کے اور کوئی قابل فخر مقام نہیں ہے.. کلیسائے سینٹ باسل کے پیاز نما شوخ رنگتوں کے وہ گنبد جو ماسکو کیا پورے روس کی ثقافت کی پہچان ہیں، وہ تو ان بادشاہی مسجد کے دودھ پیالے گنبدوں کے سامنے پانی بھرتے ہیں.. اور کریملن کے برج مینار، لاہور کے اس قدیم حصار کے پُر سطوت مظاہر خاص طور پر عالمگیری دروازے کے سامنے ہیچ ہیں.. ڈیڈی آپ ایسی شاندار وراثت ترک کر کے چلے گئے..''

''وراثت چاہے کتنی ہی پُر شکوہ کیوں نہ ہو، فٹ پاتھ پر پڑے گداگر کا پیٹ نہیں بھرتی۔ میں ذہنی طور پر پسماندہ تو نہ تھا لیکن میرے حالات نے بلکہ میرے باپ نے مجھے نالائقی اور بودے پن کی کھائی میں دھکیل دیا.. مجھے تو پیٹرس لومبا یونیورسٹی جو کچھ پڑھایا جاتا تھا میرے سر پر سے گزر جاتا.. اگر اُس شب تمہاری ماں میرے دیسی انداز کے رقص کے والہانہ پن پر فدا ہو کر مجھ سے شادی نہ کر لیتی اور مجھے تمہارے نانا کے گھر میں پناہ نہ ملتی تو میں ماسکو کے اگلے موسم سرما میں برفوں سے ٹھٹھر کر مر جاتا اور اگر واپس آ جاتا تو بے ہنر اور بغیر کسی تعلیم کے ملّہ کالونی میں بھی اب تک دو کمروں کے کسی مکان میں

بھی نہ ہوتا..میں تو بھائی سردار غالب کی مانند ایک الیکٹریشن بننے کا بھی اہل نہ تھا لیلے..''

ریستوران کے پس منظر میں جو نیم تاریک مکان ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے کھڑے تھے، اُن میں سے ایک کی روشن کھڑکی میں سے کسی بوڑھے سارنگی نواز کے ساز کے تاروں میں سے جنم لینے والی ایک عجیب روتی ہوئی رُوں رُوں کے بین کرتی آواز آنے لگی..وہ شاید بائی جی کی کوٹھے پر آمد سے پیشتر اپنی سارنگی کے سُر آزما رہا تھا کہ وہ بائی جی اب ڈیفنس میں رہائش پذیر تھیں..سرشام اپنے ایک ان پڑھ پاکستانی صنعت کار کی نچھاور کی ہوئی سیاہ مرسیڈس میں سے ہیرا منڈی میں قدم رنجہ فرماتیں اور اپنے اس آبائی کوٹھے کو گئی رات تک آباد رکھ کر پھر سے ایک معزز بستی کو لوٹ جاتیں..

کبھی وہ زمانے تھے جب اس علاقے میں کیا ہی مدھر رونقیں اور حُسن کے کاروبار تھے..اور اُنہی زمانوں میں ٹبی تھانے کے عین سامنے ایک خوش ذوق گلشن نامی طوائف نے اپنے گھر کے باہر اپنی نیم پلیٹ پر لکھوا رکھا تھا کہ..چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے..اور پھر مردہ مینڈک کی آنکھوں والے جنرل کے عہد میں یہ سب کاروبار ویران ہو گئے..یہاں مدتوں سے مقیم کنجروں کے اپنے خاندان کنجر ہونے پر اتراتے خاندان، رقاصائیں اور طوائفیں..جو مڈل کلاس تھے، وہ اقبال ٹاؤن میں منتقل ہو گئے اور جو فرسٹ کلاس کیٹیگری میں تھے، اُنہوں نے ڈیفنس میں جا بسیرا کیا۔ یوں ہیرا منڈی کے کاروبار بھی پورے شہر میں پھیل گئے..لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے یہ سب لوگ پھر سے قابل قدر اور''اِن'' ہو گئے..ثقافت کے قدر دانوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا.موسیقی کے محقق کھوج لگانے لگے کہ ہماری وراثت کے یہ امین کہیں کھو نہ جائیں، ان کی حوصلہ افزائی اپنی پہچان اور ذوق جمال کی خاطر ضروری ہے..انہیں احساس ہوا کہ فائیو سٹار ہوٹلوں، فارم ہاؤسوں اور کنٹری کلبوں کے جدید ماحول میں مُجرے اور گائیکی کا وہ لطف کہاں جو ان قدیم کوٹھوں، پان کی پیکوں سے رنگین در و دیوار، باسی پھولوں، دیسی عطر سے لبریز ہواؤں جن میں چرس کی ہلکی سی بُو کے شائبے پھریرے اڑاتے تھے، گلے میں ہار اور کانوں میں اُڑسے گئے عطر بیز ٹُونبوں کے ثقافتی موسموں میں تھا، اہل ذوق، غیر ملکی سفارت کاروں کے اہلکار، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ایگزیکٹو اپنے غیر ملکی پُر اشتیاق مہمانوں کے ساتھ اور شہر کے چنیدہ متمول افراد جوق در جوق ادھر آنے لگے..رونقیں لوٹ آئیں، کوٹھے پھر سے آباد ہو گئے، گلوکارائیں اور رقاصائیں اپنے آبائی گھروں کی جانب لوٹنے لگیں لیکن سرشام نازل ہوتیں اور گئی رات پھر سے لوٹ جاتیں..اب وہ یہاں مستقل قیام کرنا پسند نہ کرتی تھیں، کوٹھے وہ سُپر سٹور تھے جو وقت معینہ پر اپنے در کھولتے اور پھر اُن پر قفل پڑ جاتے..ان شکستہ اور تاریک مکانوں، گلی محلّوں اور کوٹھوں کے نصیب جاگ اٹھے، ان کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کرنے لگیں..غریب موسیقاروں کے بھی دن پھر گئے..یہ ریستوران ایک باکمال مصوّر..جو اپنے ہیرا منڈی کے آبائی پس منظر پر پشیمان نہ تھا، اپنی سگی خالاؤں، پھوپھیوں اور رشتہ داروں کی پیشہ وری کے نقش کینوس پر اُتارتا تھا..یہ اُسی کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھا..اُس نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیا کہ اگر وہ اپنے آبائی گھر کو ایک ریستوران میں بدل دے تو ہیرا منڈی کی لوکیشن اہل نظر کو تجسس اور ثقافت کی ڈور میں باندھ کر لے آئے گی..اور ایسا ہی ہوا..برابر کے معمولی سے گھر بھی رفعت مقام حاصل کرتے گئے..اور ان دنوں ایک اور ریستوران اس گلی میں''انداز'' نام کا سبقت حاصل کر رہا تھا کہ وہاں کی خوراک کسی احمد چیمہ کے کرشمہ ہاتھوں سے تیار کی جاتی تھی..

''لیکن ڈیڈی..نانا سرنوف کی پیشاب خانوں کی آمدنی وصول کرنے والی زندگی بھی تو کیا زندگی تھی..میں

محسوس کرتی تھی..''

''محض مجبوری اور بے آسرا پن تھا.. پہلے پہل میں نے سُکھ کا سانس لیا کہ چلو پناہ تو ملی.. پھر وقت گزرنے سے مجھے اپنی ذلت اور محکومی کا احساس ہونے لگا لیکن میں دل پر جبر کرتا رہا. شاید صرف تم دونوں کے لیے.. بلکہ تم دونوں کے لئے ہی.. اور پھر اُس ایک روز پلاسٹک کے اُس اگلو پیشاب خانے کے کموڈ کی تہہ میں مجھے جو کچھ دکھائی دیا وہ گویا میرا اپنا وجود تھا. تب میں نے نامعلوم کے اس کنویں میں چھلانگ لگا دی اور شائد.. تمہیں بھی ساتھ لے ڈوبا..''

''نہیں نہیں ڈیڈی..'' وہ اپنی نشست سے اٹھ کر اُس سے لپٹ جانا چاہتی تھی لیکن اُس نے یوں کھلے عام اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے گریز کیا'' آپ کے اُس یکدم انکار سے آپ کیسے میری نظروں میں پُرتو قیر ہوئے ہیں، میں بتا نہیں سکتی اور آپ مجھے ساتھ لانے پر پہلے رضامند ہوئے اور پھر انکاری ہو گئے.. یاد ہے.. آپ آگاہ ہی نہ ہوئے جب میں ماسکو ایئرپورٹ پر.. ابھی دو دن پیشتر.. تاشقند روانہ ہونے والی پرواز کے مسافروں کی قطار میں آپ کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی..''

''ہاں لیلےٰ..'' قالب نے اپنے سامنے بیٹھی بیٹی کی آنکھوں میں بادشاہی مسجد کے دودھ پیالے منور گنبدوں کے عکس دیکھے اور اُس نے بمشکل اپنے آنسو روکے..'' ہاں.. لیکن میں آگاہ ہو گیا تھا کہ تم میرا ساتھ دینے کے لئے میرے پیچھے آ کھڑی ہوئی ہو.. کیونکہ اُس قطار میں منتظر مجھے یکدم محسوس ہوا جیسے میری پشت پر ایک ایسا ہاتھ ہولے سے اترا ہے جس میں میری ماں کے ہاتھ کی گرمی اور محبت تھی اور میں نے مڑ کر دیکھا تو.. تم تھیں..''

''آپ.. آئندہ احتیاط کیجیے.. کبھی اپنے آپ کو بودا اور نالائق نہ کہیے گا کہ آپ نہیں ہیں.. آپ نے نانا کے کاروبار کو.. وہ جیسا بھی تھا.. اتنا عرصہ سنبھالے رکھا اور وہ کسی اور سے نہ سنبھلتا.. یہ قابلِ تحسین ہے.. اور پھر ایک ایسی عورت کے ساتھ بنا شکایت کیے نباہ کیا جو عمر میں آپ سے بڑی تھی، اُس کے پہلے سے دو بچے تھے اور.. وہ آپ سے محبت بھی نہیں کرتی تھی..''

''نہیں نہیں.. ایسا نہیں تھا'' قالب نے بے چارگی سے سر ہلایا۔

''ایسا ہی تھا ڈیڈی.. میری ماں نے آپ کے ساتھ صرف سہولت کی خاطر شادی کی.. یہ میں جانتی ہوں.. اور آپ نے بھی سُن رکھا ہوگا کہ مشرقی یورپ کی لڑکیاں ہمیشہ کسی قدر حسد میں جلتی طنز کرتی ہیں کہ رُوسی لڑکیاں خاوندوں کی شکاری ہوتی ہیں، وہ خاوند حاصل کرنے اور انہیں لُبھانے کی ایکسپرٹ ہوتی ہیں، چاہے وہ اُن سے محبت نہ بھی کرتی ہوں.. تو ڈیڈی اگر آپ ماما سے شادی نہ کرتے تو بھی آسانی سے کسی نوجوان رُوسی لڑکی کو متاثر کر سکتے تھے..''

''ہاں، شائد..'' وہ اُس کی منطق پر بے اختیار مسکرا دیا'' لیکن.. پھر تم نہ ہوتیں..''

''ہاں یہ تو ہے..'' لیلےٰ نے اپنے سیاہ بال جھٹک کر مسخرے پن سے سر ہلایا اور پھر میز پر رکھے اُس کے ہاتھ پر اپنی ہتھیلی جما کر بولی'' اور یہ بھی ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں دنیا میں کسی بھی اور شخص کی بیٹی ہونا پسند نہ کرتی۔''

وہ آنسو جو اس نے بمشکل روکے تھے، اُن میں سے دو ایک تو اُس کے بس سے باہر ہو کر اُس کے رخساروں پر اتر آئے..

''ڈیڈی..پلیز نہیں..'' لیلیٰ نے التجا کی..

''بالکل نہیں..'' اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رخساروں پر اترتی نمی کو پونچھا۔

''لیکن لیلیٰ..بس یہی کچھ ہے..''

''مجھے یہی کچھ منظور ہے۔''

''میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا..''

''کل آئے گا تو دیکھا جائے گا ڈیڈی..''

اُس ایک نیم تاریک مکان میں روشن کھڑکی میں سے برآمد ہوتے سارنگی کے سُر اپنی اداسی سے باہر آ گئے..کہ ان کے پس منظر میں ایک پائل کی چھنکتی، چھن چھن سنائی دینے لگی.. بائی جی اپنی سیاہ مرسیڈس میں سے اتر کر اپنے آبائی کوٹھے پر قدم رنجہ فرما چکی تھیں..

●○●○●○●

پاکستان میں سفر کے ایسے بھی آزار ہوتے ہیں، وہ بھول چکا تھا..

مخدوش کردار کی حامل اُس بس کی سب سے پچھلی نشست پر جہاں اُس کے سوا آٹھ مزید مسافر ٹھنسے پڑے تھے اور وہ اُن کے درمیان سانس کھینچنے کی خاطر اپنے سراپے کو کہاں تک سکیڑ سکتا تھا، پھنسا پڑا تھا۔ بوریوالا جانے والی بس ہچکولے بھرتی، کبھی غیر متوازن ہو کر ایک جانب جھکتی جھکتی اوندھی ہونے کو آتی اور پھر سنبھل جاتی، اُڑی جاتی تھی، دھول کے بادل کھلی کھڑکیوں میں سے بے دریغ داخل ہوتے مسافروں کے چہروں پر ذرّہ ذرّہ اترتے جاتے تھے اور اُس کی بوڑھی ہڈیاں ہر دھچکے پر اپنے مقام سے کھسکتی محسوس ہوتی تھیں... اس سے پیشتر کہ تمہاری نماز پڑھی جائے تم اپنی آخری نماز پڑھ لو.. ڈرائیور سے باتیں کرنا منع ہے.. داتا کی ملنگنی کی خیر.. کھلی کھڑکیوں کے باوجود مسافروں کے غلیظ بدنوں میں سے پھوٹتے پسینے اور دیگر اخراجات کی بُو دھوم مچاتی تھی.. جیب کتروں سے ہوشیار رہیں..

محض ماسکو سے لاہور تک کی مسافت کی تھکن اتارنے کی خاطر اُسے آج کی شب قالب کے ہمراہ گزار لینی چاہیے تھی.. ویسے تو وہ خود بے آسرا تھا، اُس کے ساتھ کیسے آسرا ہو جاتا، صرف ایک مائی بوڑھی کی جستجو کی خاطر.. زندگی میں پہلی بار جب وہ کامریڈ لینن کی برکت سے اب ایک نئی کار، ایک کشادہ فلیٹ اور ایک تشکر خاندان کے ہمراہ زندگی گزارنے لگا تھا، ان آسائشوں اور شکر گزاریوں کو ترک کر کے اس انجر پنجر ڈھیلی بوریوالا جاتی بس کی پچھلی نشست پر چپکے ہوئے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو کھسکانا جائز ٹھہرتا تھا؟.. یا پھر ایک اور حماقت سرزد ہو گئی تھی..

تب وہ دھول جو کھلی کھڑکیوں میں سے غبار ہوتی چلی آتی تھی، اُس کے چہرے پر بچھی اور اُس کے ہر ذرّے نے سرگوشی کی، ظہیر الدین میں اُس مٹی کا ایک ذرّہ ہوں جو بوریوالا قبرستان میں دفن تمہارے دادا اور تمہارے باپ شمس الدین انقلابی کی قبروں سے اٹھ کر تمہارے استقبال کو چلی آئی ہے.. ذرا ایک گہرا سانس بھر کر ہم ذرّوں کو اپنے بدن میں اتارو تو تم اپنے باپ دادا کے بدنوں کی مہک محسوس کرنے لگو گے.. ہم میں، وہ سارے کھیت کھلیان، گُل بوٹے، سرکنڈے، جھاڑیاں اور شجر.. اور ظہیر الدین آک کے بُوٹے موجود ہیں جن کی رگوں میں تمہارا بچپن اور جوانی رواں ہے.. اور اگر تم لوٹ آئے ہو تو ہم مٹی کے وہی ذرّے جو تمہارے باپ دادا کی قبروں کو ڈھانپتے ہیں، تمہارے بقیہ برسوں کو بھی ڈھانپ کر آسودہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس لڑھکتی ڈولتی بس کے اندر پیک شدہ جتنے بھی مسافر تھے وہ سب کھڑکیوں میں سے داخل ہونے والی دھول کو اپنے چہروں سے پونچھتے تھے، صرف ایک مسافر تھا جس نے نہ اپنی ہتھیلی سے اور نہ ہی کسی رومال سے اسے پونچھا اور اُس کے دھول آلود چہرے پر ایک ایسی طمانیت اور ٹھہراؤ تھا جس میں سے ایک دیوانگی آمیز مسکراہٹ پھوٹتی تھی..

گھٹا ٹوپ تاریکی کے وقفے مختصر ہوتے جاتے..

بہت دنوں کے بعد بارش اتری تھی اور یوں بوچھاڑوں اور آبشاروں میں اتری تھی کہ ڈاچا کے آس پاس جتنے بھی گھنے شجر تھے، وہ شرابور ہو کر تُند ہواؤں کی شدت کے آگے کمر تک جھکتے دوہرے ہوتے جاتے تھے اور اُن کے ہر پتے میں سے جھرنے پھوٹتے تھے..وہ کچھ دیر سیاہی کی نابینائی میں سیاہ رہتے اور پھر بجلی کے پے در پے کوندے چاندی کے مضطرب سانپوں کی مانند ان جنگلوں پر لہراتے اور ان کی خیرہ کن روشنی اس بھیگتے منظر کو پل بھر کے لئے برہنہ کر دیتی..

بجلی کی یہ کڑک اور دل کو منتشر کر دینے والی یہ آواز وارث چوہدری کے وسیع لونگ رُوم کی تینوں فرش سے چھت تک اُٹھتی شیشہ دیواروں کے حصار کے اندر داخل نہ ہو سکتی تھی... یوں لونگ رُوم میں ایک دم بخود سناٹا تھا البتہ ہر چمک اور ہر کڑک کی روشنی کے چاندی رنگے سانپ بے آواز شُوکتے سرکتے اندر آتے اور وارث چوہدری کے خدوخال پر جلنے بجھنے لگتے..

وہ مکمل اندھیرے میں تنہا بیٹھا تھا..آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح کرنے آئی ہے میری ساقی گری شام ڈھلے..اور آج کی شب اُس کے برابر میں تپائی پر رائل سیلوٹ وسکی کی کوئی بوتل نہ تھی..

سرما کی ہولناکیوں کے موسم دم توڑ رہے تھے اور ٹھنڈک بھری بارشوں اور گھنے سیاہ بادلوں کی کوکھ میں سے بھڑک کر جنم لینے والے بجلی کے لہریئے سانپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا..

اس لمحۂ موجود میں ظہیرالدین کہاں ہوگا..

اُس نے عمر بھر مفاہمت نہ کی..ہر قدم پر تھم جاتی ایک جنک یارڈ میں جھونک دینے کے لائق کھٹارا کار، ایک تنگ کال کوٹھڑی فلیٹ، مسلسل زچ کرنے والی ایک فربہ ہمہ وقت نشے میں دُھت نیم اپاہج بیوی اور اپنے بے اعتنا بچوں کے ساتھ بنا شکایت کے گزارہ کرتا رہا..اور بالآخر جب اُسے آسائش نصیب ہوئی تو اُسے بوریوالا کی مائی بوڑھیاں یاد آنے لگیں..اور وہ سب کچھ تیاگ کر فرار ہو گیا..

وہ مجھ سے تو کہیں جرأت مند نکلا..

مجھ میں اگر اُس جیسی جرأت ہوتی تو میں بھی یہاں سے سب آسائشیں ترک کر کے فرار ہو جاتا..اپنے لائل پور کی پسماندگی کو لوٹ جاتا..کم از کم اُس غربت کے مارے ہوئے دہقان کا پتہ کرتا کہ وہ اب کس حال میں ہے، اگر زندہ ہے تو زندگی کیسی ہے جس کے ساتھ میں نے اپنے انقلابی جوش کے بے مُہار زمانوں میں چند روز بسر کیے تھے..مجھ میں یہ جرأت نہ ہو سکی اگر ہوتی تو بھی میرے پاؤں میں فائیوسٹار ہوٹلوں کی ملکیت، یوکرین میں لوہے کی کانوں، بین الاقوامی کاروباروں اور پیوٹن کی ہمسائیگی کی بیڑیاں پڑ چکی ہیں..میں ان زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہوں تو بھی نہیں کر سکتا کہ مجھے اس سرمایہ دارانہ نظام کے تکبر اور شرمناک ثروت کی عادت ہو چکی ہے..میں اپاہج ہو چکا ہوں..

شیشے کی دیواروں کے باہر آپس میں گتھی ہوئی درختوں کی چوٹیوں پر ایک چمک نے جنم لیا، بجلی کڑکی مگر اُسے سنائی نہ دی البتہ اُس کی لشک کے کوندے بے آواز اندر چلے آئے اور وارث چوہدری کی شباہت کو ایک فلیش کی روشنی کی مانند چکا چوند کیا اور اگلے لمحے یوں گُل ہوئے کہ لونگ روم میں نابینائی راج کرنے لگی اور اُس کی شباہت اُس میں دفن ہو گئی..

وہ مجھ سے کہیں زیادہ جرأت والا نکلا..

●○●○●○●

''پاکستان؟''یُوری سمرنوف کے بھالو چہرے میں جو مہین آنکھیں تھیں، جن پر گھنی پلکیں سفید جھالروں کی صورت چلمنوں کی مانند جھکی ہوئی تھیں، اُن آنکھوں میں ایک غضب آیا''وہ سؤر کا بچہ..مجھ سے اجازت لئے بغیر.. پوچھے بغیر چلا گیا ہے..''

بلال نے سبزیوں کے گاڑھے رُوسی دہقانوں کے پسندیدہ سُوپ سے بھرا وہ چمچہ جو اُس کے سکڑے ہوئے منہ تک آ چکا تھا، نیچے کر لیا..

''وہ مجھے بتا کر گیا ہے ڈیڈی..'' تانیا کے سُوپ کے پیالے پر جُھکے ہوئے سر میں کہیں کہیں سفید دھاریاں تھیں ''وہ..اپنے وطن کے لئے ترس رہا تھا..آ جائے گا..''

''آ جائے گا؟''سمرنوف بھڑ کنے لگا''اُس کی مالک تم نہیں، میں تھا جس کے لئے وہ پیشاب خانوں کی آمدنی وصول کرنے کے کام پر تعینات تھا..اُسے مجھ سے اجازت کی درخواست کرنی چاہیے تھی۔ پچھلے چند روز سے مجھے..صدر پیوٹن کے دست راست کو، کے جی بی کے اُس ایجنٹ کو جسے آئیون خوفناک کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور ریاست کے باغی اُس کے قہر سے اپنی پتلونیں بھگو لیتے تھے، مجھے پیشاب خانوں کی آمدنی جمع کرنے کی ذلت سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، کیا یہ میرے سماجی رُتبے کے لائق ایک کام ہے تانیا..وہ سؤر کا بچہ..''

''گرینڈ پا..'' بلال کی نظریں اُس ٹھنڈے ہوتے سُوپ کے پیالے میں جو دو مشروم تیر رہے تھے، ان پر جمی تھیں ''آپ..پلیز..ڈیڈی کو یہ نہ کہیے..''

یُوری سمرنوف کو اپنے گھنے بالوں میں ملفوف کانوں پر اعتبار نہ آیا کہ یہ ایک سولہ برس کا بچہ اُسے یوں ٹوک سکتا ہے..لیلیٰ تو بچپن سے ہی قدرے خودسر تھی لیکن بلال تو ایک ایسا پرشفقت نواسا تھا جو گھر سے باہر جانے سے پیشتر اُس سے لپٹ کر اُس کے ڈھلکے ہوئے گالوں پر متعدد بوسے دیتا..آئی لَو یُو گرینڈ پا..کہا کرتا تھا یا پھر وہ کہنا کچھ اور چاہتا تھا اور مجھے غلط فہمی ہوئی ہے''کیا نہ کہوں..'' وہ گرجا۔

اُس نے آج اجتناب کیا تھا..عام طور پر واڈکا کی ایک پُوری بوتل اپنے اندر انڈیلنے کے بعد اُس کے طیش میں آنے کے امکان بڑھ جاتے تھے لیکن آج تو سوائے سادہ پانی کے اُس کے پھیپھڑوں میں اور کچھ نہیں اترا تھا اور اس کے باوجود وہ غضب میں تھا..اتنے غصّے میں آ چکا تھا کہ وہ اس کے اظہار کے لئے ایک بھالو کی مانند دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنی ہتھیلیاں لٹکا کر دانت نکوس سکتا تھا''کیا نہ کہوں؟''اُس نے پھر بلال سے مخاطب ہو کر کہا جو بدستور ٹھنڈے ہوتے سُوپ میں تیرتے دو مشروموں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''آپ..میرے ڈیڈی کو..سؤر کا بچہ نہ کہیں..کہ وہ نہیں ہیں۔''

''کیا کیا..یہ تم نے کیا کہا..''سمرنوف کے طیش میں دُکھ کا ایک عنصر شامل تھا..اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے والے صابر وشاکر داماد کا یہ بچہ، مجھ سے الفت کرنے والا..کیا اس کا ذہن ماؤف ہو گیا ہے اور وہ اپنے سُوپ پر نظریں جھکائے بُت بنا بیٹھا ہے..''کیا تم سُن رہی ہو تانیا..''اور تانیا بھی سُوپ کے پیالے کو خالی خالی نظروں سے گھور رہی تھی..وہ اُس کی چُپ کو بھی سمجھ نہ سکا اور پھر بلال سے مخاطب ہو گیا''سنولڑکے..اگر تم ابھی تک نہیں جان سکے تو جان لو کہ تمہارا باپ ایک نکما اور نالائق شخص ہے۔اگر تمہاری ماں اُس پر ترس کھا کر اُس کے ساتھ شادی نہ کرتی اور وہ میرا داماد نہ ہوتا تو وہ آج ماسکو کے کسی فائیو سٹار ہوٹل کے باہر گاہکوں کے جوتے پالش کر رہا ہوتا اور اگر بہت خوش قسمت ہوتا تو میرے کسی اِگلو پیشاب خانے کے باہر ایک کرسی پر براجمان پتلونیں ڈھیلی کرتے سیاحوں سے دو دو روبل وصول کر رہا ہوتا..اگر وہ میری اجازت کے بغیر دفع ہو گیا ہے تو اُسے ایک سؤر کا بچہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟''

بلال نے اپنے آگے رکھے سوپ کے پیالے کو ایک دھچکے سے یوں دھکیل کر پرے کیا کہ کچھ سوپ چھلک کر اُس کے کناروں سے بہہ کر ڈائننگ ٹیبل کے سفید میز پوش پر گر گیا اور وہ اٹھ کر..بدستور سر جھکائے خاموشی سے ڈائننگ روم کے باہر چلا گیا..

''تم دیکھ رہی ہو تانیا..''بُوری سمرنوف نے ڈائننگ ٹیبل پر ہتھیلی مارتے ہوئے کہا''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ اس کا مشرقی خون ہے جس میں بداخلاقی اور احسان نافراموشی بھری ہوئی ہے..آج شب وہ مجھے ایک حرامی تُرک لگا..داغستان کا وہ باغی شامیل لگا کہ ان سب کے خون ایک جیسے ہیں، بغاوت پر آمادہ..تمہیں تانیا..اگر اس سؤر کے بچے سے شادی کرنی ہی تھی تو تم اپنے پچھلے خاوند کے دو بچوں پر اکتفا کر لیتیں..اُس سے مزید بچے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی..''

تانیا کا سر جھکا رہا..''بلال، میرا بیٹا ہے ڈیڈی..جیسا بھی ہے۔''

''اچھا تو ایک سہولت کی شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا دوغلہ بچہ تمہیں اتنا عزیز ہو گیا ہے..اور وہ میرے سامنے دُم ہلانے والا..تمہارا خاوند میری پوتی لیلیٰ کو بھی ورغلا کر لے گیا ہے..میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کروں گا..''

تانیا نے پہلی بار سر اٹھایا..اُس پر ادھیڑ عمری غالب آرہی تھی..''وہ لیلیٰ کو اپنے ساتھ لے جانے پر ہرگز رضامند نہیں تھا..لیکن ڈیڈی جیسے ایک زمانے میں میں آپ سے عشق کرتی تھی، آپ کو دنیا کا سب سے بہترین اور شاندار شخص سمجھتی تھی، ایسے ہی جذبات لیلیٰ کے اپنے باپ کے لئے ہیں..قالب نے اُسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ اُس کی لاعلمی میں اس کے پیچھے ایئرپورٹ پہنچ گئی تھی اور وہ بھی مجھے بتا کر گئی تھی۔''

''گندا مشرقی خون..''سمرنوف دھاڑا..''اور تم بھی فراموش کر رہی ہو کہ اُس نادان اور نالائق پاکستانی لڑکے کو ہم دونوں نے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق پھانس لیا تھا..ورنہ تم سے اور کون شادی کرتا..''

''ہاں ڈیڈی..''تانیا نے بے شکایت اور بے روح آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھا..''بے شک یہ ایک سازش تھی لیکن قالب ایسا بھولا تھا کہ اُسے کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ ہم دونوں کی مکاری کے دام میں آگیا ہے..اور وہ کیسا ایماندار

اور وفادار شخص ثابت ہوا.. آپ شاید یقین نہ کریں، لیکن اُس نے جس طور میرا اور بچوں کا خیال رکھا اور آپ کے کاروبار کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا، میں ہولے ہولے جذباتی طور پر اُس کے قریب ہونے لگی اور.. میں اپنے خاوند سے محبت کرتی ہوں ڈیڈی.. اور مجھ پر پچھلے تین دن جو اُس کی جدائی میں گزرے ہیں کس قیامت کے گزرے ہیں، میں بتا نہیں سکتی۔''

سرنوف بھونچکا رہ گیا.. اُس نے کوشش کی کہ اپنے آپ پر ضبط کر سکے.. وہ دونوں لیلےٰ اور بلال تو اُس بے وفا مشرقی خون کی پیداوار تھے لیکن تانیا..'' لیکن.. بہرطور وہ ایک سؤر کا بچہ ہے کیا تم بھی مجھے یہ کہنے سے روکو گی..''

تانیا نہایت میکانکی انداز میں جیسے ایک پُتلی اپنے کرتب دکھا کر سٹیج سے رخصت ہوتی ہے، اٹھی اور چلی گئی..

جتنی بھی ڈھیر اوپر ڈھیر دوپہر کی دھوپ میں بوریوالا کے نواح میں واقع قبرستان میں ان گنت قبریں کیکر کے کانٹے دار درختوں اور جنگلی بیریوں کی جھاڑیوں کے چھدرے سائے میں جتنی بھی قبریں تھیں، اُن میں سے ایک قبر کے سرہانے ایک کتبے پر بجھتی ہوئی ایک عبارت تھی:

''شمس الدین انقلابی..

تاریخ پیدائش.. یکم مئی 1930ء۔ تاریخ وفات 19 مارچ 1990ء

جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے''

وہ کھوج لگاتا اپنے باپ کی قبر تک آ گیا تھا..

برابر میں ایک بے نام کچی ڈھیری تھی جس کے پہلو میں کھجور کی سوکھی ہوئی شاخوں کا ایک جھاڑو پڑا تھا۔ ظہیر الدین نے وہ جھاڑو اٹھایا اور اپنے باپ کی قبر پر برسوں کا جو جھاڑ جھنکار اٹا پڑا تھا، اُسے سمیٹنے لگا.. اور جب اُس کی خستہ ہو چکی بارشوں سے دھنس چکی قبر کے آثار نمایاں ہوئے تو وہ ایک مجرم کی مانند اُس کے سامنے سرنگوں ہو کر مٹی پر بیٹھ گیا... میں آپ کی مانند اپنے نظریات پر مستحکم نہیں رہ سکا.. میں نے ایک مدت مدافعت کی.. میں نے تب بھی اپنے آپ کو ایک مفاہمت کرتے ہجوم میں تنہا رکھا جب آپ کے نظریاتی خوابوں کی ریاست اپنے پاؤں پر ڈھیتی چلی گئی.. پھر مجھ میں سکت نہ رہی.. آپ کو دُکھ تو ہو گا کہ میرا بیٹا کامریڈ لینن کے مجسموں کا بیوپاری ہو کر اُن سے.. صلیبیں ڈھال کر مذہب کی افیون کی قربان گاہوں پر اُن کے چڑھاوے چڑھا رہا ہے.. آپ کی رُوح کو کتنی اذیت ہو رہی ہو گی.. اگر آپ کی.. یا کسی کی بھی روح ہوتی ہے تو..

●○●○●○●

روئی کے سفید ریشوں ایسی دُھند ٹیکسی کے شیشوں کو نابینا کرتی تھی اور اُن کے پار جو منظر تھے اُنہیں دھندلاتی تھی..اور پھر آس پاس آبادی کی گھناوٹ کا آغاز ہوا تو گھروں، عمارتوں اور شاہراہوں کی آلودہ حدت اُس دھند کو زائل کرنے لگی اور کچھ شگاف اُس کی سفیدی میں پڑنے لگے..کچھ کچھ عیاں ہونے لگا اور پھر اُن میں سے ایک شگاف ایک ہولے ہولے رواں نیلاہٹ سے بھر گیا جس میں ڈینیوب بہتا تھا..

ایئرپورٹ سے شہر جانے والے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ڈھیر..لاہور سے بوداپیسٹ کے ہوائی سفر کی تھکاوٹ میں تھکی ہوئی جینا اسلام کی آنکھوں میں ڈینیوب کی وہ جھلک کروٹیں بدلنے لگی..

انسان چاہے جتنا بھی دیسوں کی خاک چھان لے..جتنے بھی دریاؤں کے پار ہو..جتنے بھی جنگلوں میں گُم ہوتا پھرے اور جتنے بھی صحراؤں میں آبلہ پا ہو جائے لیکن اُس کے رگ و پے میں ہمیشہ ایک ہی دیس کی پکار ہوتی ہے..ایک ہی دریا اُسے بلاتا ہے، ایک ہی صحرا اُس کے نقش پا کی آرزو کرتا ہے اور ایک ہی جنگل اُس کی یاد میں سائیں سائیں کرتا ہے اور وہ دیس، دریا، صحرا اور جنگل بے شک وہ کائنات پار کر جائے، اُس کے پیچھے چلا آتا ہے.. اور جب ایک مدت کی جہاں گردی کے بعد اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ دیس، دریا، صحرا اور جنگل ظاہر ہوتا ہے تو اُس کے اندر ایک پچھتاوا جنم لیتا ہے کہ میں نے کیسا گھاٹے کا سودا کیا، کاہے کو عمر بھر بھٹکتا پھرا..ڈینیوب جب دُھند کے اُس شگاف میں سے داخل ہو کر اُس کی آنکھوں میں بہنے لگا تو جینا اسلام کے اندر بھی اُسی پچھتاوے نے جنم لیا.. میں کاہے کو عمر بھر بھٹکتی پھری..

”بے شک وہ زمانے تھے جب..
تمہارے خیمے کے گرد گھاس بلند ہونے لگتی تھی تو..
تم کوچ کر جاتے تھے..
ترک کر دیتے تھے اُس مقام کو..
جس کے منظر نظر پر بار ہونے لگتے تھے..
لیکن اب تو یہ ہے..کہ
خیمے کے گرد اُگنے والی گھاس کو بلند ہو جانے دو..
اپنا خیمہ نہ سمیٹو..

اگر سمیٹو تو اُس منزل کی جانب اپنی گھوڑا گاڑی کو حرکت دو..
جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا"

اور ڈینیوب بہتا جا رہا تھا..

●○●○●○●

جیکٹ کے اندرونی جیب میں..نہ تو یہ اُس کا واہمہ تھا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو ایک نفسیاتی فریب دے کر اس کیفیت میں مبتلا کرتا تھا بلکہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ راکھ کی وہ پوٹلی واقعی مدھم مدھم سلگتی محسوس ہوتی تھی..

عارف نقوی کو جیسے ایک پیام آ گیا ہو اُس نے اپنے سینے پر جس کے نیچے اندرونی جیب تھی، ہاتھ رکھا تو ایک مدھم سلگاہٹ اُس کی ہتھیلی کو آنچ دینے لگی..اُس کے باریک تراش کے ہونٹ اس بلاوے کی مسرت سے مسکرانے لگے اور اُس نے سر جھکا کر ایک سرگوشی میں کہا:

''ہیلو بلبڑ ڈ..آئی ایم بیک ہوم..اور تم میرے ساتھ ہو..ہیلو''

مصطفےٰ اسلام جو پرانی انارکلی کے فٹ پاتھی کتب بازار سے چند پھٹی پرانی کتابیں خرید لایا تھا اور محض وقت گزاری کی خاطر اُن کے ورق گردانی کر رہا تھا، چونکا ''کامریڈ..آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''

اور آج شب موم بتیوں کی کچھ کمی نہ تھی، اُن کے دو بنڈل خریدے جا چکے تھے اور اُن میں سے تین رنگین شیشوں والی کھڑکی کی سِل پر دھری موم کے پگھلتے آنسو بہا رہی تھیں..

''یونہی..'' عارف نقوی نے سر اٹھا کر مصطفےٰ اسلام کے پُرتجس چہرے کی جانب دیکھا اور وہاں اُس کے لئے اُسی یگانگت کے پرتو تھے جو ہم پیشہ رنڈیوں، فریبی سیاستدانوں، مذہبی اجتماعات میں عوام الناس کو رُلانے والے پُرغضب ملاؤں اور ذاکروں اور ایک ہی نصب العین کے فکری اور عقلی استدلال پر ایمان رکھنے والوں کے چہروں پر ہوتی ہے..ایسی یگانگت اور قربت کا انحصار رفاقت کی طوالت پر نہیں ہوتا بلکہ ایسے لوگ اپنے مشترکہ مفادات یا نظریات کے تابع پہلی ملاقات پر ہی ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں کہ اُن کی حیات ایک ہی نظریاتی منزل کے حصول کے لئے وقف ہوتی ہے..ابھی تین روز پیش وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود سے ناآشنا کراچی ایئرپورٹ پر پہلو بہ پہلو بیگانے کھڑے تھے.. اور اب اُن کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہا تھا..

''یونہی..'' عارف نقوی نے سر اٹھا کر مصطفےٰ اسلام کے پُرتجس چہرے کی جانب دیکھا جو اُن تین موم بتیوں کی جھلملاہٹ کے سایوں اور روشنیوں میں جلتا بجھتا تھا ''محض خود کلامی''

موم بتیوں کے علاوہ آج دیگر رہائشی سہولتیں بھی پُرآسائش ہو چکی تھیں..ننگے فرش پر فوم کے دو گدّوں پر دھوبی کی دُھلی ہوئی سفید چادریں بچھی تھیں، نرم تکیے تھے اور پائنتی میں کمبل طے شدہ حالت میں پڑے تھے کہ بے شک سرما کے موسم رخصت ہو رہے تھے لیکن راتوں کے پچھلے پہر ہنوز سرد ہو جاتے تھے..

یہ رہائشی سہولتیں اُس کی پھوپھیوں کی مہیا کردہ تھیں..

وہ..اُس کی ہر دو پھوپھی جانیں جواب کوچہ کمانگراں کی ایک بغلی گلی میں مقیم تھیں، اُسے اپنے سامنے پا کر پہلے تو پہچان نہ پائیں اور پھر بیک وقت اُس کے ساتھ لپٹ کر اپنے بھائی کی یاد میں بھوں بھوں کرتی رونے لگیں..اُس نے بمشکل اُنہیں اپنے آپ سے الگ کیا اور حیرت انگیز طور پر وہ فوراً ہی نارمل ہو کر اُس سے باتیں کرنے لگیں..وہ بھی اُسے جینا کے بارے میں کچھ نہ بتا سکیں کہ وہ کہاں ہے..اسی خیال میں تھیں کہ گوری گوری اُن کے آبائی گھر میں ابھی تک مقیم ہے..

اُس کے دونوں بڑے بھائی اب تک سفید ریش ہو چکے، حاجی اکبر اسلام اور حاجی اصغر اسلام ڈیفنس میں اپنے اپنے تعمیر کردہ گھروں میں اور دونوں کی پیشانی پر ماشاءاللہ کے نیون سائن جگمگاتے تھے یکدم اپنے بھولے بسرے چھوٹے بھائی کو سامنے پا کر شدید جذباتی ہو گئے.. ماں باپ کی موت کے غم میں مشترکہ طور پر کچھ آنسو بہائے جو اُن کی شرعی داڑھیوں کو مکمل طور پر بھگو نہ سکے اور پھر ان دونوں کی آنکھوں میں ایک تشویش نے جنم لیا..وہ کب کے اپنے باپ کی جوتوں کی ہول سیل دکان ترک کر کے، اُس عمارت کو مہنگے داموں فروخت کر کے ایم ایم عالم روڈ پر ایک ''شاندار شو پلینٹ'' کھول چکے تھے جہاں اُن کی شہرۂ آفاق اسلامی چپلوں کے علاوہ دنیا بھر کے مہنگے جوتوں کے برانڈ فروخت ہوتے تھے..تو تشویش کا کالا موتیا اُن کی آنکھوں میں اس خدشے کے جنم لینے سے اترا کہ شاید یہ گمشدہ بھائی اگر اچانک نمودار ہو گیا ہے تو اپنے باپ کی وراثت میں سے اپنا جائز حصہ طلب کرنے کے لئے آیا ہے، ورنہ یوں یکدم نمودار ی کا تو کوئی جواز نہ تھا..

اُنہوں نے اُس کی بہت آؤ بھگت کی اور بار بار سرسری انداز میں پوچھا کہ کتنے روز کے لئے آئے ہو..کب تک قیام کا ارادہ ہے، انہیں شدید صدمہ پہنچ سکتا تھا، اگر وہ یہ اعلان کر دیتا کہ میں تو اب آ گیا ہوں، جانے کے لئے نہیں آیا اور وہ سب سمجھ رہا تھا، اُس پر ان کی منافقت عیاں اور دکھ دینے والی تھی لیکن اُن کا دل رکھنے کی خاطر اُس نے انہیں تسلی دی کہ محض چند روز ٹھہروں گا اور پھر لوٹ جاؤں گا۔

''محض خود کلامی؟'' مصطفےٰ اسلام مسکرانے لگا..

عارف نقوی اُسے آج کے دن میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا، وہ کولونیل طرز کی سادہ رہائش گاہ جہاں اُس کے دوست آغا ارجن کا بیٹا ہمایوں رہتا تھا، اور بگن ولیا کی سوکھ چکی بیل کے جھاڑ جھنکار میں پوشیدہ وہ کوارٹر جو اُس کی عمر رسیدہ رومانویت کو بھا گیا تھا..

''محض خود کلامی؟'' مصطفےٰ اسلام نے پھر دوہرایا۔

''اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو..'' عارف نقوی کی آنکھوں میں ایک بھولی سی شرارت تھی کہ دیکھتے ہیں تم بظاہر ایک بے سروپا توجیہہ پر یقین کرتے ہو کہ نہیں'' میں ہلٹر ڈ سے باتیں کر رہا تھا..''

''اُنہیں میرا اسلام بھی کہیے گا..'' مصطفےٰ اسلام نے نہایت متانت سے کہا۔

عارف نقوی نے ایک اداکار کی مانند جو کہ وہ تھا، نہایت سنجیدگی سے سر جھکایا..اُس کی ٹھوڑی جیکٹ کو چھونے لگی اور پھر کچھ دیر بعد اُس نے اپنا چہرہ اوپر کیا اور کہنے لگا'' کامریڈ..وہ کہتی ہیں وعلیکم السلام..''

وہ دونوں ہی ایک کھیل کھیل رہے تھے..نہیں جانتے تھے کہ اپنا ردِ عمل کیسے ظاہر کریں، مسکرانے لگے..عارف نقوی اس لئے کہ یہ شخص نہیں جانتا کہ ہاں بلٹز ڈ یہاں موجود ہے اور مصطفےٰ اسلام اس لئے کہ اس کی حسِ مزاح کا جواب نہیں..پھر وہ اس صورت حال کی لایعنیت کو برداشت نہ کر سکے اور اُن کی مسکراہٹیں بلند آہنگ قہقہوں میں بدل گئیں..تینوں موم بتیوں کے ساکت شعلے ذرا پھڑ پھڑائے اور جونہی وہ دونوں اپنی حیات کی شکستگی کے ہاتھوں اسیر ہو کر یکدم چپ ہو گئے تو پھڑ پھڑاتے شعلے پھر سے اپنے مقام پر قائم ہو کر ساکت ہو گئے..

''سب کچھ رائیگاں سا گیا..بلٹز ڈ کا دل آویز حسن بھی اور میرا انقلابی کرشن بھی..راون جیت گیا اور رام کو مات ہو گئی..نظریئے کی سیتا پامال ہو گئی..مصطفےٰ، مجھے کبھی کبھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مزدوروں اور دہقانوں کی جنت کے یہ خواب دراصل ایک دیو مالائی داستان تھے جسے ہم حقیقت سمجھ بیٹھے اور اُس خواب کو پانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر بیٹھے..ہم بے جگری سے یولیسس کی مانند اپنے آدرشوں کی سنہری کھال کی جستجو میں یک چشم عفریتوں اور سائرن ڈائنوں کے سیاہ سمندروں میں اتر گئے..اور یہ سائرن جادوگرنیاں سرمایہ داری نظام کی ڈائنیں ہمیں فریب دینے کی خاطر ہمیں اپنے پاس بلانے کے لئے کیسے سحر انگیز گاتی تھیں لیکن ہم نے اپنے کانوں میں نظریئے سے مکمل وابستگی کی موم بھر لی تاکہ ہم اُن کے گیت سُن ہی نہ سکیں..اپنے خوابوں کی کشتی آرگو کو ترک کر کے اُن کے گیتوں سے مسحور ہو کر سمندر میں چھلانگیں نہ لگا دیں..اور ہم اُس دیو مالائی واہمے کو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت قبول کر کے..زندگی بھر چپّو چلاتے رہے اور جب ہم منزل پر پہنچے تو وہاں نہ کوئی سنہری کھال تھی اور نہ ہی افق پر کوئی سرخ سورج طلوع ہو رہا تھا..سب رائیگاں ہوا..''

''عارف..'' مصطفےٰ اسلام اُن تینوں موم بتیوں پر قائم آگ کی بوند شعلوں کو تکتا جا رہا تھا..''آپ مجھ سے کہیں بڑھ کر پڑھے لکھے اور نظریاتی طور پر مستحکم شخص ہیں لیکن..سب تو رائیگاں نہیں گیا..نہ میں اپنے آپ کو اور نہ ہی آپ کو اس عالمِ شکستگی کے الم میں ڈھارس دینے کے لئے یہ کہتا ہوں بلکہ..تہہ دل سے یقین رکھتا ہوں کہ بے شک ہم ایک شدید دھچکے سے دوچار ہوئے اور اُس میں کچھ رائیگانی کا رنج بھی تھا پر ایک گہری طمانیت بھی تو دُکھتے بدن پر پھاہے رکھتی اُسے کسی قدر آسودہ کرتی ہے..کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نامردی میں بیٹھے نہیں رہے، ہم نے جدوجہد کی، اپنی حیات کو داؤ پر لگایا..اس بے ایمان اور کٹھور دل ظالم معاشرے کو قبول نہ کیا..اس کے خلاف آواز تو اٹھائی، ہم نے اس بدچلن معاشرے میں اپنے آپ کو خوش چلن رکھا..بداخلاق زمانوں میں بھی بااخلاق ہو کر جو کچھ ناقص تھا، اُس کی نشاندہی کرتے رہے..اب یہ ہمارے نصیب تھے کہ اشتراکیت کے نصیب میں بہت سے بدچلن، بداخلاق اور ناقص لوگ آ گئے جنہوں نے نظریئے کی آڑ میں خلقِ خدا کو محکوم کر کے اُن کے آخری نوالے چھین کر، اُن کے ذہنوں اور زبانوں پر قفل لگا کر اُنہیں عقوبت خانوں اور سرد اندھیروں میں دھکیل دیا یہاں تک کہ اُنہیں جابر زاروں کے زمانے بھی سُہانے لگنے لگے..اُنہوں نے اس صدی کے سب سے بڑے انقلابی خواب کی شکل مسخ کر کے اُسے ڈراؤنا بنا دیا..اور سرمایہ دارانہ نظام کی چڑیلوں کو جواز مہیا کر دیا کہ وہ آئیں اور اپنے پنجے اس خواب میں گاڑ کر اس کا سرخ لہو پی جائیں..تو عارف ہمارا تو کچھ دوش نہ ہوا، ہم کیوں دُکھی ہوں کہ ہم نے تو حق ادا کر دیا..ہم جیسے لوگ کسی پر احسان تو نہیں کرتے، جب ہم اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر ایک ایسے تاریک

دریا میں کود پڑتے ہیں جس کا دوسرا کنارا دھند میں روپوش ہوتا ہے، ضروری تو نہیں ہوتا کہ ہم پار بھی لگ جائیں..کم از کم ہم ان لوگوں میں سے تو نہیں جو کنارے پر کھڑے ایک بیکار ایک بے خواب زندگی بسر کرتے رہے..تو یہ حیات ایسی بھی رائیگاں نہ تھی..''

''اور اب..اس کے آگے..اب ہمیں کہاں جانا ہے..''

''وہ لوگ جو بے مصرف اور بے خواب کنارے پر کھڑے رہے، وہ کہاں جا رہے ہیں..ابدیت کی تلاش بنیادی طور پر دیوانگی ہے جب کہ جو کچھ بھی اس جہانِ موجود میں ہے عارضی اور تحلیل ہو جانے والا ہے..لیکن اس عارضی پن میں، ہمیشہ کے لئے فنا میں تحلیل ہو جانے سے پیشتر ہمارے پاس یہ انمول طمانیت ہے کہ..جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے..''

رنگین شیشوں والی کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی سِل پر نصب تین موم بتیوں میں سے ایک جو درمیان میں تھی اُس کے بدن میں جو موم تھی وہ شائد اپنی دونوں ہم جولیوں کی نسبت حدّت سہنے کی تاب کم رکھتی تھی، اُس کا شعلہ پیندے میں جمع شدہ سرد ہو چکی ناکارہ موم میں اُتر کر بھڑکا اور بجھ گیا..

عارف نقوی نے سر جھکا کر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب کے باہر اپنی ہتھیلی نہایت پیار سے رکھی اور سرگوشی کی ''بلنڑ ڈ..کیا تم ابھی تک وہاں ہو؟''

●○●○●○●

اور ڈینیوب بہتا جا رہا تھا..

دبے پاؤں، اپنا بوجھل رُک سیک اور گٹار گھسیٹتی اپنے گھر میں.. جینا اسلام داخل ہوئی..

اُسے نہ دستک دینے کی حاجت ہوئی اور نہ ہی گھنٹی بجانے کی..ان طویل برسوں میں در بدر ملک ملک مسافتوں کے درمیان جب کبھی وہ اپنے بلاؤز میں محبوس اُس چابی کی تانبہ ٹھنڈک محسوس کرتی تو وہ اپنے گھر کے قریب ہو جاتی...یہ چابی واپسی کی اسی شب کی منتظر تھی اور تالے کے سوراخ میں داخل ہوتے ہی آسانی سے گھوم گئی۔

مامارَوجا اور ڈیڈی اسلام کے بیڈروم کا دروازہ بند تھا اور اُس کی درزوں میں تاریکی تھی لیکن اُن میں سے اُس کی ماما کے خراٹوں کی خوش آواز خرخراہٹ خارج نہیں ہو رہی تھی..اگرچہ وہ فوری طور پر دروازے کو کھٹاک سے کھول کر اُس کے غنودگی میں مدہوش فربہ سراپے سے لپٹ جانا چاہتی تھی لیکن اس سے پیشتر وہ اپنے باپ کو اپنی یکلخت آمد کی سرپرائز دینا چاہتی تھی جو اس لمحے ڈینیوب پر کھلتی بالکونی پر ہر شب کی مانند آج شب بھی بیٹھا ہو گا اور لاہور سے بوداپیسٹ کے ہوائی سفر کے دوران اُس نے یہ منصوبہ طے کر لیا تھا کہ وہ دبے قدموں سے اُس کی جانب بڑھے گی جب کہ وہ بالکونی سے نیچے بہتے دریا کی روانی میں گم ہو گا اور پھر اپنی گٹار کی تاروں کو یکدم جھنجھوڑ دے گی..اور وہ..لیکن بالکونی ویران پڑی تھی، وہ آج شب وہاں نہ تھا..بالکونی تلے بہتے ڈینیوب کے پانی تاریکی کی چادر اوڑھے اُس کے تلے بہتے چلے جاتے تھے..

ڈیڈی شاید آج..سٹور میں گاہک بہت آئے ہوں گے، اُنہیں بھگتاتے زیادہ تھک گئے ہوں گے..شاید ان کی طبیعت ناساز ہو..جلدی سو گئے ہیں..

وہ پلٹ کر اُن کے بیڈروم کی جانب بڑھنے کو تھی جب اس کے برابر میں اُس کے ذاتی کمرے نے جو خانہ بدوشی کے آغاز سے پیشتر اُس کی ملکیت ہوا کرتا تھا، اُس کے قدم پکڑ لیے..

اُس کا ذاتی کمرہ اب بھی اتنے برسوں بعد جوں کا توں تھا..جیسے اُس روز تھا جب اُس نے جان بوجھ کر در بدری کا خانہ بدوشی کا آغاز کیا تھا..اُسی حالت میں حنوط تھا..یہاں تک کہ اُس کے بستر پر بچھی چادر پر بڑے بڑے گلابی پھولوں کے پرنٹ تھے وہ بھی تر و تازہ لگتے تھے، کوئی بھی پھول کملایا نہ تھا..بستر کے برابر میں جو ٹیبل لیمپ تھا، اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا شیڈ اگر وہ اُسے چھوئے تو اُس میں ابھی تک کچھ حدّت ہو گی جیسے وہ چند لمحے پیشتر ایک روشن بلب کو گھیرے ہوا تھا..وہ ابھی ابھی اُسے بجھا کر گئی تھی۔ جینا نے اپنے رک سیک کی گرہیں کھول کر اُسے فرش پر بچھے اُس قالین پر الٹا دیا جو ایک بوڑھی روما جپسی کے ہاتھوں سے بُنا گیا تھا..

قالین پر اُس کی برسوں کی در بدری کے آثار اور آوارہ حیات کی نشانیاں بکھری پڑی تھیں..

یہ آثار اور یہ نشانیاں.. اُس کی مسافتوں کی گواہیاں تھیں.. ایک چرمی قدیم تعویذ جس کے اندر پوشیدہ کسی متروک شدہ زبان کی کوئی تحریر تھی جو اُسے رومانیہ کی ایک حواس باختہ چیسی بڑھیا نے گلے میں ڈالنے کے لئے دیا تھا کہ جاؤ جہان کے آخری سرے پر چلی جاؤ راستوں میں تم پر کوئی آفت اثر انداز نہ ہوگی..

قونیہ کے بازار سے خریدا ہوا گھومتے درویشوں کا سفید گھیرے والا لبادہ اور ایک بانسری.. اپنی موسیقی کی تمام لیاقت کے باوجود وہ اُس میں پھونکیں مار کر کوئی وجد آور دُھن نہ برآمد کر سکی..

ایک منقش نیلی اینٹ جس پر ''اللہ'' مصور تھا.. اصفہان کی ایک گمشدہ اور گلیوں میں روپوش مسجد کی ڈھے چکی دیوار میں سے چوری کی ہوئی..

چاندی کی تاروں سے کاڑھی ہوئی افغانی کوچی خانہ بدوشوں کی کسی فربہ عورت کی.. ایک سیاہ چولی.. کابل کے مرغ بازار سے خریدی ہوئی.. اور وہ باریش دکاندار جب اُس نے یہ چولی چڑھا کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو وہ اُس کی چھاتیوں کے تناسب پر اپنی آنکھیں سینکتا رالیں بہاتا تھا..

پتھر کا بظاہر ایک گول لمبوترا ٹکڑا.. ایک شِو لنگ.. جو اُس کے بھارتی بوائے فرینڈ نے اسے تحفے میں دیا تھا کہ یہ تمہیں میری یاد دلائے گا..

اور پھر پاکستان کے بہت سارے آثار اور نقش..

دیپالپور کے صوفی ماسٹر کی وہ سیاہ چادر جو انہوں نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اُسے اوڑھائی تھی..

اُستاد جی کے ہونٹوں سے چھوا گیا سگریٹ کا ایک ٹکڑا جس میں چرس کی آمیزش کی بُو باقی تھی.. اور وہ ایک کینوس جس پر وہ ایک سٹول پر برہنہ بدن براجمان ہے، اُس کے سول میٹ.. روح کے ساتھی داؤد کمال کا مصور کردہ.. اُس کی چھاتیاں اتنی بڑی تو نہ تھیں.. وہ ان آثار، ان گواہیوں اور نشانیوں میں کھوئی ہوئی کبھی رنجیدہ ہوتی اور کبھی مسکراتی اپنے آپ میں گم.. یہ فراموش کر چکی تھی کہ وہ کہاں ہے، وہ اپنے ذاتی کمرے میں اُن آثار کے ڈھیر کے آگے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی جب اُس کمرے کی خاموشی میں ایک انسانی موجودگی کی سرسراہٹ ہوئی، جینا نے پلٹ کر دیکھا تو ماما رَوجا تھی..

''تم آ گئیں جینا..''

ماما ان دو تین برسوں میں اتنی بوڑھی ہو جائے گی، وہ یقین نہ کر سکی.. اُس کی سیاہ خانہ بدوش آنکھیں بڑھاپے اور موٹاپے نے سکیڑ دی تھیں.. اُس کے نقش بھی بگاڑ سے روشناس ہو رہے تھے.. جینا دیکھ سکتی تھی کہ ماما اپنے بال رنگنے کے معاملے میں لاپرواہ ہو گئی ہے، اُس کے سفید بالوں کی جڑیں نظر آ رہی تھیں، گھٹاٹوپ گھنیرے بال اتنے چھدرے ہو چکے تھے کہ ٹیبل لیمپ کی روشنی اُن کے درمیان میں سے آسانی سے گزرتی ابتدائی گنجے پن کو نمایاں کرتی تھی۔ اگر وہ ماما کو چھوڑ کر نہ جاتی تو شاید وہ آج بھی ویسی ہی جوان دکھائی دیتی..

وہ آگے بڑھ کر ماما کی بڑھی ہوئی بانہوں میں سمائی تو وہ بلک بلک کر رونے لگی.. سسکیاں بھرتی بار بار پوچھتی ''جینا تم آ گئی ہو ناں..'' اور وہ اُس کی پشت کو تھپکتی اُسے تسلی دیتی کہ ہاں ماما.. ہاں ماما.. میں آ گئی ہوں اور اب میں نے کہیں نہیں جانا.. میری خانہ بدوشی کے دن تمام ہوئے.. ڈیڈی سو رہے ہیں؟

رَوجا نے اپنے گیلے رخسار پونچھے..اُسے ایک مرتبہ پھر چوما اور شب خوابی کا لباس سمیٹتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی
''وہ تو چلے گئے جینا..''

جینا کے دل کی دھڑکن دھک سے تھم گئی، چہرے پر زردی اترنے لگی اور ہونٹ کانپنے لگے..

''کہاں؟''

ابھی تک ناک سُنکتی اپنے آپ کو سنبھالتی رَوجا کے گمان میں بھی نہ آیا کہ اُس کی بیٹی کیا سمجھ بیٹھی ہے..''وہ.. واپس چلے گئے ہیں اپنے گھر..''

''آپ کا مطلب ہے لاہور؟''

''ہاں..وہ..مصطفےٰ کہتا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو سرپرائز دوں گا، میں کوچہ کمانگراں کے اُس کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوں گا جس میں میں پیدا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے وہ اُس لمحے بھی اپنا لکھا ہوا کوئی خانہ بدوش گیت گٹار کے سُروں کے ساتھ گا رہی ہوگی اور میں اُس کی آواز میں آواز ملا دوں گا، گانے لگوں گا اور وہ چونک کر پیچھے دیکھے گی اور..''

ہم دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کو سرپرائز دینے کی آرزو میں رہے اور نصیب نے ہمیں سرپرائز دے دی..

رَوجا اپنی آنکھیں جینا کے سراپے سے جدا نہ کرتی تھی کہ کہیں آنکھ جھپکنے سے وہ موجود سے ناموجود میں نہ چلی جائے..وہ کہیں ایک سراب نہ ہو اور بالآخر جب وہ آنکھیں جھپکتی اور پھر بھی جینا وہاں موجود ہوتی تو وہ اُس شب کی مانند، جب اُس نے دنیا کے وجود میں آنے کے بعد پیدا ہونے والے پہلے بچے کو جنم دیا تھا اور اُس کی گود میں ایک گھنے سیاہ چپکے ہوئے بالوں والی اور اُس کی گھنیری پلکیں بھی رطوبت سے جڑی ہوئی تھیں، ایک بچی ڈال دی گئی تھی اور تب اُسے دیکھ کر جیسے مسکرائی تھی آج بھی وہ اُسی بچی کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے چلی جا رہی تھی..

''آپ نے انہیں کیوں جانے دیا؟''

''کسی نہ کسی کو تو سفر میں رہنا چاہیے جینا.تمہاری واپسی ہی شاید اُس کی رُخصتی کا سبب بنی ہو..مجھ پر تو یہ بہت بعد میں کھلا کہ بے شک نسلاً میں ایک روما جپسی ہوں، تعلیم یافتہ ہو کر ایک ہی مقام پر حیات کرتی کسی حد تک..مہذب ہو چکی ہوں..میرا آبائی گھر دراپن اور جذباتی شدت پن دھیما پڑ چکا ہے لیکن مصطفےٰ..اصل جپسی تو وہ ہے..اُس کے سراپے میں ایک جپسی روح تیرتی تھی جو اُسے چین نہ لینے دیتی تھی..ہم بے شک محبت میں بندھے ایک دوسرے کے قریب آئے لیکن اس سے ماورا ایک اور شدت تھی جو بنیاد بنی اس محبت کی..ہم دونوں میں آوارگی کی روح مشترک تھی..کمیونزم کے زوال کے بعد بیشتر ہم وطنوں کی مانند ہم پر معاشی زوال کے زمانے آئے پر ہمیں اُن سے پیچھا چھڑانے میں زیادہ دیر نہ لگی..''جپسی گفٹس..'' نے ہمیں آسودہ حال کر دیا اور اس دوران مسلسل میں ایک احساس جرم کا شکار رہی کہ میں نے اُسے باندھ کر رکھا ہے..وہ میری معاشی جدوجہد کی گاڑی کے آگے جوتا ہوا ایک گھوڑا ہے جو صرف میری الفت اور ہمسائیگی کی خاطر شکایت کیے بغیر سر جھکائے چلتا جاتا ہے..وہ بندھ جانے اور جوتے جانے کے لئے پیدا نہیں ہوا تھا..اور میری خودغرضی نے اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا..میں اپنے اور تمہارے آباء کی مانند مستقبل کا حال جان لینے والی تو نہیں ہوں لیکن میرے اندر بھی کہیں نہ کہیں ایک حِس موجود ہے جو آئندہ کی کسی تصویر کا ایک مبہم اشاریہ محسوس کر لیتی ہے تو..جیسے وہ اکثر اس فلیٹ کی

بالکونی میں شب بھر بیٹھا رہتا تھا، ڈینیوب کے پانیوں پر اپنی آنکھیں رکھے تکتا جاتا تھا تب اُس حِس نے مجھے خبر کی کہ اُس کے اندر ایک خودکشی، ڈوب جانے کی آرزو جنم لے رہی ہے۔ اس لئے بھی کہ وہ بندھا ہوا ہے.. جوتا ہوا ہے.. تو میں نے اُسے جانے دیا.. ہم کسی بھی حیات کے ایک باقاعدہ.. دن بہ دن.. سال بہ سال تسلسل کی ضمانت نہیں دے سکتے، کہیں نہ کہیں کوئی حادثاتی رخنہ اندازی یکدم نمودار ہو کر اُس تسلسل کی ڈور کو منقطع کر دیتی ہے اور ہم نے زندگی جس جگ سا پزل کے سینکڑوں ٹکڑے نہایت عرق ریزی سے جوڑ کر اُن سے ایک تصویر بنائی ہوتی ہے، نصیب کی ہتھیلی ظاہر ہوتی ہے اور اُنہیں بکھیر دیتی ہے.. پوری زندگی پھر سے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے.. اور یہ ٹکڑے دوبارہ اس لئے نہیں جوڑے جا سکتے کہ تمہارے پاس اتنا وقت باقی نہیں رہتا.. یہ منتشر پن بالآخر فنا پر جا اختتام ہوتا ہے۔''

ماما پر صرف عمر ہی اثر انداز نہ ہوئی تھی، کہیں نہ کہیں، کوئی تغیر.. اُس کے دماغ کے خلیوں میں شاید ظہور پذیر ہوا تھا کہ وہ ایسی بے ربط باتیں کیے چلی جا رہی تھی..

''نہیں جینا..'' روجا کے اب بھی دل کش ہونٹ مسکراہٹ میں وا ہو گئے۔ ''تمہاری ماں کسی ذہنی خبط کا شکار نہیں ہو گئی، میں نے تمہارے چہرے پر شک کے جو حروف لکھے جا رہے ہیں، میں نے اُنہیں پڑھ لیا ہے.. جینا اگر میں اُسے روک لیتی، اور میرے روکنے سے وہ رک جاتا کہ وہ ابھی تک مجھے انہی نظروں سے دیکھتا تھا جن نظروں سے اُس نے مجھے اُس شب ڈینیوب کے کناروں پر دیکھا تھا جب میں نے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیا تھا.. لیکن اگر میں اُسے نہ جانے دیتی تو میری آبائی حِس مجھے خبر کر چکی تھی کہ وہ کسی ایک شب اس بالکونی سے اٹھ کر نیچے چلا جاتا اور ڈینیوب کے پانیوں میں اتر جاتا..''

''اور وہاں راوی کے پانی ہیں ماما..''

''ہاں.. لیکن وہ اُس کے اپنے اُس کی دھرتی میں سے پھوٹنے والے پانی ہیں جن کی نمی میں وہ مجھے گئے زمانوں میں ہر شب گیلا کرتا تھا اور وہ نمی اُس کے بدن کی ہر پور سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی..'' روجا نے پہلی بار فرش پر بکھرے جینا کے رک سیک میں سے اُنڈیلے گئے کاٹھ کباڑ پر نگاہ کی ''یہ.. سب کیا ہے؟''

''یہ سب... میری مسافتوں کے سنگِ میل اور گواہ ہیں.. آج کیسے چپ چاپ فرش پر بے جان پڑے ہیں لیکن کبھی یہ زندہ اور بیش قیمت ہوا کرتے تھے.. میں کل صبح انہیں سمیٹ کر کوڑے دان میں پھینک کر اپنے آپ کو ان سے منقطع کر لوں گی.. ان کا وجود باقی رہا تو یہ پھر سے زندہ ہو کر مجھے ترغیب دیتے رہیں گے کہ جینا.. چلو.. پھر سے مسافتیں اختیار کرو اور میں بہت تھک چکی ہوں ماما..''

''ان سب کو کوڑے دان میں پھینک کر تم سمجھتی ہو کہ تم ان سے چھٹکارا حاصل کر لو گی.. یہ سب آثار اور یادگاریں تو تمہارے بدن کی لوحِ محفوظ پر ثبت ہو چکی ہیں.. میں دیکھ رہی ہوں کہ ان میں درویشوں کا ایک سفید لبادہ اور ایک بانسری بھی ہے اور میں یہ بھی دیکھ سکتی ہوں کہ اگرچہ تم لمحۂ موجود میں ایک پھٹی ہوئی جین اور پھولدار بلاؤز میں ملبوس ہو لیکن تم ہمیشہ اسی سفید لبادے میں روپوش رہو گی اور یہ بانسری کوڑے دان میں پھینک دیئے جانے کے باوجود تمہارے ہونٹوں کو چھوتی رہے گی.. میں تمہیں اپنے ایک خواب میں شریک کروں.. جب سے مصطفےٰ رخصت ہوا ہے یہ خواب مجھ پر ہر شب ایسے اترتا

ہے کہ اگلی سویر میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ میں جاگ چکی ہوں یا ہنوز خواب میں ہوں..''

''ہاں ماما..''

''میں ایک گھوڑا گاڑی ہانک رہی ہوں اور وہ کسی کچے راستے پر نہیں ڈینیوب کے نیلے پانیوں پر رواں ہے اور اس کے باوجود اُس کے پہیّوں تلے سے دھول اٹھتی ہے.. پچھلے حصّے میں میری حیات کی کل متاع ہے.. میرا خیمہ.. چند برتن.. سوکھا ہوا پنیر اور گوشت.. دو کمبل، تین کڑکڑاتی مرغیاں اور ایک کرسٹل کا گلوب جس میں جھانک کر میں قسمت کا حال بتاتی ہوں اور روزی کماتی ہوں.. اور ہوا مجھے بے لباس کرتی ہے.. میرے گھیرے دار بلاؤز کے اندر داخل ہو کر میری چھاتیوں پر یوں سرسراتی ہے کہ وہ برانگیختہ ہوتی ہیں.. اور جینا میں تمہیں ایک جپسی بدن کی حقیقت سے دوبارہ آگاہ کرتی ہوں کہ ایک جپسی چاہے برسوں کے بوجھ سے کمر خمیدہ ہو جائے اُس کی چھاتیاں ہمیشہ پختہ، ایستادہ اور مستحکم رہتی ہیں.. تو اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار.. آزاد.. میری نگاہ میں کوئی منزل نہیں.. اور ہوا مجھے بے لباس کرتی ہے.. گاڑی کے پہیّوں کی چوبی چوں چوں کی مدھر موسیقی میں گُم گھوڑے کو ہانکتی چلی جاتی ہوں.. جینا کیا تم واقعی آ گئی ہو؟''

فرش پر بکھرے اُن سفری آثار میں سے جینا نے وہ تعویذ اٹھایا جو ایک حواس باختہ خانہ بدوش بڑھیا نے اُس کے گلے میں ڈالا تھا کہ اب تم پر کوئی آفت اثر انداز نہ ہوگی، چاہے اس جہان کے آخر تک چلی جاؤ اور اُسے روجا کے گلے میں ڈال دیا ''میں واقعی آ گئی ہوں ماما..''

اور ڈینیوب بہتا جا رہا تھا..

●○●○●○●

وہ شام جو بوریوالا میں ڈھلتی تھی..شمس الدین انقلابی کے اُس کوارٹر کے صحن میں بھی اترتی تھی جو کب کا متروک ہو چکا تھا، کھنڈر ہونے کو آتا تھا..اگرچہ اُس کے بھولے بسرے ایک کمرے کی دیواروں پر ابھی تک مارکس، اینگلز، لینن اور سٹالن کی تصویروں کے پوسٹر موسموں کے مارے ہوئے چیتھڑوں میں بدل چکے تھے..وہ ایک ایسے جگ سا پزل کے ٹکڑے تھے جس کے کچھ حصے معدوم ہو چکے تھے اور وہ کبھی دوبارہ ایک مکمل تصویر ہونے پر قدرت نہ رکھتے تھے..انہی دیواروں کے سائے میں جب اشتراکیت کے یہ فلسفی، خواب گر اور آمر مکمل حالت میں تھے ایک قاری صاحب اُسے قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے اور وہ شام جو ڈھلتی جا رہی تھی، کوارٹر کے صحن میں ڈھیتے قدیم کنویں میں جھانکتی اُس میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی... بوریوالا کے قدیم باسی بیان کرتے تھے کہ یہ کنواں مغلوں کے زمانے میں کھودا گیا تھا تاکہ دلّی براستہ دیپالپور جانے والے ہرکارے گھڑ سوار یہاں اپنے آپ کو تازہ دم کر کے پھر سے سفر اختیار کریں..جو زمانے خس و خاشاک ہو چکے ان میں کیسے کیسے تھکے ماندہ، سفر کی دھول میں گم پیاسے مسافروں نے اس کی منڈیر پر سے جھانک کر اطمینان کیا ہوگا کہ کیا اس کی تہہ میں میرے لئے دو گھونٹ پانی ہے..شاہی ہرکارے..میدان جنگ میں ہارنے والے پسپا ہوتے سپاہی اور اکثر شہزادے..اُن کا تعاقب کرنے والے فاتح..نگری نگری گھومتے درویش اور فقیر..اور کبھی راہزن..جس نے بھی دلّی کا قصد کیا وہ انہی راستوں کا مسافر ہوا..اُس کی اگلی منزل دیپالپور ہوتی..کنویں کی تہہ میں جو پانی تھے اُن پر کیسے کیسے چہرے نقش ہوئے اور ڈوب گئے..

یہ کنواں اُسے تب یاد آیا تھا..

ماسکو کے مرکزی عجائب گھر میں منی ایچر تصویروں کی گیلری میں وہ ہر تصویر کے قریب ہو کر اُس کے مختصر پن کی ستائش کرتا جب ہولے ہولے آگے بڑھ رہا تھا تو وہ ایک اور تصویر پر ایک سرسری نگاہ کر کے گزر جانے کو تھا تو اُس کی نگاہ میں کلک سے خطاطی کی گئی ہوئی تحریر کے درمیان میں درج ''دیپالپور'' کا لفظ اترا..وہ ٹھٹک کر رُک گیا..

یہ ایرانی منی ایچر تصویر بہزاد ایسے کسی اُستاد کی نہ تھی، کوئی معمولی اور گمنام مصور تھا..اس تصویر میں سبز، سرخ اور زرد رنگ کے چوغوں میں ملبوس چار شہزادہ نما شخص دکھائے گئے تھے جن کی پگڑیاں مغل دور کی ترجمانی کرتی تھیں اور وہ نیزے بلند کیے تلواریں سونتے دو شیروں پر حملہ آور ہو رہے تھے..اُن میں سے ایک بدقسمت شہزادہ اُن دونوں میں سے ایک شیر کے پنجوں تلے نہایت اطمینان سے استراحت فرما رہا تھا اور شیر کے جبڑے پر شہزادہ صاحب کے خون کے آثار تھے..گمنام مصور یقیناً اپنے عہد میں نامور نہ ہوا ہوگا کہ وہ اتنا بے ہنر اور بودا تھا کہ اُس کے مصور کیے گئے شیر..شیر نہ لگتے

تھے، شیروں کے کارٹون لگتے تھے.. یہ صرف اس تصویر کی قدامت تھی جس کی قدر کی گئی تھی اور جس نے مصور کے اناڑی پن کی پردہ پوشی کر دی تھی.. تصویر کے بالائی حصّے میں بھورے ہو چکے ہاتھ سے خصوصی طور پر تیار کردہ کاغذ پر سیاہ روشنائی میں ایک عبارت رقم تھی.. وہ آنکھیں تقریباً تصویر کے ساتھ چپکائے اُس عبارت کے کچھ حصّے پڑھ سکا کہ اُس کی ذاتی فارسی.. ایں صندلی است اور آں شجر است سے آگے نہ جاتی تھی..

''کمر ہمت بہ تسخیر ہندوستان.. پنج مرتبہ از کابل یورش فرمودند.. مرتبہ اوّل.. توابع ملتان.. مرتبہ دوم.. کابل تا نواحی.. تھانیسر پنجاب.. مرتبہ چہارم تا لاہور و دیپال پور..''

اُس جڑوں والے کنویں میں جھانکتے ہوئے وہ مختصر تصویر پھر سے زندہ ہو گئی.. بورے والا.. لاہور اور دیپال پور کے راستے میں پڑتا تھا اور وہ تصویر جس کسی مغل بادشاہ کی داستان بیان کرتی تھی، اُس کے لشکر میں شامل چند ایک سپاہیوں نے عین ممکن ہے کہ اس کنویں میں جھانکا ہوگا.. انگریز سرکار کے زمانے میں جب یہ قدیم کنواں بورے والا ٹیکسٹائل ملز میں مشقت کرنے والے مزدوروں کے لئے تعمیر کیے جانے والے سینکڑوں کوارٹروں میں سے ایک کے صحن کی قید میں آ گیا تو اس کے پانیوں میں ان مزدوروں کے چہرے عکس ہوتے ہوں گے جو شمس الدین انقلابی کے شیدائی اور معتقد تھے.. وہاں اُس کی تہہ کے پانیوں میں نہ صرف شاہ و گدا دفن تھے بلکہ اُس کے ماضی کے عکس بھی زیرِ آب کہیں تھے.. سکول جانے سے پیشتر.. اپنا بستہ گلے میں ڈالے، تختی ہاتھ میں لئے وہ بہر طور اگرچہ احتیاط سے کنویں کی منڈیر پر سے جھانک کر نشیب کے نیم تاریک آبی اسرار میں اپنی جھلک دیکھتا.. واپسی پر بھی وہ ایک نظر اس کے پیندے میں ٹھہرے ہوئے پانی پر ڈال کر پھر اپنی منتظر ماں کے پاس جاتا..

وہ پانی، کنویں کی تہہ میں دکھائی دیتے پانی جو گزر چکے زمانوں کے اُن سب چہروں کو جنہوں نے ان میں جھانکا تھا، اُن کی شباہتیں سنبھال چکے تھے اور یہ پانی اس لائق تھے کہ انہیں ماسکو سٹیٹ میوزیم یا دنیا کے کسی نامور آرٹ گیلری میں محفوظ کر لیا جاتا.. ایسا ہونا چاہیے تھا لیکن ایک پیچیدگی تھی جو حل نہ ہو سکتی تھی.. سطحِ آب پر نقش یا اُس میں دفن ماضی کی تصویروں کو جامد کر کے کسی فریم میں جڑا نہیں جا سکتا تھا.. پانی تو بہہ نکلتے ہیں اور اُن میں عکس اور دفن گزر چکے زمانوں کے سب چہرے، ہرکارے، شہزادے، سپاہی، لٹیرے، انقلابی اور خود ظہیر الدین بھی بہہ نکلتے تھے.. کنویں کا گھیرا اتنا بڑا تھا کہ اُس نے مختصر صحن کو مزید مختصر کر دیا تھا.. چھوٹی سرخ اینٹوں سے چُنیدہ اس کے اندرونی گولائی پذیر در و دیوار اتنی مدت سے چھلکتے پانیوں میں بھیگ رہے تھے کہ اُن اینٹوں کی درزوں میں سے برگد، شیشم اور پیپل کے بُوٹے پھوٹنے لگے تھے.. ان درزوں میں ان شجروں کے بیج کیسے بوئے گئے تھے اس پر آج تک کسی نے غور نہ کیا تھا کہ نہ تو کوئی پرندہ کنویں میں اتر کر اس کی گولائی میں پنجے جما کر بیٹ کر سکتا تھا جس میں کچھ بیج چلے آئے ہوں اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ ہواؤں نے کنویں میں داخل ہو کر اپنے دامن میں پوشیدہ بیج ان درزوں میں بکھیر دیئے ہوں.. بہر طور ان میں سے قدرتی طور پر پھوٹنے والے بوٹے قد میں تناور تو نہ ہو سکتے تھے لیکن اُن کی جڑیں ہر اینٹ کو اپنی گرفت میں لے کر پھیلتی جاتی تھیں.. یوں اس پرانے کنویں کی گولائی کا بیشتر حصہ جڑوں کے تانے بانے میں اُلجھ گیا تھا.. اور اسی نسبت سے اسے جڑانوالا کنواں کے نام سے پکارا جانے لگا..

آپس میں گتھم گتھا جڑوں کا یہ تانا بانا..ظہیرالدین کی حیات کا نقشہ تھا..الجھا ہوا..بے ترتیب جس کا سرا نہ ملتا تھا..
وہ اپنے تئیں تو عدل وانصاف اور انسانی وقار کے حصول کے صراط مستقیم پر چلا تھا..اُس کی آنکھوں میں کوئی ابہام نہ تھا..لیکن
سرمایہ دارانہ نظام کے تیندوے نے اُسے اپنے ہزاروں ہاتھوں میں جکڑ کر بھٹکا دیا اور وہ اپنے خوابوں کے پیغامبر کو فروخت
کرنے کے لئے بازار میں لے آیا..

اُسے شائبہ ہوا..شب کی کنویں میں اترتی سیاہی تھی، مدھم پڑتی ہوئی آنکھوں کا دھندلاتا دھوکا تھا یا کیا تھا کہ
کنویں کی تہہ میں جو پانی تھے اُن پر برج کے جنگلوں میں اترتی جاتی ایک سائیکل تھی جس کے گرد ایک پھولدار فراک ہوا
کے زور سے ایک بھرے بدن کی لڑکی کی ٹانگوں کو برہنہ کرتا بلند ہو رہا تھا..

●○●○●○●

اُنہیں یہاں آئے ہوئے..گلبرگ نمبر تین کی فردوس مارکیٹ کے قریب جی بلاک کی کوٹھیوں کی عقبی دیواروں پر سے جھانکتی ہوئی دھکا کالونی المعروف مکّہ کالونی کے سردار غالب الیکٹریشن کے رنجیدہ اور عُسرت زدہ مکان کے اس کمرے میں جس کی در و دیوار ابھی تک سیمنٹ کے پلستر کو ترستے تھے اور اُس میں ایک زنگ آلود آہنی جالی سے ڈھکا ایک چوکور روزن تھا جس کے راستے لاؤڈ سپیکروں میں سے برآمد ہونے والی کھنگارتی، دل کو یکدم دہلا دینے والی آوازیں پانچوں وقت داخل ہوتی تھیں..جس کا فرش ابھی تک پختہ نہ ہوا تھا.. یہاں آئے ہوئے انہیں چند روز گزر چکے تھے اور بے شک وہ لیلیٰ کا سگا چچا تھا اور اُن میں قرابت داری اور خون کی شراکت کا ایک آبائی رشتہ تھا لیکن یہ رشتہ جو متزلزل تھا، مستحکم تب ہوا جب اُس کے باپ نے پہلی شب بسر کرنے کے بعد اگلی سویرا اپنے بھائی کی مٹھی میں دو ہزار ڈالر کے قریب رقم زبردستی منتقل کر دی...

وہ پہلے دو چار دن تو اپنے باپ کی الفت کے سہارے اس عقوبت خانے کی گندگی اور بے آرامی برداشت کرتی رہی اور کچھ آگاہ نہ ہوئی کہ اُس گھر میں ہمہ وقت اُس کا پیچھا کرنے والے متعدد غلیظ اور بدتمیز بچوں اور وہ ایک نیم پوشیدہ سی آنٹی جو ہمیشہ ٹاٹ کے ایک پردے میں اسے جھانکتی اُس پر نظر رکھتی تھی، ان کے سوا کوئی اور بھی تھا..

ایک خشک ہو چکے کیچڑ آلود پیراہن میں اور اُس کے چہرے پر بھی خشک کیچڑ کی پپڑیاں جمی تھیں اُس نے سردار میر کو سرِ شام اُس گھر میں داخل ہوتے دیکھا..

اُسے بعد میں علم ہوا کہ وہ گلبرگ کی مین مارکیٹ کے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا التجائی نظروں سے اپنی جانب بڑھتے ہوئے ہر شخص کو دیکھنے والا ایک دہاڑی دار مزدور تھا.. یہ ایک عظیم انقلابی شاعر کی نسل کی کڑی تھی جو اُس کے خمار آلود گھمنڈ اور بے حس بے اعتنائی کے باعث جاہل اور بے ہنر رہی تھی..فٹ پاتھوں پر دوپہر اترنے تک کسی ایسے شخص کی آمد کی منتظر رہتی جو اُسے کسی بھی مشقت کے لئے کرائے پر حاصل کر لے..کوڑا ڈھونے..اینٹیں اٹھانے..کدال چلانے یا کوئی گڑھا کھودنے کے لیے..اس نسل کو اپنے دادا کے کمالِ نے نوازی سے کچھ فائدہ نہ ہوا تھا..وہ کمال کسی کام نہ آیا تھا..

سردار میر کا خشک کیچڑ بھرا رُوپ اُس کے دل میں کُھب گیا..اُس کے شناسا نین نقش کہ وہ ایک ہی لڑی میں سے تھے اُس کے لرزتے بدن پر ثبت ہونے لگے''میں آپ کی فرسٹ کزن ہوں..لیلیٰ..''

اُس نے اپنے پیراہن کی گندگی پر کچھ ملامت محسوس نہ کی اور مسکرا دیا:''آپ چاچا قالب کی بیٹی ہو.. مجھے پتہ ہے..میں منہ اندھیرے روزگار کے حصول کے لئے نکل جاتا ہوں اور اکثر گئی رات لوٹتا ہوں تو آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی..آپ کیسی ہیں؟'' وہ جھجکتا کچھ اٹکتا انگریزی کے فقرے ادا کرتا اُسے کہتا تھا..اُدھر لیلیٰ کی انگریزی بھی نہایت ابتدائی

تھی..رواں نہ تھی..

وہ صبح سویرے..جب فجر کی اذان روشن دان میں سے داخل ہو کر اسے بیدار ہو جانے پر مجبور کرتی، صحن کے کونے میں ایستادہ پانی کے نل کے نیچے اُس کا ہینڈل گیڑ تا غسل کرتا.مسواک منہ میں گھسیڑے اپنے بال سنوارتا اور نماز ادا کرنے کے بعد نہایت خاموشی سے دبے قدموں..جیسے وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے جارہا ہو گھر سے نکل جاتا..

وہ اُس کی واپسی کی منتظر رہتی..

لیلےٰ او لیلےٰ!

●○●○●○●

کُل ساڑھے سات شہتیر تھے..

کوارٹر کی چھت کو ابھی تک سہارے ہوئے..شاید اسی کالج کے وسیع ہریاول بھرے سبزہ زار میں سے کوئی ایک درخت گرا ہوگا کہ انگریز لوگ ہندوستانیوں کو تو کاٹ سکتے تھے پر کسی درخت کو کاٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے تو وہ درخت جو شاید اپنی طبعی عمر پوری کر چکا تھا یا کسی زور آور آندھی کی زد میں آ کر اپنی جڑوں کو زمین کی گرفت سے چھڑا کر اوندھا ہو گیا تھا تو شاید اور یہ محض قیاس ہے کہ اُس کے تنے میں سے اُن آٹھ شہتیروں کو تراشا گیا ہوگا جو سٹاف کی رہائش گاہ کے باغیچے کی وسعت کے ایک کونے میں اب تک کب کے بے آباد اجڑے پڑے کوارٹر کی چھت کو سہارنے کے کام آئے ہوں گے..

وہ بھی اپنی طبعی عمر پوری کر چکے تھے اور اُن میں سے لاچارگی اور شکستگی کے آنسو بُرادے کی صورت میں گرتے رہتے تھے لیکن اُن میں سے ایک کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور اُس کا کچھ حصہ کوارٹر کے فرش پر بُرادہ ہو رہا تھا اور بقیہ حصہ ابھی تک دیگر سات شہتیروں کے آسرے چھت کا بوجھ اپنے تئیں اٹھائے ہوئے تھا یعنی وہ آدھا رہ گیا تھا اس لئے گنتی کی صورت میں..کل ساڑھے سات شہتیر..

پانچویں شہتیر کے کھوکھلے پن میں..

اس کوارٹر میں منتقل ہوئے اُسے دس روز ہونے کو آئے تھے..

دن کے اوقات میں اس مشنری کالج کے ایک چھوٹے سے گاؤں جتنے رقبے میں پھیلے کیمپس میں بہت گہما گہمی بہت ہجوم رہتا..طالب علم ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے جو گمشدہ بھیڑوں کی مانند یونہی اِدھر اُدھر تانک جھانک کرتے گھومتے رہتے تھے اور وہ کسی اشد ضرورت کے تحت ہی باہر نکلتا اور کالج اوقات کے خاتمے تک اپنی چارپائی پر پڑا..تکیے پر اپنے سمیٹے ہوئے ہاتھ پر سر رکھے چھت کے شہتیروں کو تکتا رہتا..اُنہیں ایک عالمِ محویت میں گھورتا رہتا..اسی لئے تو وہ حساب کتاب میں اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ..پورے ساڑھے سات شہتیر..

اُس اولین ملاقات کے بعد ہمایوں آغا تیسرے روز اُس کا کھوج لگاتا، اپنے گھنگھریالے بالوں پر شرمندگی سے ہاتھ پھیرتا کوچہ کمانگراں میں مصطفیٰ اسلام والے کمرے میں پہنچ گیا تھا..

''انکل..اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ پچھلی شب پاپا میرے خواب میں آئے تھے اور انہوں نے مجھے خواب میں سرزنش کی کہ نالائق میرے لکھنؤ کے انقلابی زمانوں کا ساتھی میرا کرشن اتنی مدت بعد مجھ سے ملاقات کو آ نکلا اور تم نے اسے واپس جانے دیا، انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا کہ اے اول نمبر کے گاؤدی بیٹے آج ہی اُس کا سراغ لگاؤ اور اُسے کہو کہ

تمہارے ارجن آغا نے تمہیں اپنے گھر بلایا ہے..تو انکل میں کیسے پاپا کے حکم سے روگردانی کرتا..''

برلن میں صرف ہلٹر ڈتھی یا جب اِنگے چھوٹی ہوا کرتی تھی تو صرف ان دونوں کو آنکھوں میں اُسے وہ ضرورت اور الفت دمکتی دکھائی دیتی تھی جو ایک انسان کی زندگی کو معانی عطا کرتی ہے..اُن کے سوا اُسے کسی بھی غیر ضروری محبت کی عادت ہی نہ تھی..آغا ہمایوں کی سیاہ، شرارتی بھی اور شرمندہ بھی آنکھوں میں اُسے الفت کے وہی پرتو نظر آئے..''کیا تم نے واقعی پچھلی شب پاپا کو خواب میں دیکھا تھا ہمایوں؟''

''بالکل نہیں انکل۔'' ہمایوں کی آواز میں ایک گہری گھمبیرتا گونجتی تھی، جیسی شیکسپیئر سٹیج ایکٹروں کے حلقوم سے جنم لیتی ہے''لیکن اگر وہ میرے خواب میں آتے تو مجھ سے یہی کہتے..'' وہ ایک بچے کی مانند مسکرانے لگا..''اور آپ کی بہو مہر النساء اُسی روز سے میرے کان کھا رہی ہے کہ ہمایوں، پاپا کے رخصت ہونے کے بعد جس ویرانی نے اس گھر میں ڈیرے ڈال لئے تھے اور وہ ہماری روح کے نہاں خانوں میں بھی اتر گئی تھی تو جب انکل اندر داخل ہوئے تو وہ اجاڑ پن جو یہاں جا گزیں تھا، یہاں موجود نہ ہونے کے باوجود مجھے یوں لگا کہ بغلی دروازے سے رخصت ہو گیا ہے..تم انہیں کچھ منت سماجت کر کے لے آؤ..وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے انکل اور میں آپ ہی سے شکایت کر سکتا ہوں کہ آپ کی بہو مزاج کی بہت کڑوی ہے..میں اُس کے سامنے دم نہیں مار سکتا..پلیز انکل۔''

عارف نقوی بھلا چاہت کے ایسے شدید بہاؤ کی تاب کیسے لا سکتا تھا، اُسے اپنے آنسو روکنے میں دِقت ہوئی، قدرے تأمل کے بعد بولا''ٹھیک ہے..تمہیں اس کڑوے مزاج کی بہو سے بچانا بھی تو بہت ضروری ہے لیکن..اگر میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں تو وہ مالی بابا کا اجڑا ہوا، بوگن ولیا کی سوکھ چکی ٹہنیوں سے ڈھکا ہوا..وہ کوارٹر..ورنہ نہیں۔''

''میں کل آپ کو لینے آ جاؤں گا، آپ اپنا سامان پیک کر لیجئے..''

وہ کہنے کو تھا کہ میرا سامان..ایک سیاہ بیگ، میرا ٹوتھ برش اور کچھ راکھ..میں ابھی چل سکتا ہوں لیکن آغا ہمایوں ایک چھلاوے کی مانند غائب ہو چکا تھا..

اگلے روز جب وہ اس کوارٹر میں داخل ہوا تو اُس نے جانا کہ آغا ہمایوں اسے فوری طور پر اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا تھا اور یکدم غائب کیوں ہو گیا تھا..کوارٹر کی جھاڑ پونچھ کر کے اُسے خواب سنوار کر رہائش کے قابل یوں بنایا گیا تھا کہ فرش پر سبز رنگ کا ایک نیا قالین دیوار سے دیوار تک بچھا ہوا نئے پن کی مہک میں تھا، واحد کھڑکی کے مرمت شدہ چوکھٹوں میں نئے شیشے جڑے جا چکے تھے اور انہیں ایک سبز رنگ کے ہی پردے نے روپوش کر رکھا تھا..اس کے کواڑ کھولنے سے البتہ کچھ حاصل نہ ہوتا تھا کہ بوگن ولیا کی خشک ٹہنیاں باہر کے منظر کے آگے ڈٹی ہوئی تھیں..ایک پلنگ جس پر بچھی چادروں کی سفیدی کنوارپن کی حد تک ستھری تھی، سائیڈ ٹیبل، ایک رائٹنگ ٹیبل، تین کرسیاں اور ایک دو نشستوں کا صوفہ..یہ سب مہر النساء خاتون..اُس کی حال ہی میں دریافت شدہ بہو کے بندوبست تھے..

کامریڈ مصطفیٰ اسلام معترض تو ہوا لیکن جب اُس نے صدق دل سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے قدیمی دوست کے بیٹے کا دل رکھنے کی خاطر وہاں منتقل ہو رہا ہے اور چند روز بعد لوٹ آئے گا تو وہ رضامند ہو گیا۔

تو پانچویں شہتیر کے کھوکھلے پن میں..

ایک سانپ قیام پذیر تھا..جانے کب سے اُسے گھر بنائے بیٹھا تھا..وہ اُس کی موجودگی سے تب آ گاہ ہوا جب اُس نے سبز قالین پر ایک باریک سی جھلّی پڑی دیکھی، وہ پہلے تو تعین نہ کر سکا کہ یہ کیا ہے اور پھر اُسے واجد علی شاہ کا وہ کھنڈر محل یاد آ گیا جس میں اچھلتے کودتے بچپن میں وہ اور اُس کے ساتھی سانپوں کی بلوں کو تلاش کرتے تھے تاکہ اُن میں پانی انڈیل کر اُن کی سراسیمگی کا تماشا دیکھا جا سکے اور ان بلوں کے کناروں پر کبھی کبھار ایسی باریک جھلّیاں پڑی ہوتی تھیں جو اُن کی کینچلیاں ہوتی تھیں..وہ خوفزدہ تو نہ ہوا کہ سانپ جب تک اُسے زچ نہ کیا جائے، اُسے کچلنے کا ارادہ نہ کیا جائے ایک بے ضرر کیڑا ہوتا ہے، لیکن وہ احتیاط کرنے لگا..اُس شب اُسے نیند کم آئی..وہ جاگتا رہا اور کان لگا کر..شہتیروں کو تکتے اُس کی آماجگاہ کا تعین کرنے کی کوشش میں مشغول رہا..اور بالآخر یہ پانچواں شہتیر تھا جس کے اندر سے وقفے وقفے سے ایک مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی تھی..تین روز بعد پہلی مرتبہ اُن کا براہ راست ذاتی آمنا سامنا ہوا..وہ کواٹر کے باہر..جب کہ کالج کی وسعت گہما گہمی سے خالی ہو چکی تھی، لان میں کُرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا تو وہ سانپ نہایت اطمینان سے کواٹر کی چوکھٹ پر سے ابھر کر رینگتا لان میں اترا، نہایت بے اعتنائی سے اُسے اپنی توجہ کے قابل نہ سمجھتے ہوئے کُرسی کی ٹانگوں سے کھیتا اُس کی جانب نظر کیے بغیر کھٹّی کی نزدیکی باڑھ کے سبز گھنے پن میں روپوش ہو گیا..یہ کوئی شاندار منکوں اور مُہروں سے مزین بدن کا سجاوٹ بھرا باقاعدہ سانپ نہ تھا..بہت بے چارہ بے رنگ اور یتیم سا سانپ تھا اور وہ بھی تین چار بالشت بھر کا..صرف اُس کا تکونا پھن اُس کے سانپ ہونے کی گواہی دیتا تھا..عارف نقوی دم روکے اُس باڑھ کو تکتا رہا جس میں وہ گم ہوا تھا اور پھر کچھ دیر بعد وہ وہاں سے برآمد ہوا اور اُسی بے اعتنائی اور بیگانگی سے اُس کی کرسی کے برابر میں سے رینگتا ہوا چوکھٹ پار کر کے کواٹر کے اندر چلا گیا..

یہ اُس کا معمول تھا اور وہ اس معمول کا عادی ہو گیا..

وہاں صرف وہ سانپ ہی اُس کی آماجگاہ میں واحد شریک نہ تھا، ایک چُوہا بھی رہائش پذیر تھا اور کم از کم ایک شب نیند میں ڈوبے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ چادر سے باہر اُس کے پاؤں کے انگوٹھے کو کوئی نرم شے دانتوں سے کُترنے کی کوشش کر رہی ہے..یہ اُس چوہے کا پہلا تعارف تھا..

ہمایوں اور مہر النساء خاتون اُس کی حالیہ دریافت شدہ بہو اُس پر قطعی طور پر بوجھ نہ ہوئے..اُس کے روز و شب میں دخل انداز نہ ہوئے..اگر اُس کا من چاہتا تو وہ کبھی رات کے کھانے پر اُن کی ڈائننگ ٹیبل میں شریک ہو جاتا وگرنہ تین وقتوں کا کھانا ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک عیسائی خاتون مارگریٹ..دسترخوان میں ڈھانپے ہوئے اُس کے کواٹر میں بغیر کوئی بات کیے رکھ کر چلی جاتی..

یہ جو قدرت کے انسانی فہم سے ماورا کرشمے ہوتے ہیں..جنہیں نصیب بھی کہا جاتا ہے ان کی حِس مزاح کتنی بھیانک ہوتی ہے، ایک مجبور انسان کے ساتھ کیسے کیسے مذاق کرتی ہے..دل کا عارضہ اگرچہ شدت کا نہ تھا پر اُسے لاحق تھا اور آج بھی اُن سویروں کو یاد کرتے ہوئے اُس کے دل میں ایک اٹک خلل ڈالتی تھی جب ہلٹرڈ کا پُرتشویش خوش آثار چہرہ اُس پر جھکتا تھا اور جب وہ آنکھیں کھول کر اُسے شرارت سے تکتا تھا تو اُس کی جان میں جان آتی تھی کہ آریف نیند میں ہی نہیں چلا گیا..اُس کی جان تو نہیں ہلٹرڈ کی چلی گئی..جب وہ رختِ سفر باندھ رہا تھا، برلن کے فلیٹ کو مقفل کر کے پاکستان

لوٹ رہا تھا تو وہ اس یقین کا اسیر تھا کہ اُس کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں، یہ بیماریٔ دل اُسے کسی بھی لمحے مردہ کر سکتی ہے..وہ محض چند دنوں کا مہمان ہے..لیکن..یہی تو قدرت کی بھیانک جس مزاح تھی کہ وہ ابھی تک اچھا بھلا تھا..جیے جاتا تھا..

اور اگر وہ ایک کواٹر میں ایک بے ضرر سانپ اور کچے دانتوں والے چوہے کے ساتھ جیے جاتا تھا تو یہ کیسی لایعنی اور بے مقصد حیات ہے.. یوں کب تک جیے جانا تھا..برلن میں ہلٹرڈ کی موت کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتا تھا..مصوّری کی نمائشوں، جدید شاعری کی محفلوں میں شرکت کرتا تھا..جرمن ادب کے شاہکاروں کو اردو میں منتقل کرتا تھا اور چنیدہ اردو ادب کے جرمن میں ترجمے کر کے اپنے آپ کو مگن رکھتا تھا..تو اب یہی جو دو چار روز اُس کے پلّے میں تھے، وہ ایک سانپ اور ایک چوہے کی رفاقت میں بیکار بیٹھے کب تک گزارے جا سکتا تھا اور تب اُس کے اندر ایک امکان نے جنم لیا..

کیا میں اب بھی ایک اداکار ہو سکتا ہوں..

کیا اس بڑھاپے میں بھی کسی سٹیج پر کھڑے ہو کر مکالمے ایک تخلیقی جذبے کی شدت سے ادا کر سکتا ہوں..

اس لاحاصل اور بیکار حیات کا کوئی تو مصرف ہو سکتا ہے....

اُس کے بجھتے ہوئے ذہن کے پردے پر یادداشت کی تختی پر لکھے ہوئے وہ گم گشتہ مکالمے ابھرنے لگے..

''دولت، بیوی بچوں کو چھوڑ دینے کا نام تیاگ نہیں بلکہ اُن کی محبت اور کشش سے دل کو خالی کر دینے کا نام تیاگ ہے، دل میں محض پرماتما ہو، اس کا نام تیاگ ہے۔''

''عمل ترک کر دینے سے انسان سنیاسی نہیں بن سکتا..سنیاسی وہ ہے جسے پھل کی تمنا نہ ہو..''

''غصہ اور ہوس تمام گناہوں کی جڑ ہے۔''

''عظیم دُکھ ہر انسان کو غیر متوازن کر دیتا ہے..چاہے وہ کتنا ہی مضبوط اور توانا کیوں نہ ہو..''

اگر میں اداکاری اختیار کر لوں تو..

شاید یہی میرے دکھ کا مداوا ثابت ہو..اداکاری کے مسکراتے ہوئے نقاب سے میں اپنے دکھ کا چہرہ ڈھانپ لوں..لیکن یہاں..تنگ نظری اور ثقافتی تعصب راج سنگھاسن پر براجمان ہیں، وہ بھلا مہابھارت کی دانش کو کہاں قبول کریں گے..

عظیم دکھ ہر ذہن کو غیر متوازن کر دیتا ہے..

اشتراکیت کے خواب کا انہدام اور ہلٹرڈ کی موت سے بڑھ کر کوئی اور عظیم دُکھ کیا ہوگا اور اگر میرا ذہن غیر متوازن ہو رہا ہے تو اس میں میرا تو کچھ دوش نہیں..

لیکن کیا میں ایک اداکار ہو سکتا ہوں...

●○●○●○●

پانیوں کے بھی عجیب سراب ہوتے ہیں..

جو کوئی ان کے کناروں پر دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہے، وہ اسے اپنے بہاؤ میں شامل کر کے کبھی تو سدارتھ کا روپ بخش دیتے ہیں اور کبھی اسے بدگمان کر دیتے ہیں کہ سب مایا ہے.. گیان دھیان بھی اور تمہاری زندگی بھی.. جو بھی ہے وہ سب ایک بہاؤ میں ہے اور عدم کے اتھاہ سمندروں میں اتر رہا ہے..

پانی جس دیس میں بھی بہتے ہوں.. اُس کی بالکونی تلے رواں نیلونیل ڈینیوب کے یا راوی کے یہ آلودہ، گدلے اور تھم تھم کر بہنے والے پانی ان سب کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے..

راوی کے پُرشور پُل سے پرے، کشتیوں کے گھاٹ سے دور.. مصطفےٰ اسلام کے بوجھ سے بدن تلے کی ریت ہولے ہولے کھسکتی تھی اور شام نہ صرف اُس کے ابھی تک نوخیز دکھائی دیتے چہرے پر بلکہ راوی کے پانیوں پر بھی اتر رہی تھی اور وہ ان پانیوں کے سحر میں آیا ہوا تھا جیسے وہ شام میں سرسراتا سرمئی سانپ ہوں جس کی آنکھیں اُسے مسحور کر رہی تھیں.. وہ اُس آبی جادو کی سحر انگیزی میں گرفتار کب سے چپ بیٹھا ہوا تھا اگرچہ اُس کی چپ کے اندر جو خاموشی تھی وہ اُس سے ہم کلام ہو رہی تھی.. اے مصطفےٰ اسلام بے شک شاہ حسین کی نگری کی ڈور تمہیں باندھ کر پھر سے اپنی مٹی کی طرف لے آئی ہے لیکن تم تصور نہیں کر سکتے کہ وہ خانہ بدوش لڑکی جس نے ایک ایسے ہی آبی کنارے پر اپنے آپ کو تمہیں سونپ دیا تھا، جو بے شک عمر کی دبیز تہوں میں اپنے نین نقش کھو چکی ہے، پر جان لو کہ وہ اب ہر روز خراٹے نہیں لیتی کہ وہ رات بھر تمہارے بچھڑنے کے الم میں سوتی ہی نہیں ہے اور تمہاری لاڈلی جینا کب کی لوٹ چکی ہے اور وہ دونوں تمہاری واپسی کی راہ دیکھتی ہیں تو تم یہاں بیکار پڑے ایک بے مقصد اور بے محبت حیات کیوں بسر کرتے ہو..

اس لئے کہ مجھے بہرطور اپنے تخیل کی شکستگی پر.. نظریات کی بازی ہار جانے پر.. کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے.. کہ شکست کی رسوائی صرف موت کی سیاہی سے دُھل سکتی ہے.. جاپانیوں کی مانند ہاراکیری کا مرتکب ہو کر.. راجپوت رانوں کی طرح جوہر کی رسم ادا کرتے ہوئے اپنے آپ کو نذرِ آتش کر کے یا پھر غرناطہ کے چھن جانے پر ابوعبداللہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے مکمل آہنی جنگی لباس کے بوجھ کے ساتھ دریائے ابرو میں اتر کر اُس میں ڈوب کر شکست کے داغ کو دھونا ہے.. یا پھر.. راوی کے پانیوں میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے..

●○●○●○●

ہر گھر کی دیواروں پر زیبائش، سجاوٹ یا قدیم یادوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر.. کیلنڈر.. مصوری کے پرنٹ، مذہبی طغرے، وال کلاک.. اور تصویریں وغیرہ آویزاں ہوتی ہیں.. ان میں سے صرف کیلنڈر ہوتے ہیں جو اپنی معیاد پوری ہونے پر اتر جاتے ہیں، اگرچہ کچھ کی دیدہ زیبی اُنہیں مزید ایک دو برس کی مہلت دلا دیتی ہے، ان کے سوا سب سجاوٹیں دائمی بجی رہتی ہیں.. اگرچہ وہ خستہ حال ہوتی چلی جاتی ہیں، پرانی تصویروں کے بھورے اور معدوم ہوتے چہرے پہچانے نہیں جاتے اور اُن پر کوئی بھی نظر نہیں کرتا.. کبھی کسی کا دھیان نہیں جاتا، اُن کی مسلسل موجودگی اُن کو ناموجود کر دیتی ہے لیکن جب اُن میں سے کوئی ایک تصویر اپنے مقام پر نہ رہے، آج ہے اور کل نہیں، غائب ہو جائے تب ہر ایک کی نگاہ میں وہ خالی مقام آنے لگتا ہے جہاں کبھی ایک تصویر ہوا کرتی تھی.. دیوار پر اُس گمشدہ تصویر کا پورا چوکھٹا الگ سے نظر آنے لگتا ہے کہ آس پاس کا پینٹ تو مدھم ہو چکا ہوتا ہے لیکن اُس تصویر نے جس حصے کو ڈھانپ رکھا تھا وہاں کا پینٹ جوں کا توں الگ سے دکھائی دیتا ہے اور یوں دور سے وہ خالی ہو چکا حصہ ایک گھاؤ کی صورت نمایاں نظر آنے لگتا ہے.. اور وہ جو کبھی نظر نہیں کرتے تھے، اس مقام پر آویزاں تصویر کو قابل توجہ نہ سمجھتے تھے اب اُس کے خالی پن کی جانب متوجہ ہو کر ٹھٹک جاتے ہیں کہ ہائیں وہ تصویر کیا ہوئی.. اور اُن کے بدن کے اندر ایک ہول اٹھتا ہے کہ وہ تصویر کیا ہوئی..

ایک انسان بھی ایک ایسی ہی تصویر ہوتا ہے..

ایک انسان جس کی موجودگی سے اُس کی بیوی اور اولاد بے خبر اور بے پرواہ ہو جائے، اُس کی قدر نہ کرے.. وہ ایک ہی چھت تلے حیات کریں اور کوئی اُس انسان پر ایک نظر نہ کرے تو وہ بھی دیوار پر آویزاں ایک تصویر ہو جاتا ہے جسے کوئی نہیں دیکھتا.. لیکن جب وہی انسان یکدم منظر سے ہٹ جائے.. گم ہو جائے تو اُس کی تصویر کے چوکھٹے کا نشان دیوار پر نمایاں ہو جاتا ہے.. وہ بھی، اپنے گھر، بیڈ روم، وارڈ روب، اپنی پسندیدہ کُرسی پر بلکہ واش روم کے آئینے میں بھی اپنے بدن کے ہیولے کا ایک نشان چھوڑ جاتا ہے.. تب وہ سب جو اُس کی موجودگی سے غافل ہوا کرتے تھے، گھر، بیڈ روم، وارڈ روب، کرسی اور آئینے کے خالی پن کو دیکھتے ہیں تو اُن کے اندر بھی ایک ہول اٹھتا ہے کہ وہ انسان کیا ہوا..

ظہیر الدین کی رخصتی کے بعد کئی روز تک کسی نے بھی اُس کی کمی محسوس نہ کی.. گالینا اپنی آٹومیٹک جرمن وہیل چیئر میں براجمان واڈکا کے گھونٹ بھرتی امریکی فلمی رسالے پڑھتی رہتی، سویٹ لانا کو بالآخر ایک تھیٹر میں کھیلے جانے والے گوگول کے ڈرامے ''ڈیڈ سولز'' میں ایک اہم کردار مل گیا اور بورس.. وہ کامریڈ لینن کے مجسموں کی فروخت سے اپنے افغانستان میں کھوئے گئے بازو کے بل بوتے پر اتنا دولت مند ہو چکا تھا کہ اپنے گمشدہ بازو کی جگہ خالص سونے سے تراشا ہوا جس کے ناخنوں پر ہیرے جڑے ہوں ایک بازو لگوا سکتا تھا تو وہ جب کئی روز تک اپنی سہولتوں اور کامیابیوں میں مگن

اُس کی غیر موجودگی سے بے خبر رہے اور پھر ایک روز ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے، اگرچہ بورس اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا لیکن وہ کبھی کبھار ناشتے کے لئے اِدھر اپنی ماں اور بہن کو ملنے چلا آتا تھا ان تینوں نے بیک وقت اُس کرسی کی جانب دیکھا جس پر ظہیر الدین ایک سمجھوتہ کر چکے شخص کی مانند، ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے ہمیشہ بیٹھا ہوتا تھا اور وہاں ظہیر الدین کی بدنی بناوٹ کے تناسب سے وہاں وہاں لکڑی کا رنگ گہرا تھا اور بقیہ کُرسی پھیکی پڑ چکی تھی..

یہ اُس شب سے اگلی سویر کا قصہ ہے جب ان تینوں نے بیک وقت اُس خالی کرسی کی جانب دیکھا تھا.. اُس شب گالینا کے بدن پر جتنی بھی فالتو چربی چڑھی تھی، گُھل گئی.. چہرے پر جھرّیوں کے جو جالے تھے، آنکھوں کے گرد جو سیاہ حلقے اور پاؤں میں سوجن تھی، سب کے سب زائل ہوئے اور اُن میں سے ایک نوخیز چھریرے سے بدن کی اگرچہ قدرے صحت مند بیس برس کی گالینا نکل آئی اور وہ ایک سائیکل پر سوار جب کہ اُس کا پھولدار فراک ہوا کے زور سے بلند ہوتا اُس کی خوش نظر ٹانگوں کو عیاں کرتا تھا، اڑی جاتی تھی.. ماسکو کے نواح میں دریائے ماسکو کے کنارے کنارے ایک پگڈنڈی پر، برچ کے جنگلوں کی اُمڈتی سفیدی کی جانب وہ اُڑی جاتی تھی.. اور اسے اپنی پشت پر اُن دو آنکھوں کی سُلگاہٹ محسوس ہو رہی تھی جو اُس کے ہم جماعت پاکستانی نوجوان کی نوخیز زرخیزی اور جوانی کی مُنہ زور حدت کے پیام دیتی تھی.. وہ جانتی تھی کہ وہ بُرے حالوں میں اپنی سائیکل پر اُس کے پیچھے چلا آتا ہے، پگڈنڈی دریا کے کناروں سے بچھڑ کر جب برچ کے جنگلوں میں اترنے کو تھی تو گالینا نے پاؤں زمین پر جما کر سائیکل روکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا.. وہ وہاں نہیں تھا.. وہاں ایک بے سوار سائیکل کے ٹائر بدستور گھومتے جاتے تھے اور اُس پر اُس کے نوخیز بدن کی علامت کا ایک ہیولیٰ سا تھا.. وہ نہ تھا.. تب گالینا کے بدن کا تناسب پھیلنے لگا، فربہ ہوتا گیا.. اُس کے بدن پر کَسے ہوئے پھولدار فراک کے بخیے ادھڑنے لگے اور وہ اتنی وزنی ہوگئی کہ سائیکل کے ٹائر پچکنے لگے.. جھرّیاں پھر سے چہرے پر بچھ گئیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہوتے گئے اور اُس کے پاؤں پھر سے سُوج گئے اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی.. ڈبل بیڈ میں اُس کے برابر میں ہمیشہ کی طرح ظہیر الدین موجود نہ تھا.. بستر کی چادر پر اُس کے سراپے کا ایک پرنٹ ثبت تھا.. وہ نہ تھا..

ناشتے کی میز پر ان تینوں نے بیک وقت اُس کُرسی کی جانب دیکھا.. جہاں سر جھکائے، اپنے حال پر قانع، بے شکایت صابر شاکر ظہیر الدین ہوا کرتا تھا..

''بورس.. اپنے باپ کا پتہ کرو.. نہ ہم نے پوچھا اور نہ ہی اُس نے بتایا کہ وہ پاکستان میں کہاں جا رہا ہے.. شائد وہ اپنے آبائی قصبے کو لوٹا ہو جہاں وہ مجھے شادی کے بعد لے گیا تھا اور میں اُس کی گندگی اور پسماندگی سے مفاہمت نہ کر سکی تھی اگرچہ میں اُس کے پیار میں ڈوبی ہوئی تھی، اُس کا پتہ کرو.''

سویٹ لانا جو ابھی تک اُس خالی کُرسی کو متلاشی نظروں سے تکے جاتی تھی، سر اٹھا کر اپنے بھائی سے مخاطب ہوئی ''ہاں بورس.. میں اُن کی کمی محسوس کرنے لگی ہوں.. اُن کا پتہ کرو.''

اُس نے اپنے سامنے بیٹھے.. ایک عام تقریباً بھدّے نقش و نگار کے حامل رُوسی نوجوان کو دیکھا جس کے کوٹ کی ایک آستین لٹکی ہوئی تھی کہ اُسے بھرنے کے لئے ایک بازو نہ تھا.. اور وہ بار بار اُس کے ڈاچا کا وسیع لونگ روم.. چھت تلک

اُٹھتی شیشہ دیواریں اور اُن میں سے اُمڈتے اندر آتے جنگلوں سے متاثر ہوتا تھا کہ کیا میرا باپ واقعی ماسکو کے اس امیر ترین شخص کا قریبی دوست ہوا کرتا تھا..

''تم بورس ہو..ظہیر کے بیٹے؟''

''جی..سر۔''

اِن روسی عورتوں کی بچہ دانیوں میں جانے وہ کونسا ایسا نظام نصب کر دیا گیا ہے کہ اُن کے اندر جس رنگ جونسی قومیت کا بیج سرائت کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں جو بچہ اُن کی کوکھ میں سے برآمد ہوتا ہے، اپنے باپ پر نہیں جاتا..سراسر روسی شباہت کا ہوتا ہے..اپنی ماں کا ناک نقشہ اور رنگ قبول کر کے باپ کی نسل کو رد کر دیتا ہے..ویسے تو میرے ساتھ بھی یہی سانحہ ہوا ہے، میری روسی بیوی نے بھی کچھ ایسا اہتمام کیا ہے کہ میرے دونوں بچے نصرت اور رانجھا میرے نہیں لگتے، چہرے مُہرے سے کچھ شناخت نہیں ہوتا کہ میرے ہیں..اور یہ نوجوان جس کا ایک بازو کرسی پر آرام کرتا ہے اس میں کوئی ایک جھلک ایسی ہے جو ثابت کر دے کہ یہ ظہیر کا بیٹا ہے، البتہ ایک استثناء ہے..قالب کی بیٹی اور اُس آئیون خوفناک سمرنوف کی نواسی، لیلیٰ..اس نے اپنے باپ کے رنگ روپ جذب کر کے ایک مشرقی ملائمت اور دلکشی اختیار کی ہے..

''بورس..تم اُس کے دل کے قریب نہیں رہے ورنہ جان جاتے کہ وہ کہاں گیا ہے..وہ اپنے بزرگوں کی قبروں کی مٹی کے قریب ہوگا..کمیونسٹ نظام کے انہدام اور تمہاری بے اعتنائی نے اُسے واپسی پر مجبور کیا..وہ شاید کبھی واپس نہ آئے..''

''ہم..ہم تینوں..اُن کے بغیر نامکمل محسوس کر رہے ہیں..سر۔''

''تم اب جا کر نامکمل ہوئے ہو اور وہ کب کا نامکمل ہو چکا تھا..بوریوالا اتنا بڑا قصبہ نہیں ہے کہ اُس کا سراغ نہ لگایا جا سکے، میں تمہیں خبر کر دوں گا۔''

''تھینک یو سر۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ان روسیوں کے دل ایک بچے کی مانند حساس اور معصوم ہوتے ہیں، بظاہر کرخت شکل کے، منجمد چہروں والے لیکن اتنے جذباتی کہ بات بے بات پر رو دینے والے..بورس جب اپنی کرسی سے اٹھ رہا تھا، اپنی خالی آستین کو سمیٹ رہا تھا تو وارث چوہدری نے دیکھا کہ اُس نے آنکھوں میں اُمڈتے آنسو پوشیدہ کرنے کی خاطر اپنا منہ موڑ لیا ہے..

●○●○●○●

میں قصّے کہانیوں اور داستانوں کے تانے بانے جوڑنے والا ایک ایسا شخص ہوں جسے ان زمانوں میں ایک قصہ خواں یا داستان گو کہنے کی بجائے ناول نگار کہا جاتا ہے..میں جو بھی قصہ یا داستان اپنی محدود لیاقت کے بل بوتے پر جوڑتا ہوں وہ کبھی تو بغیر کسی رکاوٹ کے روانی کے ایک نرم بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے راستے میں کوئی چٹان یا کوئی ریتلا ٹاپو آ جاتا ہے اور قصّے کی روانی میں اٹک آ جاتی ہے..کہانی کے پانی اِدھر اُدھر ہو کر بہنے لگتے ہیں، مجتمع ہو کر ایک داستان کی صورت آگے نہیں بڑھتے..میری جوڑ توڑ کی صلاحیت..کس دھاگے کو کس رنگ کے دھاگے کے ساتھ جوڑنا ہے..کونسے کردار کو کہاں اور کس سے ملانا ہے تو وہاں میری یہ صلاحیت جواب دے جاتی ہے..اور میں قلم رکھ کر اُس خالی کاغذ کو گھورتا رہتا ہوں جو میرے لفظوں کی روانی کا منتظر ہوتا ہے..علاوہ ازیں ایک اور رکاوٹ بھی کبھی کبھار درپیش آ جاتی ہے کہ میں نے جو کردار تخلیق کیے ہوتے ہیں اُن میں سے کوئی ایک یا سب کے سب بغاوت کر دیتے ہیں، اگرچہ یہ میرے قلم کی روشنائی سے جنم لیتے ہیں، میں ان کا خالق ہوتا ہوں پھر بھی وہ مجھ سے برگشتہ ہو جاتے ہیں، سینہ تان کر میرے سامنے بدتمیزی سے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ تم نے بہت من مانی کر لی لیکن اب ہم بالغ اور باشعور ہو چکے ہیں، اس لئے تمہارے قلم کے تابع ہونے سے انکار کرتے ہیں، اب ہم اپنی حیات کے راستوں کا تعین خود کریں گے اور تم وہی کرو گے جو ہم خواہش کرتے ہیں اور ہم چاروں سردار قالب، مصطفیٰ اسلام، عارف نقوی اور ظہیرالدین کے بدنوں کے اندر کچھ ایسی جڑیں پھوٹ نکلی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ربط پیدا کرنے کی خواہاں ہیں..ہم چاروں کا المیہ اور نظریئے کے انہدام کی اداسی مشترک ہے تو ہم چاروں کے رنج اگر ایک ہیں، دل گرفتگی، عمر کا زوال اور مایوسی ایک ہے تو دراصل ہم ایک ہی شخصیت کے چار چہرے ہیں، ہمیں باہم کر دو، ایک دوسرے سے ملا دو..ورنہ ہم داستان کے اس مقام پر آ کر بچھڑ جائیں گے.. انہدام کے کھنڈروں میں دفن ہو جائیں گے اور مستقبل کا مؤرخ کبھی نہ جان سکے گا کہ ان کھنڈروں تلے کیسے کیسے خواب خاک ہوئے..تو اپنے تصور کو مہمیز دو، کچھ بہانے، کچھ فریب ایسے تخلیق کرو کہ ہم چاروں آپس میں مل بیٹھیں..

میری حالت اس دھمکی آمیز درخواست پر اس شکاری ایسی ہوگئی جو اپنے زعم اور نشانے بازی کے تکبر میں جانور کا پیچھا کرتا چلا جاتا ہے کہ میں جب چاہوں اسے ڈھیر کر لوں، یہ مجھ سے دہشت زدہ ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگا چلا جاتا ہے، پر جائے گا کہاں اور پھر یکدم وہ جانور پلٹ پڑتا ہے اور شکاری پر حملہ آور ہو جاتا ہے، اب اُسے اپنی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور وہ راہ فرار اختیار کرتا ہے..اب جانور شکاری ہے اور تم ایک شکار..وہ چاروں ابھی میرے اشاروں پر چلتے تھے، اور ابھی باغی ہو کر میرا پیچھا کرنے لگے تھے..

میں نے اپنے تخلیقی تصور کو بہتیری مہمیز دی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا..بہت روز تک میری سٹڈی ٹیبل پر لیمپ کی

روشنی میں بکھرے جو سفید کاغذ تھے کورے رہے.. مجھے ان چاروں کو آپس میں ملانے کا کوئی بہانہ نہ سوجھا جو اتفاق لگے، زبردستی کا غیر قدرتی میل ملاپ نہ لگے اور تب اُس تخلیقی بانجھ پن کے سناٹے میں شوکی جھوٹے کی سرگوشی سنائی دی.. میں چارپائی پر ایک چادر اوڑھے اس کے اندر روپوشی کی حالت میں جب موتیے کے جالوں سے بھری آنکھوں کو کھولتا ہوں تو مجھے گمشدہ لوگ دکھائی دینے لگتے ہیں.. اگرچہ میں نے اقرار کیا تھا کہ وہ چاروں میرے کشف کی حدیں پار کر گئے ہیں اور میں نے تم سے درخواست کی تھی کہ اس کے آگے اب تم اپنے تصور کے معجزاتی کرشمے دکھاؤ اور ان کی حیات کے راستوں کا تعین کرو لیکن تم کچھ دور چلے اور پھر تمہارا دم پھول گیا، تمہیں ان چاروں کو ملانے کا کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا.. اگر تم یہ تانا بانا جوڑنے سے قاصر ہو گئے ہو تو مجھے اجازت دو.. مجھے وہ جولاہا جانو جس کی عمر اسی نوعیت کے تانے بانے جوڑنے میں گزری ہے..

یہاں سے ناول نگار خارج ہوتا ہے اور داستان کی باگیں پھر شوکی جھوٹے کے ہاتھوں میں آ جاتی ہیں..

میں نے آج تک شعوری طور پر کبھی جھوٹ نہیں بولا..

اور اس کے باوجود عمر بھر جھوٹا کہلایا.. شوکی جھوٹا..

میں عرض کر چکا ہوں کہ اب میں توبہ تائب ہو چکا ہوں، اپنی آخرت سنوارنے کی خاطر غیب کے علم کو بروئے کار لا کر پوشیدگی کے رازوں سے پردے نہیں اٹھاتا.. لیکن کیا کروں اس محدود صلاحیت کے حامل اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکے بےچارے ناول نگار پر ترس آتا ہے جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اپنے چاروں کرداروں کی اتفاقی ملاقات کا اہتمام کیسے کرے تو میں اُس کی مدد کیے دیتا ہوں کہ غیب کے انکشاف کیے بغیر ایسا کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے تو محض ایک زرخیز ذہن اور ابتدائی دانش درکار ہے جو بےچارے ناول نگار کے نصیب میں نہیں ہے..

تو میں ان چاروں کو ملائے دیتا ہوں، اس میں کیا مشکل ہے..

ایک اکتاہٹ بھری، بےمقصد زندگی جس میں ایک بھی خواب نہ ہو.. روجا کے بلند آہنگ خراٹے ہوں، جینا کے خط کی آس ہو اور بالکونی کے نیچے بہتا ایک ہی ڈینیوب ہو اُسے ترک کر کے.. اپنے آبائی مکان میں آ بسیرا کرنا.. بےآرام تنہا راتیں بسر کرنا.. کبھی کسی تندور پر جا بیٹھنا، کسی تھڑے پر بیٹھ کر لاہوری بابوں کی جوانی کے بےسروپا قصے سننا.. اپنے بھائیوں کے شک بھرے چہرے دیکھنا، اپنی پھوپھی جانوں کے ہر ملاقات پر آنسو پونچھنا، راوی کے کناروں کی ریت میں دھنسے اُس کے پانیوں میں ڈوب جانے کی خواہش کرنا.. کامریڈ عارف نقوی کی واپسی کا منتظر رہنا کیا یہ ایک اور اکتاہٹ بھری، بےمقصد زندگی نہیں ہے..

شیراں والے گیٹ کے اندر جب وہ داخل ہوا تو وہ شام جو راوی کے پانیوں میں اتر رہی تھی اور وہ اپنے ٹھکانے کو لوٹنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوا... وہ شام شہر کی رات میں ڈھل چکی تھی، شاید بجلی کی کمی کی وجہ سے ڈبل کی بجائے سنگل فیز آ رہی تھی کہ اندرون شہر جتنی بھی سٹریٹ لائٹس تھیں، دکانوں اور گھروں میں جتنے بھی بلب روشن تھے وہ سب اتنے بجھے بجھے مدھم لگتے تھے جیسے وہ سب دیئے ہو گئے ہوں جن کی ناکافی روشنی دھندلائی ہوئی کوچۂ و بازار میں بھٹکتی پھرتی تھی، راہگیر

دھیان سے چلتے تھے، اُس نے رات کے کھانے کے اہتمام کے طور پر حاجی نہاری کے ہاں سے ایک پیالہ نہاری اور دو گرم روٹیاں پیک کروا لیں اور اب وہ اُن دونوں کی، نہاری اور روٹیوں کی حدّت شاپر بیگ میں سے سرایت کرتی اپنی انگلیوں کے پپوٹوں پر محسوس کرتا گھر کی جانب دیکھ بھال کر چلتا جاتا تھا کہ بجلی کے بلب بجھتے ہوئے چراغ سے بھی کم روشنی دے رہے تھے.. جب اُس نے کوچہ تیراندازاں کے قریب مقامی لوگوں سے الگ دکھائی دیتے ایک جوڑے کو دیکھا جو اُس کی جانب چلا آ رہا تھا..ایک قدرے گمشدہ سی کشش آمیز چہرے والی نوجوان لڑکی ایک بڑھتی ہوئی عمر والے شخص کے ساتھ جُڑی ہوئی..

نہ صرف وہ جس کی عمر کا تقاضا تھا بلکہ وہ بھی جو کہ ایک نوخیز غزال تھی، اگر دشت میں ہوتی تو چوکڑیاں بھرتی پھرتی، وہ بھی..تھک چکی تھی..

وہ دونوں صبح سویرے لوہاری دروازے کے باہر کرائے پر حاصل کردہ اپنی کار پارک کر کے قدیم شہر میں داخل ہوئے تھے.. چوک چکلا، سوتر منڈی، پانی والا تالاب، نوگزے کی قبر، ڈبی بازار، سُوہا بازار، گمٹی بازار، سنہری مسجد، کسیرا بازار، شاہی حمام..محلّہ ککے زئیاں، چڑی ماراں، رنگ محل، بارود خانہ، ہیرامنڈی..مسجد وزیر خان کے قریب خلیفے کی خطائیوں کا ایک چلتا پھرتا لنچ اور چل سو چل.. پہلے تو وہ جان بوجھ کر جدھر منہ آتا تھا، نکل جاتے تھے لیکن اب جب کہ وہ لوہاری دروازے تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ بھٹکنے لگے تھے..اور وہ اتنے بھٹک چکے تھے کہ مکّہ کالونی کے دل آزار اور بھدّے کمرے کی خواہش کرنے لگے تھے..اتنے تھک چکے تھے کہ سٹریٹ لائٹس کی بجھی بجھی روشنی کے سائے میں چلتا اُنہیں ایک ایسا شخص نظر آیا جو مقامی لوگوں کی مانند ڈھیلا ڈھالا نہ چلتا تھا، کمر سیدھی کیے ذرا خوش رفتاری سے قدم رکھتا چلا آتا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک پُھولا ہوا شاپر بیگ تھا..

''معاف کیجیے گا..'' قالب نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُس سے رُکنے کی درخواست کی ''میں اور میری بیٹی شہر کی بھول بھلیوں میں راستہ کھو بیٹھے ہیں، ہم لوہاری دروازے تک پہنچنا چاہتے ہیں..آپ کچھ راہنمائی کیجیے..''

مصطفےٰ اسلام مسکرا دیا، یہ شخص پنجابی ایک رکاوٹ کے ساتھ بولتا تھا جیسے کسی اور زبان سے ترجمہ کرتے ہوئے بولتا ہو''ویسے تو میں خود بھی یہاں ایک اجنبی ہوں اگرچہ یہ میرا آبائی شہر ہے، میرا خیال ہے کہ اگر آپ سیدھے چلتے جائیں تو چوک چکلہ میں جا نکلیں گے اور وہاں سے آپ کو لوہاری دروازے کا پھاٹک دکھائی دے جائے گا، زیادہ دور نہیں۔''

''شکریہ..'' اس شخص نے گردن میں خم دے کر کہا اور پھر اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر..روسی زبان میں کہنے لگا ''آؤ لیلےٰ..تم زیادہ تھک تو نہیں گئیں؟''

اگرچہ مصطفےٰ اسلام روسی میں کچھ زیادہ شُد بُد نہیں رکھتا تھا لیکن مشرقی یورپ کے دیگر کمیونسٹ ممالک کی مانند ہنگری میں بھی روسی کا چلن عام تھا..سکولوں میں یہ اختیاری نہیں لازمی مضمون ہوا کرتا تھا، روجا اور جینا آسانی سے روسی میں گفتگو کر سکتی تھیں اور وہ بھی اتنا آگاہ تو ہو چکا تھا کہ اس میں ادا کیا گیا ایک سادہ فقرہ آسانی سے سمجھ جائے کہ آؤ لیلےٰ..اُسے تجسس ہوا ''آپ یہاں کے نہیں ہیں؟''

''میں یہیں کا ہوں لیکن..ایک مدت سے ماسکو میرا گھر ہے..''

مصطفیٰ اسلام کا بہت جی چاہا کہ وہ فوراً کہہ دے کہ میں بھی یہیں کا ہوں لیکن ایک مدت سے بوداپیسٹ میں ہوں لیکن وہ ضبط کر گیا..

''یہ میری بیٹی ہے لیلیٰ جو میرے ساتھ چلی آئی ہے۔''

اُس کا پھر جی چاہا کہ وہ کہے کہ میری بھی ایک بیٹی ہے جینا..لیکن وہ میرے ساتھ نہیں ہے..

''مجھے سردار قالب کہتے ہیں..'' اُس نے بے وجہ اپنا تعارف کرایا..''شاید آپ جانتے ہوں میرے والد.. سردار سیماب..''

''آپ سیماب صاحب کے بیٹے ہیں..واقعی؟'' مصطفیٰ اسلام کے حواس ذرا معطل ہو گئے..اُس کے پُر جوش عہد جوانی کا..نہ صرف اُس کا بلکہ ایک پوری ترقی پسند نسل کا پسندیدہ شعلہ بیاں مترنم شاعر..ایک بار جمیعت کی بھرپور ڈنڈا بردار مخالفت کے باوجود اُس نے سیماب صاحب کو یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا تھا اور انہوں نے وہاں غدر برپا کر دیا تھا..''واقعی؟''

''جی..''

قالب نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو مطعون کیا کہ تم جس باپ سے شدید نفرت کرتے ہو اُسی کے نام کی چھابڑی لگا کر اپنی پہچان کروانے میں فخر محسوس کر رہے ہو..

''آپ..'' مصطفیٰ نے قالب کا ہاتھ تھام لیا ''آپ دونوں..میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں..آپ کے والد کا دیرینہ مداح ہوں، مجھے ان کا بیشتر کلام ازبر ہے تو پلیز..آپ کچھ وقت عنائت کیجئے..چائے کی ایک پیالی کم از کم میرے ساتھ پی لیجئے..یہ میرے لئے ایک اعزاز ہوگا۔''

قالب معترض نہ ہوا..

لیلیٰ نے اُسے ناراض نظروں سے دیکھا..یوں راہ چلتے کسی اجنبی کی چائے کی پیشکش فوراً قبول کر لینا اُسے اچھا نہ لگا..

●○●○●○●

آخر ایک انسان، عمر میں ڈھلتا ہوا انسان کب تک مکمل تنہائی کی اذیت برداشت کر سکتا تھا، کواٹر کی دیواروں پر چسپاں اُن پرانے پوسٹرز کو دیکھ سکتا تھا جن کا کاغذ جگہ جگہ سے بارشوں کے نم سے گرمیوں میں جُھلساہٹ سے شکستہ اور بوسیدہ ہو کر بھُر چکا تھا.. اگر کوئی غیر شخص اس کواٹر میں داخل ہو کر دیواروں پر نظر کرتا تو اُسے وہاں چپکی ہوئی کچھ دھجیاں چند چیتھڑے نظر آتے پوسٹر نظر نہ آتے.. جیسے ایک جگ سا پزل کے بہت سے ٹکڑے گمشدہ ہوں اور جو باقی ہوں اُن سے کوئی منظر یا تصویر نہ بنے.. لیکن ظہیر الدین کے لئے سب تصویریں صاف اور مکمل حالت میں وہاں موجود تھیں، وہ اس جگ سا پزل کے بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل جانے والے سب ٹکڑے اپنی یادداشت کے سہارے وہاں جوڑ سکتا تھا جس مقام کو اُنہوں نے بوسیدہ ہو کر چھوڑا تھا.. کُھلے کواڑوں میں سے ہوائیں عدم کے بگولوں کے پیغام لاتی پُرشور ہوتی تھیں..

وہاں.. مارکس کا چوڑا ماتھا ابھی تک چپکا ہوا تھا لیکن اُس کی سیاہ داڑھی کی جگہ دیوار کا اکھڑا ہوا پلستر نظر آ رہا تھا تو ظہیر الدین اُس کی داڑھی کو اپنے تصور سے تخلیق کر کے پلستر پر چپکا کر تصویر مکمل کر سکتا تھا.. لینن کا پورا چہرہ غائب تھا البتہ تھری پیس سُوٹ کی کچھ دھجیاں موجود تھیں.. اب بھلا جس چہرے کا وہ بیوپاری رہا ہو وہ اُسے بھول سکتا تھا بلکہ اُس کے ذہن کی دیوار پر تو ان سینکڑوں فروخت ہو چکے لینن کے مجسّموں کا ہر چہرہ ثبت تھا تو وہ اُن میں کسی ایک چہرے کا انتخاب کر کے تھری پیس سوٹ کی دھجیوں کے اوپر چپکا سکتا تھا.. اسی طور سٹالن کی گم شدہ گھنی مونچھوں کو تلاش کرنے میں بھی کچھ دشواری نہ ہوتی اور اُس کا پوسٹر بھی مکمل ہو جاتا..

بہرطور کب تک تنہائی کی اذیت میں وہ ان متروک شدہ اشتراکی خداؤں کے چیتھڑوں اور دھجیوں کو تکتا رہے اور اُن کی تصویریں مکمل کرتا رہے..

اور کب تک وہ ایک ایسے کنویں میں جھانکتا رہے جس کی گولائی کی نم آلودگی میں سے پھوٹنے والی جڑوں کے جال میں ماضی کے منظر اُلجھے ہوئے نظر آتے تھے.. اُس کے دل میں سردار قالب سے ملنے کی آرزو کی جڑیں پھوٹنے لگیں، تاشقند سے لاہور تک کے ہوائی سفر کے دوران وہ اُس کی سادگی اور معصومیت سے بہت متاثر ہوا تھا حالانکہ وہ ماسکو کے باثر اور ماضی کے غضب ناک یُوری سمرنوف کا داماد تھا.. یہ سرخ سویرے کا خواب نہ تھا جس نے اُسے سوویت یونین میں دھکیل دیا تھا بلکہ رزق روزگار کی مجبوری تھی اور اس کے باوجود وہ اُس کے لئے ایک جذباتی نزدیکی محسوس کرتا تھا.. اُسے ملنا چاہیے..

خاک ہو چکے چہرے کا تھری پیس سُوٹ کواٹروں میں سے بے دریغ داخل ہوتی ہواؤں کی زد میں آ کر پھڑ پھڑانے لگا کہ وہ بھی چند روز کا مہمان تھا اور پھر کواٹر کی دیوار کے خالی پن کا سایہ وہاں رہ جاتا تھا.. جیسے سرخ سویرے کا بس سایہ باقی رہ گیا تھا..

''آخر کب تک بلٹرڈ..''

صبح کی نرم دھوپ میں مالی بابا کے کواٹر کے باہر ایک آرام کرسی پر براجمان عارف نقوی..اور ابھی ابھی چھت کے پانچویں شہتیر کی کھوکھلی ہو چکی لکڑی میں راتوں کو سرسراتا سانپ اُس کے پاؤں کے ساتھ سرکتا جیسے جان بوجھ کر اُسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتا ہو، ایک افیونی کی مانند سستی سے سرکتا اُس کھیتی کی باڑ کی گھناوٹ میں اتر گیا تھا جب عارف نقوی نے اپنی جیکٹ پر پیار کا ہاتھ دھرتے ہوئے کہا ''آخر کب تک بلٹرڈ..میں نے کل صبح..اور یہ کوئی ناروا پیشکش نہ تھی، اصولی بات تھی کہ اگر میں بے شک اپنے ارجن آغا کے بیٹے کے گھر میں..بے شک ایک مالی کے متروک شدہ کواٹر میں پڑا ہوا ہوں اور مجھے تین وقت کا کھانا بصد اہتمام پہنچ رہا ہے تو میں کیسے کچھ ادا کیے بغیر یہاں ٹھہرا رہوں..چنانچہ میں نے نہایت لجاجت سے شرمندہ ہو کر آغا ہمایوں کو پیشکش کی تو وہ ایک عجیب سے ملال میں آ گیا..اس قدر رنجیدہ ہوا کہ مجھے بھی پچھتاوے سے دوچار کر دیا بلکہ میں مجرم محسوس کرنے لگا..بلٹرڈ مجھے معلوم ہے کہ تم کچھ رقم کی ادائیگی کی پیشکش کو ہرگز ایک قباحت نہ سمجھتیں کہ یورپی تہذیب میں اس نوعیت کا حساب کتاب ایک نارمل بات ہے، باپ بیٹوں کے درمیان بھی چلتا رہتا ہے لیکن یہ مشرق ہے... یہ لوگ رشتوں اور قربتوں کے معاملے میں حساب کتاب کو گناہ جانتے ہیں.تم جانتی ہو اُس نے رنجیدہ ہو کر کیا کہا..آپ..میرے پاپا کے دوست ہیں..اور..پاپا نے تو مجھے کبھی ایسی پیشکش نہ کی تھی، اُن کی طرح آپ کا بھی حق بنتا ہے مجھ پر..پلیز..'' اور ہمایوں کی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں..میں نے شرمندہ ہو کر اُسے گلے لگا لیا اور معذرت کی..

بلٹرڈ..تمہارا کیا خیال ہے، کیا اس عمر میں میں اداکاری کے میدان میں داخل ہونے کے لائق ہوں..میں اس کے بارے میں بہت سوچ بچار کرتا ہوں..میں یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے اس کرسی پر تو بیٹھا نہیں رہ سکتا، وہ میرا رہائشی رفیق سانپ بھی ہر صبح میرے نزدیک سے سرکتے ہوئے کیا سوچتا ہوگا کہ یہ شخص کتنا بیکار ہے..مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا..اور بلٹرڈ میں نے اُس سے وعدہ بھی کیا تھا کہ میں لوٹ کر آؤں گا..مجھے مصطفیٰ اسلام سے ملنے کی چاہت ہو رہی ہے.تم اسے جانتی ہو..اُس نے تو تمہیں سلام بھیجا تھا اور تم نے جواب میں وعلیکم السلام کہا تھا..یاد ہے؟

وہ پیالی جسے کبھی اہتمام سے دھویا نہ گیا، اُس کے کناروں پر میل کی سیاہی کے آثار تھے اور اُس میں جو چائے انڈیلی گئی تھی، وہ جوں کی توں ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اُس کی نیم سیاہ رنگت پر موم بتیوں کی روشنی عکس ہوتی تھی..لیلے ٹانگیں پسارے اُس کمرے کے فرش پر جس کی رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے نیچے بازار میں بہتی گہما گہمی کی بھنبھناہٹ اوپر آتی تھی..گھوک سوئی ہوئی تھی..وہ پیالی لیلے کے سمٹے ہوئے بازو کے قریب پڑی تھی..اور وہ دونوں نیم دراز نیند سے کوسوں دور باتیں کرتے تھکتے نہ تھے..

صرف ایک بار اس دوران لیلے نے سر اُٹھایا، نیند بھری آنکھوں کو بمشکل کھولا اور یہ نہ جان سکی کہ وہ کہاں ہے اور پھر سے تھکاوٹ اور نیند سے مغلوب ہو کر بے سُدھ ہو گئی..

اُن دنوں کے درمیان کوئی دوری نہ رہی تھی کہ ان دونوں کی زندگی کے بکھیڑوں نے ایک ہی ڈگر پر چلتے انہیں

بے وطن کیا تھا.. مصطفیٰ اسلام ابھی کچھ دیر پہلے کے اُس سے لوہاری دروازے کا راستہ پوچھتے اجنبی کے سامنے اپنی گزشتہ حیات کے کل نقشے پھیلا کر بیان کر چکا تھا کہ وہ کن راستوں پر چلتا، کیسے بوداپسٹ جا پہنچا اور پھر وہیں کا ہو رہا..

''مصطفیٰ صاحب..'' قالب کی انکساری بدستور موجود تھی ''میں آپ کی طرح ایک نظریاتی شخص نہ تھا.. آپ کی مانند کبھی بھی میری آنکھوں میں وہ جگنو نہیں ٹمٹمائے تھے جن کی روشنی بھی سُرخ دکھائی دیتی تھی.. میں ایک بے غرض جاں نثار نہ تھا، مجھے.. سردار سیماب کا بیٹا ہونے کے باوجود نہ تو اشتراکیت سے کچھ لگاؤ تھا اور نہ ہی میری فہم کے درجات ایسے بلند تھے کہ میں دنیا بھر کے مزدوروں اور دہقانوں کا درد اپنے سینے میں محسوس کر سکتا۔ میرے لئے تو نیشنل عوامی پارٹی کے ایک سرکردہ لیڈر کی ماسکو میں تعلیم حاصل کرنے کی پیشکش اپنی نالائقی اور بیکاری سے فرار ہونے کی ایک سبیل تھی.. محض ایک مجبوری تھی، میں آپ جیسے لوگوں کی ہمسری نہیں کر سکتا۔''

حاجی کی نہاری جس شاپر بیگ میں ابھی تک حدّت میں تھی، جب اُس نے لوہاری دروازے کا راستہ پوچھا تھا، اب نہ صرف ٹھنڈی ہو چکی تھی بلکہ اس میں شامل چربی زرد ہو کر لوتھڑوں میں بدل چکی تھی..

دروازہ اگرچہ کھلا تھا پر وہاں کوئی نہایت ادب آداب سے ہولے ہولے دستک دیتا تھا.. شاید یہ پہلوان ٹی سٹال کا چھوٹا تھا جو چائے کی پیالیوں کے لئے آیا تھا.. اگرچہ وہ تو دروازے کو دھڑ دھڑ پیٹتا تھا..

''آ جاؤ بھئی..'' مصطفیٰ اسلام نے اس مخل اندازی سے بیزار ہو کر کہا..

دروازے کے عقب میں سے، آہستہ سے کواڑ دھکیلتے ہوئے پہلوان ٹی سٹال کے چھوٹے کا چہرہ نہ تھا، عارف نقوی کے سفید بال اور گوری رنگت کی پُرکشش شباہت تھی اور وہ کورنش بجالانے والے جھکاؤ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، موم بتیوں کی ناکافی روشنی میں تعین نہ کر سکا کہ اندر مصطفیٰ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہے اور اس نے برلن کے اپنے خصوصی آنکھوں کے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل بھی نہ کیا تھا کہ ہرنا کوی.. آئی ایم سوری لیکن آپ کی نظر مزید کمزور ہو چکی ہے اس لئے آپ اپنی دور اور نزدیک کی عینکوں کے شیشے فوری طور پر نسخے کے مطابق تبدیل کروا لیجیے.. تو اُسے یوں بھی دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا'' کامریڈ میں آپ کی خلوت میں مخل تو نہیں ہوا.. میں بہت روز سے آنا چاہتا تھا اور آج صبح جب میرا وہ روم میٹ سانپ جان بوجھ کر میرے پاؤں کے ساتھ اپنا لچکیلا بدن مَس کرتا گزرا تو..'' عارف نقوی ٹھٹک گیا، وہاں مصطفیٰ کے سوا کچھ اور لوگوں کی موجودگی بھی محسوس ہوتی تھی..'' میں.. آئی ایم سوری.. مُخل ہوا ہوں۔''

''چلیے آئیے کامریڈ..'' مصطفیٰ اسلام اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا کہ یہ شخص اپنے لکھنوی ادب آداب ابھی تک نہیں بھولا.. اُس نے اٹھ کر ایک بوکھلائے ہوئے عارف نقوی کا ہاتھ تھام لیا'' آپ کو ایک اور کسی حد تک کامریڈ سے ملاتے ہیں.. یہ روس کے لوگ ہیں.. سردار قالب.. سردار سیماب کے صاحبزادے..''

''واقعی؟'' بچوں ایسی ایک معصوم دمک نے عارف نقوی کے چہرے کو روشن کر دیا'' اپنے سردار سیماب صاحب کے..''

مصطفیٰ اسلام نے آج کی شب کی اتفاقی ملاقات کا حوالہ دے کر قالب کا مختصر تعارف کروایا..'' مجھے ایک زمانے میں سیماب صاحب کا تقریباً تمام کلام ازبر تھا..'' عارف نقوی کے لہجے میں ایک بھرپور اشتیاق تھا'' اور میں اُن کے تتبع میں

ترقی پسندوں کی محفلوں میں اسے ترنم سے پڑھا کرتا تھا، آپ کو اپنے عظیم انقلابی باپ پر کتنا فخر ہوگا، اس کا میں اندازہ نہیں لگا سکتا..''

''جی ہاں..آپ ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے۔''

عارف نقوی کی آنکھیں موم بتیوں کی مدھم روشنی کی عادی ہوئیں تو اُس نے آس پاس نظر کی..کمرے کے ایک کونے میں جہاں موم بتیوں کی روشنی پہنچتے پہنچتے مزید مدھم ہوتی تھی، ایک یورپی لڑکی ٹانگیں پسارے منہ کھولے نیند میں مدہوش پڑی تھی۔

''جی ہاں، آپ ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے..مجھے اپنے عظیم انقلابی باپ پر بے حد فخر ہے..اگرچہ وہ اپنے انقلاب کو گھر کی چوکھٹ کے باہر چھوڑ آتے تھے..''

''یقیناً..'' عارف نقوی نے بے دھیانی میں تائید کر دی..

''میری بیٹی ہے لیلیٰ..'' قالب نے عارف نقوی کو ایک بار پھر ادھر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے دیکھا تو کہا..

''جی ہاں..'' عارف پھر بوکھلا گیا..

ہر شب کی مانند آج بھی رنگین شیشوں والی کھڑکی کی سِل پر تین موم بتیاں جلتی تھیں..اُن میں سے درمیان والی کا شعلہ جیسے کسی غیر محسوس جھونکے کی زد میں آ کر پھڑ پھڑایا اور دم توڑ گیا۔

''کامریڈ..'' عارف نقوی اپنے سفید بالوں کو جوانی کی ودیعت کردہ ایک غیر شعوری عادت کے تابع ہتھیلی کی مدد سے ماتھے سے ہٹا کر سنوارتے ہوئے بولا..''آخر کب تک؟''

مصطفےٰ اسلام کچھ دیر اُس بے وجہ بجھ چکی موم بتی کے رنج میں رہا اور پھر سر ہلا کر کہنے لگا..''ہاں کامریڈ..آخر کب تک..''

اُن دونوں کے درمیان ایک غیر مرئی بندھن تھا، ایک ڈور ایسی انہیں منسلک کرتی تھی کہ وہ آگاہ ہو گئے اُس پوری صورتِ حال سے جو انہیں درپیش تھی جس کے نتیجے میں یہ سوال اُن کے ذہنوں کو کچوکے دیتا تھا کہ..آخر کب تک..

''تمہارا معاملہ مجھ سے سراسر جدا ہے کامریڈ..ہم دونوں کے ترکِ وطن کہہ لیجیے کا جواز الگ ہے..تم تو ایک بھرا پُرا گھر، ابھی تک تمہاری الفت میں مبتلا ایک جیسی بیوی کو چھوڑ آئے لیکن میرے پاس وہاں کچھ بھی باقی نہ رہا تھا جو میرے قدم روک سکتا..بلنڑڈ کے مرنے کے بعد آخر میں کتنی راتیں تنہا اُس کے بچھڑنے کے الم میں ڈوبا رہتا اور جب وہ بستر سے اس احتیاط سے الگ ہوتی تھی کہ میری نیند میں خلل نہ پڑے، دبے پاؤں واش روم میں جاتی تھی تو اُس کا دروازہ بھی بند نہیں کرتی تھی تا کہ اُس کی کھٹاک سے میری آنکھ نہ کھل جائے وہ میرا اتنا دھیان رکھتی تھی..تو وہاں جس فلیٹ میں اُس کے قدموں کی چاپ ہمیشہ کے لئے دفن ہو چکی ہے، میں وہاں..اور وہاں برلن میں ایک خصوصی جرمن بیگانگی بھی تو تھی جو بلنڑڈ کی موجودگی میں مجھے کبھی محسوس نہ ہوئی..برابر کے فلیٹ میں مقیم کسی شخص سے اگر راہداری میں سامنے ہو جاتا تو آپ اسے صبح بخیر کی خواہش تو کر سکتے تھے لیکن یونہی یہ سوال نہیں کر سکتے تھے کہ جناب آپ آج سویرے سویرے کہاں جا رہے ہیں..کہ یہ ذاتی زندگی میں مداخلت تصور کی جاتی تھی اور وہ شخص خفا بھی ہو سکتا تھا..بلنڑڈ کو مرے ہوئے ایک ماہ سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا جب ایک ہمسائے نے لفٹ کے سفر کے دوران پوچھا کہ ہرناکوی، بہت دنوں سے آپ کی اہلیہ نظر نہیں

آ ئیں.. مجھے امید ہے وہ خیریت سے ہوں گی..اور یہ بھی اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کہیں میں برا نہ مان جاؤں..تو میرے پاس اور کوئی آپشن نہ تھا..'' عارف نقوی کو احساس ہوا کہ وہاں قالب بھی موجود ہے جو ایک لاتعلقی کی حالت میں قدرے بیزار بیٹھا ہے۔''سوری..آپ کو بھی میرے ذاتی معاملات میں آخر کیا دلچسپی ہو سکتی ہے..لیکن میں بہت دنوں کے بعد مصطفےٰ سے ملا ہوں اور پورے شہر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں جسے میں اپنی الجھنوں میں شریک کر سکوں۔''

قالب جسے حالات نے فرمانبرداری کے سانچے میں ڈھال دیا تھا کندھے سکیڑ کر بولا'' پلیز سر..میں بیزار نہیں ہو رہا۔''اگرچہ وہ ہو رہا تھا..

''محترم عارف نقوی صاحب..'' مصطفےٰ اسلام کے نوخیز لگتے چہرے پر..وہی چہرہ جو کبھی پنجاب یونیورسٹی کے زمانوں میں..سینٹ ہال میں،تقریبات اور جلسے جلسوں میں،ایشیا سرخ ہے کہ نعرے لگا تا تمتما تا سرخ ہوتا تھا، اُس پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے جنم لیا اور پھر وہ مسکراہٹ یوں اُس کے چہرے پر پھیلی جیسے وہ فاتر العقل ہونے کو ہو'' تم یقین نہیں کرو گے کہ یہی سوال بہت روز سے ان شب و روز کی لایعنیت سے اُکتا اُکتا کر میں اپنے آپ سے پوچھتا رہتا ہوں کہ آخر کب تک..مجھے یہ اقرار کرنے میں کیا شرمندگی ہو سکتی ہے کہ میری بیوی کے خراٹے اتنے زوردار ہوتے ہیں کہ وہ ڈینیوب پر کھلتی بالکونی میں مجھ تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کے باوجود مجھے اُس کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی ہے..میں نے اس دوران اپنے آپ سے بہت سے سوال کیے اور کچھ کے جواب بھی آئے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خوابوں کے انہدام کا عظیم المیہ اپنی جگہ لیکن یہ جو یادِ وطن کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے..یہ فرقتِ وطن کی بیماری، اپنی مٹی کی جانب لوٹ جانے کی خواہش کا کینسر..یہ سب خود فریبی کی پیدا کردہ علتیں ہیں۔ایک رومانوی ڈھکوسلا ہیں، اپنے آپ کو ہمہ وقت اذیت میں مبتلا رکھنے کے بہانے ہیں ورنہ حقیقت میں فرقتِ وطن وہ ہڈی ہے جس پر تم اپنے دانت جمائے اُسے بھنبھوڑتے رہتے ہو اور پھر اپنے ہی مسوڑھوں میں سے رِسنے والے خون کے ذائقے سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہو..وطن..کوچہ کماگراں میں یہ میرا آبائی گھر، میری بہک چکی پھوپھیاں..مجھ سے بے اعتنا میرے بھائی..یہ شب و روز جن میں حاجی کی نہاری، داس قلچے، خلیفہ کی خطائیاں، چاچا گام کا دیگچہ اور تنگ گلیوں کی نالیوں میں رُکی ہوئی گھنی غلاظت، شہر کے شجر، پرندے اور لوگ مجھے نہیں پہچانتے..بے شک ایک زمانے میں یہی میرا وطن تھا لیکن..میں نے اس سے جدا ہو کر ایک اور وطن میں اس کی نسبت زیادہ برس گزارے ہیں..وطن دراصل وہ ہے جہاں..آپ کے وجود کی ضرورت ہو..آپ کو چاہنے والی کچھ ایسی روحیں موجود ہوں جن کا گزارہ آپ کے بغیر نہ ہو سکے..جس کی خوراک، آب و ہوا اور ثقافت کے آپ عادی ہو جائیں..جیسے محبت کو بے شک آپ ایک رومانوی الوہی مدغم پن کہہ لیں..لاکھ تو جیہیں گھڑ لیں، لیکن محبت صرف ایک چہرے کی مسلسل رفاقت اور اُس کی عادت ہو جانا ہے..میں تقریباً ہر شام یہاں سے نکل کر راوی کے کناروں پر جا بیٹھتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک تاریخی اور رومانوی فریب دیتا ہوں کہ یہ میرے پانی ہیں، میرے آباؤ اجداد صدیوں سے ان کے کناروں پر پیدا ہوتے مرتے چلے آئے ہیں لیکن..کامریڈ..یہ پانی اب مجھے پہچاننے سے انکاری ہوتے ہیں، ان پر میرے لئے ایک لاتعلق غیریت اور اجنبیت بہتی چلی جاتی ہے..جب کہ ڈینیوب کے پانی..''

''تو پھر تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے..میرے پاس تو کوئی متبادل نہیں..تمہارے پاس تو ہے..''

''لوٹ جانے کے لیے..تا کہ میری عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو مجھے کسی بہانے، کسی سہارے کی ضرورت ہے.. جیسے گاؤں کی ایک الھڑ مُٹیار..جذباتی ہو کر اپنی ساس اور خاوند سے ناراض ہو کر گھر سے نکل گئی اور اس آس میں گاؤں سے باہر کھڑی رہی کہ کوئی نہ کوئی تو مجھے منانے کے لئے آئے گا اور جب کوئی نہ آیا تو جب شام ڈھلے ڈھور ڈنگر گاؤں کو لوٹتے تھے تو اُس نے ایک بھینس کے سینگوں میں اپنا دوپٹہ پھنسالیا اور اُس کے ہمراہ واپس جاتی احتجاج کرنے لگی کہ..اڑیے میں نے گھر نہیں جانا..تم کیوں مجھے زبردستی لئے جاتی ہو تو کا مریڈ..مجھے بھی ایک ایسے ہی بہانے کی ضرورت ہے.''

لیلےٰ اپنی تھکاوٹ میں دُھت ایک کونے میں ابھی تک مدہوش پڑی تھی..قالب نہایت تحمل سے ان اتفاقی دوستوں کی اتفاقی محفل میں نہایت تحمل سے ان کی گفتگو سنتا رہا اور پھر ذرا ہمت مجتمع کر کے دخل اندازی کر دی ''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی آپ کی اس گفتگو میں شریک ہو جاؤں، جس میں میرے دل کی باتیں بھی کہی جا رہی ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم تینوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں جو اپنی من مرضی سے اپنے دیس کی مٹی کی چاہت میں مسافر ہوئے تھے اور اب شاید پچھتا رہے ہیں کہ ہم نے ساحل کیوں چھوڑا..آپ سے میری کیفیت کچھ جدا نہیں..میں بھی اپنے بھائی کے گھر میں، مکّہ کالونی کے ایک ایسے کمرے میں جس کی دیواریں ننگی ہیں، پلستر سے آشنا نہیں اور جس میں ایک ہی روزن ہے جس میں سے اکثر بلند آہنگ دل خراش صدائیں آتی ہیں، وہاں لیلےٰ کے ہمراہ سوچتا رہتا ہوں کہ آخر کب تک..اور یہ اقرار کرتے ہوئے شرمندگی سی ہوتی ہے کہ مجھے اپنی ادھیڑ عمر روسی بیوی بھی شدت سے یاد آنے لگی ہے..بلال میرا بیٹا، جس کے چہرے پر ایک خصوصی روسی سفا کی کُھدی ہوئی ہے..میں اُس کی جدائی بھی برداشت کرنے کی سکت کھو بیٹھا ہوں..تو مجھے بھی لوٹنے کے لئے ایک بہانے کی ضرورت ہے۔''

''قالب صاحب..'' عارف نقوی پہلی ملاقات پر ہی کُھل جانے والا شخص نہ تھا لیکن ایک ہی کشتی کے مسافر تا دیر اجنبی رہنا افورڈ نہیں کر سکتے ''مصطفےٰ کے پاس لوٹنے کا جواز ہے۔آپ کے پاس اس وطن میں بھی اپنے باپ کی انقلابی شاعری کی پہچان ہے جب کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''

''مجھے..عارف نقوی صاحب..'' قالب کے چہرے کے اندر جو رگیں اور شریانیں بجھی تھی، اُن میں ماضی کے زہر گردش کرنے لگے'' مجھے یہ پہچان درکار نہیں..میرے باپ کے اندر..اپنے خاندانی پس منظر کی پس ماندگی کا ایک شدید احساسِ کمتری تھا جسے پوشیدہ کرنے کی خاطر وہ ترنم میں اپنے انقلابی گیت گاتا تھا اور اُس کا انقلاب اپنے گھر کی چوکھٹ پر آ کر دم توڑ جاتا تھا۔جس چوکھٹ کے پار اُس کے بچے اور میں اُن میں سے ایک تھا، بھُو کے سو چکے ہوتے تھے..تو وہ میری پہچان نہیں ہے!''

مصطفےٰ اسلام اور عارف نقوی ایک صدمے میں چلے گئے..کہ اُن کے انقلابی آئیڈیل کا بیٹا اُن کے خواب مسمار کر رہا ہے..

''ڈیڈی...'' لیلےٰ نے اپنی پھیلائی ہوئی ٹانگیں سکیڑیں اور غنودگی میں سے باہر آ کر ایک طویل جمائی کے اختتام پر دو موم بتیوں کی ناکافی روشنی میں اُن تینوں کے چُپ چہروں پر نظر کی ''گھر نہیں جانا..میں بہت تھک چکی ہوں۔''

●○●○●○●

رات کے اس پہر فردوس مارکٹ کی بیشتر دوکانوں کے شٹر گر چکے تھے...البتہ سُمن آرکیڈ کی گیلری میں تین چار بےفکرے اپنے گھربار سے لاتعلق، اُن بچوں سے بے پرواہ جواُن کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے اور اُس بیوی کے وجود سے بےخبر جو رات کے اس پہر بستر کی چادر پر کروٹیں بدلتی شکنیں ڈالتی تھی، آنکھوں میں اترتی نیند کو جھٹکتی تھی کہ اُس نے اپنے خاوند کی آمد پر نہ صرف گیٹ کی کُنڈی کھولنی تھی بلکہ رات کا کھانا گرم کرکے اُس کے آگے بھی رکھنا تھا..یہ تین چار بےفکرے سٹار پلس کے ہندوستانی سوپ آپرا کی آج کی قسط پر جو گیارہ بجے ختم ہوئی تھی، زور شور سے بحث کر رہے تھے اور چائے سُرک رہے تھے..بیشتر دوکانوں کے شٹر گر چکے تھے لیکن ایک دوسرے کے آمنے سامنے واقع سبزی اور پھلوں کی دو دوکانیں ابھی تک زرق برق روشنیوں میں نہائی ہوئی چکاچوند ہو رہی تھیں..ادھر اللہ رکھا اور اُدھر حاجی صاحب چوکنے شکروں کی مانند ایک دوسرے کی دوکانوں کے سامنے ٹھہرنے والے گاہکوں کا جائزہ لے رہے تھے کہ کہیں میرا یہ گاہک فریق مخالف کے بہکانے سے اُدھر تو نہیں چلا گیا..وہ بھی آسانی سے فردوس مارکیٹ کے دیگر دوکانداروں کی مانند نو دس بجے رات تک اپنی دوکانیں بڑھا کر گھر جا سکتے تھے لیکن کاروباری رقابت اس انتہا کی تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی دوسرے سے پہلے دوکان بند کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور یوں وہ ساری رات اونگھتے، چوکنے ہوتے، تاکتے گزار دیتے تھے..دو چار مرتبہ اُن کا سرِ بازار فری سٹائل دنگل بھی منعقد ہو چکا تھا..

اگرچہ سردار قالب تو آگاہ نہ تھا لیکن یہ مارکٹ..وہ فردوس نہ تھا، جس کا وعدہ تھا بلکہ وہ فردوس تھی جو پنجابی فلموں میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکتی، پورے بدن سے یوں ہونکتی جیسے اُس کے اندر پانی کھینچنے والا ڈنکی پمپ نصب ہو اور اولمپک معیار کی ہائی اور لونگ جمپیں بے دریغ لگایا کرتی تھی..اُس نے بھلے وقتوں میں جب اُس پر ہُن برستا تھا، بُرے وقتوں کے لئے اس ہُن کا کچھ حصہ پس انداز کر لیا تھا اور تب گلبرگ کی ویرانی میں ایک کمرشل مارکٹ اور اُس کے سامنے اپنے لئے ایک رہائش گاہ تعمیر کر لی تھی..ان دنوں جب اُس کے زمانوں کی بیشتر ہیروئنیں زبوں حالی کا شکار ٹیلی ویژن ڈراموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کر کے گزر اوقات کرتی تھیں وہ ایک اگرچہ مجرد لیکن بےفکر حیات بسر کرتی تھی اور کم از کم اُس کے نام سے جانی جانے والی مارکٹ کے دوکاندار اور ٹھیلے والے جب کبھی وہ نظر آ جاتی اُسے میڈم کہہ کر پکارتے تھے..

قلب نے کرائے پر حاصل کردہ کار واپس کر کے وہاں سے ایک رکشا حاصل کر لیا تھا جس کے ڈرائیور نے فردوس مارکٹ کے آگے مکہ کالونی کی بھول بھلیوں میں جانے سے انکار کر دیا تھا..

اُن دو چار بےفکروں نے رکشے میں سے اُترتے اُدھیڑ عمر شخص اور اُس کے ہمراہ جو میم تھی، اُس پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دی..وہ ان دونوں کو اتنی بےخوفی اور ڈھٹائی سے تکتے جاتے تھے جیسے وہ سینما کی سکرین پر حرکت کرتے ہوئے

کردار ہوں جنہیں دیکھنے کے لئے انہوں نے نہایت مہنگے ٹکٹ خریدے تھے..قالب نے ان کی نگاہوں کی زد میں لیلیٰ کے بدن کو آتے دیکھا تو اُس کے اندر طیش کا ایک اُبال آیا جسے اس نے بمشکل قابو میں کیا..وہ اپنے ہم وطنوں کی اس خواہ مخواہ کسی بھی عورت کو دیکھے جانے، اُس کے سراپے کا جائزہ لیتے چلے جانے اور اس پر آنکھیں مرکوز رکھنے کی سفلی عادت سے مفاہمت نہ کر سکا تھا.. یہاں تک کہ بوڑھے اور باریش حضرات بھی یکدم ٹھہر کر آس پاس سے غافل ہو کر لیلیٰ کو گھورنے لگتے..یہ ایک بیکار اور بے مقصد قوم کی واضح نشانیاں تھیں..

البتہ اللہ رکھا سبزی والے نے اُنہیں اپنی توجہ کے قابل نہ سمجھا کہ وہ اپنے مدمخالف حاجی صاحب پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا..

سبزی اور پھل کی ان دو کانوں کے آگے ''دربار'' تھا جہاں کوئی کامل ولی اللہ دفن تھا جس کے مختصر مقبرے کے سبز گنبد کے پہلو میں کسی دیہاتی قوال پارٹی کے اراکین اپنے طبلوں اور باجوں کے ساتھ ٹیک لگائے چرس کے آخری سگرٹ کب کے کھینچ کر مدہوش پڑے تھے..ایک زمانے میں ٹریفک کی بھیڑ کم کرنے کی خاطر فردوس مارکیٹ سے ایک سڑک والٹن ایئرپورٹ کے راستے فیروز پور روڈ تک تعمیر کرنے کا منصوبہ طے پایا تو راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس دربار صاحب کی آ گئی..جسے مسمار کرنے کے بغیر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا..مریدین اور معتقدین اپنے بابا کے ناموس کی خاطر کٹ مرنے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر احتجاج کرنے لگے تو نہ صرف سرسری تحقیق نے بلکہ ملحقہ قدیم تھینہ پنڈ کے کم از کم تین بوڑھوں نے گواہی دی کہ یہاں کوئی بابا شابا دفن نہیں بلکہ کسی چرسی نے اس مقام پر کوئی چھڑی دفن کر کے حق ہُو کا ورد کرنا شروع کر دیا تھا..پھر بھی عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا کہ کم از کم اُس چھڑی کو برآمد کر کے کسی اور مقام پر عزت و احترام سے دفن کیا جائے اور سڑک کے لئے راستہ ہموار کر لیا جائے..اس دوران حکومت بدل گئی اور ایک ولی اللہ کا دربار قائم رہا جسے اُن کے معتقدین نے ایک معجزے سے تعبیر کر کے نہ صرف وہاں ایک آل پاکستان قوالی مقابلے کا اہتمام کیا بلکہ ایک بورڈ بھی آویزاں کر دیا جس پر حضرت بابا شاہ قلندری، قادری، چشتی، دست گیر، پیرانِ پیر وغیرہ کے القاب درج تھے۔دربار سے آگے گلبرگ کے جی بلاک کے عقب میں دھکا کالونی کی وسیع بے ترتیب آبادی کی گلیاں تاریک تھیں، اگرچہ وہ اب مکہ کالونی ہو چکی تھی..قالب اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے ہوا تھا اور اس کے باوجود وہ ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی سنبھلتی چلی جاتی تھی..

ٹیڑھے ہو چکے..''سردار غالب الیکٹریشن'' کے بورڈ کو اپنے سامنے پا کر وہ ایک عجیب سی مسرت سے ہمکنار ہوئے..پھاٹک پر قالب نے نہایت آہستگی سے دستک دی..صحن میں خوابیدہ اُس کا بھتیجا سردار میر ازار بند اڑستا اپنی ڈھیلی چارپائی سے بمشکل اٹھا اور گیٹ کھول دیا..''چاچا..آپ اتنی رات تک کہاں رہے..خیریت تھی ناں..''

شاید اُس کا واہمہ تھا کہ سردار میر کو دیکھ کر لیلیٰ کے رخسار تمتمائے اور اس کے ہونٹ قدرے وا ہوئے...وہ سب..اپنے باپ کے شعری ذوق کی تہمت اپنے ناموں کی صورت میں لئے پھرتے تھے..غالب کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تو اُس نے اسے میر کا نام دے دیا..اور یہ میر صاحب ایک دہاڑی دار مزدور تھے..

''آئی ایم سوری..وہ..یونہی اتفاق سے اندرون شہر ایک دیرینہ دوست سے ملاقات ہو گئی اور وہ ہمیں اپنے گھر

لے گیا..سوری..''

''چاچا..ایک صاحب، اُن کا کہنا ہے کہ وہ بھی ماسکو کے رہنے والے ہیں اور آپ کے دوست ہیں، سرشام یہاں پہنچے تھے اور کب کے آپ کے منتظر ہیں..وہ تو آپ کو یہاں نہ پا کر واپس جانے پر اصرار کر رہے تھے لیکن میں نے انہیں روک لیا..آپ کے کمرے میں ہیں..''

''آخر کب تک؟''ظہیرالدین نے ذرا شرمندگی سے گردن کھجاتے ہوئے کہا..

لیلےٰ کمرے میں داخل ہوتے ہی ظہیر کی سلام دعا اور پیار قبول کر کے چار پائی پر ڈھیر ہو گئی تھی اور اب اُس کے نتھنے پھکتے اور کھلتے اُس کی گہری نیند کی غمازی کرتے تھے..

''یہ سوال آج ہر جگہ ہر مقام پر پوچھا جا رہا ہے۔'' قالب نے مسرت کی ایک کیفیت میں سر جھٹکا کہ ظہیرالدین کی یوں غیر متوقع آمد نے اسے بے حد مسرور کیا تھا''آپ کشتی کے چوتھے مسافر ہیں جو چپّو چلاتے یہاں تک آن پہنچے ہیں..''

''کونسی کشتی کے؟''ظہیرالدین اگر متحیر ہوا تو بے سبب نہ ہوا..

قالب نے اندرون شہر سامنے آتے مصطفےٰ اسلام اور پھر اُس کے کمرے میں داخل ہوتے ایک شرمیلے شخص عارف نقوی سے ملاقات کا قصہ مختصراً بیان کر دیا..

''کیا واقعی؟''ظہیرالدین ایک اور تحیر کی زد میں آ گیا''مجھے اندازہ تو تھا کہ ہم جیسے..اگرچہ تم ہم جیسا ہونے سے انکار کرتے ہو پھر بھی ہو تو ہم جیسے اور لوگ بھی ہوں گے..صرف ماسکو میں نہیں..وارسا، مشرقی برلن، بوداپسٹ، زاغرب، ترانہ، بلغراد..سب ایک زمانے کے کمیونسٹ ملکوں میں کہیں نہ کہیں اور لوگ بھی ہوں گے..مختلف قومیتوں کے جو اشتراکی فلسفے پر ایمان رکھتے ان ملکوں میں ایک سرخ سویرے کے خواب میں مبتلا آن بسے ہوں گے..ہم جیسے ایسے اور لوگ بھی ہوں گے..''

''مصطفےٰ اسلام..بوداپسٹ میں اور عارف نقوی برلن میں اور آپ ماسکو میں..ایک ہی کشتی کے مسافر۔''

''کیا واقعی یہ دونوں تم سے اتفاقاً مل گئے..''ظہیرالدین یقین میں نہیں آ رہا تھا..''میں شگونوں پر یقین تو نہیں رکھتا..ادہام پر مجھ ایسوں کا اعتماد مدت سے اٹھ چکا ہے لیکن..یہ محض اتفاق تو ہونے سے رہا کہ ہم سب..بقول تمہارے ایک ہی کشتی کے مسافر..ہم چاروں کا یوں رابطہ ہو جائے..لمحۂ موجود میں، لاہور میں..جیسے ہم ایک ہی ڈور میں بندھے ہوں..ہم نے اپنی حیات ایک خواب کی خاطر داؤ پر لگا دی..اور وہ خواب دُھند کی مانند زائل ہو گیا اور ہم بے جان پتھروں کی مانند اُس میں سے عیاں ہو کر بے وجہ اور بے مصرف ہو گئے..تو کیا ہم اُس ڈور کی مایوسی اور شکستگی میں بندھے ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں..کیا میں بھی ان مسافروں سے ملاقات کر سکتا ہوں؟''ظہیرالدین کو کیا معلوم کہ یہ بظاہر باہمی اتفاقی ملاقاتیں ایک منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہیں..

میں نے آج تک شعوری طور پر جھوٹ نہیں بولا۔

اور اس کے باوجود عمر بھر شو کی جھوٹا کہلایا..

میں تو کب کا توبہ تائب ہو کر غیب کے علم سے دستبردار ہو کر اپنی آخرت اور آنکھوں میں اترتے سیاہ موتیے کی فکر کرتا تھا لیکن جب ایک ناکام ناول نگار ہاتھ باندھ کر مجھ سے مدد کا طالب ہوا کہ میں اپنے تخیل اور تخلیق کے زور پر اپنے کرداروں کو ایک شہر میں لے تو آیا ہوں لیکن اب اُن کو آپس میں ملانے کا مجھے کوئی بہانہ نہیں سوجھتا تو مجھے اُس پر ترس آ گیا اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں نے کیسے ان چاروں کو ایک ڈور میں باندھ کر ایسے ملایا کہ اس پر حقیقت کا گماں ہو..اور اب میں پھر سے روپوش ہوتا ہوں کہ میرے ذمے جو کام لگایا گیا تھا، وہ میں نے خوش اسلوبی انجام دے دیا..البتہ میں نے اپنے کشف کو بروئے کار لا کر اُن چاروں کو..خشک ہوتے راوی کے ایک ریتلے کنارے پر..بھری دوپہر اور لشکتی دھوپ میں..گھٹنوں پر اپنے بازو جمائے کامران کی بارہ دری کو تکتے ہوئے ایک مدت سے چپ بٹھا دیا ہے..اس کے آگے نہ میں اور نہ میرا وجدان جائے گا..اگر ناول نگار جا سکتا ہے تو جائے..

دریا کوئی بھی ہو..گمشدہ اور کب کا ریتوں میں جذب ہو چکا ہو..رواں ہو یا اٹک اٹک کر آلودگی میں بہتا ہو..سرسوتی، ڈینیوب یا ماسکو ہو، جو کوئی بھی اُس کے کناروں پر آ بیٹھا ہو، گیان دھیان میں گم اُس کے پانیوں سے لَو لگا لیتا ہو..وہ ورجن ہو، مصطفیٰ اسلام یا ظہیر الدین ہو..دھیرے دھیرے ایک سا کیہ مُنی، گوتم، سدھارتھ یا بودھی ستوا ہو جاتا ہے..پانیوں کے بہاؤ کو ایک جذب میں فنا دیر تک تکتے جانے، ان پر ایک مدت سے آنکھیں بچھائے رکھنے سے ہمیشہ ایک نروان حاصل ہوتا ہے لیکن وہ جو نروان پر ایمان نہ رکھتے ہوں..حیات بعداز موت یا اس جنم کے بعد کسی اور جُون میں ایک اور جنم کا تمسخر اڑاتے ہوں..صرف اس جنم کی کلفتوں، ناانصافیوں اور اذیتوں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اپنی حیات کو داؤ پر لگا دیتے ہوں، وہ اگر قیامت تک پانیوں کے بہاؤ پر نظریں جمائے رکھیں تو اُنہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ کیا لاحاصلی ہی اُن کا مقدر ہوتی ہے..

راوی کے ریتلے کناروں پر..

وہ چاروں..بھری دوپہر کی لشکتی دھوپ میں گھٹنوں پر اپنے بازو حمائل کیے اُن پر اپنے چہرے رکھے دریا کے پار کامران کی بارہ دری کے شکستہ در و بام کو تکتے خاموش کب کے بیٹھے ہیں..

دوپہر کی اُس نرم بھی اور بےچین کرنے والی بھی دھوپ میں عریاں اُن کے ذہنوں میں عجیب سراب جھلملاتے ہیں..

دوپہر کی دھوپ میں عجب سے سراب اُن کے ذہنوں کے پردوں پر جھلملاتے..اُنہیں کبھی واہمہ سا ہوتا کہ مغل شکستگی کے یہ آثار..یہ بارہ دری ایک کشتی کی مانند ان سرابوں کے بہاؤ پر ڈول رہی ہے..کبھی گمان گزرتا کہ اُس کی محرابیں اور ستون عمارت سے بچھڑ کر راوی کے پانیوں پر تیرنے لگے ہیں..کچھ دیر بہتے جاتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں..یہ صرف نظر کے دھوکے نہ تھے اُن کی حیات جن فریب آلود خوابوں سے دوچار ہوئی تھی، یہ وہ تھے جو اُن کی آنکھوں میں سمائے جاتے تھے..

مصطفیٰ اسلام اور عارف نقوی کے درمیان تو کراچی ایئرپورٹ کی ملاقات کے بعد لاہور تک کے ٹرین کے طویل سفر کا رشتہ ناطا تھا جس کے دوران وہ ایک دوسرے کے دُکھڑوں سے آگاہ ہو کر قریب آ گئے لیکن قالب تو ابھی کل شب اور محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا کہ اپنی بیٹی کے ہمراہ سامنے سے چلا آتا تھا..اُدھر ظہیر الدین بے شک قالب کو ماسکو کے زمانوں سے جانتا تھا لیکن بس سرسری سلام دعا سے بات کبھی آگے نہ بڑھی تھی، یہ تاشقند ایئرپورٹ پر وہ طویل انتظار تھا جس کے دوران وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے..اور یہ دونوں مصطفیٰ اسلام اور عارف نقوی اُس کے لئے ابھی تک اجنبی اور بے پہچان چہرے تھے جن کے ساتھ آج سویر پہلی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے باوجود وہ اپنے اور شناسا اس لئے لگ رہے تھے کہ وہ سب ایک ہی کشتی کے مسافر تھے..

لیکن اب اس لمحۂ موجود میں اُن کے درمیان غیریئت اور پرائے پن کے سب فاصلے معدوم ہو چکے تھے اور وہ قربت اور ہمسائیگی کی یکساں سطح پر آ چکے تھے..من وتُو کی تمیز نہ رہی تھی..جیسے اُنہیں ایک ہی ماں نے بیک وقت جنم دیا ہو اور اُن چاروں کے ناڑو آپس میں اتنے اُلجھ گئے ہوں کہ اُنہیں منقطع کر کے ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو۔

وہ گئے زمانوں کی شاہراہ ریشم کے مسافر ایسے چار راہب تھے جنہوں نے اپنی دنیا تیاگ کر، اپنی مٹی ترک کر کے پامیر اور ہندوکش کی بلند گھاٹیاں اور برف زار عبور کیے..تکلا مکان اور گوبی ایسے موت بھرے صحراؤں میں دو کوہانوں والے باختری اونٹوں پر سفر کیا..ریت کے اُن یکدم اٹھنے والے سانس بند کر دینے والے زہریلے بگولوں کو سہارتے اپنے تاشقندی سیاہ اسپ دوڑاتے بالآخر کاشغر اور خُتن کے نخلستانوں میں سے گزرتے وہ اپنی منزل مقصود چین کے موبے گانسو خطّے میں واقع ڈُن ہوانگ کے قصبے میں پہنچ گئے تھے جس کے نواح میں وہ قدیم غاریں تھیں جن کے اندر ہزاروں برسوں سے بدھ مت کے فرمانوں کے نادر مخطوطے روپوش پڑے تھے..دیواروں پر مہاتما بُدھ کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے وہ سنہری اقوال کندہ تھے جنہیں اُن کے چیلوں نے محفوظ کر لیا تھا اور بُدھ کی سینکڑوں شبیہیں چٹانوں میں کھدی ہوئی ایک الوہی روشنی میں ڈوبی ہوئی تھیں..وہ چاروں اس آرزو میں اپنی دنیا ترک کر کے اتنی صعوبتیں سہتے یہاں تک پہنچے تھے تاکہ وہ اپنے سینوں کو مخطوطوں میں درج سنہری اقوال سے منور کر لیں..اپنے خوابوں کی تعبیر کو مہاتما کے مجسّموں میں دریافت کر لیں..لیکن ان چاروں تارک الدنیا راہبوں کا یہ کلفتوں بھرا برسوں پر نہیں زندگی بھر پر محیط سفر رائیگاں گیا..کہ جب انہوں نے اُن غاروں میں ہزاروں برسوں سے محفوظ مخطوطوں کو کھولا تو اُن پر جو کچھ درج تھا، وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتا مٹ گیا..صرف بھربھری کوری تختیاں باقی رہ گئیں..اور نہ ہی دیواروں پر کوئی مقدس عبارتیں تھیں اور نہ ہی وہاں وہ مجسّمے تھے جن کے وہ پجاری رہے تھے..

اُن کا زندگی بھر کا سفر اکارت گیا تھا..

جس نروان کی تمنا میں اُنہوں نے اتنے کشٹ کاٹے تھے، وہ سراب نکلا تھا..

اور اب وہ اپنے مسمار ہو چکے خوابوں کی کرچیوں کی بدن میں کُھب جانے والی اذیت کو بمشکل برداشت کرتے جانے کس دریائے آمو یا دریائے یارخون کے کناروں پر آن بیٹھے تھے اور اُنہیں فیصلہ کرنا تھا کہ نظریات کے خداؤں کی شکستگی کے بعد اب وہ کدھر جائیں..اپنے آپ کو اس دریا کے پانیوں کے سپرد کر کے اپنی مایوسی اور اذیت سے چھٹکارا

حاصل کر لیں یا پسپا ہو کر ہار مان کر اُسی دنیا کو لوٹ جائیں جسے انہوں نے ایک بہتر دنیا کے حصول کی جدوجہد میں شامل ہونے کے لئے ترک کیا تھا..کیا کریں..

اُن چاروں میں سے ایک ایسا راہب تھا جس کے چوغے کی اندرونی جیب میں راکھ کی ایک پوٹلی تھی، اُس کے لئے مہاتما بُدھ کی ارتھی کی وہ مقدس راکھ تھی جسے اشوک نے ہندوستان بھر میں عظیم الشان سٹوپے تعمیر کر کے اُن میں اپنے تئیں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا تھا..اور ان میں ٹیکسیلا کا دھر ماراجیکا سٹوپا سب سے شاندار تھا جس کے گنبد کو سونے کے پانی سے سنہری کیا گیا تھا اور وہ سینکڑوں کوس دور اپنی جانب سر جھکائے بڑھتے راہبوں کی آنکھوں کو اپنے سنہری پن کی تیز دھوپ سے چندھیا تا تھا..اگر عارف نقوی کا بس چلتا تو وہ ہلٹرڈ کی راکھ کو محفوظ کرنے کی خاطر برلن، ماسکو، بوداپسٹ اور لاہور میں سنہری سٹوپے تعمیر کر دیتا..

بُدھ کا پیغام بھی تو محبت اور یگانگت کے سوا اور کچھ نہ تھا..اور ہلٹرڈ میں بھی یہی کرشمے تھے..وہ اس راکھ کو سامنے بہتے دریا..جو نہ آموتھا اور نہ یارخون اور نہ ہی کوئی گنگا..راوی تھا..اس کے پانیوں کے سپرد بھی تو کر سکتا تھا..نہیں وہ فی الحال اُس کی جدائی برداشت کرنے کی سکت نہ رکھتا تھا..سپردگی اگر ہو گی تو مکمل ہو گی..راکھ بھی اور وہ خود بھی اکٹھے عدم میں اتریں گے، جدا جدا نہیں..

●○●○●○●

وہاں فون کے اندر بلال کی بھرّائی ہوئی آواز تھی اور پس منظر میں جیسے کوئی ہولے ہولے روتا ہو.. کچھ سسکیاں سنائی دے رہی تھیں..

یُوری سمرنوف اُس سوّر کے بچے اپنے داماد قالب کے یوں روپوش ہو جانے پر ہمہ وقت پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا.. چلو وہ تو ایک احسان نافراموش سوّر کا بچہ تھا لیکن تانیا اُس کی اپنی بیٹی بھی جس نے کبھی بھی اپنے منصوبہ بندی سے حاصل کردہ خاوند کے لئے محبت اور یگانگت کا رشتہ محسوس نہ کیا تھا کہ وہ محض ایک سہولت تھا، وہ بھی بدکلام ہو گئی تھی، اُس بدبخت کی جدائی میں آنسو بہاتی رہتی تھی اور اس کا دفاع کرتی تھی، اور اُس بلال کا تو تذکرہ ہی کیا کہ وہ بالآخر ایک مشرقی خون کا بدتمیز بیٹا ثابت ہوا.. ایک بار جب اُس نے قالب کو ایک مشرقی باسٹرڈ کہہ دیا تھا تو اُس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن اُسے ایسی خون آلود نظروں سے گھورا کہ وہ لرز کر رہ گیا تھا..

وہ ایک کسی پر بھی اعتماد نہ کرنے والا شکّی مزاج بوڑھا تھا اور کے جی بی کے ایک ایجنٹ کے لئے یہی خصلت درکار ہوتی ہے ورنہ اُس کے ہم پیشہ اُسے روند کر رکھ دیں.. وہ قالب کی جگہ کسی اور شخص کو پیشاب خانوں کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا.. اُسے مجبوراً یہ ذمہ داری ذاتی طور پر سنبھالنی پڑی اور تب اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ قالب برس ہا برس سے نہایت تحمّل اور فرمانبرداری سے جو ڈیوٹی سرانجام دیتا رہا تھا، اُس میں کتنی رذیل قباحتیں ہیں..

یہ ایک معمول کا دن تھا.. یوری سمرنوف کو سرخ چوک کے قریب ایستادہ اُس کے سب سے منافع بخش نیلے پلاسٹک کے جو اِگلو پیشاب خانے تھے اُن کے سامنے اپنی سیاہ مرسیڈس میں بیٹھے ہوئے، موٹی نگہبان عورت سے دن بھر کی کمائی وصول کرتے.. حساب کتاب کرتے اپنے مثانے میں کچھ بوجھ محسوس ہوا.. اُس نے کچھ دیر ضبط کیا لیکن بڑھاپے نے جن اعضاء کو ڈھیلا کر دیا تھا انہوں نے اس بوجھ کو زیادہ دیر تک سہارنے سے انکار کر دیا.. ایسا تو کوئی مسئلہ نہ تھا کہ وہ ضبط کرتا رہتا اور بالآخر اپنی پتلون گیلی کر لیتا، سڑک کے پار واقع اُس کی ذاتی ملکیت میں اکٹھے چھ پیشاب خانے تھے جہاں وہ اپنے آپ کو فارغ کر سکتا تھا..

اُس فربہ نگہبان عورت کے لئے یہ ایک تاریخی اور پُرفخر لمحہ تھا کہ صدر پیوٹن کا نزدیکی رفیق.. ماسکو بھر میں ایستادہ تمام پیشاب خانوں کا مالک یُوری سمرنوف پتلون کے بٹن ٹٹولتا اُسے ذاتی طور پر مخاطب ہو کر کہے کہ.. کیتھرین ان میں سے کونسا پیشاب گھر فارغ ہے اور وہ ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ اِگلو گھر کا دروازہ آگے بڑھ کر کھول دے اور وہ اندر داخل

ہو کر ہر گاہک کی طرح چٹخنی چڑھا دے..

ازاں بعد جو بھی سانحہ ظہور پذیر ہوا اُس کے بارے میں مختلف افواہیں تھیں..

یوری سمرنوف نے جب پیشاب خانے کے پلاسٹک کے دروازے کی چٹخنی چڑھا کر تاریک ہو چکے اگلوگھر میں پتلون کے بٹن کھولے تو یکدم کموڈ کے پیندے میں جمع غلاظت کے جو گھنے ڈھیر تھے، اُن کے تعفّن سے اُس کا سانس رک گیا..اور وہ اوندھے منہ کموڈ پر جا گرا..قیاس آرائی کی سرگوشیوں میں یہ امکان بھی تھا کہ پلاسٹک کے وہ چوڑے اور فراخ کموڈ صرف کھڑے ہو کر اپنے آپ کو فارغ کرنے کے لئے تھے..ان پر بیٹھے ہوئے اپنا بوجھ پاؤں کے پنجوں پر منتقل کر کے ایک نیم خلا میں اپنے آپ کو قائم رکھنا پڑتا تھا اور یوری سمرنوف شاید بے دھیانی میں اطمینان کے ساتھ کموڈ پر اپنے تئیں بیٹھ رہا تھا کہ وہ غڑاپ سے اُس کے پیندے میں جمع شدہ غلاظت میں گر کر غرق ہو گیا..ان سرگوشیوں کو اس امر سے بھی تقویت حاصل ہوئی کہ بعدازاں اُسے دفن کرنے سے پیشتر نہلانے دھلانے اور ایک نئے سوٹ میں ملبوس کر کے چہرے کو میک اپ سے تروتازہ کرنے والے تدفینی ہاؤس نے اُسے نہلانے اور ستھرا کرنے کے ضمن میں معمول سے بڑھ کر روبل چارج کیے..

اُس کی ناگہانی موت پر صدر پیوٹن کی جانب سے قبر کے لئے پھولوں کی ایک چادر بھیجی گئی بلکہ ایک تعزیتی بیان بھی جاری کیا گیا کہ نئے روس کی اقتصادی تعمیر نو میں میرے رفیق یوری سمرنوف نے جو شاندار خدمات سرانجام دی ہیں، پورے ماسکو میں جس طور غیر ملکی سیاحوں اور اہل شہر کے لئے ہر کونے پر جو لازوال سہولتیں مہیا کی ہیں، انہیں تاریخ میں سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا..ماسکو کے اُسی آرچ بشپ نے جس نے قادر قریشی کی نئی رہائش گاہ میں پُر تقدس قدم رنجہ فرمایا تھا، اس خدا ترس عیسائی کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اسے جنت میں یسوع مسیح کے قدموں میں جگہ ملنے کی بشارت دی تھی..

فون کی دوسری جانب بلال کی بھرائی ہوئی آواز تھی جس کے پس منظر میں کوئی ہولے ہولے روتا تھا..کچھ سسکیاں ابھرتی تھیں ''ڈیڈی..نانا جان مر گئے ہیں..ہم انہیں قومی ہیروز کے قبرستان میں دفن کر کے ابھی ابھی لوٹے ہیں.. امّی کے آنسو رکتے ہی نہیں آتے اور وہ بار بار آپ کا نام لیتی ہیں اور میں آپ سے..اور لیلے سے بہت اداس ہوں..پلیز ڈیڈی..''

اور جب اُس نے.. بلال نے..اُس کے بیٹے نے یہ کہا تھا کہ میں آپ سے..اور لیلے سے بہت اداس ہوں تو سردار قالب کے قلب میں ایک چھید پڑ گیا تھا..

اس نے لوٹ جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا..

عارف نقوی کی اندرونی جیب میں بلٹر ڈ کی راکھ سلگتی تھی..قالب کے قلب میں ایک چھید پڑ گیا تھا، کچھ ایسے ہی مصطفےٰ اسلام کی جیب میں ایک خط تھا جس کے حرف لَو دیتے تھے..

''روح اور خون کے رشتے ایسے خیمے نہیں ہوتے کہ..
جب چاہا اُنہیں نصب کر دیا اور جب چاہا سمیٹ لیا..
یہ تمہاری شریانوں میں خیمہ زن ہوتے ہیں
اُن کی طنابیں تمہارے جُثے کے گرد کسی ہوتی ہیں
اور اُن کی میخیں تمہاری رگوں میں گڑی ہوتی ہیں..
خانہ بدوش بھٹکتے پھرتے ہیں ہر چراگاہ ہر وادی میں
اُنہیں تلاش ہوتی ہے کسی آخری چراگاہ کی..
کسی آخری وادی کی..
جہاں وہ خیمے لگانے کی بجائے..
اپنی روحیں بو دیں..اور ان سے ہمیشگی کے شجر پھوٹیں..
اور وہ اُن شجروں کی آبیاری اپنے خون سے کریں..
اور بالآخر وہ رزقِ خاک ہوں..
ان گنت چشموں کا پانی پی کر آپ کو احساس ہوتا ہے..کہ وہ چشمہ
جو آپ کے اپنے وطن کی مٹی میں سے پھوٹتا ہے..
اُسی کے پانی سب سے شیریں ہیں..
تو پھر دیس دیس کے جھرنوں سے اپنی اوک کیوں بھرنی..
اور راوی کے پانی گدلے اور زہرناک ہیں..میں پی آئی..
ڈینیوب کی نیلاہٹ اپنی نیلی بانہیں پھیلائے..
آپ کی منتظر ہے..
اور ماما روجا بھی..
اور میں بھی..''

جینا

ظہیر الدین کو نہ کوئی پیام آئے اور نہ کوئی اُس کے لئے آزردہ ہوا..
اُس کی اندرونی جیب میں نہ تو کسی کی راکھ سلگتی تھی، اور نہ ہی کسی نظم کی حدت..
وہ آگاہ نہ تھا کہ ماسکو میں اُس کے نئے فلیٹ کے ڈائننگ روم میں اُس کی کرسی پر نقش اُس کے بدن کے سائے نہ صرف بورس اور سویٹ لانا کو بلکہ اُس کی وہیل چیئر میں قید بیوی کو بھی رُلاتے تھے..اُس کی غیر موجودگی کی کسک اُنہیں

اذیت سے بھرتی تھی اور وہ اُس کی واپسی کے تمنائی ہوتے تھے..اور وہ آگاہ نہ تھا..

اُجڑ چکے خوابوں والے جن کی کٹھن مسافتیں رائیگاں گئی تھیں، وہ چاروں راہب نہ کسی آ مواور نہ کسی یار خون دریا کے کناروں پر بیٹھے تھے..راوی کے گدلے پانیوں کے پار کامران بارہ دری کو اتنی دیر سے تک رہے تھے کہ وہ سراب ہوئی جاتی تھی..دو پہر کی دھوپ کب کی مدھم ہو کر ڈھل چکی تھی اور بارہ دری کے در و دیوار کے سائے پانیوں پر اپنے سرمئی شاہے بڑھاتے تھے..

''آخر کب تک؟''

''ہاں..کب تک؟''

تب کامران کی بارہ دری اپنے ٹاپو جزیرے سے کھسک کر راوی کے پانیوں میں اتری اور دھیرے دھیرے اُن کے بہاؤ سے ہم آہنگ ہو کر اُن پر بہنے لگی اور اُن چاروں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی اُس کے سنگ پانیوں پر بہتے جاتے ہیں اور جہاں نصیب لے جائے وہاں تک بہتے جاتے ہیں..

●○●○●○●

''آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں روزگار کے لئے کیا کرتا ہوں..صبح سویرے اپنی سائیکل پر نکل جاتا ہوں تو کہاں جاتا ہوں..کبھی دوپہر تک خالی ہاتھ لوٹ آتا ہوں اور کبھی شام ڈھلے کیچڑ میں لت پت یا دھواں آلود چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہوں تو کہاں جاتا ہوں..میں یہاں آتا ہوں..''

گلبرگ مین مارکیٹ کے داخلے پر دائیں جانب فٹ پاتھ پر ایک انسانی منڈی بچی تھی..وہاں بہت سے لوگ.. جن کے چہرے مشقتوں اور ذلتوں سے پچکے ہوئے تھے، اپنے اپنے ہُنر کے سامان رکھے بیٹھے تھے جس ہُنر کے زور پر وہ آج کچھ روزگار حاصل کر سکتے تھے اور اکثر نہیں بھی کر سکتے تھے..راج مزدور.. بال تیل سے چپڑے ہوئے اور بھدّی بدوضع انگلیوں میں مشقت کی دراڑیں..کدالیں..بیلچے، دابڑے اور تعمیر کے اوزار، تیسیاں اور رہے اپنے آگے سجائے.. گھروں کو پینٹ کرنے والے تو دور سے پہچانے جاتے تھے کہ اُن کے بوسیدہ کپڑوں پر رنگ رنگ کے دھبّے نظر آتے تھے.. وہ اپنے مٹی کے تیل سے صاف کردہ ہر سائز کے برش، پلاسٹک کی بالٹیاں اور رنگوں کی معروف کمپنیوں کی مختلف رنگوں کے فرق ظاہر کرنے والی پھٹی ہوئی فہرستیں اپنے آگے پھیلائے گاہکوں کے منتظر تھے..کسی بھی رہائش گاہ، عمارت یا زیرِتعمیر ڈھانچے میں جتنی بھی پیچیدگیاں اور مسائل جنم لے سکتے تھے اُن سب کا مداوا یہاں موجود تھا..گھروں میں بجلی کی تاریں بچھانے والے..فرنیچر پالش کرنے والے..باورچی اور جانور ذبح کرنے والے..بلند درختوں پر چڑھ کر اُن کی تراش خراش کرنے والے..یہ سب لوگ ماہرین میں شمار ہوتے تھے لیکن ان کے سوا جو اکثریت میں تھے، اُن کے پاس سوائے دو ہاتھوں کے اور کوئی ہنر تھا، اور انہیں دن بھر کے لئے اُجرت پر ساتھ لے جانے والے بہت ناپ تول کر ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے تھے..مکمل اطمینان تو تبھی ہو سکتا تھا اگر انہیں جیسا کہ پرانے زمانوں میں برائے فروخت غلام کے بدن کو ٹٹولا جاتا تھا، اُس کا منہ کھلوا کر دانت گنے جاتے تھے اور اکثر اُس کے سینے پر ایک گھونسا رسید کر کے اُس کی سکت کا اندازہ لگایا جاتا تھا..انہیں بھی وہ اسی طریقۂ کار سے منتخب کرتے لیکن ان تہذیب یافتہ زمانوں یہ کچھ نامناسب سا لگتا اور وہ صرف انہیں نظروں سے ٹٹول کر اندازہ لگاتے کہ اس بندے میں دن بھر کی کمر توڑ مشقت سہارنے کی سکت ہے یا نہیں.. آپ کسی ناتواں بیل کو تو ہل میں نہیں جوت سکتے اور نہ ہی کسی ایسے گدھے پر سامان لادیں گے جس کی پسلیاں نکلی ہوئی ہوں..اور اُس کی ٹانگیں لاغر ہوں..

''میں یہیں آتا ہوں..'' اس کے لہجے میں نہ تو کوئی کڑواہٹ تھی اور نہ ہی کسی احساس کمتری کا پرتو ''جب کوئی مجھے لے جاتا ہے جیسے تیسے کام کے لئے بھی تو میں شام ڈھلے گھر آتا ہوں اور جب میرے نصیب میں روزگار نہیں ہوتا تو دوپہر کے وقت لوٹ جاتا ہوں۔''

''تم..اس کے سوا اور کوئی..ایسا کام نہیں کر سکتے جس میں تمہاری عزت نفس مجروح نہ ہو..یوں فٹ پاتھ پر گداگروں کی مانند بیٹھے رہنا محنت کی توہین نہیں ہے؟''

''جب غربت تمہارے گھر میں داخل ہوتی ہے تو عزت نفس دوسرے دروازے سے نکل جاتی ہے۔'' اُس کے چہرے پر پھیلتی دل کش مسکراہٹ میں بھی کچھ شکایت نہ تھی۔''میرے پاس سوائے ان دو ہاتھوں کے اور کوئی ہُنر نہیں..کیا چچا قالب نے تمہیں نہیں بتایا کہ ہم کن برے حالوں میں جیئے..اور ہمارے دادا اپنی شاعری سے کل کائنات کو بھڑکا کر جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے انقلابی نظریات چوکھٹ کے باہر چھوڑ آتے تھے اور ایک اور شب میرا باپ اور اس کے چھوٹے بڑے بہن بھائی جن میں تمہارا باپ بھی شامل تھا، بھوکے سو چکے ہوتے تھے..اُسے اپنے انقلابی خمار میں کہاں خبر ہوتی تھی کہ اُس کا کونسا بچہ کس سکول میں کونسی جماعت میں پڑھتا ہے..اگر پڑھتا ہے تو..میرا باپ بھی کچھ پڑھ لکھ نہ سکا، ہوش سنبھالا تو مزدوری کے لئے نکل پڑا..تو پھر میں اُس کا بیٹا کہاں سے کوئی ہُنر حاصل کرتا..ویسے میں نے..اپنے عظیم دادا کی شاعری کا ایک ایک مصرعہ پڑھا ہے بلکہ اُن کی کچھ نظمیں میں انہی کے انداز میں گنگناتا رہتا ہوں..اور ان میں سے ہر مصرعے نے پہلے میرے باپ کے بدن کو چھیدا اور پھر اس کی نوک میرے بدن تک آ پہنچی کہ یہ قول اور فعل کے تضاد سے جنم لینے والے گھاؤ تھے..میں نے آج تک کسی دوست یا جاننے والے کو یہ نہیں بتایا کہ میں سردار سیماب کا پوتا ہوں، اُس کی غفلت اور بےحسی کا ثمر..میں اُس کے عظیم ادبی مقام کی حفاظت کرتا ہوں..ویسے لیلٰے..اگر اس شب نیشنل عوامی پارٹی کا وہ لیڈر تمہارے باپ کے بجائے میرے باپ کی جانب متوجہ ہو جاتا تو وہ ماسکو میں ایک سکالرشپ کا حقدار ٹھہر جاتا اور تب میں..تم ہوتا..اور تم میں..''

وہ رات بھر روتی رہی تھی..

نانا سمرنوف کے ساتھ اُس کا لگاؤ اگرچہ واجبی اور رشتے کے احترام تک محدود تھا لیکن..وہ اُس کی ماں کا باپ تھا اور کبھی کبھار جب اُس کا جی چاہتا وہ اُس کے ساتھ شفقت بھی برتتا..اور یہ اُس کے پیشاب خانوں سے حاصل کردہ دولت تھی جو انہیں ایک پر تعیش اور بےفکر زندگی عطا کرتی تھی..دراصل یہ بلال کی بھرائی ہوئی آواز میں جو ڈوبتا ہوا غم اور ایک فریاد تھی، اُس نے اسے رات بھر رُلایا تھا..

''میر بیٹے..لیلٰے رات بھر اپنے نانا کی موت کے صدمے سے اشک بار اپنا تکیہ بھگوتی رہی ہے..مجھے آج کچھ دوستوں اور کچھ اجنبیوں سے ملاقات کے لئے جانا ہے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم آج کام پر نہ جاؤ..اس کا دل لگاؤ..اسے گھما پھرا لاؤ..یہ تمہاری فرسٹ کزن ہے۔''

وہ اس پہلی بار یکدم نمودار ہو جانے والے کسی قدر شرمیلے سے چچا کی درخواست رد نہ کر سکا..رضامند ہو گیا..

اُس نے جب سے وہ آئی تھی، کبھی نظر بھر کر نہ دیکھا تھا اور جب آج اُس نے دیکھا تو اُس کی نظر اُس کے سراپے سے بھر گئی..وہ دونوں جھجکتے ہوئے ملّہ کالونی کی تعفن بھری بھول بھلیوں میں سے نکل کر باہر آئے تو اُسے لگا کہ لاہور کی مدھم دھوپ صرف اِس لئے تخلیق ہوئی تھی کہ وہ لیلٰے کے چہرے پر اُترے، اُس کے بدن کے دودھیا پن، سیاہ آنکھوں

کے فریب اور ترشے ہوئے لبِ لرزاں کو یوں روشن کر دے کہ جو کوئی اُس پر نظر کرے ٹھٹک جائے، ٹریفک تھم جائے اور اُس کی کولہوں پر سے کھسکتی شلوار جسے وہ بار بار اڑستی تھی اور وہ پھر بھی کھسکتی تھی، اُسے دیکھ کر پرندوں پر بھی وصال کے موسم اترنے لگیں۔

گلبرگ کی مین مارکیٹ کے داخلے پر بائیں جانب فٹ پاتھ پر انسانوں کی مویشی منڈی کی جو تذلیل سجی تھی اسے دیکھ کر لیلیٰ پہلی بار اُس الجھاؤ اور ناسمجھی میں سے نکلی کہ آخر کیوں اتنے لاکھوں لوگوں نے مارکس اور اینگلز کے دقیق فلسفے کو قبول کیا اور ولادے میر لینن کے مرید ہو کر اُس کے ہر حکم کی پیروی کرنے لگے جیسے کہ وہ ایک پیغمبر ہو.. اگر وہ بخوشی کمیونزم کے حصول کے لئے لاکھوں کی تعداد میں مارے گئے تو کیوں مارے گئے.. آخر زار کے سارے خاندان کو ہلاک کر کے گڑھوں میں دبا دینے کا جواز کیا تھا، اتنی شقی القلبی کہ اُس کے بچے بھی تلف کر دیئے جائیں۔

اُس نے جب فٹ پاتھ پر بیٹھے روزگار کے منتظر درجنوں بندۂ مزدور کو تقریباً ہر خریدار کے سامنے حیوانوں کی سطح پر منت سماجت کرتے دیکھا، گڑگڑاتے اور تقریباً پاؤں پڑتے دیکھا اور اُن سب کے چہروں پر بھوک تھی تو اُس پر وہ سب منکشف ہو گیا جو ابھی تک پردہ پوش تھا اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا... نہ صرف یہاں بلکہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں.. افریقہ اور جنوبی امریکہ میں.. دنیا بھر میں بندۂ مزدور کے اوقات ذلت آمیز حد تک سخت اور تلخ تھے.. اور جب اُنہیں مساوات، عدل اور روٹی کپڑے مکان کی نوید سنائی گئی.. اُنہیں جانوروں کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کے راج سنگھاسن پر بٹھانے کا وعدہ کیا گیا تو وہ کیسے ایک سرخ پرچم نہ تھام لیتے، اُس انقلاب کا ساتھ نہ دیتے جس کا نعرہ تھا کہ .تمہارے پاس کھو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں سوائے تمہارے پاؤں میں پڑی زنجیروں کے.. یہ الگ بات کہ وہ جو صدق دل سے مساوات اور عدل کی اس منزل پر یقین رکھتے تھے، اُن کے پہلو بہ پہلو ایسے بھی تھے جن کے اندر چھوٹے چھوٹے زار چھپے بیٹھے تھے جنہوں نے انقلاب کے نام پر وہی ظلم روا رکھے.. ذرا سا اختلاف کرنے کی پاداش میں ان کے پاؤں میں وہی زنجیریں ڈال دی گئیں جو ابھی ٹوٹی تھیں اور ابھی پھر سے جُڑ گئیں.. سرخ سویرے کے دھوکے دے کر کیسے کیسے ظلم کمائے گئے..

گلبرگ مین بلیوارڈ کی جانب سے ایک شوکتی ہوئی بی ایم ڈبلیو سپورٹس کار نمودار ہوئی، فٹ پاتھ کے کناروں کے ساتھ رکتے رکتے آ لگی۔ اس میں سوار شخص کا ایک ہاتھ باہر آیا اور وہ جو راج مزدور، رنگ والے، ہنر مند اور خالی ہاتھ تھے، وہ اُس ہاتھ کی جانب لپکے کہ اس ہاتھ میں ان کی روزی کی لگامیں تھیں..

صرف لیلیٰ تھی جو حسین چوک کے دائیں جانب قصوری روڈ کے وسط میں واقع بیکری کافی اینڈ ٹی کمپنی کے بالائی منزل کے پُر ہجوم ریستوران میں شلوار قمیض میں ملبوس تھی.. وہاں جو نوخیز اُس کی ہم عمر لڑکیاں غُل کرتی، امریکی سلینگ میں منہ بگاڑتی، اوہ شِٹ.. اوہ فک کرتی بے پرواہ اور کسی بھی دنیاوی فکر مندی سے عاری تھیں.. وہ یا تو گھٹنوں تک گرتے مغربی طرز کے گھیرے دار لباسوں میں تھیں اور یا پھر معمول کی نیلی یا سیاہ جینوں میں جو اُن کے کولہوں سے ذرا نیچے بیلٹوں پر قائم تھیں اُن میں پھنسی ہوئی تھیں.. وہ ذرا آگے ہو کر شیک کا ایک گھونٹ بھرتیں تو اُن کی پشت میں ایک لکیر نمودار ہو کر برابر کی میز پر بیٹھے کسی لڑکے کا دل روک دیتی.. اور وہاں جو لڑکے تھے ان کے انداز بھی بے پرواہ اور نخریلے تھے.. اور

مجال ہے لیلٰے کے کانوں میں اردو یا پنجابی کا ایک لفظ بھی اترا ہو کہ وہ سب اوہ شِٹ ،اوہ فک لوگ تھے..

سردار مِیر کا نہ چہرہ مہرہ اتنا تر و تازہ اور نفیس تھا اور نہ ہی اُس کی معمولی کاٹن کی شلوار قمیض اور پشاوری چپل گواہی دیتے تھے کہ وہ اس ریستوران میں بیٹھنے کے لائق ہے..اُس کی شکل اور چرمر لباس والے تو نیچے پارک شدہ مہنگی کاروں کی اگلی نشستوں پر براجمان اپنے صاحب لوگوں کے انتظار میں چوری چھپے اپنی پسند کے گانوں کی کیسٹ کار کے ریکارڈ میں لگا کر اپنا وقت گزارتے تھے..وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا، دعا کر رہا تھا کہ کہیں کافی کے دو پیالوں اور ایک کلب سینڈوچ کا بل اتنا نہ آجائے کہ وہ اُس کی جیب میں پڑی رقم سے زائد ہو جائے..وہ تو اس سی ٹی سی بیکری کے پاس سے گزر کر سیون اپ روڈ پر واقع اُس چھپّر ہوٹل میں کبھی کبھار جایا کرتا تھا جہاں کی دال ماش مزدوروں اور ڈرائیوروں کو مرغوب تھی۔

لیلٰے کو اشتراکیت کا جو فسوں دنیا بھر میں پھونکا گیا تھا،اُس کا جواز اُس انسانی منڈی کے دل کو بجھا دینے والے منظر نے اگر مکمل طور پر عیاں نہ کیا تو وہ یہاں اس ریستوران کے باہر کی دنیا سے مکمل طور پر کٹے ہوئے تضاد میں ظاہر ہو گیا تھا..ان لوگوں کے غیر ملکی بلکہ امریکی لہجے..مہنگے ملبوسات..بے دریغ ہنسی کی کھنک..کسی میز پر کھانا کھا کر اٹھنے والے چار پانچ لوگ ویٹر کی طشتری میں ادائیگی کی جتنی رقم لاپروائی سے پھینک دیتے تھے..اتنی رقم اُس فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے کسی مزدور کو اگر روزانہ بھی مزدوری ملتی چلی جائے تو مہینے بھر کی کمر توڑ مشقت کے بعد بھی نصیب نہ ہو..

ان دونوں پر اچٹتی ہوئی نظریں ٹھہرتی تھیں اور پھر کسی حد تک حقارت کے ساتھ آگے بڑھ جاتی تھیں..یہ دودھیا بدن کی لڑکی رنگ ڈھنگ سے غیر ملکی لگتی ہے لیکن یہ یہاں اپنے ڈرائیور یا گھریلو ملازم کے ہمراہ کیوں چلی آئی ہے..ان نظروں میں یہی استعجاب تھا..

''میں نے سنا ہے کہ آپ لوگ واپس جا رہے ہیں؟''

''ہاں...'' اُس کے اس سوال میں کیا کہیں الفت کا ایک ذرّہ دمکتا ہے..کوئی شکایت کا پہلو ہے یا یہ صرف ایک سوال ہے، وہ فیصلہ نہ کر سکی'' نانا کی وفات کے بعد بلال بہت گھبرا گیا ہے..مجھ سے چھوٹا ہے..ذرا سی گرج چمک ہو تو خوفزدہ ہو کر چوری چھپے اپنے بیڈروم سے نکل کر میرے پاس آ جاتا ہے..ظاہر ہے ماں بھی اپنے باپ سے بچھڑنے کے غم میں ہے..تو ہمیں جانا ہے..لیکن...''

لیکن؟....مِیر کی سوال کرتی آنکھیں لیلٰے کے دودھیا چہرے پر تتلیوں کی مانند پھڑ پھڑانے لگیں..

●○●○●○●

پھولی ہوئی خمیری روٹی کے پور پور میں سلگاہٹ ابھی تک محفوظ تھی اور اُس کی گرم مہک رنگین شیشوں کی کھڑکی والے کمرے کے اندر ایک ماں کی گود کی آسودگی بھرتی تھی..

پرانے اخباروں میں لپیٹے، تنور میں سے برآمد ہوتے ہی وہ چھوٹا ماسٹر بگٹٹ بھاگتا اُسے سینے سے لگائے بھاگم دوڑ سیڑھیاں چڑھتا چند لمحوں میں ہی اس کمرے میں داخل ہو گیا تھا اور اسی لئے روٹی کی تمازت پر جب عارف نقوی کی انگلیاں اتریں تو وہ ذرا ٹھٹکا کہ اس تمازت میں ہلٹر ڈ کے راکھ وجود میں جو حدت کبھی تھی، وہ اس کی انگلیوں نے محسوس کی..

''یہ تو واہ..ابھی تک گرم ہے۔''

''کامریڈ..صرف ایک گرم روٹی کو چُرانے کے جرم میں ''لامزاربل'' کا مرکزی کردار زندگی بھر ایک مفرور اور شکار کیے جانے والا ایک جانور رہا، یہ ایسی ظالم شے ہے..ان طویل برسوں میں بوداپسٹ میں صرف مجھے اپنی ماں اور اس کے ہاتھوں کی بنی ہوئی گرم روٹی کی یاد نے رُلایا..ایک روٹی، تندور میں سے نکلتی یا توے پر سے اُترتی جب اُس کے پکے ہوئے بدن پر کہیں کہیں بلبلے سے اٹھتے ہیں جن میں حدت کا ایک سانس قید ہوتا ہے جو تمہارے چھونے سے اُن میں سے خارج ہونے لگتا ہے..یہ بڑی ظالم شے ہے..یہیں اس کمرے سے نیچے جو صحن ہے اس کے کونے میں وہ چولہا سلگاتی تھی.. ہم سب بہن بھائی ایک چنگیر کے گرد ہالہ بنائے اُس کا گھیراؤ کیے پُر اشتیاق نظروں سے اپنی ماں کے ہاتھوں میں ایک گیلی گولائی کی شکل اختیار کرتے پیڑے کو تکتے جاتے تھے جسے وہ اپنی ہتھیلیوں کے پیالوں میں جھلاتی اُسے ذرا سا پچکاتی تو وہ ایک بتاشے کی مانند چپٹا ہو جاتا اور پھر وہ اُسے ایک قوال کی مانند ایک مخصوص ردھم میں ہتھیلیوں کے درمیان چھنکتی گول روٹی کی شکل دینے میں جانے کیسے کامیاب ہو جاتی کہ اگر اُس ردھم میں ذرا سی بے احتیاطی ہو جاتی تو گیلا آٹا اُس کی ہتھیلیوں کے کناروں سے لٹک جانے لگتا..ایک کوزہ گر ہنرمندی سے وہ روٹی اپنی ہتھیلیوں کے چاک پر چڑھا کر اُسے ایک شکل دیتی اور پھر توے پر الٹ دیتی..وہ پہلی روٹی جو توے سے چنگیر میں اترتی ہم سب کے ہاتھ اُس کی جانب لپکتے..اور اس دوران ماں آٹے کے ایک اور پیڑے کو اپنی ہتھیلیوں کے چاک پر چڑھا دیتی...اُس کے ماتھے پر چولہے کی آگ کی قربت سے پسینے کے جو قطرے نمودار ہوتے اُن میں سے کوئی ایک ٹپ سے آٹے میں گر جاتا...بس اتنے زمانوں میں کسی روٹی میں اُس کے پسینے کی مہک تو نہ نصیب ہوئی۔'' مصطفےٰ اسلام نے جب عارف نقوی کی جانب..اپنی ماں کے چولہے اور اُس کے سامنے رکھی چنگیر کے زمانوں سے واپس آکر نگاہ کی تو وہ اپنی شرمیلی مسکراہٹ میں مبتلا اُسے محبت سے تک رہا تھا..''سوری کامریڈ..میں بھی کیسی فضول رومانویت میں مبتلا ہو گیا تھا..''

''تو کیا تم لوٹ رہے ہو؟''

''ایک مشترک سوچ تو ہم سب میں راوی کے کناروں پر دھونی رمائے چاروں راہوں میں سرائت کی تھی کہ نہیں.. یہ ملک بُجھ گیا ہے عارف.. اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے.. تب جب ہم سینہ سپر پُر جوش اور پُر جنوں تھے تب ایک خواب تو تھا.. پر اب ہر سُو راکھ کے ڈھیر ہیں جن میں مجھے تو کوئی ایک چنگاری سلگتی نظر نہیں آتی کہ ہم ٹھہر جائیں اور اُسے ہوا دیں، ایک شعلہ بھڑکنے کی امید رکھیں.. اس کے کوچۂ و بازار میں تو مذہبی لبادے اوڑھے بے حسی، بے غیرتی اور بے ایمانی راج کرتی ہے.. محض اپنی مٹی کی چاہت میں ان تاریک راہوں میں مارے جائیں.. یہاں ٹھہر کر کیا کریں؟''

''طالبان کے ساتھ مل جائیں..''

''طالبان کے ساتھ؟..'' مصطفےٰ اسلام کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا.. راوی کے کناروں پر براجمان اُس راہب ظہیر الدین نے بھی دبے لفظوں میں طالبان کا ذکر کیا تھا.'' کامریڈ.. حماقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے.. یہ لوگ صحیح معنوں میں مذہب کی افیون کے بیوپاری ہیں کہ یہ وسیع پیمانے پر گُل لالہ کی کاشت کرتے ہیں، اُن کے ڈوڈوں میں سے افیون کشید کر کے اسے ہیروئن کی سفیدی میں بدل کر اس سے حاصل کردہ رقم کو صرف کر کے اپنے تئیں جہاد کرتے ہیں تو کامریڈ صرف ایک گرم روٹی کی حدّت محسوس کر کے اتنے تو نہ بولائے جاؤ..''

''ہم بحث برائے بحث تو کر سکتے ہیں کہ نہیں..''

''کیوں نہیں..''

''کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ میں عارف نقوی.. لکھنؤ کی سٹیج پر ایک انقلابی کرشن کسی مندر کے براہمن کی تنگ نظری کے سنگ چل سکتا ہوں لیکن.. کچھ حقائق ہیں جن سے ہم روگردانی اگر چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے..''

''مجھے از حد دلچسپی ہے ایسے حقائق سے..'' مصطفےٰ اسلام مسکرانے لگا.. پر عارف نقوی کے چہرے پر سے وہ شرمندہ اور معصوم مسکراہٹ سمٹ چکی تھی..

''ہم بھی تو ایک نظام کی بوسیدگی کو درہم برہم کر کے بدلنے کی خاطر مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں.. ریاستی مشینری کے ہر کل پُرزے.. فوج، بیوروکریسی، ملائیت کو ملیامیٹ کر کے.. اپنا ایک نظام نافذ کرنا چاہتے تھے اور ہم ماؤزے تنگ کے اس قول پر دل و جان سے ایمان رکھتے تھے کہ انقلاب بندوق کی نالی سے جنم لیتا ہے تو ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے.. صرف نظریات کا..''

کھڑکی کی سِل پر دھری تینوں موم بتیوں کی جانب اگر تا دیر دیکھا جاتا تو ایک ایسا لمحہ منکشف ہوتا جس میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سانس لے رہی ہوں، زندہ ہوں.. اپنی حیات کے یوں دھیرے دھیرے پگھلنے کے خوف سے اُن کے شعلے لرزیدہ ہوں..

''کامریڈ..'' مصطفےٰ اسلام بدستور مسکرا رہا تھا.'' براہ کرم ہم کفار کو تو اُن برگزیدہ حضرات کے ساتھ شامل نہ کیجیے جو بچیوں کے سکولوں کو بارود سے اڑاتے ہیں، عورتوں کو برقعوں میں لپیٹ کر سرِ عام کوڑے لگاتے ہیں.. چھوٹے بچوں کے ہاتھوں فوجیوں کو ذبح کرواتے ہوئے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہیں اور حجاموں کی دوکانوں کو بموں سے مسمار کرتے ہیں.. داڑھیوں کو مٹھی میں بھینچ کر پارسائی کی رسید جاری کرتے ہیں..''

اور اُدھر عارف نقوی بدستور اسی متانت سے اپنی بات آگے بڑھانے کو بے چین تھا'' کامریڈ ہم نے بھی تو اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کو آخری سچ جانا.. اس سے انکار کرنے والے یا مکمل طور پر ایمان نہ لانے والے لاکھوں لوگوں کو عقوبت خانوں میں ڈال کر مردہ کیا.. سائبیریا کی برفوں میں اتنے لوگ دفن کئے کہ اُن میں مزید تدفین کی گنجائش نہ رہی.. ہزاروں برسوں سے اپنی اپنی دھرتی پر آباد قومیتوں کو وہاں سے اکھاڑ کر کسی اور اجنبی ویرانے کی جانب دھکیل دیا تا کہ وہ مزاحمت نہ کر سکیں.. چیچنیا کی پوری آبادی کو در بدر کیا.. ہم بھی تو نظریاتی داڑھیاں ماپ کر فیصلہ کرتے تھے کہ کیا یہ مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے طے کردہ معیار پر پوری اترتی ہے.. نہیں اترتی تو سنگسار کر دو.. تو پھر ہم میں اور ان میں کچھ فرق ہے کامریڈ.. ہم اپنی علم و دانش میں اور وہ اپنی جاہلیت میں ایک ہی راستے پر چلے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے.. تو پھر..''

مصطفےٰ اسلام رنجیدہ نہ ہوا بلکہ وہ اس بحث سے لطف اندوز ہو رہا تھا.. وہ اور اس کی قبیل کے نظریاتی لوگ ہمیشہ کسی حد تک مجرم محسوس کرتے رہے کہ انقلاب اور مساوات و عدل کے نام پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں لیکن ان زمانوں میں وہ اسے سرمایہ دارانہ ملکوں کا پروپیگنڈا سمجھتے رہے اور اس میں مبالغہ بھی آخری حدوں کو چھوتا تھا اور جب انہیں حقائق کا علم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی'' ٹھیک ہے کامریڈ.. میں قائل ہو گیا ہوں کہ طالبان اور ہم اصل میں دونوں ایک ہیں تو کل سویرے ہی اُن میں شامل ہونے کے لئے وزیرستان کو کوچ کرتے ہیں البتہ اس میں ایک قباحت ہے کہ سفر اتنا طویل نہیں کہ وہاں پہنچیں تو ہماری داڑھیاں شرعی معیار کی بہار سے آشنا ہو چکی ہوں.. ویسے کامریڈ..'' وہ یکدم رُک گیا اور اُس کی مسکراہٹ چہرے سے سمٹ گئی'' میں نے تو.. لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا ہے.. اور اس ارادے کو مزید تقویت اُس نظم نے دی ہے جو میری بیٹی جینا نے اپنے خط میں لکھی ہے.. آپ سنو گے؟''

''نہیں..'' عارف نقوی نے سر ہلا کر انکار کر دیا..

مصطفےٰ اسلام جو ابھی پُر جوش ہوا تھا، یکدم پژمردہ ہو گیا کہ وہ سمجھ نہ سکا کہ آخر عارف جیسا ادب آداب کا مارا ہوا شخص اُس کی اتنی معمولی درخواست کو یوں حقارت سے رد کیوں کر رہا ہے..''نہیں؟''

''اس لئے نہیں مصطفےٰ اسلام کہ.. میں تم سے حسد کرتا ہوں.. اور میں ہر اُس شخص سے حسد کرتا ہوں جو کبھی نفرت کی حدوں کو چھونے لگتا ہے جس کے پاس واپسی کا کوئی نہ کوئی جواز، کوئی جذباتی بلاوا ہوتا ہے.. تمہارے پاس تمہاری خانہ بدوش بیوی کی اُلفت کے بہانے ہیں، تمہاری بیٹی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ایک نظم ہے جو تمہاری روح کے پانیوں میں کُنڈیاں اتار کر تمہیں شکار کرتی ہے.. میرے پاس کیا ہے؟.. مٹھی بھر راکھ.. ایک بھائیں بھائیں کرتا مُردہ فلیٹ.. جس کی ہر شے میں، شیلف میں سجی کتابوں، گلدانوں، بستر کی چادروں یہاں تک کہ واش روم کے شاور کی روانی میں بھی کبھی وہ زندہ ہوا کرتی تھی.. اور اب اُس کے بغیر یہ سب اشیاء دم توڑ چکی ہیں.. وہ فلیٹ ایک گورستان ہو چکا ہے جس میں وہ تمام چیزیں جو اُس کے زیرِ استعمال تھیں، بالوں کے برش، ہیئر پن، زیرجامہ، پرفیوم، اُس کی عینکیں، ٹیبل لیمپ کے سوئچ کا بٹن جسے وہ دباتی تھی.. اور وہ اشیاء جن پر اُس کی آنکھیں مرکوز ہوتی تھیں سب کی سب اُس گورستان میں دفن ہو چکی ہیں تو.. میں کہاں واپس جاؤں.. اسی لئے میں ہر اُس شخص سے نفرت کی حد تک حسد کرتا ہوں جس کے ہاں لوٹ جانے کے جواز ہوتے ہیں.. میں تمہاری بیٹی کی لکھی گئی نظم اس لئے بھی سننا پسند کروں گا کہ اُس میں کہیں نہ کہیں تو میری بیٹی اِنگے کے جذبات کی کچھ

جھلکیاں ہوں گی..پلیز..''

روح اور خون کے رشتے ایسے خیمے نہیں ہوتے کہ..
جب چاہا اُنہیں نصب کر دیا اور جب چاہا سمیٹ لیا..

اور جب وہ نظم کے آخری مصرعوں تک پہنچا..ڈینیوب کی نیلاہٹ اپنی نیلی بانہیں پھیلائے..آپ کی منتظر ہے..اور ماما روجا بھی..اور میں بھی..تو مصطفےٰ اسلام کی آواز بھرا گئی..

کھڑکی کی سِل پر جمی تین میں سے دو موم بتیوں کی مومی حیات اختتام کے پینڈے میں پہنچ کر گرم پگھلاہٹ میں دفن ہو چکی تھی..

اُس نے آواز کی بھراہٹ پر قابو پانے کی سعی کی اور ہولے سے پوچھا ''عارف..آپ..''

''میرے پاس کوئی متبادل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جواز ہے ٹھہرنے کا اور رخصت ہونے کے لئے بھی کوئی بہانہ نہیں ہے..نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے اور نہ..الحمرا آرٹس کونسل کے تھیئٹر میں جرمن ڈرامہ نگار برٹولڈ بریخت کا ایک معروف کھیل ''دے تھری پینی آپرا'' اردو زبان میں سٹیج ہو رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک ایسے اداکار کو کاسٹ میں شامل کرنے سے انکار نہیں کریں گے جو اردو اور خاص طور پر جرمن سے شناسائی رکھتا ہو..شاید وہ میرا انتخاب کر لیں..''

''میرے چلے جانے کے بعد اس کمرے کو..جس میں میں پیدا ہوا تھا، پھر سے ویران نہیں ہونا چاہیے..آپ یہاں منتقل ہو سکتے ہیں..''

''پیشکش ایسی ہے کہ انکار کرنا کفر ہے..لیکن..وہاں ہمایوں کے لئے میں اُس کے پاپا کا روپ ہوں..اور میرے مالی کواٹر کی چھت کے پانچویں شہتیر میں قیام پذیر راتوں کو سرسرانے والا میرا رہائشی شریک اور وہ پوپلے منہ والا چوہا، جو نیند کے دوران میرے پاؤں کا انگوٹھا چبانے کی کوشش کرتا رہتا ہے..میں ان کے بغیر اداس ہو جاؤں گا..مجھے وہیں رہنے دو..آپ چلئے..ہم اہلِ چمن خوش رہیں گے آپ سفر کیجئے..ہمارا تو یہ حال ہے کہ..

اب کون منتظر ہے ہمارے لئے وہاں منیؔر
شام آ گئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا..

کھڑکی کی سِل پر دھری موم بتیوں میں سے دو تو کب کی اپنی مومی حیات کے اختتام کے پینڈے میں ڈوب کر فنا میں اتر چکی تھیں اور جو آخری موم بتی ابھی تک جھلملاتی تھی، وہ رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے داخل ہونے والے ایک غیر محسوس ہوا کے جھونکے کی زد میں آ کر تھرتھرائی اور اُس کا شعلہ بھی سیاہ پوش ہو گیا..وہ دونوں اندھیرے میں لاپتہ ہو گئے..

●○●○●○●

رنگین شیشوں والی کھڑکی کی سِل پر جب وہ تیسری اور آخری موم بتی ہوا کے کسی غیر محسوس جھونکے کی زد میں آ کر بجھ گئی اور وہ دونوں مصطفےٰ اسلام اور عارف نقوی اندھیرے میں لاپتہ ہو گئے تو کھڑکی کے نیچے جو کوچہ کمانگراں تھا، اور لوہاری دروازے کا بوسیدہ آہنی کوکوں اور پھولوں سے سجاوٹ شدہ جو پھاٹک تھا، وہاں سے تقریباً ساڑھے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ملّہ کالونی میں سردار غالبؔ الیکٹریشن کے مختصر مکان کی پہلی منزل پر واقع ایک ایسے کمرے میں جس کی اینٹیں سیمنٹ کے لیپ کی منتظر تھیں اور جس کی چھت کی قربت میں وہ مستطیل آہنی روشندان نصب تھا جس کے راستے کبھی دل کو چھو لینے والی اور کبھی دل خراش آوازیں داخل ہوتی تھیں، وہاں اُس چارپائی پر جس کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں، اس پر لیلےٰ اونگھ رہی تھی، جب کبھی کروٹ بدلتی تو چارپائی کی چولوں میں سے جو چُرچُر کی آواز برآمد ہوتی وہ اسے بیدار کر دیتی اور وہ آنکھیں کھول دیتی تو اُسے انکل ظہیر الدین کا چہرہ دکھائی دینے لگتا جس کی جھریوں میں مسافتوں کی دُھول تھی جو تاشقند ایئرپورٹ کے طویل انتظار کے دوران اُس کے ڈیڈی سے سر جوڑ باتیں کرتے رہے تھے اور جب وہ اندرون شہر کی در بدری سے واپس آئے تھے تو اس کمرے میں اُن کے منتظر تھے..

چھت میں نصب پلاسٹک کی سفید بریکٹ میں سے بجلی کی ایک سیاہ تار ایک باریک سنپولئے کی مانند برآمد ہو کر لٹک رہی تھی اور اُس کے آخر میں سو واٹ کا ایک بلب کسی اژدھے کی آنکھ کی مانند چکا چوند ہوتا ان دونوں کے سروں پر جُھول رہا تھا..

''ظہیر صاحب.. مجھے نہیں معلوم کہ آپ جب ان گنت زمانوں کے بعد اپنے بوریوالا پہنچے تو آپ پر کیا گزری.. لیکن میرے ساتھ ایک عجیب سانحہ ہوا ہے.. میں اپنے آبائی شہر میں اپنی بیٹی کے ساتھ گھومتا پھرا اور یہ مجھے اجنبی لگا اور مجھے ماسکو کے گلی کوچوں کی یاد آنے لگی.. مجھے اپنی پنجابی بھی جو کہ میرے آس پاس چلتے پھرتے لوگوں کی زبان پر تھی، نامانوس لگی اور میں روسی کے لئے ترس گیا.. کیا آبائی وطن، اپنی مٹی کی کشش، سب کے سب انسانی ذہن کے تخلیق کردہ رومانوی فریب ہیں.. تو اپنے ماسکو کی کچھ خیر خبر.. میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ لیلےٰ کے نانا انتقال کر گئے ہیں، بلال کا فون آیا تھا اور اس بیٹے کی بھرائی ہوئی آواز نے میرے آگے بچھی ہوئی مستقبل کی بساط کے سارے مُہرے آگے پیچھے کر دیئے ہیں.. آپ کا تو ماسکو سے رابطہ ہو گا..''

ظہیر الدین کی مسافتوں کی دُھول سے اٹی جھرّیوں میں سے اُس دھول کے چند ذرّے ماسکو کے تذکرے سے دمک اٹھے.. گالینا، سویٹ لانا اور بورس خاندانی البم میں چسپاں ایک تصویر کی مانند ساکت اُس کی نگاہوں کے سامنے آویزاں ہو گئے.. ''وارث چوہدری مجھے ماسکو کی خیر خبر پہنچاتا رہتا ہے.. اور اُس نے مجھے عجیب سی خبریں دیں.. قالب،

انسانی نفسیات میں جانے یہ کیسی بھول بھلیاں ہیں کہ اُن میں بھٹکتے ہوئے راستہ تلاش کرتے ہوئے یکدم کوئی ایسی نامعلوم حقیقت سامنے آ جاتی ہے جس کے وجود کا آپ کو گمان بھی نہیں ہوتا..جانے کیا پیچیدگی ہے کہ جونہی ایک شخص جس کی ہمہ وقت موجودگی آپ کے لئے ایک مکمل ناموجودگی رہتی ہے، جب موجود نہیں رہتا، منظر سے اوجھل ہوجاتا ہے اُس کی پرچھائیاں بھی معدوم ہوجاتی ہیں تو یکدم اُس کی موجودگی کی خواہش دل کو رنجیدگی اور قلق سے دوچار کرتی ہے کہ وہ بے شک جوتا موجود ہو چکا ہے، ایک جذباتی سہارا ایک آسرا تو تھا..تب یہ پچھتاوا جنم لیتا ہے کہ آخر ہم نے اُسے اپنے برتاؤ سے اتنا بددل کیوں کر دیا کہ اُس نے فرار کی راہ اختیار کر لی..قالب، میں تو کبھی اپنے کسی خبط آمیز تصور میں یہ قیاس بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میرا بیٹا بورس میری ناموجودگی کو اس شدت سے محسوس کرے گا کہ وارث چوہدری سے درخواست کرے گا کہ وہ میرا کھوج لگائے..میں ابھی تک بے یقینی کے وسوسوں میں مبتلا ہوں کہ کیا ایسا ہونا بھی ممکن ہے..اور بقول وارث چوہدری کے..گالینا اور سویٹ لانا بھی میری عدم موجودگی کو نہایت شدت سے محسوس کر رہی ہیں، کیا ایسا ہونا بھی ممکن ہے؟''

''تو پھر آپ بھی لوٹ جانے کے بارے میں سوچنے لگے ہیں سر..''

''آپ بھی..کیا تم بھی واپسی کا ارادہ باندھ رہے ہو قالب؟''

''مجھے بنیادی طور پر لیلٰے کی فکرمندی ہے، وہ ماسکو میں پلی بڑھی ہے بلکہ شہر سے دور اپنے نانا کے ڈاچا کی کھلی نتھری فضا میں سانس لینے کی عادی ہے اور لاہور کی فضا میں تو ہمہ وقت آلودگی کا ایک غبار چھایا ہوتا ہے، خاص طور پر مکّہ کالونی میں تو میں دیکھ سکتا ہوں کہ وہ سانس بھرتے ہوئے گویا کشٹ کاٹتی ہے..مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ جائے..ظہیر صاحب، لیلٰے میرے ساتھ چلی آئی ہے تو صرف اس لئے کہ اُس کے اندر..ہر رُوسی کی مانند ایک مشرقی جذباتیت ہے اور یہ جذباتیت میری محبت کی سان پر چڑھ کر اتنی تیز دھار ہوگئی ہے کہ اس کے نتیجے میں وہ مجروح بھی ہوسکتی ہے..مجھ پر یہاں کوئی شب ایسی نہیں گزری جس میں میں اس ادھیڑبُن میں مبتلا نہ ہوا کہ اب حیات کو کن راستوں پر گامزن کروں..میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ ڈیفنس کے علاقے میں کوئی گھر کرائے پر حاصل کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرلوں..لیکن اُس نئی زندگی میں لیلٰے کا کردار کیا ہوگا..میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں بچا..یہاں سے کہاں جاتا ہے..فنا کا ایک پاتال ہے..جس میں چند برس میں بہر طور گر جاتا ہے تو پھر لیلٰے کا کیا ہوگا..اپنی زبان، ثقافتی ورثے، اپنے موسموں اور..اپنی ماں اور بھائی سے دور ایک اجنبیت کی تنہا زندگی کا سامنا کیوں کر کر سکے گی..اور مجھے بھی بلال بہت یاد آنے لگا ہے..''

''تمہیں قالب..اپنا دفاع کرنے کی چنداں حاجت نہیں..خاص طور پر محترم یوری سمرنوف کی موت کے بعد..ہم چاروں..اور کس نے کہا تھا کہ ایک ہی کشتی کے سوار..شاید اُسی مشرقی جذباتیت کی رو میں بہہ کر ادھر آ گئے..من کی موج میں بلا سوچے سمجھے ایک اضطرار کی گرفت میں جکڑے یہاں چلے آئے..ہم ایک ابہام میں چلے آئے اور اب سوچ میں پڑے ہیں کہ آئندہ حیات کو کیسے اور کہاں بسر کرنا ہے..لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارا واپسی کا فیصلہ غلط تھا، نہیں ہمیں آنا ہی چاہیے تھا، نہ آتے تو عمر بھر پچھتاتے رہتے، اپنی مٹی سے جدائی کی کسک بھی ہمیں جینے نہ دیتی، ہم نے اچھا کیا کہ ہم آ گئے..اور اب اگر ہم نے اپنا چاؤ پورا کرلیا ہے تو اچھا کریں گے اگر لوٹ جائیں گے..میں تو نہیں..تم لوٹ جاؤ گے..''

ڈیڈی اور انکل ظہیر کیسے مجھ سے غافل ہو کر اپنی حیات کے بکھیڑوں کے تانے بانے میں اُلجھے ہوئے ہیں اور اُنہیں کوئی سرا نہیں مل رہا اور محض اس لئے کہ میری آنکھیں بند ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نیند میں جا چکی ہوں..اگر میں ایک اونگھ میں ہوں تو شاید اس بے نام سی حدّت کے باعث جو چند روز سے میرے بدن کو بے آرام کرتی ہے..مجھ سے سانس نہیں لیا جاتا اتنی آلودگی ہے ڈیڈی کے آبائی شہر میں..ماسکو میں..اپنے دوستوں کے ہمراہ ڈاچا کے قریب جو سُست ندی ہے جس کے کناروں پر اتنی بلند قامت گھاس ہے کہ جب گئی رات سب لوگ واڈ کا سے مخمور ہو جاتے تھے تو کچھ جوڑے اُس گھاس میں روپوش ہو جاتے تھے لیکن مجھ میں ایک حجاب سا رہا، میں معمولی بوس و کنار سے آگے جانے سے انکاری ہو جاتی تھی..تو تب نانا سمرنوف کی پارٹیوں میں یا وارث چوہدری کی شاندار محفلوں میں پرانی فرانسیسی وائن کے گھونٹ بھرتے جب کہ منقش گلاسوں کا کرسٹل چھت سے لٹکے فانوسوں کی روشنی سے دمکتا تھا تب..کیا میں یہ تصوّر بھی کر سکتی تھی کہ کبھی میں مکّہ کالونی کے اس تنگ کمرے میں جس میں شائد روسی دہقان اپنے مویشی بھی نہ باندھیں..ایسے کمرے میں بخوشی قیام کروں گی..اور اس دوران ایک معمولی پڑھا لکھا شخص میری زندگی میں داخل ہو گا جو شہر کے فٹ پاتھوں پر بیٹھا اُن گاہکوں کا منتظر ہو گا جو اُسے صرف ایک دن کی مزدوری کے لئے ایک جانور کی مانند ہانکتے ہوئے لے جاتے ہیں..اور یہ شخص نہ تو پوشکن کی شاعری سے آگاہ ہو گا، نہ ہی اُس کے کانوں میں چائے کوسکی کی دھنیں اتری ہوں گی اور نہ ہی وہ بالشوئی تھیٹر کے وجود سے واقفیت رکھتا ہو گا..اور اس کی تمام تر ہنرمندی اس کے ہاتھوں کی مشقت میں پنہاں تھی جس کا کوئی مول نہ پڑتا تھا..اُس کے چہرے پر گزر چکے زمانوں کے فاقے اور ذلتیں رقم تھیں..اس کے باوجود اُسے سامنے پا کر میرے دل کی باگیں یوں کھنچ جاتی ہیں کہ وہ چرنے کو آتا مجھے بے بس کرتا ہے..کیا اُس سی ٹی سی ریستوران میں اُس نے کہا تھا کہ وہ واپس بھی آ سکتی ہے یا کہا نہیں تھا محض کہنے کی تمنا دل پر زور کرتی تھی..ڈیڈی اور انکل ظہیر اس واہمے میں ہیں کہ میں نیند میں گم ہوں، جب کہ نہیں ہوں..

کمرے کے واحد مستطیل روزن میں سے یکدم گلا صاف کرنے کی ایک کھنگار ساعت پر خراشیں ڈالتی داخل ہوئی اور پھر وہ مختصر کمرہ فلاح کی پکار کی گونج سے بھر گیا..

لیلیٰ بظاہر نیند میں روپوش رہی..

قالب اور ظہیر سر جھکائے اس پکار کے اختتام کے منتظر ہوئے..چُپ ہو گئے..

لیلیٰ نے زندگی میں پہلی بار اس کمرے میں فلاح کی یہ پکار سنی تھی..پہلے روز تو وہ ٹھٹک گئی تھی، خوفزدہ ہو کر سمٹ گئی تھی لیکن وہ اس آواز سے مانوس ہوتی ہو گئی..اسے یہ پکار اچھی لگنے لگی..بلکہ وہ اس کی منتظر رہنے لگی..

روزن پھر سے ایک چُپ میں چلا گیا..اذان کا اختتام ہو چکا تھا..

''وہ جو بے نام بھٹکتی ہوئی کشتی ہے جس کے ہم چاروں سوار ہیں، تو وہ جو برلن کا عارف نقوی تھا، مجھے تو وہ ایک کھویا ہوا بے آسرا بچہ لگا، وہ اتنا معصوم ہے..اُس نے مجھے نہایت رازداری سے بتایا تھا کہ گزرے زمانوں میں وہ لکھنؤ کی سٹیج پر ایک انقلابی کرشن کا روپ دھارا کرتا تھا، ایک اداکار ہوا کرتا تھا اور وہ منگل کے روز پھر سے ایک اداکار ہونے کے لئے الحمرا آرٹس کونسل کی سٹیج پر آڈیشن دے رہا ہے..جانے اُسے منتخب کیا جاتا ہے یا نہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ اپنے

ایک کامریڈ کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر خصوصی طور پر بوریوالا سے یہاں لاہور پھر آ جاؤں.. تھیٹر کی اگلی نشستوں پر بیٹھ کر اُس کی پرفارمنس کی..وہ جیسی بھی ہوگی، داد دوں.تم تب تک شائد جا چکے ہو گے..''

''اور آپ..''

''مجھے ابھی کچھ روز تو ٹھہرنا ہے..میں جس سفید روئی بھرے سفید خواب کے تعاقب میں یہاں آیا ہوں اس کی تعبیر دیکھنی ہے..اب میں تمہیں سودائی لگوں گا جب میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ وہ موسم آنے والے ہیں جب ویرانوں میں پیاسے آک کے بُوٹوں کے ڈوڈے منہ کھول دیتے ہیں اور اُن میں سے سفید مائی بوڑھیاں پُھوٹ کر ہوا میں ڈولنے لگتی ہیں..مجھے اُن میں سے کسی ایک مائی بوڑھی کا پیچھا کر کے اسے اپنی مٹھی میں بند کر لینا ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اُس کے نازک روئیں مردہ نہ ہو جائیں..مجھے تب تک یہاں ٹھہرنا ہے..اور قالب..'' یکدم ظہیرالدین کی روانی پر حیرت اور استعجاب کے قفل پڑ گئے..اُس کی آنکھیں بے یقینی میں پھیلنے لگیں کہ جو کچھ اُنہیں دکھائی دینے لگا تھا وہ تخیل کا فریب تو ہوسکتا تھا، حقیقت ہرگز نہ ہوسکتی تھی کہ مکّہ کالونی کی اُس شب میں اس مختصر سیمنٹ کے لیپ سے ناآشنا دیواروں والے کمرے میں..اُس روزن میں سے جس میں سے ابھی کچھ دیر پہلے فلاح کی آواز داخل ہوئی تھی اُس میں سے اپنی سفید رداؤں میں لپٹی، ڈولتی، جھجکتی، بے آواز وہ روئی روئی سفید مائی بوڑھیاں داخل ہو رہی تھیں..وہ قالب کے سراپے کے گرد سفید پریوں کی مانند اِٹھلاتی طواف کرنے لگیں..اُس کے ظہیرالدین کے چہرے پر بچھے جھریوں کے جال کو بھرنے لگیں..اور وہ لیلےٰ کے بظاہر نیند میں جا چکے بدن پر یوں اترنے لگیں کہ اُس کا سراپا بھی روئی کی سفیدی میں اتر گیا..

لیلےٰ نے پَٹ سے یوں اپنی آنکھیں کھول دیں جیسے مدت سے کسی سحر کے جادو سے سوئی ہوئی کوئی شہزادی کسی منتر کے پڑھنے سے بیدار ہو جاتی ہے''انکل ظہیر..آپ کیوں اپنے خواب کی ان مائی بوڑھیوں کو اپنے ساتھ لے آئے ہیں..یہ مجھے سونے نہیں دیتیں..انہوں نے میری آنکھوں کو بھی سفید کر دیا ہے..''

●○●○●○●

''خانہ بدوشوں کی گھوڑا گاڑیوں کے پہیے ..سدا حرکت میں نہیں رہتے..
سفر کی دیوانگی بالآخر زوال پذیر ہو جاتی ہے..
جیسے باغوں میں سدا بلبل نہیں بولتی..
نہ ماں باپ سدا رہتے ہیں..
نہ ہی حسن جوانی سدا رہتے ہیں..
نہ بہار کے موسم سدا بہار ہوتے ہیں..
اور نہ ہی دوشیزاؤں کی بانہوں میں..
سدا کنگن کھنکتے ہیں..''

رات کا وہی پہر ہے..

وہی پہر جب ڈینیوب کے پانی بودا اور پیسٹ کے شہروں کو ایک کرتے سوگواری سے یوں بہتے ہیں، اتنی مدھم چال میں بہتے ہیں جیسے تھم چکے ہوں..

فلیٹ کا دروازہ جو اندر سے آج بھی مقفل نہ تھا، ذرا سا دھکیلنے سے کھل گیا اور وہ ایسی آہستگی سے کھلا کہ بالکونی میں رات کے اس پہر گٹار کو آغوش میں لئے اُس کے تار چھیڑتی جینا کو بھی خبر نہ ہوئی ''خانہ بدوشوں کی گھوڑا گاڑیاں'' کی دُھن جو اُس کی گٹار کے تاروں سے جنم لیتی تھی، وہ بالکونی سے اترتی نیچے مدھم چال میں بہتے ڈینیوب میں ڈوبتی تھی اور اُس کے سُر بالکونی سے اندر آکر راہداری میں ایک سُریلی دُھند کی مانند پھیلتے مصطفیٰ اسلام کے کانوں میں ترنم ریز ہوتے تھے..

فلیٹ کے اندر ایک بے خبری خوابیدہ تھی کہ اُس نے اپنی آمد کی خبر نہ کی تھی..

وہ اُس خوابیدہ بے خبری میں دبے پاؤں چلتا بالکونی کی جانب بڑھا تو یکدم راہداری میں بچھے قالین میں سرگوشیاں ہونے لگیں، تپائی پر سجے گلدان پر نقش پھولوں کی پتیاں جاگ اٹھیں اور ان کی تازگی ایسی تھی کہ ان پر اوس کی بوندیں جھلملانے لگیں..راہداری کے عین درمیان میں چھت سے لٹکتا وہ مختصر حُجم کا فانوس جو اُس نے ایک چیک پناہ گزین سے حاصل کیا تھا، اُس کے بلور کے قتلے ایک جگمگاتا جل ترنگ بجانے لگے.. یہاں تک کہ بالکونی کے راستے ڈینیوب کی نیلاہٹ میں رنگا نیل ہوا کا ایک جھونکا راہداری میں داخل ہوا اور اُس کے قدموں تلے بچھ گیا، اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جُوتے اُس کی نمی سے گیلے ہونے لگے ہیں..سب کو خبر ہو گئی تھی..

قالین کی سرگوشیاں، گلدان کی پتیوں پر اتری اوس کی بوندوں کی گیلاہٹ، فانوس کے بلور قلموں میں سے جنم لینے والے جلترنگ کے سُر اور ڈینیوب کی نیلاہٹ میں بھرے نیلی ہوا کے جھونکے کے لمس نے جینا کو بھی خبر کر دی ''ڈیڈی؟''

پچھلے چند ہفتوں سے اُس کی یادداشت کی تختی پر جو کچھ نقش ہوتا چلا گیا تھا..کوچہ کمانگراں کا وہ رنگین شیشوں کی کھڑکی والا کمرہ..لاہور کے گلی کوچے اور ان کی گہما گہمی..بچھڑ چکے پیاروں کی وہ صدائیں جو اُس مکان میں گونجتی تھیں اور اُن میں اُس کے باپ کے آخری سانسوں کی ایک درخواست بھی تھی..وہ سب موسم اور خوراکوں کے ذائقے..سب کچھ اُس تختی سے دُھل گیا اور وہ کوری ہوگئی..جیسے وہ راہب جو صحراؤں کے کشٹ کاٹتے طویل مسافتیں پُرصعوبت طے کرتے جب ان مقدس غاروں تک بالآخر پہنچتے ہیں تو وہاں پوشیدہ سب کے سب مخطوطے کورے ہو چکے تھے..اُسے محسوس ہوا بلکہ یقین ہوا کہ وہ تو کہیں بھی نہیں گیا تھا یونہی کچھ دیر پہلے اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر اپنی دوکان ''جپسی گفٹس'' کے قریب ایک قدیم قہوہ خانہ میں ہنگیرین وائن کے چند گھونٹ بھر کر گھر واپس آ رہا ہے..

جینا بالکونی سے اٹھ کر اپنے خاص انداز میں جو کہ اُس نے اپنی ماں سے مستعار لیا تھا، مسکراتی بانہیں پھیلائے اُس کی جانب چلی آتی تھی..

اُس نے اپنا وزن تھوڑا سا بڑھا لیا تھا اور یہ کرشمہ یقیناً چاچے گام کی شوربے والی اوجھڑی کا تھا..اُس کے ذہن میں تو وہی بھرے بدن کی کہ خانہ بدوش لڑکیاں کم ہی چھریری ہوتی ہیں، جینا تھی جس نے آج سے تقریباً تین برس پیشتر اپنی جڑوں کی تلاش کی خاطر رختِ سفر باندھ لیا تھا..ان برسوں میں اُس کے چہرے کی معصومیت تو برقرار رہی تھی پر اُس پر طویل دربدری کے کُھردرے نقش ثبت ہو چکے تھے اور وہ بہت دانا سیانی لگ رہی تھی..وہ اُس کے بوڑھے وجود کے ساتھ ایک آکاس بیل کی مانند چمٹ گئی..

''آپ کو کچھ اندازہ ہے ڈیڈی کہ جب میں اتنے برسوں بعد لوٹی تو بالکونی خالی پڑی تھی، تو مجھ پر کیا گزری..میں کتنی دل گرفتہ ہوئی۔''

''اور تمہیں بھی جینا..کچھ اندازہ ہے کہ جب میں کوچہ کمانگراں کے اُس کمرے میں داخل ہوا ہوں اس آس میں کہ تم اپنی گٹار پر جھکی کوئی گیت گنگنا رہی ہوگی اور وہاں سوائے چند موم بتیوں کی پگھل کر منجمد ہو چکی موم کے تمہاری اور کوئی نشانی نہ تھی تو مجھ پر کیا گزری..''

''کیا گزری ڈیڈی..'' اُس کے سینے میں سے جینا کی مدھم آواز آئی کہ اُس کا چہرہ اُس میں دفن تھا..

''مجھے وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ وطن اب ایک سراب ہے..اگر آپ ایک طویل مدت اپنی مٹی سے جدا رہیں تو وہ بے وفا ہو جاتی ہے، تمہیں پہچاننے سے انکاری ہو جاتی ہے..میرے سارے رشتے کب کے سارے ناطے ایک مدت سے خس و خاشاک ہو کر ہوا بُرد ہو چکے اور جو ابھی موجود تھے، اُنہیں جدائی کی لمبی مسافت نے اتنا اجنبی کر دیا تھا کہ نہ تو اُن کے دل میں آپ کے لئے الفت کی کوئی چنگاری پھوٹتی تھی اور نہ ہی آپ کے بدن میں وہ خون جوش کرتا تھا جو کہ مشترک تھا..وطن محض کسک آمیز پرانی یادوں کا رومانوی نام نہیں ہے..محض چند گلی کوچے..کچھ گل بوٹے اور شناسا شجر یا پرانے ذائقے نہیں ہیں..بلکہ وطن وہ ہے جہاں کوئی تمہارا منتظر ہو..جہاں تمہارے وجود کی ضرورت ہو، حیات کرنے کا کوئی جواز

ہوء جہاں تم ہو جینا..''

اس کا کیا ذکر کہ مصطفےٰ اسلام بمشکل اپنے آنسو روکتا تھا اور جینا کی آنکھوں سے برکھائیں برستی تھیں کہ وہ جیسی ہی کیا جو بات بے بات پر رو نہ دے..وہ آنسو پونچھتی ناک سُنکتی مسکراتی اُس سے الگ ہوئی اور کہنے لگی ''ڈیڈی آپ کو راہداری میں چلتے ہوئے اپنے بیڈروم کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سناٹے کا احساس نہیں ہوا..خاموشی ہے..کچھ سنائی نہیں دے رہا..''

یہ کیا پہیلی ہے..مصطفےٰ اسلام شش و پنج میں پڑ گیا..

''ڈیڈی..''اُس کی نم آلود آنکھوں میں ایک الفت بھری شرارت کے شرارے پھوٹتے تھے''کیا رات کے اس پہر ماما کے خراٹے اتنے بلند نہ ہوتے تھے کہ آپ کو بالکونی پر بیٹھے ہوئے بھی سنائی دیتے تھے، آپ کو ڈسٹرب کرتے تھے..تو وہ آج کیوں سنائی نہیں دے رہے..سناٹا ہے..''

''ہاں..لیکن..''اُس کے بدن میں کسی بُری خبر کی تشویش کی چیونٹیاں رینگنے لگیں..''تمہاری ماں..خیریت تو ہے ناں جینا..''

''ڈیڈی..جس دن سے آپ گئے ہیں، وہ مکمل طور پر نیند میں جاتی ہی نہیں..تو خراٹے کیسے لیں گی..اکثر رات بھر جاگتی رہتی ہیں..''

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے..

وہ جو شباب کے دن تھے، میری آنکھوں میں سرخ ستارے جھلملاتے تھے تب..روجا کیسی دل کی باگیں کھینچ کر اُس پر سوار ہو جانے والی، میرے بدن کو قابو میں کر کے حواس معطل کر دینے والی لڑکی ہوا کرتی تھی..پوری شب جگائے رکھنے والی..اور پھر وہ دن کہ..خراٹوں کے سوا اور کوئی بدنی رابطہ نہ تھا..بستر کی چادر پر شکنیں صرف کروٹیں بدلنے سے اُبھرتیں..

شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے..

مصطفےٰ اسلام نے اس کے فربہ ہو چکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جگایا نہیں کہ وہ سوئی نہیں تھی، عمر کے زوال اور جدائی کی کسک سے صرف ایک اونگھ میں تھی، روجا کے کاندھے سے جب اس کا ہاتھ مَس ہوا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی نہیں..اُسی اطمینان بھری اونگھ میں رہی کہ وہ اپنے مرد کے لمس کو پہچانتی تھی..کیا واقعی وہ اپنا آبائی وطن ایک مرتبہ پھر ترک کر کے اُس کے پاس لوٹ آیا ہے، اُس کی نیم غنودگی سوال کرتی تھی..اُسے یقین نہیں آ رہا تھا..وہ بند آنکھوں سے منتظر ہوئی کہ کاندھے پر رکھا اُس کے مرد کا ہاتھ اُس کے بدن کے کس حصے پر منتقل ہوگا..پژمردہ اور ڈھلک چکی اُس کی چھاتیاں ایک دودھ بھرے تناؤ میں آ گئیں اور وہ اُن پر جا ٹھہرا..اب اسے کامل یقین ہوا کہ وہ واقعی اُس کا مرد تھا..کوئی بھی بے شک رجعت پسند..مردوں سے احتیاط کرنے والی کوئی یورپی لڑکی بھی اپنے بدن پر رکھے ہاتھ کے لمس سے یہ نہیں جان سکتی کہ یہ کس کا ہاتھ ہے..کہ اُس کی زندگی میں معمول کے مطابق بہت سے ہاتھ ہوتے ہیں لیکن ایک خانہ بدوش لڑکی..بے شک اعلیٰ تعلیم یافتہ، شہری زندگی کی آسائش میں پلی بڑھی..صرف اُس ہاتھ کو اپنے بدن پر اترنے کی اجازت دیتی ہے جو کہ اُس کے پہلے اور

آخری مرد کا ہاتھ ہو تو وہ اُس کے لمس کو پہچان سکتی ہے..

''تم آ گئے ہو؟'' اس نے نیم غنودگی میں کہا..

''ہاں..جاگ جاؤ۔''

''میں تو سوئی ہی نہیں مصطفٰے۔''

یہ پھر سے وہی زمانے ہوئے جب ہر قدم پر جنوں اختیار ہوتا تھا. مصطفٰے اسلام کے بدن کی کھولت، بزرگی اور پژمردگی، عمر کے جتنے برس گزرے تھے، وہ سب کے سب زائل ہوئے اور روجا کے بدن کا بھدا پن اور فربہی بھی ایک نوخیز سانچے میں ڈھلے..

بیڈروم کے باہر راہداری کے آخر میں اُس بالکونی کے نیچے جہاں جینا اپنی گٹار گلے سے لگائے اپنے آپ میں مسکراتی تھی، اُس کے نیچے..ڈوناؤ..استروس، ڈونا ریا یا ڈینیوب اپنی سوگواری کی سیاہی میں دفن بہتا جاتا تھا اور اُس میں اُن کے دو بدن تھے اتنی حدت میں کہ اُس کے پانی اُن کی سلگاہٹ کی تاب نہ لا کر ابلنے لگے، ان میں ایک ابال آیا، ایک ہیجان نے جنم لیا جو ایک فوارے کی مانند ان بدنوں میں سے چھوٹا اور پھر وہ سلگتی حدت ہولے ہولے دھیمی پڑتی گئی۔

''تمہارا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے..'' روجا نے اپنے سانس درست کرتے ہوئے بمشکل کہا۔

''لاہوری خوراکیں..'' مصطفٰے اسلام نے معذرت کی۔

●○●○●○●

ماسکو کی فلائٹ کے منتظر برابر کی نشستوں پر منتظران دونوں کو ایک دل آزردگی آپس میں باندھتی تھی.. وہ اُس مشترک آزردگی میں بندھے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے سے اجتناب کرتے تھے.. اپنے سامنے سے گزرتے سامان گھسیٹتے، بورڈنگ کارڈز پر بار بار نظر ڈالتے کہ کہیں وہ غلط ٹرمینل پر نہ چلے جائیں، بروقت پہنچ جائیں پریشان حال چہروں والے اُن مسافروں کو تکتے جاتے تھے جو اُن کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے تاشقند ایئرپورٹ پر.. یہ پانچ گھنٹے کا انتظام تو ختم ہونے میں نہیں آ رہا.. بے رحم اور سخت گیر لوہے کی کُرسیوں پر بیٹھے بیٹھے اُن کے بدن دُکھنے لگے تھے..

میں نے اپنے آپ کو واپسی کے جواز مہیا کرنے کی خاطر کیسے کیسے فریب دیئے.. اور اُن میں سب سے بڑا دھوکا میں نے لیلٰے کی صورت میں دیا کہ وہ کیسے ایک اجنبی ثقافت، زبان اور معاشرے میں ڈھل سکے گی.. ایک یورپی مزاج اور شکل کی لڑکی کا پاکستانی تعلیمی اداروں میں کیسے گزارہ ہوگا، شادی کیسے ہوگی، میری موت کے بعد اس کا مستقبل کیا ہوگا..
لاہور سے تاشقند تک جانے والی ازبک ایئر لائن کی پرواز میں سوار ہوتے ہی اُس کے ضمیر نے ملامت کرنی شروع کر دی کہ تو نے بے ایمانی سے کام لیا ہے.. لیلٰے کو بہانہ بنایا ہے جب کہ یہ تم خود ہو جو اپنا وطن چھوڑ کر واپس جانا چاہتے تھے.. اور یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ وہ اپنے وطن کی ثقافت، زبان اور معاشرے سے قدرے بیگانہ ہو چکا تھا، برسوں کی جدائی سے ایک ایسی دراڑ وجود میں آ چکی تھی جو لاکھ چاہنے پر بھی بھر نہ سکتی تھی.. اسے سب کچھ پرایا لگتا تھا.. یہ چند روز اُس نے ایک ذہنی اور نفسیاتی انتشار میں گزارے تھے.. پہلے روز جب وہ اپنے بھائی سردار غالب الیکٹریشن سے گلے ملا تھا تو.. اُسے اس کے بدن سے اپنے خون کی خوشبو نہیں، گندگی کی ایک دھواں آلود بُو آئی تھی اور اس نے بمشکل اپنی ابکائی پر قابو پایا تھا.. اُس گھر کے پژمردہ، عُسرت میں شکستہ در و دیوار کی ہر اینٹ اُسے ایک تابوت کی صورت نظر آتی تھی.. ہر ننگی سیمنٹ سے عاری اینٹ ایک برہنہ بھک منگی لگ رہی تھی اور اس کے روزن میں سے جو وقت بے وقت کھانسنے اور کھنگارنے کی دل خراش آوازوں کے بعد ایک دھاڑتی ہوئی آواز کمرے میں داخل ہو کر ننگی اینٹوں کو بھی لرزہ انداز کر دیتی تھی.. وہ ایک جہنم میں تھا جس میں سے وہ پہلی شب کے بعد ہی فرار ہونے کے بہانے تلاش کرنے لگا.. ابتدائی طور پر لیلٰے کا ردعمل اتنا شدید اور ناپسندیدگی کا نہ تھا، ایک تو اس کے لئے یہ ایک مشرقی ایڈونچر تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ قیام عارضی ہو سکتا ہے.. جب کہ اُس کے اندر ایک دہشت پھیلنے لگی تھی کہ کہیں مجھے زندگی کے بقیہ ایام اس عقوبت خانے میں ہی نہ گزارنے پڑیں..
راتوں کو مکّہ کالونی میں ابلتے گٹروں کا سیاہ تعفن اس کمرے کے اندر بے دھڑک چلا آتا جو نہ صرف اس کے وجود میں بلکہ گندے تکیے اور چادر میں رچ بس جاتا.. وہ گویا خود ایک گٹر میں گر جاتا.. اس تعفن بھری تاریکی میں وہ دیر تک

سانس روکے رکھتا اور جب مجبوراً منہ کھولتا تو غلاظت کے ریلے اس میں داخل ہونے لگتے..اس نے ماسکو کے ایک پیشاب خانے کے کموڈ کی تہہ میں ٹھہری ہوئی آلودگی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر بغاوت کی اور وہ یہاں پھر سے ایک کموڈ میں گر گیا تھا..چندروز جو چمکیلے اور روشن رہے وہ ظہیر الدین، مصطفیٰ اسلام اور عارف نقوی کی رفاقت کے مرہون منت تھے..

سو لیلیٰ تو صرف ایک بہانہ تھا فرار کا..یہ وہ خود تھا..

اور پھر زندگی میں پہلی بار اُس کے سسر سمرنوف نے اس کے ساتھ نیکی کی اور اپنے ہی ایک کموڈ میں ڈوب گیا..

اب اسے لیلیٰ کے بہانے کی بھی حاجت نہ رہی تھی..

لعنت ہے تم پر سردار قالب..جیسے اس بدبودار ڈرامے کا منظر یکدم تبدیل ہو گیا ہو، سٹیج پر داخل ہونے والا ایک نیا کردار جو اس کا ضمیر بھی ہو سکتا تھا، اسے لعن طعن کرنے لگا کہ لعنت ہے تم پر سردار قالب..جس مٹی سے تم پھوٹے..جس کی ہوا اگر نہ چاہتی تو جب تم نے اس جہان میں وارد ہو کر منہ کھولا تھا تو وہ تمہارے نومولود پھیپھڑوں میں نہ اترتی اور تم اسی دم نیلے پڑ جاتے..تم اسی دھرتی کو اب ایک بدبودار غلاظت خانہ قرار دے رہے ہو یہاں تک کہ تمہیں اپنے خون سے بھی کراہت آنے لگی..لعنت ہے تم پر..دراصل تم اپنے سسر اور بیوی کی عنایت کردہ آسائشوں کے اتنے اسیر ہو چکے ہو کہ تمہیں اپنی مٹی سے بھی گھن آنے لگی..دراصل یہ گندگی اور غلاظت اس دھرتی میں نہیں تم میں..ایک مطیع اور فرمانبردار اور داماد کی صورت، پیشاب خانوں کی کمائی وصول کرنے کی ذلت کے باعث..تم میں کلبلاتی ہے..یہ تمہارے اندر ہے..تم اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے وطن لوٹے تھے ورنہ مکہ کالونی کے ابلتے گٹروں میں تو اتنی غلاظت نہ تھی..لعنت ہے تم پر..

''لیلیٰ..'' وہ ان کچوکوں کو سہار نہ سکا اور دیر سے چپ بیٹھی اپنے آپ میں گم لیلیٰ سے مخاطب ہوا ''مجھے صدقِ دل سے بتاؤ کہ کیا تم وہاں..اس مکہ کالونی میں یا اُس شہر میں اپنی بقیہ حیات کا تصور کر سکتی ہو؟''

''نہیں..''

''تو پھر..''

''تو پھر کچھ بھی نہیں ڈیڈی..میں نے کہا تھا ناں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں تو میں آج بھی آپ کے ساتھ ہوں اور واپس جا رہی ہوں..''

''تو پھر تمہارے چہرے پر ایک آزردگی کیوں ایک سرسوں کے کھیت کی مانند پھیل رہی ہے..''

''بس وہ ایک دن تھا..''

''کونسا دن..''

''جب آپ اپنے کامریڈز کے ہمراہ ایک دن گزارنے کے لئے جا رہے تھے اور آپ نے مجھے کزن میر کے سپرد کر دیا تھا..وہ مجھے اس فٹ پاتھ پر لے گیا تھا جہاں سے وہ اگر خوش بخت ہوتا تھا تو ایک جانور کی حیثیت میں فروخت ہو جاتا تھا..اگر تو زندگی بھر کے لئے فروخت ہو جانا ہو تو انسان صبر کر لیتا ہے لیکن ہر روز ایک نئے مالک کا انتظار..ایک نئی غلامی کی خواہش..یہ کیسی ذلت آمیز جانور حیات ہے ڈیڈی..میں اس سے مفاہمت نہیں کر سکتی..آپ خود اقرار کیا کرتے تھے کہ آپ کو کمیونزم یا ترقی پسند نظریات سے کچھ لگاؤ نہ تھا اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے بھی نہ تھا کہ میں تو اس نظام کے انہدام کے بعد کی

پیداوار ہوں..لیکن اس فٹ پاتھ پر بیٹھے بیشتر بھوکے، نادار اور فٹ پاتھ کی جانب بڑھنے والے ہر گاہک کی جانب کتوں کی ایک روٹی ایک بوٹی کے اشتیاق میں منتظر آنکھوں والے مزدوروں کو دیکھ کر میں اشتراکیت کے فلسفے کی قائل ہوئی..''

''اور میر؟''

''میری اس مختصر اٹھارہ برس کی زندگی میں وہ پہلا مرد تھا جس کی آنکھوں میں نہ تو میرے لئے کچھ ہوس تھی اور نہ ہی مجھے اس نے متاثر کرنے کے لئے کسی دکھاوے یا فریب سے کام لیا..وہ جو تھا ظاہر تھا..''

''تم اس سے متاثر ہوئیں؟''

''میں انکار نہیں کر سکتی کہ نہیں..''

قالب پروردہ تھا اسی مغربی معاشرے کا جس میں اولاد کو انتخاب کا حق دیا جاتا ہے بلکہ ان کے جذبات کی صداقت جان کر ان کی معاونت کی جاتی ہے''اگر تمہارے جذبات میں اس کے بارے میں کوئی پختہ سنجیدگی ہے..تم سمجھتی ہو کہ یہ مرد تمہیں زندگی بھر الفت بھری خوشی دینے کے قابل ہے تو میں انکل سمرنوف کے صدر پیوٹن کے آس پاس جو رابطے تھے، ان میں سے کسی ایک سے درخواست کر سکتا ہوں..اسے ماسکو میں سیٹل کیا جا سکتا ہے..''

''نہیں ڈیڈی..میں ابھی ایک الجھن میں ہوں..نہیں جانتی کہ جو کچھ میں اس کے لئے محسوس کرتی ہوں وہ محض ایک عارضی ابال ہے جس میں مشرق کے سحر کا ایک رومانوی تصور ہے یا اس میں ہمیشگی کے جذبات پرورش پا رہے ہیں، میں نہیں جانتی..اور اگر جان لوں تو بھی..میں یہ کبھی نہ چاہوں گی کہ اسے ایک قابل فروخت شے کے طور پر روس میں درآمد کر لیا جائے..اور وہ..مجھے معاف کر دیجئے گا ڈیڈی..کہ وقت گزرنے سے آپ جیسا اطاعت گزار اور فرمانبردار ہو جائے..اور آپ نانا سمرنوف اور میں ماما گالینا ہو جائیں اس پر حکمرانی کرتے ہوئے..ویسے ڈیڈی میں نے اسے صرف پل دو پل جانا ہے لیکن یہ جانا ہے کہ وہ عمر بھر اس فٹ پاتھ پر بیٹھا رہے گا لیکن کبھی بھی یوں درآمد ہونا پسند نہیں کرے گا، بہر طور پیشکش کا شکریہ۔ مجھے معلوم ہے آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں لیکن یوں نہیں ڈیڈی۔''

تاشقند ایئرپورٹ کے دروازوں کو دھکیلتے، قدرے خمار میں لگتے، مرد و زن..مرد نیویارک، لندن اور پیرس کے خصوصی اور گنے چنے لوگوں کے لئے تیار کردہ ملبوسات میں مہکتے، کلائیوں پر ہیروں سے جڑی دمکتی گھڑیاں جنہیں عرب باشندے بھی خریدنے سے جھجکتے..اور ان کی عورتوں کے بھدے بدن ڈھکے ہوئے نیویارک کے ففتھ ایونیو کے فیشن گھروں کے تازہ ترین لباسوں میں اور ٹفنی جیولرز کے جواہرات سے، سراپے اگرچہ بھدے مگر زیبائش شدہ..انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیوں کے جمگھٹے امارت میں زینت شدہ..ان میں ایک عمر رسیدہ سنہری وِگ میں آراستہ عورت جس کی ڈھل چکی چھاتیوں کی ڈِھل مِل میں ایک پوڈل تھوتھنی گھسائے اونگھ رہا تھا اور پوڈل کے شیمپو شدہ سفید بالوں کی دونوں پونی ٹیلوں میں اگرچہ معمولی سے لیکن ہیرے لشکتے تھے..

یہ نیا روس تھا..

کمیونزم کے چنگل سے آزاد ایک نیا اور جمہوری روس۔

اگرچہ وہ بھی زاروں کی مانند اقلیت میں تھے..اور خلق خدا پہلے سے بھی زیادہ ذلتوں کی ماری ہو گئی تھی لیکن وہ نمائندگی کرتے تھے سرمایہ دارانہ نظام کی بے بہا متمول برکتوں کی..صرف ان چند لوگوں پر اس نظام کی رحمتوں کا نزول ہو رہا تھا..

جب ان کی آمد کا ہنگامہ قدرے دھیما پڑا اور ان میں سے بیشتر ماسکو کی پرواز کے انتظار کی کوفت ڈبونے کی خاطر ریستوران کے بار کاؤنٹر پر جا براجمان ہوئے تو قالب نے آہستہ سے کہا ''لیلٰے..''

''جی ڈیڈی...''

''بلال.. بڑا ہو گیا ہوگا..''

لیلٰے کے دودھیا چہرے پر سفید اور معصوم اپنے باپ کی الفت میں ڈوبی ایک مسکراہٹ پھوٹی ''ڈیڈی.. ان چند روز میں بلال کتنا بڑا ہو سکتا ہے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتیں.. اگر آپ اپنے بچے سے صرف ایک دن کے لئے جدا ہوں تو آپ کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اس جدائی کے دوران جانے کیسا قد کاٹھ نکال چکا ہوگا.. جوان ہو چکا ہوگا..''

''ڈیڈی..'' اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیں ''آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ کیوں چلی آئی تھی.. آپ مجھے گھر چھوڑ آئے تھے اور میں ماسکو ایئر پورٹ پر آپ کے پیچھے قطار میں آ کھڑی ہوئی تھی.. اس لئے کہ آپ اتنے معصوم ہیں..''

سردار قالب کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اپنے آپ کو معصوم قرار دیئے جانے پر اسے اپنی توصیف سمجھے یا اپنی سادگی کی حماقت اور اس نے گڑبڑا کر لاؤنج کی مرصع دیوار پر آویزاں وال کلاک پر نظر کی اور ایک سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا ''ماسکو کی پرواز میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ میں تمہارے لئے ریستوران سے جوس لے کر آتا ہوں۔'' اور وہ اس کی خواہش جانے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

اگرچہ ماسکو کی پرواز میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا، لیکن اس کے سوا یہ میسّر تھا جو باقی تھا.. اور اُسے لیلٰے کو اُس لمحے اس کے سردار میر کے سینے پر بالوں کے جو گھنے الجھاؤ تھے ان میں اٹکی ہوئی پسینے کی بوندوں کی گیلی بُو آئی اور اس کے کولہوں پر کسی نیلی جین ڈھیلی ہونے لگی.. یہ عجیب سے آثار تھے..

ماسکو کے لئے روانہ ہونے والی ایروفلوٹ کی پرواز کے اعلان لاؤنج کے طول و عرض میں گونجنے لگے اور وہ دونوں بے تابی سے اٹھے اور اپنا سامان گھسیٹتے تعین کردہ ٹرمینل کی جانب بڑھنے لگے..

ماسکو ایئر پورٹ کے اندرون کی گرمائش بھری آسودگی میں سے جب وہ باہر آئے تو وہاں نیم تاریکی کی جانب سے ہولے سے آتی نم آلود سردی میں ٹھٹھرتی ہوا میں برچ کے جنگلوں کی سفیدی کی مہک بھی چلی آتی تھی۔ بارش کا مزاج اس شب تو نہ تھمنے والا تھا اور مسلسل بوند بوند گرتے جانے والا تھا..

قالب نے اس تازہ اور تند سفید ہوا میں ایک گہرا سانس بھرا اور اس کے بدن سے اجنبیت رخصت ہو گئی..

ایئر پورٹ کے پُر ہجوم لاؤنج میں جو چہرے حرکت کرتے تھے، ان میں بلال اور تانیا کی منتظر متلاشی آنکھیں بھی تھیں جو تاشقند سے آنے والے مسافروں پر رکتی تھیں اور سفر کر جاتی تھیں اور بالآخر وہ ان دونوں کے چہروں پر ٹھہر گئیں.. ان آنکھوں سے جدائی اور الفت کے جھرنے پھوٹنے لگے..

اس تازہ اور تُند سفید ہوا میں جو برچ کے گھنے بیلہ میں بھیگتے جنگلوں کی جانب سے چلی آتی تھی اس نے وہ گہرا سانس بھرا..تانیا کے پُرشوق اور بلال کے اس کے لئے اداس ہو چکے اور اب تمتماتے چہرے پر نظر کرتے اس نے جیسے برچ کے جنگلوں سے مخاطب ہو کر سرگوشی کی ''اے مادرِ وطن روس، اگرچہ میں تمہارا لے پالک بیٹا ہوں لیکن میں تم سے بھی جدا نہیں رہ سکتا، میں لوٹ آیا ہوں..''

●○●○●○●

شٹالے کے اوس میں بھیگے نچڑتے ہریاول سمندر کھیت میں..ملگجی چاندنی کے غبار میں نہائی ہوئی وہ ایک سرمست خمار کی مستی میں اپنے دونوں ہاتھ اوس بھرے بُوٹوں پر پھیرتی اُن کی ٹھنڈک اور گیلاہٹ کو اپنی کھلی ہتھیلیوں میں محسوس کرتی چلتی جا رہی تھی..اُن ہتھیلیوں پر قسمت کی جو ریکھائیں کُھدی تھیں ان میں وہ اوس سرائت کرتی اُس کے پورے بدن میں پھیلتی ایک ٹھنڈک بھری نمی سے یوں تروتازہ کرتی تھی جیسے کچھ لمحے پہلے اُس کا وجود دُھوپوں کا مارا ہوا پژمردہ اور سُوکھتا ہوا دھان کا ایک کھیت تھا جو ہتھیلیوں کے راستے داخل ہوتی اوس کے چھینٹوں کے چھڑکاؤ سے جی اٹھا ہو..اُس کے بُوٹوں میں جان پڑ گئی ہو..

وہ ایک وینس تھی جو سمندر کی نیلاہٹ میں سے اپنا لبادہ سنبھالتی ظاہر نہ ہوتی تھی، بلکہ مکمل برہنگی میں شٹالے کے ہریاول سمندر کے بیچ میں اترتی جاتی تھی..شٹالے کی ہری کچور فصل اُس کی رانوں تک آتی اُسے اپنے آپ میں مدغم کرتی تھی..لیکن وہ اُس میں ڈوبتی نہ تھی، خمار کی اداس اور اپنے آپ پر رحم کھانے والی بے قراری میں، اپنی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو پُونچھنے کا تردّد کئے بغیر کہ وہ بُوٹوں پر پھسلتی اپنی ہتھیلیوں کو آنکھوں تک نہ لانا چاہتی تھی، وہ چلتی جاتی تھی..یہاں تک کہ وہ آنسو رخساروں سے ڈھلک کر اُس کی ملگجی چاندنی کے غبار میں نہائی ہوئی سفید رنگت کے انار چھاتیوں پر گرتے..
اُن کی مدھم حدّت کے اثر سے ذرا دمکتے اور پھر جونہی اوس کی ٹھنڈک اُن پر غالب آتی تو وہ سرد اور بے رُوح ہو جاتے..

وہ کبھی کبھار اپنی نم آلود ہتھیلیوں کو اپنی چھاتیوں پر پھیرتی اور ذرا سی کپکپاتی کہ راتیں سرد ہو رہی تھیں..

اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار کسی کمرے کی قید میں نہیں بلکہ کھلی فضا میں برہنہ حالت میں یوں تُولا کے شہر کے باہر برچ کے ایک قدیم جنگل میں جہاں تک دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن آ گئے تھے وہاں وہ شدید برستی بارش میں یوں بے خودی میں چلتی گئی تھی..

سَرجی یونیورسٹی میں اُس کا سینئر کولیگ تھا..اُس نے اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے لئے جنگی حکمت عملی کے موضوع کا انتخاب کیا تھا..اور وہ اس موضوع پر طویل اور سینکڑوں راتوں کی تحقیقی عرق ریزی کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ..ماضی کی عظیم جنگوں کی حکمتِ عملی کا مطالعہ کر کے، اُن کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر اگر کسی ایک جنگ کی منصوبہ بندی کی جائے تو وہ جیتی جا سکتی ہے..شکست کا امکان البتہ سراسر خارج نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں نصیب یا کسی ناگہانی صورت حال کا سامنا بھی ہو سکتا ہے..سَرجی کو مہا بھارت کی جنگ سے لے کر ٹرائے کے محاصرے، ہینی بال کی روم پر یلغار..سکندر اعظم اور ایرانی دارا کے درمیان ہونے والے معرکوں کے علاوہ تمام تر یورپی جنگوں کی تفصیل یوں از بر تھی جیسے وہ خود اِن جنگوں میں ایک سپاہی کے طور پر اور ایک سپہ سالار کی حیثیت میں بھی شریک ہوا ہو..ظاہر ہے ایک رُوسی ہونے کے ناطے اُس کی

خصوصی دلچسپی نپولین کے حملے اور جرمنوں کی پیش قدمی کے مراحل میں تھی..

تو اب وہ تُولا یونیورسٹی میں جنگی حکمت عملی پڑھانے کے بجائے اقتصادیات پر کیوں لیکچر دیتا تھا؟

ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد اور بہت ہی نمایاں پوزیشن حاصل کرنے کے بعد اُسے ڈیفنس کالج میں نئے کیڈٹوں کو جنگی حکمتِ عملی پڑھانے کی ملازمت آسانی سے مل گئی..اُس کے کولیگ اُس کی ذہانت اور کھرے بے لاگ تجزیوں کے بے حد معترف تھے اور اُس کی تعظیم کرتے تھے..لیکن کسی ایک سیمینار کے دوران چند سینئر فوجی افسروں کی موجودگی میں لینن گراڈ کے معرکے پر لیکچر دیتے ہوئے، بلیک بورڈ پر اُس جنگ کے ہر محاذ کے تفصیلی نقشے بناتے ہوئے اُس نے ان زمانوں میں ایک انہونی بات کہہ دی..اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر روسیوں نے جرمنوں کی برتر فوجی عظمت کا منہ توڑ کر بالآخر اُسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تو اس میں روسی سپاہ کے کمیونزم کے فلسفے پر ایمان رکھنے یا اکتوبر انقلاب کی سلامتی کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دینے کا کچھ عمل دخل نہ تھا..یہ جنگ صرف مادر وطن روس کی بقا کے جذبے سے سرشار ہو کر لڑی گئی..کہ روسیوں کی حب الوطنی ہی اُن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے..اور اگر اُن زمانوں میں روس پر زاروں کی حکمرانی ہوتی تو بھی اس عظیم فتح نے بہرطور روسیوں کے قدم چومنے تھے..چنانچہ اُسے فی الفور اس نظریئے کے پیش کرنے پر ڈیفنس کالج سے فارغ کر دیا گیا..سوویت یونین کے انہدام سے صرف چھ ماہ پیشتر..

اور اب وہ تُولا یونیورسٹی میں اقتصادیات پڑھاتا تھا..زمانے اور نظام بدل گئے تھے اور ان میں جنگی حکمت عملی کے ایک ماہر کی کچھ زیادہ گنجائش نہ تھی..

اور وہ اُن دنوں روسی ادب کی طالبہ تھی..

سَرجی اُس سے دس برس بڑا تھا..وہ یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پیشتر اُن تمام میدانوں میں مارا مارا پھرتا تھا جہاں جہاں روسیوں نے نپولین کی مدافعت کی تھی..وہ مہینوں کسی ایک ماضی کے میدانِ جنگ میں خیمہ نصب کیے پڑا رہتا.. کبھی کبھار کسی کھیت یا جنگل میں دبے ہوئے بوسیدہ ہو چکے نپولین کے زمانے کے ہتھیار اُس کے ہاتھ لگ جاتے..اور اکثر اپنے آپ کو ایک روسی سپاہی اور اپنے سامنے فرانسیسی افواج کو صف آرا تصور کرتے ایک خیالی دشمن کی جانب کھیتوں اور ویرانوں میں چیختا چلاتا بھاگنے لگتا تا کہ وہ اُس عہد کے روسی سپاہی میں ڈھل کر اُس کے ذہن میں آتے خیالوں تک رسائی حاصل کر سکے..روسی دہقان اسے ایک خبطی سمجھ کر اُس کی جانب کچھ دھیان نہ کرتے۔

تو یوں سَرجی ذرا تاخیر سے یونیورسٹی میں آیا اور اس لئے وہ اُس سے دس برس زیادہ کی عمر میں تھا..

سَرجی نے اُسے..کیتھرائن کو ملتفت نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود شعوری کوشش سے اُس کی دبیز عینک میں اپنی نیلی نگاہوں سے چھید کرتی زبردستی اُس کے دل تک پہنچ گئی تھی..

تُولا کے قدیم چوبی گھروں سے ذرا آگے وہ شاہراہ جو ٹالسٹائی کی آبائی ریاست یاسنایا پولیانا تک سفر کرتی ہے اُس میں سے ایک ذیلی سڑک دائیں جانب مڑتی گلابی پھولوں کے وسیع کھیتوں کے اندر تک چلی جاتی ہے..ان پھولوں کی کاشت بے حد منافع بخش تھی کہ اُن سے کشید کردہ عرق سے جان بچانے والی کچھ ادویات تیار کی جاتی تھیں اور وہاں اُس ذیلی سڑک کے اختتام پر..جہاں ان گلابی کھیتوں کا اختتام ہوتا تھا اور برچ کے صدیوں قدیم گھنے برچ کے جنگلوں کا آغاز

ہوتا تھا..جو مادرِ وطن روس کے سینے پر ازلوں سے بچھے ہوئے تھے وہاں سَر جی کا برچ کے تنوں سے تعمیر کردہ ایک جھونپڑا تھا جس میں وہ تنہا زندگی بسر کرتا تھا..

اُس شب بھی ایسی ہی ملگجی بجھی بجھی سی چاندنی کا غبار سارے عالم میں تھا اور چوبی جھونپڑے کے شہتیروں کی درزوں میں سے وہ چاندنی دبے پاؤں چلی آتی تھی.. سَر جی ایک مختصر مدت کے لئے سرگرم عمل رہا اور پھر مُنہ موڑ کر ایک شکست خوردہ حالت میں نیند میں چلا گیا..شاید وہ اُس لمحے ہومر کے زمانوں میں کسی یونانی معرکے میں ہزیمت آشنا ہو گیا تھا..

تب وہ ایک غیر تسلی شدہ بدن کے ساتھ، خراٹے لیتے ہوئے منہ موڑے سَر جی کے پہلو سے اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آئی تو اُسے بارش نے آلیا اور وہ برچ کے جنگلوں کی بھیگتی سفیدی میں اپنی برہنگی کو بھگوتی اُن کے اندر تک چلی گئی تھی..

کیا تب اُس کے وحشی ترین تصوّرات میں، کسی ناممکن گمان میں، کسی سراب خواب میں اس امکان کی کوئی تصویر مصور ہو سکتی تھی جس میں وہ ٹُولا کے برچ کے جنگلوں کے بجائے پنجاب کے ایک دور افتادہ اور پس ماندہ گاؤں کے باہر کچے گھروندوں کے ایک ڈیرے میں سے نکل کر جہاں ایک بھڑکتا الاؤ کب کا راکھ ہو چکا تھا وہ یوں ایک اوس میں بھیگتے شٹالے کے کھیت میں بدن برہنہ، ایک ایسی ہی ملگجی چاندنی کی رات میں ایک بدن فروش طوائف کی صورت میں یوں چلتی جائے گی.. ہزیمت اور شکست خوردگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

لاہور سے بورے والا واپسی پر ظہیر الدین کے لئے متعدد سندیسے اور پیغام منتظر تھے جو ایک ہی شخص کی جانب سے چلے آئے تھے..وہ اُس کی وہاں موجودگی کی سُن گُن پا کر، اُس کی آمد کی خبر پا کر اُس کے کواٹر تک آیا تھا..جڑوں والے کنویں میں جھانک کر..کواٹر کو بے آباد پا کر وہ آس پاس کے لوگوں کو تاکید کر گیا تھا کہ جونہی وہ واپس آئے اُسے میری خبر کرنا..اُس شب جب وہ ایک مخمصے میں تھا کہ آخر یہ کون بیتاب ہے، عبداللہ پردیسی کون ہے جس کے سندیسے مجھے ملے ہیں تو کواٹر کے باہر کسی زوردار جیپ کے ٹائر گھسٹنے اور رکنے کی آواز آئی..اور پھر وہ اُس کے سامنے کھڑا، ایک پاپا ہیمنگوے طرز کی گھنی داڑھی میں پوشیدہ اپنی مسکراہٹ عیاں کرتا تھا..

گمشدہ اور گزر چکے زمانوں کی تاریکیوں میں سے وہ یکدم نمودار ہوا اور اُسے پہچاننے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی.. اور اس دوران وہ اُس سے لپٹ چکا تھا..

اگر بورے والا ٹیکسٹائل مل کی مزدور یونین کا سربراہ اُس کا والد شمس الدین انقلابی تھا تو ویونگ سیکشن کا انچارج اسماعیل پردیسی اُس کا نائب اور جی جان سے سرخ انقلاب کے لئے زندگی قربان کر دینے کا عزم رکھتا ہوا اُس کا قریبی ساتھی تھا..وہ اور اُس کا اکلوتا بیٹا عبداللہ اس مِل کے احاطے اور کواٹروں میں پلے بڑھے تھے اور واقعی بچپن کے جگری یار ہوا کرتے تھے..ظہیر الدین نے جب ماسکو کے لئے رختِ سفر باندھا تو عبداللہ.. بی اے کرنے کے باوجود معمولی ملازمت کے حصول کے لئے بھٹکتا پھرتا تھا..ان دونوں کے درمیان زمانوں کے اتنے پانی بہہ چکے تھے کہ وہ ایک عرصے سے اُسے یکسر بھولا ہوا تھا..اُن کی دنیاؤں میں رابطہ نہ رہا تھا..اور اب وہ اُس کے سامنے کھڑا..ایک پاپا ہیمنگوے طرز کی گھنی داڑھی

میں پوشیدہ اپنی مسکراہٹ ظاہر کرتا تھا..داڑھی میں سفیدی کا تناسب اور ماتھے پر نمودار ہو چکی کروٹیں جدائی کے زمانوں کا پیمانہ نظر آتی تھیں..

''ظہیر..تم تو ایسے گم ہوئے ،ایسے کھو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں..'' وہ شکایت نہ کرتا تھا، اُس کے چہرے کو جی بھر کے دیکھتا اُس پر نثار ہوتا تھا..''میرے ایک کارندے نے مجھے خبر کی کہ مِل کے اُس اجڑے ہوئے کوارٹر میں جس کے صحن میں جڑوں والا کنواں ہے، وہاں باہر کے ملکوں سے آیا ہوا کوئی شخص مقیم ہو گیا ہے..اور وہ..تمہارے سوا اور کون ہو سکتا تھا ظہیر..تم اب آ گئے ہو؟''

''ہاں عبداللہ..''

''تم نے آج میرے ساتھ چلنا ہے..''

''ابھی؟''

''ہاں..''

''کہاں؟''

''جہاں میں لے چلوں..''

●○●○●○●

عبداللہ پردیسی کی ملکیت میں اب اراضی کی ایک بے بہا وسعت تھی..اُس نے ایک مدت بیکاری کی ذلت برداشت کی اور جب زندگی میں پہلی بار اس نے مسلسل دو روز بھوک کاٹی تو اُسے احساس ہوا کہ اُس کی ناکامی کا سبب اُس کا باپ تھا جو غربت میں مست مزدوروں کے راج کے خواب دیکھتا تھا، مساوات اور عدل پر مبنی ایک معاشرے کے طلوع ہونے کا منتظر تھا..اور وہ منتظر ہی رہا..اپنے باپ کی فلاکت زدہ زندگی اور ناکام جدوجہد ہی دراصل اُس کی بھوک کا سبب تھی..اُسے اپنے لئے ایک جدا راستہ اختیار کرنا تھا ورنہ اُس کا انجام بھی اُسی جیسا ہونا تھا کہ جس روز اُس کے باپ کو دفن کیا گیا..اُس کے کوارٹر میں بھی شمس الدین انقلابی کے کوارٹر کی طرح اشترا کی ادب اور کمیونسٹ رہنماؤں کے پوسٹرز کے سوا کچھ بھی نہ تھا..چنانچہ عبداللہ نے مساوات، انصاف اور سچائی سے مکمل طور پر منہ موڑا..بے رحم، بے انصاف اور بے روح ہو گیا اور زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں تھیں..پہلے ایک امیر کبیر سُست الوجود عیاش جاگیردار نوجوان جعفر گیلانی کے قریب خوشامد اور اُس کے پاؤں میں ہمہ وقت ایک جانور کی مانند لوٹنے سے ہوا..اُس کے تعاون سے ایک سپننگ مل قائم کی اور یہاں اُس کے وہ دن کام آئے جب وہ اپنے باپ کے ہمراہ سارا سارا دن بورے والا ٹیکسٹائل مل کے سپننگ یونٹ میں گزارا کرتا تھا..اور جب اُس سپننگ مل کے تکلے یوں گھومنے لگے کہ اُن کے گرد سُوت کے نہیں سونے کے تار لپٹنے لگے تو اُس نے جعفر گیلانی کو ایک شب جب وہ بظاہر عالم مدہوشی میں تھا اور وہ دونوں بلیک لیبل کی دو بوتلیں اپنے اندر انڈیل چکے تھے چیلنج کر دیا کہ سردیوں کی اس یخ بستہ رات میں مرد وہی ہوگا جو نزدیکی نہر میں چھلانگ لگا کر تیرتا ہوا دوسرے کنارے کو ہاتھ لگا کر واپس آ جائے..دو چار مزارع اور خدمت گزار بھی سر جھکائے ساتھ ہو لیے..اُن دونوں نے بیک وقت..غُل کرتے، شور مچاتے، قہقہے لگاتے اور عبداللہ پردیسی اس غُل غپاڑے میں ایک اداکار کی حیثیت سے بلند آہنگ اور پُرشور تھا..جعفر گیلانی اپنی مدہوشی میں یہ کیسے جان سکتا تھا کہ عبداللہ پردیسی ذرا پیچھے رہ گیا ہے اور اُس نے بے دریغ نہر کے ان پانیوں میں چھلانگ لگا دی جو ٹھہرے کی اس شب میں برف کی کرچیوں میں بدل جاتے اگر ایک پل کے لئے ٹھہر جاتے..

وہ دو چار مزارع اور خدمت گزار عینی گواہ تھے کہ مخدوم سائیں نے نہر کے نیم بستہ پانیوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے دوسرے کنارے کو ہاتھ لگا لیا اور پھر واپس ہوئے ہیں تو یکدم نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں..

کچھ لکھت پڑھت نہ تھی..عبداللہ پردیسی نے سپننگ مِل کے احاطہ میں اپنے محسن اور عزیز دوست کے لئے تنبو قناتیں لگوا کر پورے دس روز اُس کی آخرت کو آسان کرنے کی خاطر قرآن خوانی کروائی..اور ہر روز چالیس دیگیں نذر نیاز کیں، چونکہ کچھ لکھت پڑھت نہ تھی اس لئے اب وہ سپننگ مِل کا خود مختار مالک تھا..پھر ہر اُس کاروبار میں برکت پڑنے لگی، فضل ہونے لگا جس میں عبداللہ پردیسی ہاتھ ڈالتا تھا، زرعی اوزاروں کی سب سے وسیع فیکٹری..متعدد

کولڈسٹور یج..چاول چھڑنے کے کارخانے..انڈوں سے چوزے نکالنے والی ہیچر یز اور لاہور کی ایم ایم عالم روڈ پر ایک غیر ملکی برگر ریستوران کی فرنچائز۔

اُس کا اثر رسوخ اتنا تھا کہ ملک کی ہر سیاسی پارٹی اُسے اپنے امیدوار کے طور پر ٹکٹ دینے کے لئے منت سماجت کرتی تھی..وہ تین مرتبہ ایم پی اے رہ چکا تھا اور صوبائی اسمبلی میں ایک آتش بیاں مقرر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جو ہمیشہ حق سچ کی بات کرتا تھا، مزدوروں، کسانوں اور غربت کے مارے لوگوں کی بات کرتا تھا..ہمیشہ اپنے باپ کا حوالہ دیتا تھا کہ اُس نے کیسے اپنے نظریات کی خاطر عمر بھر بغیر کسی ستائش یا ذاتی غرض کے جدوجہد کی..

وہ جو اُس کی بے بہا وسعت والی اراضی تھی اُس کے درمیان میں اُس کا ڈیرا تھا..

متعدد کچی کوٹھڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی جن میں کپاس اور دیگر اجناس کے ڈھیر ذخیرہ شدہ تھے..ان ڈھیروں کے کناروں پر نوار کی چار پائیاں تھیں..کوٹھڑیوں کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا جس میں بے کار ہو چکی زرعی مشینری کے پُرزے بکھرے ہوئے تھے، کھاد کی بوریوں کے انبار تھے..اس برآمدے کے سامنے ڈیرے کا کچا صحن پھیلا ہوا تھا جس کی حدود کا تعین آموں اور مالٹوں کے باغوں کے اُن پیڑوں سے ہوتا تھا جو اپنی وسعت میں سے برآمد ہو کر اُس صحن تک پہنچتے تھم جاتے تھے..کچے صحن کے درمیان میں ایک الاؤ بھڑکتا تھا جس کے روشن کناروں کی قربت میں بڑے بڑے نواری پلنگ بچھے تھے..اور جہاں الاؤ سے کچھ دور ایک نیم تاریکی کا آغاز ہوتا تھا وہاں عبداللہ پردیسی کے مزارع جھکے جھکے اپنے آپ کو پوشیدگی میں رکھتے حرکت کرتے تھے..وہ پرچھائیوں کی مانند بے آواز ظاہر ہوتے اور اُن کے گلاسوں کے خالی پن کو بلیک لیبل سے بھرتے پھر سے پوشیدہ ہو جاتے..

مالٹے کے باغوں کی آخری ٹہنیوں اور مہک آور کھٹے پتوں کے قریب ایک تنور دہکتا تھا جس میں مسلسل کپاس کی سُوکھی ٹہنیاں جھونکی جارہی تھیں..وہی پرچھائیاں مزارع چولہے پر چڑھے اُس دیگچے کا دھیان بھی رکھتے تھے جس میں ایک چولستانی بکرے کا گوشت حدّت کی تاب نہ لا کر خستہ ہو رہا تھا..

کسی ایک خدمت گزار کے خدوخال روشن ہوتے..اور کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ جیتے جاگتے انسان ہیں، اُنہی کی مانند اپنی ماں کی دعاؤں کے آرزومند ہوتے ہیں، اپنے بچوں پر جان دیتے ہیں اور اُنہی کی مانند اپنی اور وہ بھی مشقتوں اور ذلتوں کی ماری گھر والی کے ساتھ..اُنہی کی مانند جنسی اشتعال میں آتے ہیں کہ وہ اس شب محض مجبور پُتلیاں دکھائی دیتے تھے جن کی ڈور اُن کے مالک کے ہاتھ میں تھی..وہ انسان تو نہیں ہو سکتے تھے..

تنور کی سلگتی کچی گولائی سے چپکی روٹیوں کے خمیر میں سے پک جانے کی ایک اشتہا انگیز مہک اٹھی اور وہ ظہیر الدین کے نتھنوں تک چلی آئی اور اُسے احساس ہوا کہ خمار گندم اُس پر غالب آتا ہے اور آتش سیال کے چند گھونٹوں کے سوا اُس کے بدن میں اور کچھ نہیں اترا..اُس نے متوقع نظروں سے عبداللہ پردیسی کی جانب دیکھا..عبداللہ پردیسی کوئی ایسا عیار اور دھوکے باز شخص نہ تھا..اُس نے بھوک سے مجبور ہو کر یہ طور طریقے اپنائے تھے اور کبھی کبھی راتوں کو وہ اپنے باپ اسماعیل پردیسی کو کسی فنا کی دھند میں سے ظاہر ہوتے خواب میں دیکھتا جو اُسے ملامت کرتا کہ عبداللہ تم نے سرمایہ داری نظام سے مفاہمت کر لی..اور تم میرے بیٹے ہو..وہ ایک مر چکے، خاک ہو چکے باپ سے کیا بحث کرتا کہ ابّا میں نے وہی چلن اپنا

لئے جو ز مانے کے تھے..تو اگر میں نے انحراف کیا تو کیا برا کیا..اگر چہ میرا دل نہیں مانتا تھا..

جب ظہیر الدین نے اُس کی جانب متوقع نظروں سے دیکھا تو عبداللہ پردیسی نے اپنی نہایت عمدگی سے تراشی ہوئی نیم سفید پاپا ہیمنگوے داڑھی کو سہلایا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا''خوراک کے لئے کچھ صبر کرو..ابھی کچھ اور سامان بھی ہیں جو لاہور کے ٹاؤن شپ سے چل پڑے ہیں..میرا ابھی ان سے رابطہ ہوا ہے اور وہ راستے میں ہیں..''

''سامان؟''ظہیر الدین کے چہرے پر ایک تحیّر آیا۔

''ہاں..''عبداللہ پردیسی کا حلق صرف بلیک لیبل کی مدھم کڑواہٹ اور دھیمی نفاست کا عادی تھا اور وہ اُس کے حلق میں ایک آبِ حیات کی مانند اُتری''ہاں سامان...تم اتنے برسوں کے بعد غیب سے نمودار ہوئے ہو تو تمہارے اعزاز میں کچھ سامان..ویسے ظہیر الدین اگر تم تقریباً چالیس برس کے بعد یا کچھ برس زیادہ..تم لوٹے ہو تو اُس کھنڈر ہو چکے کواٹر میں کیوں آ مقیم ہوئے ہو...اگر تم چاہو تو ڈیفنس لاہور میں میرے دو خالی پڑے غریب خانے ہیں..میری عقل مت میں یہ نہیں آ رہا کہ آخر تم اُس کھنڈر میں کیوں شب و روز کرتے ہو؟''

ظہیر الدین اپنے اس ہمدم دیریں کی اُلفت سے قدرے متاثر ہوا..جسے وہ یکسر بھلا چکا تھا''تمہاری عقل مت میں عبداللہ یہ نہیں آ سکتا کہ اگر میں روس کو کوچ کر گیا اور اب وہ ایک مادرِ وطن ہے تو میں وہاں ایک عرصہ محض نظریات اور خوابوں کا اسیر ایک کسی حد تک عُسرت زدہ حیات کیوں بسر کرتا رہا..اور پھر کامریڈ لینن کے مجسموں کی صورت میں مجھ پر کرم ہو گیا، میں ثروت مند ہو گیا تو اگر میں اس کے باوجود اپنی حالیہ آسائشیں اور بال بچوں کو ترک کر کے لوٹ آتا ہوں تو مجھے کسی آسائش یا عیش کی تمنا تو نہیں..صرف ماضی کے ان کھنڈروں میں چند سانس لینے کی آرزو تھی جو مجھے بے حال کرتی تھی..تو میں وہاں اُس کھنڈر گھر میں خوش ہوں، مجھے وہیں رہنے دو عبداللہ..''

تب اُس شب کے گھنے نابینا اندھیروں میں جو اُس ڈیرے کے چار چفیرے راج کرتے تھے، کھیتوں کھلیانوں کی سیاہی میں سے نمودار ہوتی، کچے راستے پر روشن لشکتی آنکھوں کو چندھیا دینے والی ایک تیز دھار روشن آنکھ ظاہر ہوئی...جیسے انجان سمندروں میں سے ابھرنے والے کسی یک چشم سائیکلوپ کا ظہور ہو..اُس کی روشن چندھیاہٹ کے ہمراہ ایک میکانکی گڑگڑاہٹ کی آواز تھی جو شب کے سیاہ پیراہن کی دھجیاں بکھیرتی تھی..

وہ تیز دھار روشن آنکھ حرکت کرتی اُن دونوں کے قریب آ گئی اور پھر یکلخت بجھ گئی..

یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کی ہیڈ لائٹ تھی جو ڈیرے کے صحن کے کناروں پر پہنچ کر گُل ہو گئی تھی..

ایک ٹریکٹر ٹرالی میں سفر کرنے کا آزار اگر بیان میں نہیں آ سکتا تو اس سے اترنے کا عمل بھی جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے..اور جو اتریں وہ دو خوش وضع اور خوش لباس اگر چہ دُھول میں بھبھوت بنی لڑکیاں تھیں، ٹریکٹر کے دھچکوں سے جوڑ جوڑ ہلیں، طویل سفر کے دھچکوں سے بے حال وہ لڑکھڑاتی بمشکل اُتریں..انہیں ثابت قدم رہنے کے لئے اپنے آپ کو قائل کرنا پڑا اور پھر بھی ان کی ٹانگیں لرزتی تھیں..وہ تاریکی میں سے الاؤ کی روشنی میں داخل ہوئیں تو اُن کے کروٹیں لیتے متناسب گورے بدنوں کے اشتعال سے الاؤ کے گرد جو راکھ ٹھنڈی ہو رہی تھی اُس میں سے بھی چنگاریاں پھوٹنے لگیں..

''یہ..کون ہیں؟''ان یورپی لڑکیوں کا پنجاب کے اس دور دراز کچے ڈیرے میں یوں ظاہر ہونا اگر ظہیر الدین کو

استعجاب سے آشنا نہ کرتا تو اور کیا کرتا..

''یہی تو سامان ہے..'' عبداللہ پردیسی کے چہرے پر وہ دادطلب مسکراہٹ پھوٹی جو کسی شعبدہ باز کے ہونٹوں پر تب نمودار ہوتی ہے جب وہ رومال جھٹک کر ایک ہیٹ میں سے خرگوش برآمد کر دیتا ہے''میں نے تمہاری آمد کی خوشی میں تمہاری ہی ہم وطنوں کا خصوصی بندوبست کیا ہے..''

''میری ہم وطن؟''

''ہاں..روسی ہیں..میرا ڈرائیور انہیں لاہور سے لارہا تھا تو راستے میں ٹائر پنکچر ہو گیا اور سپیئر ٹائر بھی اُس بدبخت کی لاپروائی سے ڈکی میں ایک مدت سے پنکچر شدہ حالت میں پڑا تھا.تو ان بے چاریوں کو یہاں ٹریکٹر ٹرالی پر لانا پڑا..ورنہ یہ تو صبح تک نہ پہنچتیں..''

اُن دونوں بے چاریوں کے چہرے اور لباس اس دھچکے سفر کے دوران نہ صرف گرد سے اٹ چکے تھے بلکہ ان میں ایک بے ترتیبی اور انتشار بھی نمایاں ہو رہا تھا..الاؤ کی بھڑک نے ان کی آنکھیں چندھیا دی تھیں، انہوں نے بیک وقت اپنی آنکھوں پر ہتھیلیوں کا سایہ کیا اور الاؤ کے پار یہ تعین کرنے کے لئے دیکھنے لگیں کہ آج کی شب وہ ان میں سے کس شخص کے بلاوے پر یہاں آئی ہیں..اور اُسے پہچاننے میں انہیں چنداں دشواری نہ ہوئی، وہ حسب معمول ایک ادھیڑ عمر اگرچہ کسے ہوئے بدن کا ایک شخص تھا..اس خطے میں اُنہیں کسی نوجوان نے کم ہی اپنی خلوت میں طلب کیا تھا، اُن کا سابقہ اکثر ڈھل چکی عمر کے لوگوں سے پڑتا..کئی تو تقریباً لاچار اور اپاہج ہوتے جو اپنی آل اولاد سے چوری چھپے انہیں کسی گیسٹ ہاؤس میں مدعو کرتے..اور وہ ذاتی طور پر نوجوانوں کی نسبت ایسے لوگوں کی رفاقت کو ترجیح دیتیں کہ وہ زیادہ کارآمد نہیں ہو پاتے تھے۔ الکوہل یا ویاگرا کے سہارے کے باوجود ڈھیلے ڈھالے اور سُرعت پسند رہتے..وہ اُن سے معمولی چھیڑ چھاڑ کرنے اور انہیں بے لباس دیکھنے کی ہوس کو مطمئن کر لینے کے سوا اُن کے لئے کچھ دشواری کا باعث نہ بنتے..وہ جو تقریباً سفید ہو چکی رخساروں کو صرف ڈھانپتی ہوئی داڑھی والا شخص تھا اُس کے برابر میں گھنے اور رنگین پایوں والی چارپائی پر ایک اور شخص براجمان تھا اور اُس کے چہرے پر انہیں دیکھ کر کوئی ہیجان یا اضطراب نہ آیا اور وہ لاتعلق سا بیٹھا رہا..

عبداللہ پردیسی ایک ٹھنڈے مزاج کا بے رحم اور کٹھور دل شخص تھا جو انسانوں کو صرف منفعت اور کاروباری فائدے کے لئے ایک کنڈوم کی طرح استعمال کر کے انہیں مفادات کے ڈسٹ بن میں پھینک دیتا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک ہوس پرست یا عیاش طبع انسان نہ تھا..یعنی یہ اُس کی زندگی کا معمول نہ تھا، محض کبھی کبھار وہ گھریلو ذائقوں سے اکتا کر بازار کی خوراک پر منہ مار لیتا تھا..اسی لئے ان لڑکیوں کو دیکھ کر نہ تو وہ ہائے ہائے کرتا اٹھا، اُن سے دوستانہ انداز میں لپٹ کر خوش آمدید کہتے ہوئے یونہی اُن کے بدن ٹٹول کر اطمینان کیا کہ جو الگ باندھ کے رکھا ہے، وہ مال اچھا ہے یا نہیں اور نہ ہی اُس کی باچھوں سے ہوس کی کوئی رال ٹپکی بلکہ وہ ان کا استقبال کرنے کی خاطر چارپائی سے یوں مؤدب ہو کر اٹھا جیسے وہ اُس کے ڈیرے پر قدم رنجہ فرمانے والی کوئی محترم اور معزز ہستیاں ہوں..''تشریف لائیے..میں آپ کا میزبان عبداللہ پردیسی ہوں اور میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ میری درخواست پر اتنا کٹھن سفر کر کے میرے ڈیرے پر تشریف لائی ہیں..کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گی..''

اُن دونوں نے ایک دوسرے کی جانب بے یقینی سے دیکھا کہ اُنہیں ایسے ادب آداب کے استقبال کی عادت نہ تھی..اور وہ مخمصے میں رہیں کہ پہل کون کرے..

''میں کیتھرائن ہوں..'' نہ اُس کے چہرے سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ ایک بدن فروش ہے اور نہ ہی اُس کے لہجے میں لُبھانے کی خاطر کوئی مصنوعی دل نوازی تھی..عام روسی لڑکیوں کے برعکس اس کا سراپا ایسا نہ تھا جو اُس کے لباس سے تنگیِ داماں کی شکایت کرتا بلکہ وہ کسی حد تک دبلی اور ایک قد نکالتے شیشم کے شجر کی مانند چھریری تھی ''اور یہ..'' اس نے اب تک گُنگ کھڑی لباس سے دھول جھاڑتی ساتھی لڑکی کی جانب نظر کی ''لولیٹا ہے..''

''لولیٹا؟'' عبداللہ پردیسی نے ایک محظوظ تجسس کے ساتھ استفسار کیا ''نباکوف کی...لولیٹا..''

تو عام گاہکوں کے برعکس یہ شخص روسی ناول نگار نباکوف کو جانتا تھا، یعنی کم از کم یہ شب اتنی بری اور ہنگامہ خیز یا دنگے فساد والی نہ ہوگی یہ اُس نے محسوس کر لیا تو یہاں وہ اقرار کر سکتی تھی ''دراصل اس کا اصل نام بہت پیچیدہ ہے اور آسانی سے پکارا نہیں جا سکتا..سلیئے جان گورزاکوف..تو کسی آپ جیسے صاحب ذوق نے اس کے بچگانہ پن اور معصوم چہرے کو دیکھ کر اسے لولیٹا کا نام دے دیا تھا جو اس کی پہچان بن گیا ہے..''

اب یہ لولیٹا جو ابھی تک لاہور سے یہاں تک کے سفر کے دھچکوں سے سنبھل نہ پائی تھی، ابھی تک کسی قدر بدحواس تھی اور اُس کے چہرے پر ایک قبض شدہ ناگوار تأثر تھا یکدم چنچل اور معصوم ہونے کی اداکاری کرنے لگی، اپنے دونوں ہونٹ ایک بچی کی مانند سکیڑ کر مسکرانے لگی کہ یہی اُس کا سب سے بڑا اشتعال انگیز ہتھیار تھا..اگرچہ وہ کم از کم تیس پینتیس برس کی ایک پختہ کار عورت تھی لیکن وہ پہلی نظر میں ایک معصوم سی چودہ پندرہ برس کی بچی دکھائی دیتی تھی اور بعد میں وہ جو کرتب دکھاتی تھی تو لوگ عش عش کر اٹھتے تھے..ویسے جس کسی نے بھی اُسے لولیٹا کا نام دیا تھا، اُس کے مشاہدے کی داد دینی پڑتی تھی..

''اور یہ میرے بچپن کے دوست ہیں ظہیرالدین..آپ کے..کیتھرائن آپ کے ہم وطن ہیں..''

وہاں الاؤ سے پرے جہاں اُس کی روشن بھڑک مدھم ہو کر رات کی سیاہی میں بجھ جاتی تھی، وہاں جو سائے حرکت کرتے تھے، خدمت گزار اور چاکر سر جھکائے دبے پاؤں مالک کے اشارے پر پُتلیوں کی مانند آگے پیچھے ہوتے تھے اگرچہ سائے لگتے تھے لیکن اُن کے اندر بھی ایک انسانی نظام متحرک تھا جس میں سے ایک تجسس جنم لیتا تھا..اُن کی جھکی ہوئی آنکھوں میں بھی ٹرالی میں سے اترنے والی گوریوں کے مکمل سراپے گردش کرتے تھے اگرچہ وہ کچھ الجھن میں مبتلا تھے کہ یہ جو گوریاں ہیں، اور ظاہر ہے گشتیاں ہیں، تو ہمارے حیثیت والے مالک ان کی اتنی آؤ بھگت کیوں کر رہے ہیں، ایسا رکھ رکھاؤ والا سلوک کر رہے ہیں جیسے وہ پردے میں سے باہر نہ آنے والی ہماری مالکنیں ہوں..

''میرے ہم وطن؟ واقعی؟''

عبداللہ پردیسی نے اُس کی بے یقینی بھانپ لی ''ہاں واقعی..یہ ماسکو میں رہتے ہیں..کیوں ظہیر؟''

اپنی دھرتی کے اس اچانک حوالے سے سنبھلنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا..جیسے آپ تکلا مکان کے صحرا میں ہوں، ایک لاہوری ہوں اور سامنے سے ایک شخص دو کوہانوں والے باختری اونٹ پر سوار چلا آتا ہو اور وہ اپنا تعارف کرواتے

ہوئے کہے کہ میں..لاہور سے آیا ہوں..

کیتھرائن کے خدوخال پر اپنے آبائی شہر ٹولا کی اُن گلیوں کی قدامت نقش ہونے لگی جن میں آج بھی سینکڑوں برس سے قائم روسی دہقانوں کے چوبی مکان اپنی قدامت پر نازاں اپنے آپ کو ہر نئے دن سنبھالتے تھے کہ ان کے مسمار ہونے کے دن قریب آ رہے تھے..اور انہی قدیم چوبی مکانوں کے پہلو سے وہ سڑک نکلتی تھی..جس کے آخر میں ادویاتی پھولوں کے کھیتوں اور برچ کے جنگلوں کی گھناوٹ کے کناروں پر..ہمز.جی کا جھونپڑا تھا.''کیا واقعی آپ ماسکو سے آئے ہیں''اُس نے انگریزی ترک کر کے براہ راست روسی میں سوال کیا..

ظہیرالدین ابھی تک ایک لاتعلق حالت میں ایک تماشائی کی طرح چارپائی پر بیٹھا تھا جس کے آس پاس بوریوالا سے کچھ فاصلے پر واقع ایک کچے ڈیرے کا کسی پنجابی فلم کا شوٹنگ کی خاطر ایک سیٹ لگا ہوا تھا..یہ زندگی نہ تھی زندگی کا بہروپ تھا..اس سیٹ کے پس منظر میں چند کچی کوٹھڑیاں نیم اندھیرے میں کبھی نظر آتی تھیں اور کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تھیں،صحن کے درمیان میں شاید کسی ہنگامہ خیز رقص کو فلم بند کرنے کے لئے ایک الاؤ روشن تھا جس کی جلتی بجھتی روشنی میں رقاصہ نے تھرک تھرک جانا تھا..اور آس پاس ایکسٹرا فنکار جنہیں بولنے کے لئے کوئی بھی مکالمہ نہ دیا گیا تھا، جھکے جھکے اداکاری کر رہے تھے..اور پھر اس سیٹ کی جانب کسی عفریت کی روشن آنکھ چلی آتی تھی جس میں سے وہ دونوں..یقیناً اس فلم کی ہیروئنیں برآمد ہوئی تھیں اور اب ان میں سے ایک وہ جو محض تماشائی تھا اُس سے سوال کرتی تھی کہ کیا واقعی آپ ماسکو سے آئے ہیں؟

''ہاں..''ظہیرالدین نے روسی میں ایک لاچارگی،مجبوری سے مسمار ہوتے جواب دیا''روس میرا گھر ہے..میرا وطن ہے.''

کیتھرائن کا جیسے دم رُک گیا ہو..یہ شخص پنجاب کی ایک رات میں ماسکو کے ٹھیٹھ روسی لہجے میں بولتا تھا..

میڈم پیرزادہ نے اسے قطعی طور پر متنبہ نہ کیا تھا کہ اگر میں تمہیں ایک مناسب سے زیادہ ایڈوانس وصول کر کے کسی بوریوالا قصبے سے پرے کسی ڈیرے میں بھیج رہی ہوں تو وہاں کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو ٹھیٹھ..ماسکو کے روسی لہجے میں گفتگو کر سکتا ہے..

کُل تین مہینوں کا پاکستانی ویزا جاری ہوتا تھا اور اس سے متعلقہ کاغذات اور فیس وغیرہ کا سارا انتظام میڈم پیرزادہ اپنے سفارتی،وزارتی اور مذہبی رابطوں کے ذریعے آسانی کر لیتی تھیں.کیتھرائن کے پاس سوڈان،دوبئی،سعودی عرب اور پاکستان میں سے کسی ایک ملک کے چناؤ کا اختیار تھا اور اس نے پاکستان کو صرف اس لئے پسند کیا کہ بچپن میں وہ''آوارہ ہوں'' کی اتنی شیدائی تھی کہ وہ راج کپور کی مانند جس نے یہ انداز چارلی چپلن سے مستعار لیا تھا،ایک تنگ کوٹ، پائینچوں تک چڑھی پتلون پہنے،سر پر ایک پچکا ہوا ہیٹ جمائے ہاتھ میں چھڑی گھماتے''آوارہ ہوں'' گاتی پھرتی تھی..یہ شاید سوویت عہد کا سب سے پسندیدہ غیر ملکی گیت تھا جو تقریباً تین درجن سوویت زبانوں میں گایا گیا تھا اور سرخ چوک کی شاموں میں اکارڈین پر بجتی اس کی دھن روسی جذباتیت کو آبدیدہ کر دیتی تھی..کیتھرائن آگاہ تھی کہ یہ گیت ہندوستان میں ترتیب دیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے ہندوستان اس فہرست میں شامل نہ تھا جہاں روسی بدنوں کی مانگ ہو سکتی تھی..تو قریب ترین امکان پاکستان تھا جسے اکثر روسی

لوگ ہندوستان سے کچھ الگ نہ سمجھتے..

جس روز اُن ساتوں نے.. کہ کوئی مصلحت ایسی تھی جس کے تحت ایک وقت میں صرف سات لڑکیوں کو ہی ایسی مہمات پر روانہ کیا جاتا تھا.. لاہور ایئر پورٹ پر قدم رکھا تو میڈم پیرزادہ ان کی جانب ''میری بیٹیاں'' پکارتی مسکراتی ہاتھ پھیلائے اُن کی جانب بڑھی اور پھر ان کے صدقے واری جاتے، لاڈ پیار کرتے انہیں اپنے جوہر ٹاؤن کے اس مکان میں لے گئی جو گھنی آبادی سے ذرا ہٹ کر واقع تھا.. اور اُس شب تمنائیوں کا تانتا بندھ گیا.. وہاں شہر لاہور میں ایسے شائقین بھی تھے جو روس سے آنے والی کھیپ کی پروازوں کا حساب کتاب رکھتے فوراً جوہر ٹاؤن کے لئے رختِ سفر باندھ لیتے تا کہ اس سے پیشتر کہ وہ کھیپ مسلسل مستعمل ہو جائے، وہ اس کی نسبتاً کم کشادگی سے بہرہ ور ہو سکیں..

ان تین ماہ کی متوقع آمدنی سے.. اور بجا طور پر اس کا نصف سے زیادہ حصّہ میڈم پیرزادہ کا جائزہ حق بنتا تھا کیتھرائن کم از کم بقیہ برس اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ان ٹانگوں کو آرام کی بھی تو حاجت ہوتی تھی وہ ٹولا میں دنیا بھر کے ادب کا مطالعہ فراغت سے کر سکتی تھی..

''کیا واقعی روس آپ کا گھر ہے؟'' اس کی بے یقینی جاتی نہ تھی..

''ہاں..'' بے اعتنائی بدستور تھی..

''اور وہاں آپ کیا کرتے ہیں؟'' کیتھرائن اپنی مادری زبان کے چند لفظ سن کر ایسے بے اختیار ہیجان میں مبتلا تھی کہ وہ فراموش کر گئی کہ وہ اس دور دراز ڈیرے پر محض اپنے بدن کو پیش کرنے کی خاطر آئی ہے.. گاہک سے اس کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کرنے کے لئے نہیں..

''میں وہاں.. ولادے میر لینن.. کامریڈ لینن کے متروک شدہ مجسّموں سے صلیبیں ڈھالتا ہوں..'' ظہیر الدین پہلی بار مسکرایا..

کچی کوٹھڑی کے اندر ایک ہلکی گرمائش تھی جو کپاس کے اس سفید انبار کے ریشوں میں سے جنم لیتی تھی جو چھت کی قربت تک چلا جاتا تھا.. روئی کا یہ ڈھیر گویا ایک ٹھہر چکا سفید سمندر تھا جو چھت سے بہتا اُس کنارے تک آتا تھا جہاں ایک رنگین پایوں والے وسیع نواری پلنگ پر.. جس پر کسی مقامی جولاہے کا بُنا ہوا ایک ڈبّی دار نقشوں والا بلیک اینڈ وہائٹ کھیس بچھا ہوا تھا.. وہ دونوں.. ظہیر الدین اور کیتھرائن ایسے طالب علموں کی مانند مجرم بنے بیٹھے تھے جو کمرۂ امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں.. پلنگ کے رنگین پائے کے برابر میں لکڑی کے ایک سٹول پر بلیک لیبل وِسکی کی ابھی تک کنواری، اس کی نتھ ابھی تک نہ کھلی تھی ایک بوتل پڑی تھی جو عبداللہ پردیسی نے از راہِ احتیاط وہاں رکھوا دی تھی..

اُس نے ابھی تک جو کہ معمول کا معمول تھا نہ تو اُس کے بدن کو ٹٹولا تھا اور نہ ہی اُسے کپڑے اتارنے کے لئے کہا تھا.. اُسے آج تک کسی بھی گاہک نے اتنی دیر تک حجاب میں نہ رکھا تھا..

اُدھر برابر کی کچی کوٹھڑی میں جہاں کھاد کی بوریوں کا ذخیرہ تھا اور ہوا میں ایک کیمیائی بُو تھی، عبداللہ پردیسی بھی ایک ایسے ہی اگرچہ قدرے کم جسامت کے پلنگ پر لولیتا کے برابر میں انگلیاں چٹخاتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اگر آغاز کرے

تو کیسے کرے، اس اشتعال انگیز بچی لگتی عورت کے ساتھ کیا کرے جس نے ''اُف یہاں کتنی گرمی ہے'' کا سہارا لے کر اپنے بلاؤز کو ذرا کھسکا دیا تھا صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ خیر سے اتنی بچی بھی نہیں ہے۔۔

''اور وہاں۔۔آپ کیا کرتی ہیں؟'' ظہیر الدین نے پوچھا۔۔

''اب تو یہی کچھ کرتی ہوں۔''

''ہمیشہ سے؟''

''نہیں ہمیشہ سے تو نہیں۔''

''تو اس سے پہلے۔۔؟'' وہ یہ استفسار کرتے ہی معذرت طلب ہو گیا ''سوری۔۔اگر آپ۔۔یہ ایک ذاتی سوال تھا۔۔ آئی ایم سوری۔''

گفتگو بدستور روسی زبان میں رواں تھی۔

یہ صرف ہڈیوں کے اندر رچ گئی طویل سفر کی دُکھن، جوڑ جوڑ میں جو ٹیسیں اٹھتی تھیں اور پسلیاں جو چیخ گئی تھیں، یہ اُن کا سبب نہ تھا کہ وہ بار بار پہلو بدلتی بے آرام ہوتی تھی بلکہ اُسے ابھی تک اپنے برابر میں بیٹھے شخص کے روسی لہجے اور اُس کی اُس کے بدن سے رغبت نہ رکھنے کا انداز تھا جو اسے بے چین کرتا تھا۔کیا واقعی۔۔اُس ملک میں جو امریکی سامراج کا ساتھ دے کر سوویت یونین کی افغانستان میں ہزیمت کا شراکت دار ہوا تھا اور ماسکو میں اس جنگ کے دوران ہلاک ہونے والے روسیوں کی جو یادگار تھی وہاں روسی عوام اپنے پیاروں کی موت کا امریکہ کو کم اور پاکستان کو زیادہ ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔۔ اس دشمن ملک میں وہ ''آوارہ ہوں'' کی دُھن میں مست چلی آئی تو یہاں یہ کونسا مقام ہے۔۔کونسا دیار ہے بورے والا جس کی قربت میں کیسا یہ فارم ہاؤس ہے جہاں ایک کچی کوٹھڑی میں جس کی چھت تک کپاس کے انبار جاتے ہیں اور جس کے کناروں پر وہ دونوں ایک پلنگ پر مجرم بنے بیٹھے ہیں اور۔۔یہ شخص روسی میں گفتگو مجھ سے کرتا ہے۔۔اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ شخص ظہیر الدین دراصل ایک پُتلی ہے جو محض اپنے ہونٹ ہلا رہی ہے جب کہ شائد کپاس کے ڈھیر کے اندر کوئی اور روسی نژاد شخص روپوش ہے جو روسی میں باتیں کر رہا ہے۔۔۔

ویسے ان چار پانچ ہفتوں میں وہ مقامی نفسیات کی پُر پیچ بھول بھلیوں سے کسی حد تک شناسا ہو چکی تھی۔۔اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک معصوم دکھائی دیتا شخص، بے تعلق اور شرماتا ہوا نہایت مسکین سی شکل بنائے سر جھکائے بیٹھا رہے اور پھر یکدم اٹھے اور تم پر پل پڑے۔۔اس ظہیر الدین کے بارے میں بھی اُسے اسی نوعیت کے خدشات تھے۔۔

''اور اس سے پہلے۔۔یوں سمجھ لیجئے کہ میں۔۔ہمیشہ سے یہی کچھ ہوں۔۔اور پلیز آپ یہ نہ کہئے گا کہ میں شکل اور گفتگو سے ایک بدن فروش نہیں ایک شریف زادی لگتی ہوں کہ ایسے کامپلی منٹ شب کے آغاز میں مجھے ملتے ہی رہتے ہیں۔'' کیا اس کے لہجے میں کچھ کڑواہٹ تھی یا وہ ایمانداری سے اپنی حیات بیان کرتی تھی ''مجھے جس غرض کے لئے کرائے پر بلایا گیا ہے آپ وہ غرض پوری کیجئے۔۔اور اگر اس دوران آپ مجھ سے میری ہی زبان میں سرگوشیاں کرتے رہیں تو میں احسان مند ہوں گی کہ ایسی شبوں میں میرے کانوں میں ہمیشہ نامانوس زبانوں کے اظہار اترتے ہیں۔۔اور میں اپنے آپ پر

جبر کر کے اداکاری کرتی ہوں کہ میں سب سمجھ رہی ہوں۔۔''

یہ عجیب ابھی تک ایک انوکھی اور غیر متوقع شب تھی لیکن اس کے باوجود اُس کے لہجے میں جو تلخی در آئی، اس پر نادم ہوئی کہ ایک گاہک کے ساتھ اتنی درشتگی سے تو مخاطب نہیں ہوا کرتے۔۔ اُسے اپنا رویّہ بدلنا چاہیے۔۔ وہ مسکراہٹ۔۔ خود ساختہ جسے تخلیق کرنے کی وہ ماہر ہو چکی تھی اُس کے ہونٹوں پر ایک اشتعال انگیز لرزش میں پھڑ پھڑانے لگی ''میں کہیں بھی۔۔ کسی بھی ایسی شب میں۔۔ یوں بیکار تو نہیں بیٹھی رہی۔۔ کیا میں اپنے کپڑے اتار دوں۔۔''

ظہیر الدین کو اس پیشکش سے ایک دھچکا لگا۔۔ ''پلیز۔۔ میں قطعی طور پر لاعلم تھا کہ عبداللہ پردیسی نے کچھ سامان کیے ہیں اور آپ لوگوں کو کسی غرض کے لئے یہاں بلایا ہے۔۔ میں تو محض چند روز پیشتر بورے والا میں اپنے ماضی کو کریدنے آیا تھا۔۔ ہوا میں ڈولتی مائی بوڑھیوں کا تعاقب کرنے کی خاطر آیا تھا۔۔ اور میں اس موجودہ صورتِ حال کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر قطعی تیار نہ تھا۔۔ پلیز آپ جیسی ہیں ویسی ہی رہیں۔۔''

''اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو۔۔'' کیتھرائن کی اس موجودہ پیشہ ورانہ حیات میں یہ شخص ایسا تھا جسے وہ پڑھ نہ سکی تھی۔۔ ہوس اور جنس کی تختیاں اسے ازبر تھیں مگر اس کے بدن پر بے اعتنائی اور لاپروائی کے مخطوطے پہلی بار رقم ہو رہے تھے۔۔

''میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ کپاس کے ان ڈھیروں میں سے جو نرم آسودگی، ملائمت اور گداز ہے وہ کیسے اپنے بدن کی ہر پور میں محسوس کر رہی ہوں۔۔''

وہ بھی اس کی موجودگی میں آسودگی محسوس کر رہا تھا ''آپ کا یہ اظہار سادہ نہیں ہے۔۔ کہہ سکتے ہیں کہ شاعرانہ ہے۔۔ تو۔۔ کیسے ہے؟''

کیتھرائن کی احتیاط کچھ کام نہ آئی تھی۔۔ اُس کے اظہار نے اسے ظاہر کر دیا تھا۔۔

''اور اس سے پہلے۔۔'' ظہیر الدین نے پھر سے اپنا سوال دوہرایا کہ اسے احساس ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی اگر اب ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ سے پیشہ ور ہے۔۔ ''میں۔۔ ایک تقریباً ستر برس کا آزمودہ کار شخص ہوں۔۔ ان معاملوں میں تجربہ نہیں رکھتا لیکن بہر طور اتنی تشخیص کر سکتا ہوں کہ اس سے پیشتر آپ وہ نہیں تھیں جو اب ہیں، تو کیا تھیں؟''

''اولیٹا میری سہیلی نہیں ہے۔۔ ہم ایک ہی فلائٹ پر لاہور میں اتری تھیں۔۔'' کیتھرائن کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس موضوع کو کیسے بدلے۔۔ اور یہ ایک بھونڈی کوشش تھی اسے فوراً ہی احساس ہو گیا۔۔

''آپ اگر اپنے آپ کو۔۔ اپنے ماضی کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔۔'' وہ قدرے پشیمانی سے بولا۔۔

''آپ مجھے۔۔ مجھ سے کوئی بھی فرمائش کر سکتے ہیں۔۔ کسی بھی انہونی غیر قدرتی جنسی انداز کی خدمت کا تقاضا کر سکتے ہیں۔۔ آپ نے صرف اشارہ کرنا ہے کہ میڈم پیرزادہ کو اتنی ادائیگی کر دی گئی ہے کہ کسی بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے۔''

اُس کے اندر۔۔ اس روسی کیتھرائن کے اندر اس کی رگوں اور شریانوں میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی تھیں۔۔ جو کھلتی نہ تھیں۔۔ وہ اجتناب کئے جاتی تھی۔۔ ظہیر الدین کے لئے گویا یہ ایک دعوت مبارزت تھی کہ آخر یہ عورت کھلتی کیوں نہیں۔۔

برابر کی کھاد کی بوریوں سے لبریز کوٹھڑی میں بجی لگتی لولیٹا نے عبداللہ پردیسی کو چاروں شانے چت کر لیا تھا اور وہ ایک شاہ سوار ہو چکی تھی..وہ اپنے گھوڑے کو سانس لینے کی مہت نہ دیتی تھی..

''کیتھرائن..میں محض متجسّس ہوں..''اس نے پہلی بار اُسے اُس کے نام سے پکارا..اور ایک نزدیکی کو جنم دینے کی کوشش کی..

کیتھرائن بھنویں چڑھا کر شرارت سے مسکرا دی..''میرے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس میں کوئی ایسی شق تو درج نہ تھی جس کے تحت مجھے اپنے ماضی کے قصّے بیان کرنے کے لئے پابند کیا گیا ہو..''

وہ کھسک کر اس کے قریب ہو بیٹھی صرف اس لئے کہ وہ دھیمی آواز میں گفتگو کر سکے..''میں تُولا یونیورسٹی میں روسی ادب پڑھانے پر مامور تھی اور لیوٹالسٹائی کے ناولوں میں تصوف، مذہبی رجحانات، تاریخ کے حوالے سے اس کا مخصوص نظریہ اور ایک نئے مذہبی نظام کی تشکیل میرے خصوصی موضوع تھے..تم جانتے ہو گے کہ تولا سے کچھ فاصلے پر ٹالسٹائی کی آبائی ریاست یاسنایا پولیانا کے گھر، تالاب اور باغ واقع ہیں..''وہ یہاں ٹھٹک گئی، کہہ دینا چاہتی کہ اسی راستے میں ادویاتی کھیتوں اور برچ کے جنگل جہاں سے آغاز ہوتے ہیں وہاں سَر جی کا وہ جھونپڑا تھا جہاں ایک شب بارش کی بوچھاڑیں تھیں اور میں..''اور میں تقریباً ہر دوسرے تیسرے ہفتے اپنے طالب علموں کو وہاں لے جایا کرتی تھی..تو میں یہ تھی..''

وہ لب بستہ اُسے تکتا رہا..سوویت یونین کے انہدام کے بعد وہاں جو سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی تغیرات رونما ہوئے وہ ان سے بخوبی آگاہ تھا..اسے اندازہ ہو گیا کہ کیتھرائن کی کہانی کس انجام کی جانب بڑھ رہی ہے..

''تو پھر؟''

''نئے روس میں..آپ کو علم ہو گا..ہم جیسے لوگوں کی گنجائش نہ رہی..تعلیمی اداروں میں ان لوگوں کی تطہیر کا آغاز ہو گیا جو فنون لطیفہ سے وابستہ تھے..ادب، موسیقی، تصویر کشی اور غیر ملکی زبانیں پڑھانے والے محقق اور معلم فالتو قرار دیئے گئے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ سب بیکار مشاغل تھے جو نئے روس کے لئے منفعت بخش ثابت نہ ہو سکتے تھے..اور وہ چند لوگ جنہیں خوش قسمتی سے فارغ نہ کیا گیا آپ جانتے ہیں اُن کی ماہانہ تنخواہ کتنی تھی..سواہیلی عربی، بنگالی، اردو اور سنسکرت کے مانے ہوئے بین الاقوامی شہرت یافتہ سکالرز کو یونیورسٹی کتنی رقم ادا کرتی تھی..آپ ماسکو میں اتنی رقم سے تین وقت کا کھانا بھی افورڈ نہیں کر سکتے..میں دو برس بیکار رہی..چند ماہ کے لئے ایک روسی کروڑ پتی کے بچوں کو ادب پڑھانے کی کوشش کرتی رہی..پھر رشتے کی ایک پھوپھی کے ہاں پڑی رہی..اور اُس نیک دل خاتون کے وسائل بھی محدود تھے اور مجھ میں بھوک سہنے کی سکت دم توڑتی جاتی تھی..میرے کپڑے بوسیدہ ہونے لگے، بال ایک عرصے سے شیمپو نہ ہونے کے باعث باقاعدہ دھو نہ سکی اور جب میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو وہاں مجھے ایک گداگر کی صورت نظر آنے لگتی..خودکشی کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی اور پھر..ایک فرشتہ میری مدد کو آ گیا..وہ بھی آپ کی طرح پاکستانی نژاد ہے..قادر قریشی میری مدد کو آ گیا..''

ظہیرالدین اُس کے قصّے میں اتنا مگن تھا کہ قادر کا نام آنے پر وہ چونکا نہیں اور پھر یکدم ٹھٹھک گیا''قریشی؟''

''شاید آپ اس سے واقف ہوں..ماسکو میں رہائش پذیر پاکستانیوں میں وہ بہت ممتاز ہے..وہ بہت پرہیزگار،

خدا ترس اور مددگار شخص ہے.. میں خود اپنی ایک جاننے والی کے حوالے سے اُس کے شاندار دفتر میں گئی اور اُس کی شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے پہلی کھیپ میں شامل کر لیا، مجھ سے بھوک سہی نہیں جاتی..''

ڈیرے کی کچی کوٹھڑیوں کے باہر سرد ہو چکے الاؤ سے پرے گنّے کے کھیتوں میں پوشیدہ گیدڑوں کے بھونکنے ہاؤ ہو کرنے کی آوازیں آنے لگیں..الاؤ کی قربت میں مدہوش پڑے ایک مزارع نے بیزار ہو کر آنکھیں کھولے بغیر ٹٹولتے ہوئے مٹی کا ایک ڈھیلا تلاش کیا اور گنّے کے کھیتوں کی جانب پھینکا..گیدڑ چپ نہ ہوئے..

''یہ کتّے ہیں؟'' کیتھرائن ڈری..

''نہیں..'' ڈھارس دینے کی خاطر ظہیر الدین نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا..'' گیدڑ ہیں..''

''وہاں..بھیڑیے ہوا کرتے تھے..''

''کہاں؟''

''سَر جی کے جھونپڑے کے باہر..اکثر نہیں کبھی کبھار وہ برچ کے جنگلوں میں روپوش ہوتے تھے... مجھے ڈر لگتا تھا..''

کوٹھڑی میں ذخیرہ شدہ کپاس کے ڈھیروں کے اندر ہوا کا سرد یلا پن کچھ دیر تو اپنی ٹھنڈک برقرار رکھتا لیکن وقت گزرنے سے اُن ریشوں میں سرائت کر کے اپنی سردی کھو بیٹھتا..پلنگ پر براجمان ان دونوں کے وجود ایک نرم حدّت کی آسودگی میں تھے..

ظہیر الدین کا ذہن بھٹکنے لگا..چھت کے شہتیروں کو چھوتے سفید ریشہ دار نرم ڈھیر..جانے یہ کپاس جب دھاگوں میں بٹی جائے گی تو اُن کے تانے بانے سے کیسے انہونے عجوبے پیراہن بُنے جائیں گے..جنہیں کوئی مجذوب پہنے گا یا کوئی ہیر سیال..کون آیا پہن لباس سُرخ ے..اور یہ بھی تو ممکنات میں سے ہے کہ یہ انبار کپاس کے نہ ہوں..آک کے بوٹوں سے جنم لینے والی بے حساب روئی روئی سفید مائی بوڑھیاں ہوں جو ہوا کے دوش پر سوار ڈولتی ہوئی اس کوٹھڑی میں پناہ گزیں ہو گئی ہوں..جیسے وہ دونوں بھی تو درحقیقت پناہ گزیں تھے..اپنی بے مہر حیات سے فرار ہو کر اس کوٹھڑی میں آن چھپے تھے..نہیں چاہتے تھے کہ اس شب کی سحر ہو..

''تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ رات میرے لئے کیسی معجزہ آثار ہے..'' کیتھرائن کے چہرے پر اُس لمحے جو رنگ پھوٹا، شفق کی مانند پھیلا تو اگر وہ اُس لمحے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیتی..ایسی شفق رنگ سُرخی جو موسم سرما کے بجھے بجھے برفوں سے زیر ہوتے ڈھلتے آفتاب میں سے ٹھنڈک بھری کرنوں میں سے شوخ رنگ ہو کر سر جی کے جھونپڑے میں داخل ہوا کرتی تھی..بس وہی رنگ اس کوٹھڑی کے اندر اُس کے چہرے پر تمتماتا تھا..اُس نے ظہیر کے کاندھے پر ہولے سے اپنا سر رکھ دیا جیسے اُس پر نیند غالب آ رہی ہو..اُسے محسوس ہوا کہ کاندھے پر آرام کرتے اُس کے رخساروں میں سے جو گرمائش پھوٹتی ہے، وہ اُس کے بدن میں اترتی اُس کی مردہ ہو چکی رگوں اور شریانوں کو زرخیز کرتی ہے..

''کیا تم معجزوں پر یقین رکھتی ہو؟''

''اگر معجزے اس نوعیت کے ہوں تو یقیناً۔'' کیتھرائن نے اُس کے کاندھے سے سر اٹھا کر اُس کے سامنے اپنا چہرہ نمایاں کیا ''سنو... میں جب سے تمہارے اس ''آوارہ ہوں'' وطن میں آئی ہوں تو مجھے ہر شب پُر ہوس، ان گھڑے، ناتراشیدہ مونچھوں اور بے ترتیب داڑھیوں والے، زمینداروں اور کارخانہ داروں سے واسطہ پڑتا تھا..وہ جو کہتے ہیں ناں کہ گداگر کے پاس چناؤ کا اختیار نہیں ہوتا تو وہ میرے پاس بھی نہ تھا اور میں شکائت نہیں کر رہی کہ اگر آپ اپنے بدن کو فروخت کے لئے پیش کر دیں تو آپ خود ہی انکار کے حق سے دستبردار ہو جاتے ہیں..اور یہ لوگ جو مجھے تو بہت معصوم اور بھلے لگے شراب کے دو چار گھونٹ حلق سے اتارتے ہی بدمست ہو جاتے اور بچوں کی مانند کھلکھلاتے میری منت ساجت کرتے کہ میڈم پلیز اپنے کپڑے اتار دو..وہ میرے گورے رنگ کے احترام میں اکثر مجھے میڈم کہہ کر مخاطب کرتے..ہم روسی آپ مشرقیوں کی مانند اپنے بدن کو سینت سینت کر بے وجہ ہمہ وقت پوشیدگی میں نہیں رکھتے..ہمیں..سب روسی مرد و زن کو برہنگی سے کچھ شرمندگی نہیں ہوتی کہ ہر عورت کے پاس وہی کچھ ہے جو کسی بھی دوسری عورت کے پاس ہے اور ہر مرد..ہو بہو وہی بدن ہے جو ازلوں سے چلا آیا ہے تو اس میں حجاب کا کیا سوال..اور ان میں سے کم از کم ایک سویٹ شخص مجھے یاد آتا ہے جو عالمِ خمار میں میری برہنگی کے گرد گھومتا رقص کرتا ''اللہ ہُو'' کے نعرے بلند کرتا تھا اور گھڑی پر بھی نظر رکھتا تھا تاکہ اُس کی نماز قضا نہ ہو جائے...ان شبوں کے قصے بہت طولانی ہیں..اور پھر..یہ شب..ایک غیر متوقع آزادی کی شب میرے نصیب میں آ گئی جب میری مادری زبان کی شیرینی میرے کانوں میں رس گھولتی ہے اور..تم نے ابھی تک مجھ سے کچھ بھی نہیں چاہا.تو کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟''

باہر..گیدڑ اُن گنے کے گھنے کھیتوں میں روپوش ہو کر آہ و زاری کرتے، بھونکتے، ہاؤ ہُو کرتے..تھک ہار کر خاموش ہو چکے تھے..

''تم ٹالسٹائی کے صوفیانہ اور مذہبی رویوں کی محقق رہی ہو..جس نے وصیت کی تھی کہ اُس کی موت پر قطعی طور پر عیسائیت کی رسوم ادا نہ کی جائیں اور روسی آرتھوڈاکس چرچ نے اُسے مرتد قرار دیا تھا..وہ زار کے زمانوں کا پہلا شخص تھا جس کا تابوت کسی بھی دعا یا حمد و ثنا کے بغیر، پادریوں کی غیر موجودگی میں اُس قبر میں اتارا گیا تھا جسے کچی رکھنے کے لئے اُس نے وصیت کی تھی تو تم کیتھرائن..ایک محقق کی حیثیت سے اُس کے کون سے ناول یا کہانی کو اُس کا لازوال شاہکار سمجھتی ہو؟''

''فک ٹالسٹائی..''

''جی..'' وہ بوکھلا گیا ''تم نے کیا کہا؟''

''وہی جو تم نے سنا..یہ خبطی بوڑھا جو درجنوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا، تمہارے مہاتما گاندھی سے خط و کتابت کرتا تھا اور آخری عمر میں چینی زبان صرف اس لئے سیکھ رہا تھا تاکہ وہ کنفیوشس کے اقوال براہ راست اُس کی زبان میں پڑھ سکے..وہ میرے تو کسی کام نہ آیا، میں نے اپنی زندگی اسے سمجھنے کے لئے وقف کر دی تو مجھے بالآخر کیا حاصل ہوا؟ یہی کہ میں اب ایک ایسی بدن فروش ہو گئی ہوں جس کا روس میں کچھ مول نہیں پڑتا اور وہ برآمد کر دی گئی ہے۔اپنی من مرضی سے کہ اُس سے بھوک سہی نہیں جاتی..تو میں اگر یہاں ہوں تو صرف اس سفید ریش کاؤنٹ کی وجہ سے..اس لئے..فک ہم..''

''آ ہم..''ظہیر الدین ہولے سے کھانسا..

کیا یہ میرے چہرے کو پڑھ سکتی ہے، جو کچھ میرے پورے بدن میں کتابت ہو رہا ہے اور اس کیتھرائن کے چہرے کی روشنائی سے ہو رہا ہے اور وہ ساری عبارت میرے چہرے پر رقم ہوتی چلی جاتی ہے تو کیا وہ اسے پڑھ سکتی ہے..نہیں، میں امید کرتا ہوں کہ نہیں..ظہیر الدین..ایک بچہ جس کی جیب میں ایک چوری شدہ کیک ہے اور وہ پکڑا نہیں جانا چاہتا..یہ کیا سوچے گی..یہ کیا سوچے گی نہیں..میں کیسے اپنے چہرے کو کورا کرلوں، اس پر رقم ہوتی عبارتوں کو مٹا دوں جو دوہائی دیتی ہیں کہ ایک سائیکل برچ کے جنگلوں میں گم ہو رہی ہے..ایک پھولدار فراک ہوا میں پھولتا پھڑ پھڑا رہا ہے اور پھر وہ سائیکل سوار مڑ کر اسے دیکھتی ہے تو وہ گالینا نہیں ہے..کیتھرائن ہے..اور اُس کی شکل سائیکل کے فریم سے جدا ہو کر ایک تصویر کی مانند اُس کی جانب چلی آ رہی ہے اور پھر اُس کے زوال پذیر بدن پر یوں بچھتی جا رہی ہے کہ سانس لینا بھی محال ہو رہا ہے..

اے ظہیر الدین اپنے آپ سنبھالو..ایک بدن فروش عورت کو اپنے آپ پر حاوی نہ کرو ورنہ تماشا بن جائے گا..

''ہیلو..''کیتھرائن نے اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنی پانچوں اُنگلیوں کو نچایا..

اِس کی تو انگلیاں بھی میرے بدن میں جیسے وہ سارے کا سارا تازہ مکھن ہو، اُس میں کُھبتی جاتی ہیں..''شاید تم میرے اس..فک ہم..کے بازاری اور فحش اظہار سے صدمے میں چلے گئے ہو..ایسے اور اس سے کہیں برے اور تفصیلی جنسی اظہار میری خصلت میں داخل ہو گئے ہیں کہ مجھ سے فرمائش کی جاتی ہے کہ میں دوران عمل اپنے خریداروں سے ایسی ہی گھٹیا اور گندی زبان میں گفتگو کروں..آئی ایم سوری..میں احتیاط کروں گی..''

''نہیں..مجھے کچھ اور الجھنیں بھی ہیں..''کیا وہ اس جواز کے فریب میں آ کر میرے چہرے پر جو کچھ درج ہوتا چلا جا رہا ہے اُس سے غافل ہو جائے گی..

''اور تم ظاہر ہے صرف ایک شب کی اور وہ بھی خریدی ہوئی قربت کے بعد مجھے ان الجھنوں میں شریک نہیں کر سکتے..''

''شائد نہیں..''ہاں..وہ فریب کھا گئی ہے..اُسے اندازہ ہی نہیں کہ میں کس مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہوں..

اُن کے درمیان مکمل چُپ کا ایک ایسا وقفہ حائل ہو گیا جس کے سناٹے میں کپاس کے ریشوں پر جو نامعلوم ہوا اثر انداز ہوتی تھی اُس کی ہلکی سفید سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تھی..اور وہ ابھی تک بے خبر تھے کہ کپاس کے ڈھیر کے اندر کچھ ٹڈّیاں بھی ہیں جن کے رینگنے اور اچھلنے کی بے آوازی بھی ان کے لئے ایک مدھم آواز ہوئی جاتی تھی..

''میں تم سے اجازت کی طلب گار ہوں..''جیسے اُس چُپ کے دوران اُس کے بدن کے اندر ایک ہُوک ایک باگیں تڑانے والے وحشت نے جنم لے لیا ہو..وہ اُسی بے لگام وحشت کی اسیر پلنگ سے اٹھی اور اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی..''میں آج کی شب اس آزادی کو اپنے پورے بدن میں سرائت کرتے محسوس کرنا چاہتی ہوں..''اُس کی جانب سے کسی انکار یا اجازت ملنے کا توقف کیے بغیر اپنے آپ کو وہ بے لباس کرنے لگی..ایک پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ..نہایت احتیاط اور خوش اسلوبی سے..یہاں تک کہ وہ اپنے پورے بدن کے ساتھ اُس کے سامنے ظاہر ہو گئی..

اور ظہیر الدین، ایک لاتعلق بے حسی کے ساتھ اُسے تکتا رہا جیسے وہ گوشت پوست کی ایک عورت نہ ہو..میوزیم

میں ایستادہ ایک برہنہ مجسمہ ہو..

وہ نہ تو اُسے جنسی اشتعال دلانے کی خاطر اور نہ ہی اپنے بدن کی نمائش کے لئے اس کے سامنے کھڑی تھی.. کولہوں پر ہاتھ رکھے وہ ایک عجیب غیر جانبدار بے اعتنائی سے اُسے تکتی چلی جارہی تھی جیسے اُس کے ردِ عمل کی منتظر ہو..اُس کے بدن پر ایسے کچھ آثار نہ تھے جو یہ گواہی دیتے کہ اسے تقریباً ہر شب ان گھڑے اور مخمور لوگ پامال کرتے رہے ہیں..کہ ایسی پامالی کی خراشیں بدن پر کبھی ثبت نہیں ہوتیں، جو پھونک روح کی اُس بدن کو زندگی سے ہمکنار کرتی ہے، وہ خراشیں اُسے چھلنی کرتی ہیں اور چونکہ روح ظاہر نہیں اس لئے جو کچھ اس پر گزرتی ہے وہ اگرچہ رقم ہوتی ہے پر دکھائی نہیں دیتی.. ظہیرالدین کو تو وہ ایک پہاڑی ندی میں سے نہا کر نکلتی ایک کنواری کی مانند نوخیز اور ان چھوئی لگ رہی تھی..بے شک وہ نہ تو اُس کی جانب جنسی طور پر ملتفت ہوا اور نہ ہی کسی اور رغبت نے اُس کا دل روکا..لیکن..بہرطور..کسی نہ کسی سطح پر جہاں جذبات کی راکھ سرد پڑ چکی تھی اُسے وہاں کچھ چنگاریوں کے یکدم سلگ جانے کا احساس ہوا..اگرچہ یہ چنگاریاں بھک سے بھڑکیں اور پھر بجھ گئیں..

''ہاں میں معجزوں پر یقین رکھتی ہوں اور اس معجزہ آثار شب میں اپنی اُس حیات سے فرار ہونا چاہتی ہوں جس میں صرف جنسی بھوک، لوٹ کھسوٹ اور جھنجھوڑ پن تھا..'' وہ اُس کے انکار یا اقرار کی التجا میں نہ تھی ''میں..ابھی لوٹ آؤں گی..'' کوٹھڑی کا دروازہ..کسی غربت سے حواس کھو چکے ترکھان کے ہاتھوں کا ان گھڑت ناتراشیدہ جس پر آہنی پھول اور کوکے ٹھونکے گئے تھے کیتھرائن کے دھکیلنے سے اُس کے کواڑ یوں وا ہوئے جیسے محبت کے سمندر میں غرق شدہ ایک عورت اپنے محبوب کے ذرا سے لمس سے وا ہو جاتی ہے..مگر چاندنی بہت دیر سے اس دروازے کے کھلنے کی منتظر تھی، شائد وہ اپنے دُھندلے غبار سے اُس پر دستک بھی دیتی رہی تھی اور مایوس ہو کر لوٹ بھی چلی تھی، بے دھڑک اندر چلی آئی اور کپاس کے ڈھیر کا وہ حصہ جو عین دروازے کے سامنے تھا اُس کے ریشے ریشے میں اتر کر اسے ایک نقرئی لَو سے بھگو دیا...وہ ظہیر کے قدموں کے عین قریب آ کر تھم گئی..وہ تاریکی میں ہی رہا..کیتھرائن اُس سے منہ موڑے دروازے کے کواڑوں پر ہاتھ رکھے اُس کی جانب پُشت کیے کھڑی تھی..اُس کے نیم سنہری بال بے دریغ کوٹھڑی میں چلی آنے والی مگر چاندنی کی بجھی بجھی روشنی میں یوں منور ہوتے تھے کہ ایک ایک بال الگ الگ ایک سنہری سنپولیا ہوا جاتا تھا..یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ دروازے کی چوکھٹ میں جڑی ایک..مصور کی جانب پشت کیے ایک نیوڈ پینٹنگ ہو، اگرچہ اُس کا سراپا تاریکی میں ہے لیکن اس کے باوجود اُس کے بدن کا عروج و زوال اُس تاریکی میں بھی اپنے زیر و بم کو نمایاں کرتا ہو..اور ابھی وہ ایک تصویر تھی اور اگلے لمحے وہ اُس چوکھٹ کے فریم میں سے زندہ ہو کر اُسے خالی کر کے باہر نکل گئی..

اوس میں بھیگتے، نچڑتے ہریالی کے ایک سمندر کھیت میں، ملگجی مگر چاندنی کے غبار میں نہائی ہوئی، ایک سرمست خمار کی مستی میں اپنے دونوں ہاتھ اوس بھرے شتالے کے بُوٹوں پر پھیرتی، ان کی ٹھنڈک اور نمی کو اپنی ہتھیلیوں میں محسوس کرتی برہنہ بدن وہ چلتی جارہی تھی..

اور جب وہ اُن نم آلود ٹھنڈک بھری ہتھیلیوں کو اپنی پُر اشتیاق چھاتیوں پر پھیرتی تو اُس کے بدن میں ایک

لذت آمیز کپکپی جنم لیتی..کہ راتیں سرد ہونے لگی تھیں..

اور وہ ایک بار..زندگی میں پہلی بار..ایسی مکمل برہنگی میں ٹولا کے قصبے کے باہر برچ کے جنگلوں کے اندر جب کہ بارش اُن کے سفید چتکبرے تنوں کو بھگوتی انہیں سیاہی مائل کر رہی تھی..وہ ایسی بے خودی میں ان کے اندر چلتی گئی تھی.. سَرجی کے جھونپڑے کے باہر بارش میں بھیگتی..

اور تب..بہت برس تو نہیں گزرے..اُس کے اُس بارش میں بھیگتے تصوّر کے کینوس پر اس امکان کی کوئی تصویر پینٹ ہو سکتی تھی جس میں وہ پنجاب کے کسی قصبے بورے والا سے کچھ فاصلے پر واقع کسی زراعتی ڈیرے میں سے یوں نکل کر جب کہ الاؤ بجھ چکا تھا، تندور کی گولائی کی کچی مٹی میں حدت کے آخری شرارے پھوٹ چکے تھے..اُس کے گرد اپنے آپ میں سکڑے ہوئے نیند میں مدہوش کچھ جسم تھے وہ چارے کے ایک کھیت سمندر میں ہاتھوں کے چپّو چلاتی اپنے برہنہ بدن کی کشتی کھیتی، ایک مکر چاندنی میں نہائی تیرتی چلی جائے گی..

ہزیمت اور شکستگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

بدن توڑ جھٹکوں کے یکدم تھم جانے پر جب وہ اور لولیتا ٹریکٹر ٹرالی سے اتری تھیں تو اُن کی نظر کے پار شب کے اندھیارے میں ایک عجیب پُراسرار منظر کھلا تھا..ان دونوں کو، کیتھرائن اور لولیتا کو آبادیوں میں روپوش گمنام ریسٹ ہاؤسوں، سستے ہوٹلوں، دور دراز فارم ہاؤسوں اور ویران گھروں کے بیڈ روموں میں داخل ہونے کی عادت تھی..فوری طور پر مخمور شدہ گاہکوں کے آگے بڑھ کر ان پر نچھاور ہوتے لپٹ جانے والوں کی عادت تھی..انہیں ایسے اوپن ایئر بیڈ روم کی توقع تو ہرگز نہ تھی..اور وہاں ایک الاؤ میں سلگتی ٹہنیوں کی ٹوٹ پھوٹ خاموشی میں دراڑیں ڈالتی تھی..ایک شخص نے پلنگ سے اٹھ کر ان دونوں کا سواگت شہزادیوں کے روپ میں کیا..اور اُس کی آنکھیں لاتعلقی میں گم اُس شخص کے چہرے کی جانب سفر کر گئیں جس کے گھنے بالوں میں سفیدی بہت تھی، بے سبب لگتی اداسی بہت تھی..وہ عمر کے آخری زینوں پر پہنچا ہوا کسی آزردگی میں ٹھہرا ہوا تھا، کیتھرائن کی آنکھوں میں سَرجی کی پرچھائیاں تیرنے لگیں..وہی لگتا تھا..اپنے جھونپڑے میں بیٹھا کسی جادوٹونے کا شکار ہو کر بوڑھا ہو گیا تھا اور وہ ٹولا سے جانے کیسے یہاں پنجاب کی ہریاول کے درمیان اس کچے ڈیرے میں چلا آیا تھا..

اُس کی زندگی میں ہر روسی لڑکی کی مانند، سکول کے ایام میں، یونیورسٹی کے دوران اور پھر اُسی یونیورسٹی میں ایک معلّمہ کی حیثیت میں کچھ مرد تو آئے تھے..ان میں سنجیدہ اور جذباتی طور پر پختہ رفاقتیں تو کم کم تھیں، بیشتر بے فکری اور بدنی مجبوریوں کی پروردہ آشنائیاں تھیں..یہ صرف سرجی تھا جس کے لئے وہ ایک بے مہار گھوڑی ہو گئی تھی جس کی باگیں اتنی شدت سے کھنچیں کہ اُس کی باچھیں چرنے سے خون بہنے لگے تب بھی وہ اُس کی چاہت سے دستبردار نہ ہوئی کہ یہی پہلا مرد تھا جس کے بچے وہ اپنے بدن میں پرورش کرنے کی آرزو رکھتی تھی..

سرجی نے اسے ترک تو نہ کیا..جذبات کے اظہار میں وہ کبھی منہ زور نہ ہوا..اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ ناپ تول کر اُس سے محبت کرتا ہے..اُس کی قربت میں، پُرجوش جنسی ہیجان کے دوران بھی اُس کے ذہن میں وہ نہ ہوتی، ماضی میں لڑی گئی جنگوں کے میدانوں کے نقشے اُس کے تصوّر میں ہوتے اور وہ ان کی کمان سنبھال کر کبھی ہینی بال کے روپ میں ہوتا اور کبھی

سکندر ہو جاتا..اُسے کسی دائمی رفاقت کی حاجت ہی نہ تھی، کسی اور انسان کی نزدیکی کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ ایک تنہا سپاہی تھا جسے صرف اپنی تلوار ڈھال اور وہ بھی تصوراتی عزیز تھی..

اور جب وہ کمر توڑ مسافت کے بعد ڈیرے کے درمیان میں بھڑکتے الاؤ کی جانب لڑکھڑاتی بڑھتی تھی تو اُس کی روشنی میں ایک ادھیڑ عمر چہرہ، شکست سے دوچار لگتا، ایک ہارا ہوا سپاہی لگتا سر جھکائے پلنگ پر بیٹھا اُسے نظر آیا اور اُس کے دل میں اتر گیا..

ایک مرتبہ پھر اس نے اوس کی نمی اور ٹھنڈک میں بھیگی دونوں ہتھیلیاں اپنی چھاتیوں پر رکھیں تو اُن کے نرم ماس میں اُن کی گیلاہٹ جیسے ان کی پیاس کو سیراب کرنے لگی..ایک گاہک کے چہرے کی اداس شکستگی سے یوں متاثر ہو جانا، اُسے دل میں اترنے دینا تو ایک سودائی پن تھا، بھلا اس سے کیا حاصل حصول ہو سکتا تھا..

اوس بھرے شتالے کے بوٹے اُس کی ننگی رانوں تک آتے اُن پر اپنی ہریاول کی زبانیں پھیرتے تھے اور اگلے قدم پر وہ پیچھے رہ جاتے اور اُسے کچھ اور زبانوں کا لمس محسوس ہونے لگتا..

''کیتھرائن..'' ایک سرگوشی سی تیرتی اُس کے کانوں میں اتری..شتالے کے سبزے پر پھسلتی کہ اُس پر اوس کی نمی تھی، ایک مدھم آواز اُس تک پہنچی..اُس نے پلٹ کر دیکھا تو ہریاول کے اس سمندر کے کناروں پر وہ جس کپاس بھری کوٹھڑی میں سے نکل کر آئی تھی اُس کی چوکھٹ میں وہ کھڑا تھا..شائد وہ اپنی اداسی سے باہر آ کر اُس کے بدن کا طالب ہو گیا ہو، اس خیال سے وہ قدرے رنجیدہ ہوئی، تو معجزہ رونما نہ ہوا تھا، اُسے حاصل کرنے کے لئے یہ پکار آئی تھی..وہ پلٹی اور اُس کی جانب واپس ہونے لگی..مگر چاندنی میں اُس کا چہرہ ایک بجھا ہوا الاؤ تھا..

''کیتھرائن..'' وہ ابھی اُس سے کچھ فاصلے پر تھی جب اُس نے پھر پکارا ''اس ہریاول کے اندر مت چلو..اس کے اندر جانے کیا کیا پوشیدہ ہے، یہ برچ کے جنگلوں کی مانند معصوم نہیں ہے..میں تمہارے لئے فکر مند اور منتظر رہا..''

اس کے دونوں ہاتھ کھلے کواڑوں پر ثبت تھے..اور اُس کے چہرے پر اُس کے لئے جو تشویش تھی وہ کیتھرائن کی آنکھوں میں آنسو لانے کے لئے کافی تھی..وہ اُس کے مقابل ہو کر ایک لمحے کے لئے ساکت ہوئی اور پھر اُس سے لپٹ گئی..کواڑوں پر رکھے ہاتھ اُسے تھامنے کی خاطر الگ ہوئے اور اُس کی پشت پر ثبت ہو گئے..کیتھرائن کے بدن نے..رانوں اور چھاتیوں نے شتالے کے کھیت پر سے جتنی بھی سرد ہوتی اوس سمیٹی تھی، وہ بوند بوند ظہیر الدین کے بدن میں اترنے لگی..اُس کی سب آزردگی، ناآسودگی اور شکستگی میں سرائت کرتی اُسے زائل کرنے لگی..

برسوں کے زوال کی مگر چاندنی ڈھلی اور ان کے ایک دوسرے میں مدغم سراپے چودھویں کی شب ایسی روشنی میں نہائے گئے..کپاس کے ریشے اُن کے بدنوں کی حدت سے یوں سلگنے لگے کہ وہ کسی بھی پل بھڑک کر ہر شے راکھ کر سکتے تھے..

●○●○●○●

چیئرنگ کراس سے آگے.. جہاں ایک زمانے میں سنگ مرمر کے کولونیل اور مغل فن تعمیر کے ملغوبے سے ایستادہ ایک گنبد تلے ملکہ وکٹوریا کا فربہ سراپا براجمان تھا اور پھر اہل ایمان نے ملکہ کے اُس بت کو وہاں سے بے دخل کر کے لاہور عجائب گھر کے تہہ خانے کی قید میں ڈال کر وہاں قرآن پاک کا ایک نسخہ نصب کر کے اس عمارت کو مشرف بہ اسلام کر لیا تھا وہاں سے آگے ایڈورڈ سٹون کی تخلیق کردہ واپڈا کی چھجے دار بلڈنگ سے متصل آواری ہوٹل کی آسائش تھی جہاں کسی زمانے میں کولونیل دور میں اونگھتا ہوا.. بلند چھتوں، جن کے قدیم شہتیروں نے نیچے بچھے وکٹورین پلنگوں پر جانے کیسے کیسے ہوش ربا نظارے دیکھے تھے.. دبیز دیواروں.. جن پر کی گئی قلعی کی درجنوں تہیں ذرہ ذرہ بھرتی تھیں، وسیع چوبی فرش والا ڈائننگ روم.. اور اس فرش کو کرسمس کی راتوں اور نئے سال کی شبوں میں رقص کرتے جوڑوں کے جاموں سے چھلکنے والی شرابوں نے سینچا تھا "پارک ہوٹل" ہوا کرتا تھا جسے مسمار کر کے "آواری ہوٹل" کے بے جان ڈھیر نے سر اٹھایا تھا.. اور اس کے پار.. ایوانِ اقبال کو مُڑتی سڑک کے اُس پار الحمرا کی سرخ اینٹوں کا ایک نامکمل دکھائی دیتا اہرام سر اٹھاتا تھا اور یہ اہرام مال روڈ پر سے گزرنے والی رگ و پے میں ایک پرشور اور اذیت بھرنے والی ٹریفک سے نالاں فریاد بھی نہ کر سکتا تھا کہ اہرام کی خاموشی ہی ان کے ثبات کا سبب ہے.. وہاں الحمرا کا ہال نمبر ایک مکمل تاریکی میں اندھیر تھا، صرف ایک تیز سپاٹ لائٹ جو سٹیج کی چھت میں سے طلوع ہوتی، ایک عفریت کی روشن آنکھ کی مانند سٹیج پر ایک تنہا کھڑے.. عارف نقوی کے چہرے پر جمی عینک کے دبیز شیشوں کو یوں اشکاتی تھی کہ ان کے عقب میں پوشیدہ آنکھیں نہ چاہنے کے باوجود چندھیائی جاتی تھیں اور جب کبھی یہ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوتیں تو ان کے سامنے سٹیج کے پار آڈی ٹوریم کی اگلی نشستوں پر براجمان انہیں نیم تاریکی میں کچھ ہیولے سے نظر آتے.. جرمن ڈرامانگار برٹولٹ بریخت کے کھیل "دے تھری پینی آپرا" کو اردو میں پیش کرنے والا نوجوان ہدایت کار.. اس کھیل کے لئے پہلے سے منتخب ہو چکے اداکار اور الحمرا کے اہرام سے سدا سے چمٹی ہوئی سرکاری جونکیں.. جنہیں صرف خون چوسنے سے غرض تھی ورنہ وہ تو بریخت کے نام سے بھی آگاہ نہ تھے.. عارف نقوی اداکاری کے آڈیشن کے لئے الحمرا کی سٹیج پر کھڑا تھا.. بلقرڈ کے مرنے کے بعد اس نے یہی جانا تھا کہ بس یہی آخری اور مکمل تنہا پن ہے.. آج بریخت کے لئے آڈیشن دیتے ہوئے، اس وسیع سٹیج کے ہولناک صحرا میں کھڑے ہوئے جب کہ آس پاس گھپ اندھیرے کے سناٹے تھے، سامنے جو ہیولے بیٹھے تھے ان کی پہچان نہ ہوتی تھی تو اسے احساس ہوا کہ بلقرڈ کے گزر جانے کے بعد وہ تنہائی تو نہایت معمولی تھی.. اس سے کوسوں آگے ایک اور بے بس تنہائی بھی ممکن تھی.. ایک خالی سٹیج پر کھڑے ہونے کی تنہائی..

مکالمے ادا کرنے سے پیشتر عارف نقوی نے جب اپنے حلق میں اٹکے ہوئے اضطراب کو نگلنے کے لئے گلا

صاف کیا تو اس کی کھنکار الحمرا کے ہال نمبر ایک کی پہنائیوں کی تاریکیوں میں یوں گونجی کہ وہ شرمندہ ہو گیا..اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب کے باہر اپنی ہتھیلی ثبت کی کہ وہ ہلٹر ڈ کی راکھ کی حدت محسوس کر کے آڈیشن کی اس آزمائش کے لئے کچھ توانائی حاصل کرنا چاہتا تھا..تاریکی میں ہیولے دکھائی دیتے، سٹیج کے سامنے جو نشستوں کی قطار تھی وہاں بیٹھے ڈرامے کا نوجوان ہدائت کار..جو غیر ملکی ڈراموں کو اردو میں ڈھال کر لاہور کی سٹیج پر پیش کرنے میں مہارت رکھتا تھا، اُس کھنکار کے بعد اپنے آپ کو مطعون کرنے لگا کہ آخر اُس نے کیوں اس بوڑھے اور گمشدہ شخص کو صرف اس لئے آڈیشن کے لئے مدعو کر لیا تھا کہ وہ ایک مدت سے جرمنی میں رہائش پذیر تھا، ''ڈرمزان دے نائٹ'' میں جن جرمن لفظوں کو جوں کا توں رکھا گیا تھا کہ ان کے متبادل اردو میں دستیاب نہ تھے تو وہ انہیں ادا کرنے کے لئے موزوں ہو گا..اُس نے اپنی درخواست میں اگرچہ لکھنؤ کی کسی سٹیج کے تجربے کا حوالہ دیا تھا اور اسے جان لینا چاہیے تھا کہ اگر وہ تقسیم سے پیشتر اداکاری کے کسی تجربے کا حوالہ دیتا ہے تو وہ...بہت ہی بوڑھا ہو گا..اور اب وہ پچھتا رہا تھا..اُس کے سامنے سٹیج پر تقریباً ستر برس کا ایک نروس سا شخص کھڑا تھا ،جس کے عناصر میں اعتدال نہ تھا، وہ ذرا لرزتا بھی تھا..بہرطور اسے مدعو کیا گیا تھا اس لئے دل پر پتھر رکھ کر اگلے پانچ سات منٹ اسے برداشت کرنا تھا..اور پھر مسکراتے ہوئے اس بزرگ سے معذرت کر کے اسے رخصت کر دینا تھا..

''پلیز..''اس تاریک سمندر میں سے نوجوان ہدائت کار کے ہیولے میں سے آواز آئی..''جی..بسم اللہ کیجیے..''

کنویں کی گولائی آپس میں گتھم گتھا ہوتی جڑوں اور ان جڑوں کے درمیان میں سر نکالتے اینٹوں میں سے پھوٹتے نوخیز بوٹے ایک ہریاول سے نچڑتے بگولے کی مانند تہہ میں ٹھہرے ہوئے پانیوں سے اٹھتے ،گھومتے ان دونوں کے جھکے ہوئے چہروں کے قریب ہو کر انہیں اپنے سبز نم آلود بوسے دینے کی آرزو رکھتے تھے..

ان دونوں کے عکس ایک آبی تصویر کنویں کی تہہ کے پانیوں کے کینوس پر ڈولتے تھے..کبھی وہ گھل مل جاتے ،کسی آہستہ رو جھونکے کے زور پر جو پانیوں میں ایک ہلکی سرسراہٹ وجود میں لے آتا..اور پھر چند لمحوں بعد وہ پھر الگ ہو کر اپنی شناخت کو واضح کر دیتے..

''تمہیں لولیٹا کے ساتھ لوٹ جانا چاہیے تھا..'' ظہیر الدین پاتال میں آنکھیں جمائے اُس کے عکس سے مخاطب ہو کر بولا''تمہاری میڈم پیرزادہ کے رابطے جس نوعیت کے ہیں، وہ تمہارے لئے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتی ہے..تم نے لوٹنا تو بہرحال ہے..''

کیتھرائن نے بھی اپنے برابر میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھے ظہیر کی جانب نگاہ نہ کی.. پانیوں سے ہی کلام کیا''میں اس کی زرخرید غلام نہیں ہوں..اگرچہ میں ایک جنسی مزدور کے طور پر ایک باہمی سہولت مندی کے معاہدے کے تحت آئی لیکن میں پابند نہیں ہوں..تمہارے دوست پردیسی کی بہت فراخ دلی سے عطا کردہ رقم جو اس نے میری ناکردہ خدمات کے عوض مجھے قدرے شرمندگی سے پیش کی تھی، میں نے لولیٹا کے سپرد کر دی ہے تاکہ وہ اسے میڈم کی خدمت میں پیش کر دے..میرا پاسپورٹ اور واپسی کا ٹکٹ میرے ہینڈ بیگ میں محفوظ ہے..تمہیں میرے بارے میں فکر مندی کی ضرورت نہیں ہے.. ہاں اگر تم میرے یوں رُک جانے پر..تمہاری مزید رفاقت کی چاہت میں ٹھہر جانے پر معترض ہو تو میں لوٹ سکتی ہوں..''

''کیتھرائن..میرے لئے بھی یہ ایک معجزہ آثار شب تھی..اوس میں بھیگے ٹھنڈک سے سرد ہوتے تمہارے بدن

نے گویا پچھلی شب مجھے ایک اور جنم دیا.... جیسے میں تمہاری کوکھ سے پھر پیدا ہو گیا لیکن میں اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا بلکہ اس عمر میں اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا کہ اس کنویں کی پرانی اور مردہ ہوتی ایک جڑ کی مانند تمہاری نوخیزی کی ہرے بھرے بُوٹے سے لپٹ کر اسے بھی مرگ آشنا کر دوں..اور میں تو ماضی کو کرید نے کے لئے یہاں آیا تھا..ایک اور مستقبل کی تلاش میں تو نہیں آیا تھا.تم دیکھ چکی ہو کہ اس مختصر کواٹر کے کمرے جو کھنڈر ہونے کو ہیں،ان کی اینٹوں پر کتنی برساتوں کے پانیوں کے دھارے بہہ چکے ہیں.. یہاں معمول کی زندگی کی کوئی معمولی سی آسائش بھی میسر نہیں..ہر شے فنا کی جانب رواں ہے.. صرف یہ کنواں ہے جس کے پاتال کے پانیوں میں کچھ زندگی ہے مگر کب تک..اگر تم غور کرو تو ان پانیوں کی تہہ میں تمہیں ریت اور مٹی کی آخرت نظر آئے گی جس کے اندر بقیہ ماندہ پانی بھی بالآخر جذب ہو جائیں گے.....تم دیکھ رہی ہو کہ میری حیات بھی بوند بوند فنا کی ریت میں جذب ہو رہی ہے اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ماسکو میں میرے بیوی بچے بھی موجود ہیں تو کیا تم ان حقائق سے جان بوجھ کر چشم پوشی کر رہی ہو..میرا ساتھ کیوں دینا چاہتی ہو..صرف ایک شب کی رفاقت سے تم کیسے آگاہ ہو سکتی ہو کہ میں کیا ہوں،کون ہوں..اس لائق ہوں کہ تم اپنے آپ کو مجھ سے متعلق کر لو..آخر کیوں؟''

پاتال میں ظہیر الدین کے جھلملاتے عکس سے آنکھیں اٹھا کر انہیں جڑوں اور بوٹوں کے سبز مرغولے میں سے بلند کرتے اُس نے پہلی بار ظہیر الدین کے چہرے سے براہ راست رجوع کیا''ہم دونوں سَرجی کی کسی جنگ کے ہارے ہوئے سپاہی ہیں..نہ کاؤنٹ ٹالسٹائی میرے کچھ کام آیا اور نہ ہی تمہارے سرخ سویرے کے خواب حقیقت آشنا ہوئے تو ہم دونوں شکستگی اور رسوائی سے منسلک ہو کر ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں..اگر ہم معمول کے لوگ ہوتے،معمول کی زندگی کرنے والے لوگ ہوتے تو شاید ایک دوسرے کے پاس سے اجنبیوں کی مانند گزر جاتے لیکن ہم ٹھہر گئے..کیوں..؟ ہزیمت اور رسوائی کی مشترکہ کشش تھی جو ہمیں قریب لے آئی..اور میں..بدن فروشی اور وہ بھی اپنی من مرضی سے اختیار کرنے کے بعد کیا کوئی اور ذلت باقی رہ جاتی ہے..اور اس کے پار سوائے اتھاہ تاریکی اور فنا کے مجھے بھی تو کچھ اور سجھائی نہیں دیتا..اُس تاریکی میں ظہیر الدین تم مجھے اگرچہ ایک بجھتے ہوئے چراغ نظر آئے..تو مجھے تمہاری یہی پل بھر کی لَو درکار ہے..جتنی دیر بھی رہے..اس کھنڈر نما کواٹر میں کچھ قیام کرنا..اس کنویں کے پاتال میں تمہارا چہرہ دیکھ لینا..میرے لئے..یہی کافی ہے اگر تم اعتراض نہ کرو تو..''

''میں نے یہاں دائمی قیام نہیں کرنا کیتھرائن..میں نے کہیں جانا ہے..''

یہ کہاں سے درماندگی اور شکست خوردگی کے عمیق سمندروں میں سے یہ کہاں سے کیتھرائن کا اوس بھرا بدن نمودار ہو گیا ہے جو گالینا،بورس اور سویٹ لانا کے چہرے بجھا کر ان پر اپنی حکمرانی قائم کرتا ہے..

''تم نے کہاں جانا ہے؟''ایک ہراس کیتھرائن کی شباہت پر سیاہ ہوا..اُس کی نیلی آنکھوں میں تشویش کے سرخ ڈورے تیرنے لگے..

ظہیر الدین نے اُس کے رخسار پہ ہاتھ رکھا..جیسے ایک بچے کو تسلی دینے کی خاطر رکھتے ہیں''مجھے..ابھی آک کے بُوٹوں میں سے پھوٹنے والی ریشہ ملائم مائی بوڑھیوں کے تعاقب میں جانا ہے..اگر میں وہاں سے لوٹ آیا تو..''

●○●○●○●

چھت کے کھو کھلے ہو چکے شہتیر کے اندر..اور کیا وہ پانچواں شہتیر تھا یا چھٹا..شائد وہ اپنا قیام بدلتا رہتا تھا۔اُس کے اندر وقفوں وقفوں کے ساتھ سنائی دینے والی اُس فضول سے رنگ والے سانپ کی سرسراہٹ شب بھراُس کے کانوں میں سرسراتی رہی..جیسے کوئی کتابی کیڑا شخص کسی قدیم بوسیدہ اوراق کی کتاب پر جھکا ہوا آخری سطر پر پہنچ کر دم روک کر احتیاط سے صفحہ پلٹتا ہے تو کاغذ کی ایک بھربھری سرسراہٹ سنائی دیتی ہے..

نینداس سے کوسوں دور شائد برلن کے اُس مقفل فلیٹ کے ڈبل بیڈ کے اس نصف حصے میں رہ گئی تھی جہاں ہلٹرڈ کا وجود گہری نیند میں ہوا کرتا تھا..

اُس چوہے کے بچے نے آج شائد اُس کی اضطرابی کیفیت جان کر اُس پر کرم کیا اور اُس کے انگوٹھے پر اپنے نرم دانت جمانے کی کوشش شب بھر نہ کی..

شب بھر وہ کروٹیں بدلتا رہا..ایک خوف بھرا اضطراب اُس کی نس نس میں تیرتا پھرا اور نینداُس سے کوسوں دور رہی کہ اگلی صبح الحمرا کے سٹیج پر کھڑے ہو کر اُسے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا امتحان دینا تھا..

ارجن سے مخاطب ہو کر مہابھارت کی جنگ سے پیشتر کرشن کے جو مکالمے تھے وہ اُسے ازبر ہوا کرتے تھے لیکن وہ آج کیوں بھولتے جاتے تھے..

جب کبھی.. بلکہ ہر شب برلن میں جب ہلٹرڈ اسے کچھ ہدایات دے کر بیڈروم میں چلی جایا کرتی تھی تو وہ اس پرانی البم کو کھول لیتا جس میں وہ بوسیدہ ہو چکی کسی کتاب کی مانند بھربھری ہونے کو تصویریں چسپاں تھیں..جن میں وہ ایک سنہری گتے سے تراشیدہ تاج سر پر سجائے اپنے سامنے کھڑے آغا ارجن کی جانب ایک شاہانہ ہاتھ بڑھائے زمانوں سے ساکت تھا تو وہ زیرلب ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے وہ ڈائیلاگ دوہراتا چلا جاتا تھا..وہ اُس کی یادداشت پر ثبت ہو چکے تھے..لیکن آج شب..کرشن مہاراج کے لب تو ہلتے تھے پر وہ مکالمے سنائی نہ دیتے تھے..وہ اس کا عمر بھر کا ساتھ چھوڑ رہے تھے..وہ اپنے اضطراب میں بھٹکتا اُنہیں بھولتا جاتا تھا..

اور کل صبح..اُس کی آواز اور ادائیگی کا امتحان تھا..اور جو ڈائیلاگ اسے برلن کی تقریباً چالیس برس کی حیات کے دوران میں بھی نہ بھولے تھے، آج بھولتے جاتے تھے..شاید چھٹے شہتیر کے کھوکھلے پن میں سمٹا ہوا سانپ بھی اب آنکھیں جھپکے بغیر نیند میں چلا گیا تھا کہ وہ بہت دیر سے سرسرایا نہ تھا..اور وہ شخص جو ایک بوسیدہ کتاب پر جھکا تھا، اس نے بھی اس کا بھرتا ہوا بوسیدہ ورق الٹا نہ تھا، وہ بھی سو گیا تھا..

''پلیز..'' اُس تاریک سمندر میں سے نوجوان ہدائت کار کے ہیولے میں سے آواز آئی ''جی..بسم اللہ کیجیے..''
اُس اتھاہ تاریکی کو عارف نقوی نے آنکھیں میچ کر دیکھنے کی کوشش کی کہ سٹیج کی چھت میں نصب تیز سرچ لائٹ انہیں چندھیاتی تھی تو وہاں اگلی نشستوں پر براجمان کچھ ہیولے پہچان میں آنے لگے اور ان میں وہ نوجوان ہدائت کار بھی تھا جسے اس نے اپنے چہرے کے تأثرات اور مکالموں سے متاثر کرنا تھا..وہ آنکھیں میچے ہوئے اُس سے مخاطب ہوا ''آپ میری آڈیشن کی درخواست میں میری اداکاری کے مختصر تجربے کے کوائف پڑھ چکے ہوں گے کہ میں ایک زمانے میں..اور تب آپ شائد پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس زمانے کو گزرے ہوئے تقریباً پچاس برس گزر چکے ہیں۔'' اس کا خیال تھا کہ اُدھر سے ایک مدھم سی ستائش بھری ہنسی کی آواز آئے گی جو نہ آئی اور وہ کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ ''تو اُن زمانوں میں میں لکھنؤ کی سٹیج پر اداکاری کا شوق پورا کیا کرتا تھا..میں اقرار کرتا ہوں کہ میں کوئی اعلیٰ درجے کا اداکار نہ تھا، میری صلاحیت درمیانے درجے کی تھی لیکن میرا جذبہ اور ادائیگی کی شدت تماشائیوں پر اثر انداز ہو کر انہیں تالیاں پیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی..''
''مسٹر نقوی..'' اتھاہ تاریکی میں سے ہدائت کار کی آواز..جو کہ زیادہ دوستانہ نہ تھی، ایک تنبیہہ کے انداز میں آئی ''پلیز آپ مکالمے بولنے کا آغاز کر دیں..ابھی نصف درجن مزید امیدوار بھی منتظر ہیں۔''
''سوری..'' عارف نقوی نے عینک اتار کر اپنی پژمردہ آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھا اور پھر اسے دوبارہ ناک پر جما کر شرمندگی سے کہا ''بے شک میں پچھلے چالیس پچاس برس سے اپنی دھرتی سے جدا رہا لیکن بقول غالب..میں رہینِ ستم ہائے روزگار تو رہا لیکن اس کے خیال سے غافل نہیں رہا..میں اس امر سے بخوبی آگاہ ہوں کہ بجا طور پر پاکستان کی تاریخ اور ثقافت میں بہت کچھ خارج کیا جا چکا ہے اور میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ کسی غیر اسلامی نظریئے، رواج یا ادب کی کچھ گنجائش نہیں لیکن..اس کا کیا کیجئے کہ ہمارے زمانوں میں یہ تفریق کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی..صرف سوچ یا انسانیت کی اعلیٰ اقدار مذہب سے ماورا ہی ہمارے معیار ہوا کرتے تھے..''
''پلیز مسٹر نقوی..'' سامنے کے اندھیارے میں سے ایک بے صبر اور کسی حد تک تضحیک آمیز آواز آئی..
''جی جی..'' عارف نقوی یکدم نروس ہو گیا۔ ''تو میں..صرف مہاراج کرشن کا انقلابی روپ دھار سکتا ہوں..''
''کرشن..؟'' کسی نے بے یقینی میں سرگوشی کی..
''جی..وہ مہابھارت کی جنگ کی آغاز سے پیشتر کرشن اپنے بھائی ارجن سے مخاطب ہوتے ہیں..ان کے جو مکالمے میں آج سے تقریباً پچاس برس پیشتر لکھنؤ کی سٹیج پر ادا کیا کرتا تھا آج..لاہور کی سٹیج پر ادا کرنے کی کوشش کروں گا..اجازت ہے؟''
''نقوی صاحب..خدا کے لیے..شروع کریں۔''
''اے ارجن..'' عارف نقوی نے یکدم پلٹ کر اپنے دائیں جانب کھڑے آغا بابر کے تصور سے مخاطب ہو کر دائیں بازو کو ایک تھئیٹریکل انداز میں بلند کرتے ہوئے کہا..کہا اور پھر..یکدم اس کا ذہن کورا ہو گیا..مکالمے مٹنے، لگے یادداشت دھندلکوں میں کھونے لگی اور تب اُس کی جیکٹ کی اندرونی جیب میں پوشیدہ بلٹر ڈ کی راکھ میں سے ایک چنگاری پھوٹی اور سرگوشیاں کرنے لگی..آ ریف..سامنے بیٹھے لوگوں کو کچھ خبر نہ ہو گی کہ تم جو ڈائیلاگ بول رہے ہو، وہ واقعی رامائن

میں مذکور ہیں یا نہیں..تم اُسی انداز اور لہجے میں اپنے پیرائے کو ڈھال کر مکالمے تخلیق کرلو..جہاں کہیں یادداشت جواب دیتی ہے وہاں اپنی تخلیق کی آمیزش کرلو..کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی..

''اے ارجن..'' عارف نقوی ایک نئے اعتماد سے گویا ہوا اور اس کی آواز میں جو سہج گھمبیرتا تھی، وہ الحمرا کی سٹیج کے اوپر چھت پر تانے ہوئے ریشمی پردوں تک گئی اور ان میں ایک ہلکی لرزش نے جنم لیا ''میں..سب کا پیدا کرنے والا ہوں..مجھ سے یہ ساری کائنات کا نظام چل رہا ہے..اے ارجن..'' اندھیرے میں گم نوجوان ہدائت کار اور اس کے برابر میں براجمان اداکار سنبھل کر بیٹھ گئے کہ اس ''اے ارجن'' نے گویا اُن کے دلوں پر دستک دی تھی ''سارے جانداروں کے اندر میں ہوں..کائنات کا شروع اور اخیر میں ہوں..میں ہی ابتدا اور میں ہی انتہا ہوں..ابتداء میں ہر جانب تاریکی تھی..اور یہ تاریکی پانیوں پر تیرتی تھی اور تب میں نے کہا کہ اے روشنی ہو جا..تو وہاں روشنی ہوگئی، تاریکی چھٹ گئی اور اُن پانیوں پر مہا آتما کی روح تیرنے لگی..''

''تم یہ کیا کہہ رہے ہو آریف..'' ہلٹرڈ کی راکھ کی سُلگاہٹ نے حیرت سے کہا ''تم رامائن، بائبل اور قرآن کو گڈمڈ کر رہے ہو..''

''کیا ان میں کچھ فرق ہے؟'' عارف مسکرا دیا اور پھر ارجن سے منہ موڑ کر تاریکی میں گم ہال کے اندھیاروں کی نابینائی میں آنکھیں اتارتے ہوئے بولا ''اے ارجن..جب دنیا میں دھرم کم ہوتا ہے اور ادھرم بڑھ جاتا ہے تب میں جنم لیتا ہوں..کبھی بدھ کی صورت میں، کبھی عیسیٰ کے روپ میں اور کبھی محمد کی شکل میں..نیکوکار کو پناہ دینے کے لئے اور ظالموں کو سزا دینے کی خاطر..عہد بہ عہد یہ میں ہوں کرشن جو ظاہر ہوتا ہوں..میں ایک ہی قاصد ہوں جو ہر زمانے میں ایک ہی پیغام لے کر آتا ہوں..میرے روپ بہروپ بدلتے رہتے ہیں، پر میں وہی رہتا ہوں جو کبھی تھا، جو ہوں اور جو کبھی ہوں گا..یہ میں ہوں جو برگد کے پیڑ تلے نروان سے آشنا شانتی کا سوم رس پی کے مسکراتا ہوں اور کبھی میرے سر پر کانٹوں کا تاج ہوتا ہے اور صلیب پر کھینچا ہوا اُس سے شکایت کرتا ہوں کہ اے میرے رب تو نے میرا ساتھ کیوں چھوڑ دیا اور کبھی لوگ مجھے پتھر مارتے ہیں اور میرے پاؤں خون آلود ہو جاتے ہیں تب بھی میں ان لوگوں کو بددعائیں نہیں دیتا کہ میں کل عالم کے لئے رحمت بنا کر اتارا گیا ہوں اے ارجن، کیا تم سن رہے ہو؟''

اگلی نشستوں پر بیٹھا ہوا نوجوان ہدایت کار عارف نقوی کی ادائیگی اور اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے دم بخود تھا..اُس کے دل میں لہر سی اٹھی کہ میں اس اردو میں ڈھالے ہوئے جرمن ڈرامے کو سٹیج کرنے کے بجائے صرف اس بوڑھے شخص کو مرکزی بلکہ اکلوتے کردار کے روپ میں سٹیج پر لاؤں اور رامائن کے اس قصّے کو اس کی زبانی پیش کروں لیکن گنجائش نہ تھی ایک طے شدہ اکلوتے سچ سے انحراف کرنے سے گردن کٹ جاتی تھی

''اے ارجن..'' عارف نقوی نے جب ہال کے اندھیاروں سے آنکھیں ہٹا کر اپنے بائیں جانب سٹیج کے اس مقام کو دیکھا جہاں آغا بابر لکھنؤ کے زمانوں میں زیرلب اپنے مکالمے یاد کرتا کھڑا ہوتا تھا تو اُسے شائبہ ہوا کہ وہ وہاں آج بھی ہے..پر وہ ہو نہیں سکتا تھا..وہ تو مر چکا ہے..

''اگر میں ہو سکتی ہوں تو وہ بھی ہو سکتا ہے..'' ہلٹرڈ ہنسی..

عارف نقوی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔۔''اے ارجن کیا تم سُن رہے ہو کہ میں نے کیا کہا... میں نے کہا کہ جب دھرم کمزور پڑ جاتا ہے اور ادھرم بڑھتا ہے تو میں دنیا میں انسان کے بھیس میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں۔۔''

''اے کرشن۔۔'' جیسے اُس نے ادا کیا تھا کہ اے ارجن... اُسی انداز میں آغا بابر کے شائبے نے اسے مخاطب کیا ''کونسا دھرم اور کیسا ادھرم۔۔ ہم تو کسی دھرم۔۔ کسی مذہب پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔۔ ہم تو سرخ سویرے کے خوابوں کے مسافر تھے۔۔''

''ارجن۔۔'' عارف نقوی نے اتنی گھن گرج سے پکارا کہ سٹیج کی چھت کے ریشمی پردے تیز ہوا کی زد میں آئے ہوئے پانیوں کی مانند کروٹیں بدلنے لگے۔۔''زمانے بدل چکے ہیں۔۔ وہ سب شجر، پھول بوٹے، برگد اور پیپل سے لپٹی ہوئی بیلیں اور خواب مردہ ہو چکے ہیں۔۔ تم یہ آرزو تو کر سکتے ہو کہ تمہارے گھر کے آنگن میں جو ایک گدلا جوہڑ ہے اس میں کبھی کنول کے سرخ۔۔ ہمارے نظریات کے سرخ کنول کے پھول کھلیں گے۔۔ پر یہ ایسی آرزو ہے کہ جو محال ہے۔۔ ہم ان پھولوں کو زبردستی تو کھلا نہیں سکتے۔۔ ہمیں ان زمانوں سے مفاہمت کرنی ہوگی۔۔ اور یہ بھی جان لو کہ کنول کے پتے اور مرغابی کے پر پانی میں رہنے کے باوجود خشک رہتے ہیں۔۔ دنیا میں رہتے ہیں پر اس کی آلائشوں سے آزاد رہتے ہیں۔۔ اے ارجن کیا تم سُن رہے ہو۔۔ ہمیں ان آلائشوں سے پاک رہنے کے لئے مہابھارت کے اس یُدھ میں شریک ہونا پڑے گا۔۔ اور صرف اس ایک یُدھ میں کامرانی ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمیں آزاد نہیں کر سکتی۔۔ ابھی بدر اور احد کے معرکے باقی ہیں۔۔ اور کربلا کا یُدھ آخری فیصلہ کرے گا۔۔ کیا تم سن رہے ہو اے ارجن۔۔''

●○●○●○●

ماسکو کے مئی کے آسمان پر وہ سفید ہنڈولوں کی مانند ڈولتی اڑتی پھرتی تھیں..

''تم کہاں آ گئے ہو ظہیر الدین..'' اُس نے اپنے آپ سے تب ماسکو میں سوال کیا تھا..

وہ بورے والا نارمل سکول سے چھٹی ہونے پر سیدھا گھر نہ جاتا تھا..

وہاں جہاں دھان چھڑنے کے کارخانے تھے.. دھوپ میں سُوت کی رنگی ہوئی سرخ، نیلی پیلی جامنی اٹیاں سوکھتی تھیں ریلوے لائن کے پار.. ایک وسیع ویرانہ تھا جس میں آک کے بوٹوں کے سوا ہر بوٹا ہر پتہ لُوتی دھوپ میں مردہ ہو جاتا تھا.. چند گرگٹ تھے جو اپنی بلوں میں سے گردنیں لامبی کر کے سونگھتے باہر آتے تھے اور وہ بھی آتش برساتی دوپہر کی تاب نہ لا کر فوراً کسی اور گرگٹ کی بل میں پناہ لے لیتے تھے..

ظہیر الدین بھی گویا آک کا ایک بُوٹا تھا.. اُس کا کچا بدن برستی آگ میں بھی نہ پژمردہ ہوتا تھا اور نہ ہی جھلستا تھا..

وہ ان آک کے بوٹوں کے درمیان ہر بوٹے پر جھک کر اس کے ڈوڈوں کو جانچتے چلتا جایا کرتا تھا.. ان کے زہر موہرہ رنگ کے پتے جن کی شریانوں میں زہریلا، گھنا، لیس دار دودھ گردش کرتا تھا اُن میں پرورش پاتے کسی ایک ڈوڈے کا مُنہ حدت کی تاب نہ لا کر کھل جاتا اور اُس میں سے ایک نرم سفید مائی بوڑھی پھوٹ کر اُس گرم ہوا کی ڈولی پر سوار فضا میں ڈولنے لگتی اور وہ ظہیر الدین اپنی تختی گھماتا اُس ایک مائی بوڑھی کا پیچھا کرنے لگتا تھا.. اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ مارتا پر وہ اس کی گرفت میں نہ آتی.. اُس کے آگے آگے بے آواز تپش کی لہروں پر سوار اڑتی جاتی..

اور آج اُسی ویرانے میں جو ظہیر الدین کھڑا تھا، اُس کے اور اُس نارمل سکول میں پڑھتے بچے کے درمیان نصف صدی سے زیادہ کی مسافتیں تھیں..

اگرچہ آج یہ ویرانہ، وسعت اور بے آبادی میں اتنا بے انت نہ رہا تھا، مختصر ہو چکا تھا کہ رینگتی، لالچی اور خود غرض انسانی بستیوں نے اُس کی ویرانگی کو نگل لیا تھا لیکن اُس کی آنکھیں اس لمحۂ موجود میں اُس کے مختصر ہو چکے وجود کو قبول کرنے سے انکار کئے جاتی تھیں، کہ ان میں ابھی تک وہی بے انت پھیلاؤ والا میدان جہاں آک کے بُوٹوں کے سوا ہر نمود جھلتی تھی، نقش تھا..

تو اُس مختصر ہو چکے ویرانے نے شکایت کی.. کہ تم اب آئے ہو ظہیر الدین..

اور وہ جو اگلے زمانوں میں دھوپ میں سُلگتا ایک بے سایہ ویرانہ ہوا کرتا تھا جس میں آک کے بُوٹوں کے زہرناک جنگل گھنے ہوا کرتے تھے، وہاں.. اب نصف صدی کے بعد صرف ایک آک کا بُوٹا تنہا کھڑا تھا..

کل ویرانے میں تنہا صرف ایک بوٹا آک کا...

وہ بُوٹا اس مختصر ویرانگی میں تنہا..وہ بھی کب کا اس ویرانے کو ہموار کرنے کے لیے، ایک اور سنگ وخشت کی بدہیئت تعمیر کی خاطر کسی درانتی کی زد میں آ کر کٹ چکا ہوتا اگر اُس بُوٹے کے رگ وپے میں مسلسل ایک یاددہانی نہ پکارتی پھرتی کہ اے آک کے بُوٹے مستقبل میں اُسی بچے نے پھر سے طویل مسافتیں طے کر کے تم تک پہنچنا ہے تو تم نے اُس کا انتظار کرنا ہے، تب تک قائم رہنا ہے۔ چنانچہ باقی سب بُوٹے تو کٹتے رہے لیکن جب درانتی والا ہاتھ اُس کی جڑ پر وار کرنے کو تھا تو اُس کے پتوں میں سے زہریلے لیس دار دودھ کی بوندیں ٹپکیں، ہاتھ پر گریں اور اُسے پل بھر میں نیلا کر کے مردہ کر دیا.. جب متعدد ہاتھ اُسے نابود کرنے کی کوشش میں بے جان ہو گئے تو اُسے منحوس جان کر چھوڑ دیا گیا اور تب لوگ اُس سے کترا کر نکل جاتے..بس وہی آک کا بُوٹا تنہا بچا تھا اور اُس کا منتظر تھا..

دھوپ کی حدّت اگرچہ اِن دنوں میں بجھ چکی تھی لیکن ظہیرالدین اس تنہا بُوٹے کے سامنے جیسے سکتے میں ہو، بے حس وحرکت کھڑا، اُس قدیم ویرانے کے بچھڑ جانے اور معدوم ہو جانے پر رنج والم میں ڈوبا سر سے پاؤں تک پسینے سے شرابور ہو رہا تھا..اور یہ جو ایک مختصر سے ویرانے کی ویرانگی بچی تھی یہ بھی گھروں میں گھر چکی تھی..اس کے چاروں اور سیمنٹ اور اینٹوں کے بھدّے حصار ابھرتے تھے اور ان کے اندر عُسرت زدہ خاندان پناہ گزیں تھے..اور ان کی کھڑکیوں سے ناکیں جوڑے غلیظ بچے تھے جو آک کے ایک بُوٹے کے سامنے کھڑے ایک اجنبی کو حیرت سے تکتے جاتے تھے..سفید چھدرے ہوتے بالوں کے اندر اُس کی کھوپڑی کے ننگے پن میں سے پسینے کی بوندیں پھوٹتی، بالوں میں سے راستہ بناتی اُس کی آنکھوں میں گرتی تھیں..

اگرچہ وہ قائم رہنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن تنہا پورے آسمان کی دُھوپ سہتے وہ پژمردہ ہو چکا تھا، اُس کے ڈنٹھلوں میں جان نہ رہی تھی، پتے مرجھا رہے تھے اور اُن پر جو رگیں ابھرتی تھیں وہ بے جان ہو کر سکڑ رہی تھیں..وہ آخری دموں پر تھا..

یہ قدرت کا ایک ان مٹ اور ابدی اصول ہے کہ جو کوئی بھی جاندار اس جہان میں پیدا ہوتا ہے اُس کے لئے اپنی حیات سے بھی زیادہ اہم ایک اور حیات کو جنم دینے کا جذبہ اتنی شدت سے بھر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی نسل کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے..نہ صرف انسان بلکہ حیوان، کیڑے مکوڑے، پرندے، شجر، گُل بُوٹے سب اپنی اپنی نسل کی بقاء کی جنگ مسلسل لڑتے اپنے آپ کو فنا کر لیتے ہیں لیکن اپنا قائم مقام ضرور چھوڑ کر جاتے ہیں..آک کا وہ تنہا بوٹا جو اپنے سامنے فنا کی تاریکی دیکھ رہا تھا بھلا وہ اس تگ ودو سے الگ کیسے رہ سکتا تھا..اُسے مردہ ہونے سے پیشتر اپنا بیج اُن ہواؤں کے حوالے کرنا تھا جو اُسے اُڑا کر کسی اور ویرانے میں جا بوئیں گی..

یوں بھی وہ جس کا منتظر تھا، وہ آ گیا تھا، اُس کے سامنے پسینے میں شرابور بُت بنا کھڑا تھا..

جڑوں والے کنویں کے پاتال کی نیم سیاہی میں کیتھرائن کا چہرہ، کنارِ آب کھونٹے سے بندھی ایک کشتی کی مانند ہولے ہولے ڈولتا تھا..

وہ موسیٰ اس لئے بھی نہ تھا کہ صرف اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے آزاد کر کے اُن سرزمینوں تک لے جاتا جن کا اُس کے رب نے وعدہ کیا تھا.. بلکہ وہ دنیا بھر کی قوموں کو اُن کی زنجیروں کو انقلاب کی آتش سے موم کر کے اُنہیں ایک نئی خوابوں کی سلطنت میں بسانا چاہتا تھا..

وہ پیغمبر بھی نہیں تھا اگرچہ ایک کتاب رکھتا تھا..

اور یہ کیسے لوگ تھے دنیا بھر کے.. ذلتوں کے مارے جو اُس پر ایمان لے آئے.. اور پھر سامراج کے سُنہری بچھڑے کے پرستار ہو گئے.. اور جب اُس نے ہوش سنبھالی تو وہ پیغمبر متروک ہو چکا تھا.. اُس کے جانشینوں کے ظلم وستم نے ایمان رکھنے والوں کو بھی دل برداشتہ کر دیا اور وہ خوابوں کی سلطنت وجود میں آنے سے پیشتر ہی خس وخاشاک ہو گئی..

وہ بوسیدہ کواٹر جو ڈھے جانے کو تھا، اُس کی دیواروں پر ابھی تک خوابوں کے چیتھڑے چپکے ہوئے تھے.. مارکس کی گھنی داڑھی کا ایک چیتھڑا.. لینن کے گنجے سر کی ایک دھجی اور سٹالن کی مونچھوں کے چند بال..

اُس نے اپنی سرد سرزمین سے دُور.. ''آوارہ ہوں'' کے ایک دیس میں کہیں، کسی لاہور سے دور.. دور افتادہ کسی بورے والا سے پرے ایک ایسی شب میں جب کہ وہ ٹریکٹر ٹرالی کے ہچکولوں سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی جب کہ ڈیرے کے صحن میں ایک الاؤ روشن تھا، تندور میں سلگتی روٹیوں کی مہک سارے میں تھی تو اُس نے وہاں اپنی سَرجی کو دوبارہ پا لیا تھا اور وہ اب دوبارہ اُس سے بچھڑنا نہیں چاہتی تھی..

جڑوں والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی کیتھرائن نے پاتال کی نیم سیاہی میں پانیوں پر ہلکورے لیتے اپنے عکس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا.. میں دوبارہ بچھڑنا نہیں چاہتی.. ظہیر الدین ہزیمت اور شرمندگی کے آخر میں اگرچہ ایک بجھتا ہوا دِیا ہے لیکن میں اُس کی لرزاں زرد آخری کرنوں میں جتنے بھی برس اُس کے پاس باقی ہیں اُن میں رنگا اپنا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں.. بچھڑنا نہیں چاہتی..

ظہیر الدین کی پسینے سے نمکین ہوتی آنکھوں کے سامنے ایک معجزہ رونما ہونے لگا..

آک کا وہ بُوٹا جو ابھی پژمردہ اور بے جان سا تھا اُس کے اندر ایک توانائی بھرنے لگی.. اُس کے مرجھائے ہوئے پتے ایک جھرجھری لے کر تروتازگی کی کروٹیں بدلنے لگے.. ان پُرنقش شریانوں میں سے دودھ پھوٹنے لگا، ڈنٹھل کی کمر میں جو جھکاؤ تھا، وہ کڑی کمان ہو گیا اور وہ جو خشک ہوتے ڈوڈے اُس کی شاخوں پر مرجھاتے تھے ان میں جان پڑ گئی، وہ یوں ہرے بھرے اور توانا ہوئے جیسے ابھی ابھی اُن کا جنم ہوا ہو.. اور پھر اُن میں سے ایک ڈوڈا ایسا تھا جس کے اندر نسل کے تسلسل اور بقاء کی حرارت نے زور کیا اور اُس کا مُنہ چڑیا کے ایک پیاسے بچے کی مانند کُھل گیا.. جیسے ایک کوکھ کھلتی ہو.. اور اُس کے اندر پوشیدہ ایک سفید ریشہ وجود نے باہر کے جہاں کی روشنی دیکھی تو اُس نے پیدا ہونے کا فیصلہ کر لیا.. کہ اُس سفید روئی بدن کے اندر ایک سیاہ رنگ کا بیج تھا جو اُس نے ہواؤں کے سپرد کرنا تھا.. وہ نوزائیدہ مائی بوڑھی ڈوڈے کی کوکھ میں

سے برآمد ہوئی..ایک نومولود بچے کی مانند اُس کے پپوٹوں پر جو چپکتی ہوئی آلائش تھی اُس میں آنکھیں کھول کر اُس نے اس جہانِ رنگ و بُو کو پہلی بار دیکھا اور ایک گرم ہوا کو اپنے ریشوں میں سرائت کرتے محسوس کیا جو سرگوشیاں کرتی تھی کہ میں تمہارے بیج کو اپنے دوش پر سوار کر کے بہت دور ان ویرانوں تک لے جاؤں گی جہاں اس بیج سے آک کے سینکڑوں بُوٹے جنم لے کر تمہاری نسل کا تسلسل جاری رکھیں گے..

اُس کی، ظہیر الدین کی نمکین ہوتی آنکھوں کے اندر اس تنہا بُوٹے کے ایک ڈوڈے میں سے جنم لینے والی حسین سفید پری مائی بوڑھی کا سراپا تیرا اور اُس کے خشک ہونٹ ایک مسکراہٹ میں کُھل گئے کہ یہ سفر رائیگاں نہ گیا تھا..

وہ باریک ریشوں سے بُنا تقریباً بے وزن وجود گرم ہوا کی زد میں آ کر ڈوڈے کی کوکھ میں سے برآمد ہوتے ہی ذرا بلند ہوا اور پھر فضا میں بے آواز تیرنے لگا..ظہیر الدین اپنے شرابور سکوت میں سے باہر آیا اور دونوں ہاتھ ایک ایسے بچے کی مانند بے اختیار بڑھا کر جو گیس کے ایک غبارے کی ڈور ہاتھ سے چھوٹ جانے پر پھر سے اُسے پکڑ لینا چاہتا ہے اُس مائی بوڑھی اُس آک کی بڑھیا کو دبوچنے کے لئے اُس کا پیچھا کرنے لگا..

اور وہ قابو میں نہ آتی تھی..

وہ اپنے تئیں جھپٹ کر اُس کے سفید سراپے پر اپنی مٹھی یکدم بند کر لیتا پر جب وہ اسے کھولتا تو اُس کے اندر سوائے پسینے کے اور کچھ نہ ہوتا..ایک سفید ریشہ بھی نہ ہوتا..اور وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے منڈلاتی ڈولتی ہوا کے دوش پر ہولے ہولے اڑی جاتی..

وہ اُس کے تعاقب میں چلا جاتا تھا پر وہ اُس کی گرفت میں نہ آتی تھی..

یہ تو کہ نہیں اگر وہ اُس کی مٹھی میں آ جاتی تو اُس نے اسے بھینچ کر کچل دینا تھا، اُس نے تو اُسے محض اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر اُس کے سراپے کو جی بھر کے دیکھنے کے بعد آزاد کر دینا تھا لیکن مائی بوڑھی تو اُس کی بڑھتی ہوئی ہتھیلیوں سے ہراساں تھی کہ وہ اپنے اندر کے بیج کی حفاظت کرنا چاہتی تھی..وہ کہاں قابو میں آتی تھی..

پھر ایک تغیر رونما ہوا..ایک تبدیلیٔ ہیئت نے جنم لیا..

ایک پُر اشتیاق بچے، ظہیر الدین، ہاتھ فضا میں پھیلائے اُس تنہا آک میں پھوٹنے والی اکلوتی مائی بوڑھی کے پیچھے اُسے اپنی ہتھیلیوں کی آغوش میں سمیٹنے کی آرزو میں بے سُدھ چلا جاتا تھا جب اُسے اپنے پاؤں تلے ایک خلاء کا احساس ہوا..وہ زمین پر نہیں پڑ رہے تھے، اتنے ہلکے اور لطیف ہو گئے تھے جیسے روئی کے گالے ہوں، سطح زمین سے ہولے ہولے اوپر اٹھ رہے ہوں.. پورا بدن ہلکا پھلکا ہو گیا ہو جیسے باریک سفید ریشوں سے بُنا ہوا ہو..ایک تبدیلی ہیئت جنم لے رہی تھی..نہ صرف اُس کی ہیئت بلکہ شکل بھی ایک تبدیلی سے دوچار تھی، چہرے پر سفید روئیں پھوٹنے لگے اور وہ روئی کی مانند بے وزن، سفید ریشوں کی صورت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا..

کیا وہ اس تبدیلی ہیئت..جو اُس کے بس میں نہ تھی، سے ہراساں اور خوفزدہ ہو گیا تھا یا اُس نے اسے قبول کر لیا تھا..

اگر کوئی چنگا بھلا انسان..جسے کافکا نے تخلیق کیا ہو ایک سویرا اپنے بستر میں بیدار ہو اور وہ محسوس کرے کہ وہ ایک

مکوڑے میں تبدیل ہو گیا ہے تو وہ ہرگز اولین لمحوں میں..اس ناگہاں تبدیلیٔ ہیئت پر یقین نہیں کرے گا لیکن جب وہ اپنا بازو اٹھائے گا تو وہ مکوڑے کی ایک باریک ٹانگ میں تبدیل ہو چکا ہوگا..وہ سر کو محسوس کرے گا تو وہ چھوٹا ہو چکا ہوگا اور پھر وہ بستر سے اٹھنے کی سعی کرتا ہے تو اُسے رینگ کر فرش پر گرنا ہوگا..تب وہ ہراساں اور خوفزدہ تو ہوگا..

لیکن ظہیرالدین نہ ہوا..

یہ تبدیلیٔ ہیئت کہ وہ ایک انسان سے ایک مائی بوڑھی میں بدل رہا تھا اُس پر تھوپی نہ گئی تھی بلکہ در پردہ..اتنے برسوں سے، اپنے بچپن سے وہ یہی آرزو دل میں پالتا رہا تھا کہ کاش کبھی میں..اسی طور ہولے ہولے ہوا کی سلوٹوں پر ڈولتا اڑتا پھروں..بھلا محض ایک مائی بوڑھی کے تعاقب کی خاطر کوئی اتنے بکھیڑوں میں پڑتا ہے..گھربار اور کنبے کو ترک کر کے دور کا مسافر ہو جاتا ہے..در پردہ وہی آرزو تھی جو پوری ہو رہی تھی یا پوری ہو چکی تھی..

اور جب اُس کا نصیب حسب آرزو ہو گیا تو اُس کا دل جو اب ایک سیاہ بیج کی صورت اُس کے روئیں روئیں میں دھڑکتا تھا ایک ابدی مسرت سے ہمکنار ہو گیا لیکن اس ابدی مسرت میں ایک پچھتاوا تھا..وہ جو اس لمحۂ موجود میں جڑوں والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی اُس کی راہ تکتی تھی، اُس کی منتظر تھی اُس پر اُس کی گمشدگی سے کیا بیتے گی..وہ اس عجوبے کی گتھیاں سلجھانے میں ناکام رہا تھا کہ ابھی پچھلی شب اُن کی رفاقت کے پہلے قدم اٹھے تھے اور اس کے باوجود وہ عمر بھر کی قربتوں اور محبتوں پر حاوی ہو گئی تھی..لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی..وہ چاہتا تو بھی اپنی پچھلی جُون میں نہیں لوٹ سکتا تھا اگرچہ وہ نہ چاہتا تھا..

کیتھرائن ظاہر ہے کب تک اُس کی آس میں جڑوں والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی رہے گی، بالآخر ماسکو لوٹ جائے گی اور وہاں اُسے اگلے برس کے مئی کے مہینے کا انتظار کرنا ہوگا جب سنبل کے درختوں میں سے وہی مائی بوڑھیاں جنم لیں گی جنہوں نے اُسے بورے والا واپسی کی ترغیب دی تھی اور شائد اُن میں سے ایک مائی بوڑھی ایسی بھی ہو جو ہوا کے دوش سے سبجے سبجے اترتی اُس کے رخساروں پر آ ٹھہرے اور اُس کے ریشوں کے اندر ظہیرالدین کے جو نقش ہوں، وہ اُنہیں پہچان لے..

زندگی میں پہلی بار اپنی سب کلفتوں اور دکھوں سے آزاد، اپنے سرخ خوابوں کی شکستگی کے ماتم سے آزاد وہ ایک مائی بوڑھی کی صورت میں کسی ایسے ویرانے کی جانب دھیرے دھیرے ڈولتا اڑتا چلا جاتا تھا جہاں وہ اپنے ریشوں کے اندر پوشیدہ بیج کو زمین کی کوکھ کے سپرد کر دے گا..کیا پتہ اُس بیج سے ایک ایسی نسل جنم لے جو پھر سے انصاف، برابری اور عزت نفس کی بحالی کے پرچم تھام لے..

''ارجن..کیا تم سُن رہے ہو..میں نہ صرف اس کائنات کے پتّے پتّے بُوٹے بُوٹے..ہر گُل اور شجر میں سانس لیتا ہوں بلکہ انسانوں کے سوا جو حیوان ہیں میری روح ان میں بھی پھونکی گئی ہے..میں سدھارتھ کی گیان میں گُم مدھ بھری نیم وا آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ اُس کے قدموں میں ٹانگیں سکیڑے بیٹھے تابعدار ہرنوں کی آنکھوں میں بھی ایک اداسی کی صورت قیام کرتا ہوں..میں سامری کے بچھڑے کے سنہرے پن میں جھلکتا ہوں..خرِ عیسیٰ کی خاموش اطاعت میں ہوں..قصویٰ کی لامبی آنکھوں میں بھی میرا ہی جلوہ ہے اور وہ اپنی مست الست چال میں دنیا کے ہر جانور سے ممتاز ہوئی جاتی ہے کہ اُس پر کیسا سوار ہے جس کے پاک وجود سے اُس کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی چھنک کُل کائنات میں گونجتی ہے..اور سنو میں اُس سفید گھوڑے براق کے پروں میں بھی سرگوشیاں کرتا ہوں جو قصویٰ کے سوار کو آنکھ جھپکنے کے وقفے سے بھی پہلے..ایک لرزتی ہوئی کُنڈی کے ساکت ہو جانے سے بھی پہلے عرشوں پر لے جاتا ہے..اور وہاں کون ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں، بس میں ہی میں ہوں..ارجن کیا تم سُن رہے ہو..؟''

باہر..لاہور کی مال روڈ پر الحمرا کے ہال نمبر ایک کے برابر میں سے گزرتی ٹریفک سگنل پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبور اُرکتی ٹریفک کی بے چینی میں کیا کوئی ایک ڈرائیور یہ گمان کر سکتا تھا کہ بائیں جانب سرخ اینٹوں کے ڈھیر اہرام کے اندر ایک تیز سرچ لائٹ کی زد میں آیا ہوا کوئی شخص نہ محمد بن قاسم کا تذکرہ کرتا ہے اور نہ ہی محمود غزنوی یا اورنگزیب کے گیت گاتا ہے بلکہ کسی ہندو دیوتا کا روپ اختیار کیے ہر عقیدے میں سے سچ کے ذرّے چُن کر اُنہیں انسانیت کی چادر میں ٹانکتا ہے..

ارجن کیا تم سُن رہے ہو؟

''آریف..'' راکھ کے پیار بھرے ہاتھ اُس کے سینے کو تھپکنے لگے..''تم بُھلا بیٹھے ہو کہ تم یہاں ایک جرمن ڈرامے کے اردو روپ میں اداکاری کرنے کی خواہش میں آڈیشن کے لئے آئے ہو..تم سچ مچ کرشن نہیں ہو..محض ایک اداکار ہو..اپنے جوش کے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لو..اپنے اضطراب کو قابو میں رکھو..تمہارے دل کو دھچکے لگ چکے ہیں، وہ اتنے اضطراب کا متحمل نہیں ہو سکتا..ذرا ہوش سے کام لو..آریف..''

ابھی تُولا کے باہر گلابی کھیتوں کے کناروں سے آغاز ہونے والے برچ کے جنگلوں کی شب میں وہ بارش سے بھیگتی تھی اور ابھی..وہ تن تنہا برہنہ بدن ایک لق و دق صحرا میں کھڑی تھی..دھوپ کی تپش اُس کے پنڈے کی پور پور میں سلگتے ہوئے تیر کھبوتی اُسے بھسم کر دینے پر تلی ہوئی تھی..

اور اُس صحرا میں جہاں ریت کا ہر ذرّہ تپش کا ایک چراغ تھا وہاں اُس کی گرم ہوا کے دوش پر سفید ریشوں کی ایک ڈولی تھی جو فنا کے کہاروں کے کاندھوں پر سوار ڈولتی چلی جاتی تھی..اُس ڈولی کی پوشیدگی میں سے ایک چہرہ ظاہر ہوا اور فوراً ہی چھپ گیا..

کیتھرائن ہڑبڑا کر جڑوں والے کنویں کی منڈیر سے اٹھ بیٹھی..

اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سَر جی کو کھو دیا تھا..

ظہیر الدین ابھی ظاہر ہوا تھا اور ابھی چُھپ گیا تھا..

فنا کے کہاروں کے کاندھوں پر سوار وہ ڈولی ایک مائی بوڑھی کی مانند ڈولتی اُس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی..

●○●○●○●

تمام روشنیاں گُل ہو چکی تھیں..

وارث چوہدری کے ڈاچا کا لونگ روم جس کی صرف ایک دیوار جو اُس کی پشت پر تھی، نابینا تھی، فلارنس کے قریب جو سنگ مرمر کی قدیم کانیں تھیں جن میں سے کبھی مائیکل انجلو اپنے مجسمے نکالتا تھا وہاں کے سنگِ مرمر سے تراشیدہ تھی.. بقیہ تینوں دیواریں فرش سے چھت تک سراسر شفاف شیشہ تھیں لیکن اتنی دبیز کہ اُن پر کوئی چٹان بھی آ گرے تو شائد ایک معمولی سی دراڑ تو نمودار ہو جائے پر اُن کے کرچی کرچی ہو کر مسمار ہو جانے کا کچھ امکان نہ تھا.. آج بھی اُس کی بیوی اور دونوں بیٹے نصرت اور رانجھا اُسے شب بخیر کہہ کر، اُس کے رخساروں پر بوسے ثبت کر کے اپنے اپنے بیڈ رومز میں جا چکے تھے..

اگرچہ تمام روشنیاں گُل ہو چکی تھیں لیکن لونگ روم کے پھیلاؤ میں تاریکی نہ تھی، ایک ہلکی سفیدی کا غبار سا تھا جیسے مگر چاندنی کے آثار ہوں..کہ باہر اُس کے ڈاچا کے باہر کے گھنے جنگلوں کی ہریاول پر ہولے ہولے برف کے گالے بے آواز اترتے اُنہیں اپنی روئی سفیدی سے ڈھانپتے تھے اور اُن کے درمیان میں بہتی ندی کے پانیوں پر گرتے، کچھ دیر اپنا وجود قائم رکھتے، اُس پر بہتے تھے اور پھر گھل جاتے تھے..آج شب..ابھی کچھ دیر پہلے تک تو ہوا میں ایک یخ بستگی کی کیفیت ٹھہری ہوئی تھی اور پھر یکدم ایک سرد سکوت نے سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ہوا کے جو نامعلوم جھونکے آوارہ پھرتے تھے، انہوں نے بھی اپنا دم روک لیا، کچھ دیر ایک سناٹا رہا اور پھر اُس میں سے روئی کے سفید گالے اترنے لگے..

تب، اُس شب، جب ابھی ستمبر کے آخری دن تھے، ڈاچا کے باہر کے جنگلوں کا ہر شجر ایک تیز کٹیلی سرد ہوا کے سندیسے اپنے پتوں اور ڈالیوں میں ملفوف کرتا نہایت متجسس کہ اندر اس لونگ روم کی حدت بھری آسودگی میں اور کون ہے، اڈا چلا آ رہا تھا..اور ظہیر الدین اسی سامنے والے صوفے میں دھنسا بیٹھا تھا اور وارث چوہدری کے آنکھوں میں اپنے ہمدم دیریں کی تصویر نقش ہوتی تھی اور اُس تصویر میں بکھر چکے سرنگوں شکست خوردہ خواب تھے اور وہ کہہ رہا تھا کہ..میں تمہیں روکوں گا نہیں ظہیر الدین..لیکن وہاں..ان چالیس پچاس برسوں میں وہ لوگ جو کبھی تمہارے قریب تھے، دور پار کے عزیز و اقارب تھے اُن میں سے بیشتر تو مر کھپ چکے ہوں گے اور جو ہوں گے وہ تمہیں کہاں پہچانیں گے..نہ وہ کیکر کے درخت ہوں گے اور نہ شیشم کے بلند قامت پیڑ..وہاں کوئی بھی نہ ہو گا..

اور ظہیر الدین نے شرارت سے سر لایا تھا..وارث بے شک وہاں میرا جاننے والا کوئی ایک نفس بھی زندہ ہو..نہ میرے زمانوں کا کوئی کیکر یا شیشم رہا ہو لیکن.. بورے والا کے باہر جو بے انت ویرانگی ہے وہاں بہر صورت آک کے

بُوٹے ابھی تک موجود ہوں گے..اور ان کے ڈوڈوں میں سے مائی بوڑھیاں پھوٹیں گی..اور میں اُن باریک ریشوں سے بُنت کی گئی ہوا کے دوش پر ڈولتی مائی بوڑھیوں کا تعاقب کروں گا..

اور پھر وہ دونوں ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے تھے..کہ اُن کا یہ حال کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا..اور نہ ہی وہ کسی کو سمجھا سکتے تھے کہ ذہن میں خلل اندازی ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ ایک انسان جس نے صبر شکر سے اپنے نظریات پر مستحکم ہو کر تنگی ترشی کی بہت کٹھن مسافتیں طے کی ہوں اور پھر بالآخر وہ اُنہی نظریات کے دیوتا کو بازار میں لا کر فروخت کرنے کے نتیجے میں اب پُر آسائش اور مالی طور پر آسودہ ہو چکا ہو یہاں تک کہ اُس سے برگشتہ اور کسی حد تک بے زار اُس کے بال بچے بھی اب اُس کی تعظیم کرنے لگے ہوں تو وہ شخص..یکدم اس متمول اور پُر وقار ہو چکی حیات کو ترک کر کے کسی ویرانے کی جانب صرف اس لئے لوٹ جانا چاہتا ہے تاکہ وہ وہاں کسی آک کے بُوٹے میں سے پھوٹنے والی مائی بوڑھی کا تعاقب کر سکے..نہ ہی وہ کسی کو سمجھا سکتے تھے اور نہ ہی کوئی یہ سمجھ سکتا تھا اور..نہ ہی وہ سمجھانا چاہتے تھے..

وہ اُس کی رخصتی کے بعد بے آسرا سا ہو گیا تھا..اُس کے قریب جتنے بھی دوست اور آشنا تھے اُن سب کی آنکھوں میں سے آکاس بیلیں پھوٹتی تھیں جو اُس کے بدن کے گرد لپٹ کر اُس کی امارت کی ہوس میں مبتلا اُس کا خون چوسنا چاہتی تھیں..صرف ظہیر الدین تھا جس کی بے غرض قربت اُسے تسکین دیتی تھی..

وہ بہت متعجب ہوا تھا جب ایک روز اُس کے بیٹے بورس نے اُس سے رابطہ کیا تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں اپنے باپ کی جدائی جانے کیسے اور کیوں حقیقی طور پر سلگنے لگی ہے..اُس نے ظہیر الدین کا کھوج لگانے کے لئے پاکستان میں اپنے رابطے متحرک کیے تھے اور اُسے صرف اس قدر خبر ملی تھی کہ بورے والا میں اُس کے والد شمس الدین انقلابی کے تقریباً کھنڈر ہو چکے کوارٹر کے صحن میں جو ایک جڑوں والا کنواں ہے اُس کی منڈیر پر کوئی سفید فام عورت بیٹھی رہتی ہے اور اُس کے پاتال میں جھانکتی اپنے آپ سے کچھ سوال جواب کرتی رہتی ہے..ظہیر الدین کا کچھ اتہ پتہ نہ ملا تھا..

باہر شیشے کی دبیز دیواروں کے باہر برفباری کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا اور وہ اب اکا دکا گالوں کی صورت نہیں انباروں میں آسمانوں سے اترتی جنگلوں پر اپنا سفید بوجھ ڈالتی اُن کے ہر شجر کو جھکاتی، دوہرا کرتی تھی..

اور تب..اُن شیشہ دیواروں پر سر پٹختے برف کے گالے میں اگرچہ نہ تو وہ مخمور تھا اور نہ ہی اُس نے اپنے یار کی قربت کے لئے کسی تصور کو آنچ دی تھی..ہر گالے میں اُسے ظہیر الدین کی شکل ظاہر ہوتی دکھائی دینے لگی..کچھ دیر وہ ضبط کئے بیٹھا رہا..

کچھ حساب کتاب کرتا رہا کہ یہ کیسا وہم ہے..کیسا گمان ہے..برف کے سفید گالوں میں اُس کے ہمدم دیریں کا چہرہ کیسے نقش ہو سکتا ہے، پر وہ وہاں تھا..اور وہ اُس کی خاموش دستک کی تاب نہ لا سکا، اٹھا اور شیشے کی دیوار میں نصب شیشے کی ایک کھڑکی جو نظر میں نہ آتی تھی کھول دی..

برف کا ایک انبار لونگ روم میں چلا آیا..

لِونگ روم کی وسعت میں برف کے گالے آک کے بوٹوں میں سے پھوٹنے والی سفید مائی بوڑھیوں کی مانند اڑتے پھرتے تھے..

وارث چوہدری ایک ناکافی لباس میں.. چار خانے کی لیل پوری دھوتی اور کڑھائی والے ایک کُرتے میں ملبوس ٹھٹھرنے لگا..

میرے منتظر مت رہو.. اُن میں سے برف کے یلغار کرتے کھلی کھڑکی میں سے ہجوم کرتے داخل ہوتے گالوں میں سے ایک گالا وارث چوہدری کے رخساروں کے ساتھ آ لگا.. اور اس پر ظہیرالدین کے سب نقش و نگار لالۂ گُل کی مانند نمایاں تھے.. وارث میرے منتظر مت رہنا.. کہ مجھ میں اور ایک مائی بوڑھی کے وجود میں کچھ فرق باقی نہیں رہا.. تو من شدی.. من تو شدی.. میں مدغم ہو چکا ہوں.. میرے منتظر مت رہنا..

''ظہیرالدین تم کہاں ہو؟''

''مجھے خود خبر نہیں کہ میں کہاں ہوں.. لیکن میری حیات کا سب بوجھل پن رخصت ہو چکا ہے اور میں.. لطیف، ہلکا پھلکا اڑا جاتا ہوں.. ایک مائی بوڑھی ہو چکا ہوں..''

●○●○●○●

''یہ کونسا دریا ہے؟''

ڈوناؤ..استروس..ڈونا ریا..

ہمیل نے عینک اتاری، ریلوے ٹائم ٹیبل بند کر کے وی آ نا کا نقشہ سمیٹنے لگا'' جانتے نہیں یہ وہی مشہور بین الاقوامی دریا ہے، کسی کا ڈونا، کسی کا ڈوناؤ اور سب کا بلیو ڈینیوب..''

سب کا بلیو ڈینیوب.. مصطفےٰ اسلام گئی شب میں اُسی بالکونی پر تنہا بیٹھا جہاں اُس نے اس داستان کے آغاز میں خود اپنا تعارف کروایا تھا اپنے آپ سے یہ سوال کرتا تھا کہ کیا میرا بھی ڈینیوب..وہ ایک طویل مدت اُس سے جدا رہا تھا.. اپنے آبائی کوچے کمانگراں کے اُس گھر میں جس کی رنگین شیشوں والی کھڑکی نیچے بہتے بازار میں کھلتی تھی اور جس کی سِل پر کبھی تین موم بتیاں روشن ہوا کرتی تھیں اور اُن کی جھلملاہٹ میں کراچی ایئرپورٹ پر انتقال جانے والے خوش رو اور خوش اطوار اور شرمیلے سے عارف نقوی کا چہرہ جلتا بجھتا تھا، جس کے ہمراہ لاہور کی جانب آہنی پٹڑی پر گڑگڑاتی ٹرین کے ڈبے کی کھلی کھڑکیوں میں سے اُس کی دھرتی کی دھول غبار کی صورت اُن کے چہروں پر اترتی تھی..اور وہ اسے پونچھنے سے گریز کرتے ایک خودکش سواری رکشا پر سوار لوہاری دروازے کے باہر اترتے تھے..تو وہ اس دریا سے ایک مدت تک جدا رہا..لیکن جب وہ لوٹا، جینا اُس کی لاڈلی اُس کے بدن کے ساتھ لپٹی، روجا کے برس اُس کی قربت سے زائل ہوئے لیکن جب اُس نے ڈینیوب کے پانیوں پر نگاہ کی تو وہ بدستور اُس کی آمد سے بے خبر بہتے جا رہے تھے..اُن میں اُس کی جدائی کا کچھ ملال نہ تھا..وہ اگر لوٹ کر نہ آتا تو بھی وہ یونہی بہتے رہتے..اُن کے بہاؤ میں کچھ فرق نہ آتا..لیکن جب وہ چاروں بُدھ بھکشو اپنے اپنے نروان کی آرزو میں راوی کے گدلے پانیوں کے کناروں پر براجمان تھے تو اُسے محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ اُن سے جدا ہو جائے تو اُس کی جدائی میں رنجیدہ ہو کر راوی کے بہاؤ میں ایک الم ناک ٹھہراؤ آ جائے گا..

تو کیا ازل سے جب آپ اپنی ماں کی کوکھ میں سے ظاہر ہوتے ہیں تو اُسی لمحے آپ کی پیدائش کے ساتھ ہی آپ کے دریا، شجر اور پھل پھول اور بُوٹے بھی جنم لیتے ہیں اور آپ بے شک اُنہیں تیاگ کر اجنبی دریاؤں، ناشناسا شجروں اور انجانے پھل پھولوں اور بوٹوں کی قربت میں اپنی حیات کا بیشتر حصّہ بسر کر لیں تب بھی وہ تمہیں اجنبی، ناشناسا اور انجانا ہی جانتے ہیں اور آپ کی جدائی سے قطعی طور پر ملول اور رنجیدہ نہیں ہوتے..نہ آپ سے گلے ملتے ہیں اور نہ ہی آپ کے بدن میں اتر کر شریانوں اور رگوں میں دوڑتے خون میں شامل ہوتے ہیں..بس الگ الگ سے رہتے ہیں..

روجا ایک مطمئن اور آسودہ حالت میں خوابیدہ تھی..اور جینا..اپنی خانہ بدوشی ترک کر کے..اُس سے تائب ہو کر..اور اب ایک مدت سے اُس نے کوئی نظم نہ لکھی تھی بوداپسٹ یونیورسٹی میں ''جپسیز اِن لاہور'' کے موضوع پر لیکچر دیتی

اپنے ایک ایسے کولیگ کے عشق میں مبتلا ہو کر جو دعویٰ تو یہی کرتا تھا کہ اُس کی رگوں میں بھی خانہ بدوش خون موجزن ہے.. اُس کے فلیٹ میں منتقل ہو چکی تھی..

''اے ارجن..''

مصطفیٰ اسلام پر اسی خصوصی ہنگیر ین وائن کا جو کہ بہت ہلکی تھی اتنا تو اثر نہ ہوتا تھا کہ اُسے یکدم اُس بالکونی پر براجمان اُسے پکارتی ہوئی ایک آواز سنائی دینے لگے کہ..اے ارجن...

اے ارجن..تم کیسے سورما ہو کہ مہابھارت کے یدھ میں اترے ہی نہیں..اپنی جان بچا کر اپنی بیوی کی چاہت اور بیٹی کی اُلفت میں پسپا ہو گئے ہو...میں جو کہ کرشن ہوں..الحمرا ہال نمبر ایک کی سٹیج پر تنہا کھڑا..ایک تنہا سرچ لائٹ کی روشنی میں آیا ہوا ہوں لیکن میں نے ابھی تک ہار نہیں مانی..نہ ڈھال زمین پر رکھ کر شکست تسلیم کی اور نہ ہی اپنے بھالے کو کوروؤں کے سپرد کیا ہے..

مصطفیٰ اسلام یکدم ہڑبڑا کر بالکونی سے یوں اٹھ بیٹھا کہ وہ دسویں منزل کی بلندی سے نیچے ڈینیوب میں گرتا گرتا بچا..''تم کہاں ہو عارف نقوی؟''

میں نہ تو ہتھیار ڈال دینے والوں میں سے ہوں اور نہ ہی مہابھارت کے یدھ سے فرار ہونے والوں میں سے ہوں کہ میں..کرشن ہوں..میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں رام کی سیتا کی راکھ ہے..

●○●○●○●

''ارجن..'' اُس کے دائیں ہاتھ پر آ غا ارجن..اپنے چمکیلے لبادے اور گتّے کے سنہری تاج کو ایک ربڑ بینڈ سے اپنے ماتھے پر باندھے شرارت سے مسکراتا تھا کہ آج میرے یار کا دماغ چل گیا ہے..اُس میں کچھ خلل آ گیا ہے کہ ہم نے لکھنؤ کی سٹیج پر جو انقلابی ڈراما کھیلا تھا اُس میں کرشن کے یہ مکالمے تو ہرگز نہ تھے..اور یہ اتنے جوش میں ہے کہ اگر میں نے اسے ٹوکا تو یہ مجھ پر برس پڑے گا..تو ٹھیک ہے..یہ کہہ لے جو کچھ اس کے خلل زدہ دماغ میں آتا چلا جا رہا ہے..کہہ لے..

''سنوارجن..'' عارف نقوی نے جیسے اُسے ڈانٹا ''میں دوہراتا ہوں..جب دھرم کمزور پڑ جاتا ہے اور ادھرم بڑھ جاتا ہے تو میں اپنے آپ کو اس پاپ بھری دنیا میں ظاہر کرتا ہوں..'' اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا، اُس میں سے سرخی پھوٹتی لگتی تھی اور اُس سرخی میں سے پسینے کے قطرے بلبلوں کی مانند اٹھتے ٹپ ٹپ اُس کی آنکھوں میں گرتے تھے اور وہ آنکھیں بھی بیر بہوٹی لال گلال ہوئی جاتی تھیں..''اے ارجن..سارے جانداروں کے اندر میں ہوں..میں آغاز ہوں اس کائنات کا اور میں ہی آخر ہوں..میں تُلسی کے مقدس انگلیوں میں مسلے جانے والے ایک پتے کی مہک میں، میں ہوں..پیپل کے ہر پتے پر جتنی بھی رگیں ابھرتی ہیں وہ میرا ماتھا ہیں اور ہر رگ تب جنم لیتی ہے جب ایک پورا جنم گیان دھیان اور بُھوک پیاس میں بیتے تو تب ایک رگ پیپل کے پتے کی ہتھیلی پر ابھرتی ہے..اشوک کے شجر کی گھناوٹ میں کھِلتے ہر سرخ پھول میں میرا لہو دوڑتا ہے..گیندے کے پھولوں کی زردی میں میرے سانس ہیں..مولسری..کے شجر سے گرنے والے نازک ملوک پھولوں میں جو ایک ناگوار لیکن سحر انگیز مہک اٹھتی ہے وہ میرے بدن سے ہی چھو کر گئی ہے..ارجن، کیا تم سُن رہے ہو؟''

وہ یہ مکالمہ ادا کرتے ہوئے دائیں جانب سٹیج کے اُس حصّے کی جانب مڑا جہاں ابھی ابھی آغا ارجن شرارت سے مسکراتا تھا..وہاں کوئی بھی نہ تھا..گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا..

یکدم عارف نقوی کی پسینہ آلود کنپٹی کی رگیں ایک زخمی چڑیا کے دل کی مانند دھک دھک پھڑکنے لگیں..اُسے احساس ہوا کہ مکالموں کی ادائیگی کے دوران وہ اپنے پُر جوش اضطراب میں اپنی آواز اور سکت کی حدیں پار کر گیا ہے اور اُس کے سر میں درد کی ایک لہر اٹھی ہے اور کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگی ہیں تو شائد اُس کا بلڈ پریشر ایک فوارے کی مانند شُوٹ کر گیا ہے، اُس کی آنکھوں میں بھی دھندلاہٹ کے جالے گھنے ہونے لگے تھے..اپنے لہجے کی بلند آہنگی اور اضطراب کو دھیما کرنے کی سعی کرتے ہوئے اُس نے سرگوشی کی ''سُنوارجن..جب دکھ سکھ، الفت، نفرت، گرمی اور سردی سے وابستگی ختم ہو جائے تب تمام بے چینی، حرص، لالچ اور خوف آتما سے رخصت ہو جاتے ہیں اور تب من کو شانتی اور سکھ نصیب ہوتے ہیں..سانپ کو دھن سے پیار ہوتا ہے تو خزانوں کی حفاظت سانپ کرتے ہیں..انسان جن خیالات پر مرتا ہے اُنہی خیالات کا صلہ پاتا ہے..پرماتما اُسے تب یاد آتا ہے جب وہ دم توڑ رہا ہوتا ہے..جوگی وہ ہے جو ہر دم اُسے یاد رکھے..دل کی ساری توجہ آرام، آسائش، لذت اور ذائقے سے وابستہ ہے..دل کا رخ بیرون کی طرف مائل ہے..اندرون کی جانب نہیں..اے ارجن..''

ہال نمبر ایک کی اگلی نشستوں پر براجمان جس کی موجودگی سے عارف نقوی کب کا غافل ہو چکا تھا جس کی سٹیج پر کھڑے ایک آڈیشن دیتے ہوئے بوڑھے اداکار سے بیگانگی اور بیزاری اس دوران ایک اطاعت میں بدل چکی تھی اسے محسوس ہوا کہ وہ اسے زندگی کی ہر اُس رمز سے آگاہ کر رہا تھا جس سے وہ اب تک غافل تھا..اُس کی سوچ میں جتنے بھی الجھنوں اور شکوک کے جالے تھے وہ اُس کی تقریر سے زائل ہوئے جاتے تھے..اگرچہ وہ جانے کیوں یکدم اپنی بلند آہنگی کو ترک کر کے ایسی سرگوشیوں میں اتر آیا تھا جو اُس کی سماعت کے پردوں پر ثبت ہوتی چلی جاتی تھیں..وہ منہ کھولے ایک بے وقوف بچے کی مانند اُسے تکتا جاتا تھا..بہت دیر سے اُس نے آنکھیں نہ جھپکی تھیں..یہ نوجوان ہدائت کار تھا..

''ارجن..دوست، بیوی بچوں کو چھوڑ دینے کا نام تیاگ نہیں..بلکہ اُن کی کشش اور محبت کو دل سے پاک کر دینے کا نام تیاگ ہے..دل میں پرماتما کے سوا کسی اور کا بسیرا نہ ہو یہ تیاگ ہے..عمل ترک کر دینے سے انسان سنیاسی نہیں ہوتا، سنیاسی وہ ہے جسے صلے کی تمنا نہ ہو۔''

اُس کی کنپٹی بدستور دھڑکے جا رہی تھی جیسے اُس کے اندر کوئی ایسی رگ ہے جو خون کے خلفشار کی تاب نہ لا کر پھٹ جانے کو ہو..اُس رگ کو دلاسہ دینے کی خاطر جب اُس نے اپنی لرزتی ہوئی انگلیاں اُس پر رکھیں تو اُن کی پوریں بھی اُس کی دھڑکن کی بے اختیاری سے مغلوب ہو کر دھڑکنے لگیں..وہ تو خبر نہ رکھتا تھا کہ اُس کے خود ساختہ کرشن کے مکالمے نوجوان ہدائت کار کے دل و دماغ پر ایک سحر کی مانند طاری ہو چکے ہیں اور وہ صرف اسے تنہا سٹیج پر کھڑا کر کے ایک منفرد نوعیت کا کھیل پیش کرنے کے بارے میں سوچے چلا جا رہا ہے اور عارف نقوی اسی وسوسے میں مبتلا تھا کہ ابھی تک اُسے کیوں اشارہ نہیں ملا کہ وہ اپنی ادائیگی ختم کر کے سٹیج سے اتر آئے کہ وہاں دوسرے امیدوار بھی منتظر تھے اور کیا نوجوان ہدائت کار اُسے اپنے ڈرامے میں ایک کردار دینے کے لئے رضامند ہے یا اسے رد کر دیا گیا ہے..

کنپٹی میں جو دھک دھک مسلسل اضطراب میں تھی وہ ہولے ہولے کسی رگ میں سفر کرتی ماتھے سے دل کے نواح میں اترتی محسوس ہو رہی تھی..اور اُس دل کی پوشیدگی کے باہر جیکٹ کی اندرونی جیب میں اُس کی راکھ تھی جو شائد اُسی روز اُسے راوی میں بہا دینی چاہیے تھی پر وہ اُس سے مکمل طور پر بچھڑ جانے کے خیال سے سہم گیا تھا..اُس کی اندرونی جیب میں ہلٹرڈ کی جو سُلگاہٹ تھی وہی اُسے آسرا دیتی تھی، اُس کی تنہائی کا مداوا تھی، راتوں کی رفیق تھی، اُس سے بچھڑ کو وہ بھلا کیسے اس پرائی زندگی کا سامنا کر سکتا تھا جو اب ایک پرائے دیس میں بسر ہو رہی تھی..

ظہیر الدین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئے گا..کیا وہ نیم اندھیرے میں غرق کسی نشست پر بیٹھا ہوا ہے..اُس نے وعدہ کیا تھا..کہاں چلا گیا..

معاً وہاں الحمرا کی سٹیج پر چھت سے اترتی اکلوتی سرچ لائٹ کی زد میں آئے ہوئے جیسے جنگی کیمپ سے فرار ہونے والا ایک قیدی رات کی تاریکی میں یکدم کسی گارڈ کی حرکت کردہ سرچ لائٹ کی زد میں آ جاتا ہے اُس کے اندر ایک عجیب سوال نے جنم لیا..دیوار برلن کے پتھروں پر وہ مرتبان اوندھا کر کے اُس نے ہلٹرڈ کی جتنی راکھ بکھیری تھی، اُس میں ہلٹرڈ کے بدن کے کونسے حصے بکھر گئے تھے اور اُس کی جیکٹ کی اندرونی جیب میں جو باقی ماندہ راکھ ہے اُس میں اُس کے کونسے نقش ابھی تک پنہاں ہیں..کیا اُس کے سنہری بالوں کی ایک لٹ..شائد اُس کے وہ ہونٹ جو بڑھاپے کے باوجود، مرجھائے ہوئے بھی اپنی

گلاب رنگت میں رنگے ہوئے تھے..دونوں نہ سہی، شائد ایک ہونٹ یا ایک ہونٹ کا کچھ حصہ، شائد وہ حصہ جو کناروں کے نزدیک ہو کر خم کھاتا تھا..شاید وہی خم..اُس کے بدن کے مدھرپن کا کوئی پل بھر کا سریلا الاپ..دونوں آنکھیں نہ سہی، کسی ایک آنکھ کا کچھ نُور جس میں اُس کا اپنا سراپا ابھی تک نقش ہو..لیکن شائد نہیں یقیناً اُس کا بلٹرڈ کا دل کہ وہ اُس کے سینے کے ساتھ لگا مسلسل سلگتا دھڑکتا اپنے ہونے کا پتہ دیتا تھا..اگر اُس کے سامنے اگلی نشستوں پر نیم تاریکی میں ہیولے ہوتے ہدائت کار کی جانب سے ابھی تک کوئی اشارہ نہ آیا تھا تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ اُسے اپنی ادائیگی جاری رکھنی چاہئے..

''اے ارجن..میں تمہاری بُدھی میں بھیم کے بول ڈالتا ہوں..اُس نے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم دریا کی جھاگ کی مانند بہاؤ کے ساتھ بہے چلے جارہے ہیں، کوئی جو بھی سوچے یا کرے، ہم ہر لحہ بڑھاپے اور موت کی جانب بہتے چلے جارہے ہیں..کون جانے ہم کب تک زندہ رہتے ہیں..تو اے ارجن موت نیزوں اور بھالوں کے بدن میں اترنے سے واقع نہیں ہوتی بلکہ پرماتما کو بُھلا دینے سے ہی انسان مرجاتا ہے..اور تم جانتے ہو کہ موت کی حقیقت کیا ہے؟ جانتے ہو ارجن..'' عارف نقوی کے اظہار میں فنا کی سرد ایسی گونج تھی کہ سٹیج کی چھت پر تنے ریشمی پردے یوں تھرائے جیسے موت کی آخری ہچکی سے انسان کا وجود تھرآتا ہے..سامنے اندھیرے میں روپوش ہدائت کار اور بقیہ لوگوں کے بدن بھی فنا کی سردی محسوس کرتے کپکپانے لگے..''جب تم ایک نظریئے کو ایک دھرم کی مانند اپنی رگوں کے خون میں شامل کر لیتے ہو اور اُس کے لئے اپنی دھرتی اور پُرکھوں کا دھرم تیاگ دیتے ہو اور پھر..تم چاہے کتنی ہی بے جگری اور بہادری سے اس مہابھارت کے یُدھ میں جنگ کرو، تمہارے نیزے ٹوٹ جاتے ہیں، تمہارے بھالے موم ہو جاتے ہیں، تم نہتے مارے جاتے ہو..اے ارجن میں بھی یونہی تاریک راہوں میں مارا گیا..میں ہارنے والوں کے قبیلے میں سے نہ تھا، پر مجھے لکشمی کے ندیدے اور لالچی پجاریوں نے مات دے دی..ارجن دراصل یہی موت ہے..تم سے وعدہ کیا جاتا ہے لیکن نہ تخت اچھالے جاتے ہیں اور نہ تاج..نہ ہی خلق خدا راج کرتی ہے..اور تم تاریک راہوں میں مارے جاتے ہو..تمہارے سامنے تمہارا وہ بھائی نہیں ہے جو مکھن چرانے والا نٹ کھٹ لڑکا تھا، جس پر گوپیوں کے دل اشوک کے سرخ پھولوں کی مانند نچھاور ہوتے تھے اور جو ازل بھی ہے اور ابد بھی..جس کے دم سے اس کائنات میں روشنی ہے..جو کبھی بدھ تھا اور کبھی عیسیٰ ہوگا اور کبھی کالی کملی والا ہوگا..تمہارے سامنے اُس کی ارتھی ہے کہ وہ اپنے نظریات کی شکست کی تاب نہ لاسکا..اے ارجن اب تم تو سُن رہے ہوگے لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا کہ یہی موت کی حقیقت ہے..'' اُس کی کھرج کی گونج مدھم پڑتی نرخرے میں سے برآمد ہونے والے ایک اور سانس کھینچنے کی جدوجہد کی اذیت میں مبتلا ہچکی ہونے لگی..

''آریف..'' اُس کی جیب میں ملفوف راکھ نے سرگوشی کی..''آریف..تمہاری شکل میرے قریب ہوتی جاتی ہے..نہیں، تم میرے پاس فنا کی تاریکی میں مت آؤ آریف..''

''ہم..دریا کی جھاگ..کی مانند..بہاؤ کے ساتھ..بہتے چلے جارہے ہیں اور....اور....''

کنپٹی میں پھڑکتی رگ یکدم جیسے رعشہ زدہ ہوگئی اور وہ بے اختیاری سے دھڑ دھڑ دھڑکتی اُس کے اندر کے اندر اُتر کر اُسے ادھیڑتی چلی گئی، رگ و پے میں ناقابل برداشت اذیت کے بلبلے پھوٹنے لگے..سرچ لائٹ کی تیز آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی اُس کی آنکھوں میں اتھاہ سیاہی بھرتی چلی گئی..

اور جب وہ سٹیج پر گرا.... تو لکڑی کے فرش پر گرنے سے ایک ایسے انہدام کی گونج پیدا ہوئی جو کسی بلند قامت شجر کے گرنے سے ایک جنگل میں جنم لیتی اُس میں پوشیدہ اور چہکتے ہوئے پنکھ پکھیروؤں کو خاموش کر دیتی ہے..اُن کی چونچوں کے گرد فنا کے سیاہ دھاگے گسے جاتے ہیں..

کچھ لمحے اُس اندھیری چُپ میں بیتے جن کے دوران نوجوان ہدائت کار اور اُس کے ہم نشینوں نے یہی جانا کہ بوڑھا اب موت کا ناٹک کھیل رہا ہے..لیکن جب وہ بہت دیر تک سٹیج پر بے حس وحرکت پڑا رہا تو وہ سب اٹھتے ہوئے سٹیج پر چڑھ آئے..اُسے پکارا..برابر میں بیٹھ کر سرگوشیاں کیں..

یہ کون تھا..کہاں سے آیا تھا..

اُن کے پاس درخواستوں کے ایک پلندے میں..کہیں ایک درخواست تھی کہ وہ ایک جرمن کھیل کے اردو روپ میں اداکاری کا خواہش مند تھا..اس کے سوا اُس کی اور کوئی شناخت نہ تھی..ابتدائی صدمے سے سنبھل کر اس کا اتہ پتہ جاننے کی خاطر انہوں نے اُس کی جیبوں کو ٹٹولا کہ شاید ان میں سے کوئی شناختی کارڈ یا ڈرائیونگ لائسنس یا ملاقاتی کارڈ دستیاب ہو جائے جو نہ ہوا تو نوجوان ہدائت کار نے دل کڑا کر کے کہ اس سے پیشتر کسی مردے کے پیراہن کی تلاشی لینے کا اس کا کچھ تجربہ نہ تھا اُس کی اندرونی جیب کو ٹٹولا تو اس میں سے کوئی پہچان برآمد نہ ہوئی سوائے ایک پوٹلی کے..اُس نے پوٹلی کی گرہ ڈھیلی کر کے اُسے کھولا محض اس تجسس کی خاطر کہ شاید اس میں اس مردہ ہو چکے بوڑھے کا کچھ اتہ پتہ ہو..

اور اس میں..کچھ راکھ تھی..جو نوجوان ہدائت کار کی بے احتیاطی کے باعث کہ اُس کی انگلیاں خوف سے سرد ہو کر لرزتی تھیں، اُس پوٹلی کے کھل جانے سے گرنے لگی..عارف نقوی کے مردہ ہو چکے چہرے پر گرنے لگی..اُس کا منہ ابھی تک کھلا تھا اور اُس کے بے جنبش لبوں کی بناوٹ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ..اے ارجن کہتے کہتے یکدم مُردنی میں چلے گئے تھے..نوجوان ہدائت کار کو شائبہ سا ہوا کہ جب وہ راکھ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں پر بکھری تو شاید وہ لمحہ بھر کے لئے زندہ ہوئیں اور اُن پر ایک چہرہ نقش ہوا لیکن اگلے ہی پل پھر سے بے جان ہو گئیں..

اُس راکھ میں یقیناً ہلٹرڈ کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ تھی کہ وہ اُس کے چہرے پر بجھی جاتی تھی..ایک ہونٹ کا وہ خم تھا جو اُس کے سرد ہو چکے ہونٹوں پر ثبت ہوتا اُنہیں چومتا تھا..ایک آنکھ کا کچھ نور تھا جس میں سوائے عارف نقوی کے خدوخال کے اور کوئی تصویر نہ تھی اور ہاں..راکھ کے ہر ذرے میں ابھی تک ایک دل دھڑکتا تھا اور جونہی جس کے لئے وہ اب تک دھڑکتا تھا وہ مردہ ہوا تو وہ بھی تھم گیا..راکھ، راکھ میں..اور مٹی، مٹی میں!

اُس شب نہ تو ہمایوں آغا کے عطا کردہ متروک شدہ مالی کوارٹر کے چھتے بوسیدہ ہو چکے شہتیر میں وہ سانپ سرسرایا اور نہ ہی چوہے کا وہ نرم دانتوں والا بچہ اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا کہ وہ بھی ایک ملال میں تھے..

''کنول کے پتے اور مرغابی کے پَر کی چکنائی اُنہیں پانی میں رہتے ہوئے بھی خشک رکھتی ہے..دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیاداری سے آزاد رہو اور جب دنیا چھوڑنے کا وقت آئے تو تمہیں کچھ رنج نہ ہو..''

اے اَرجن!

20 مارچ 2010ء

مستنصر حسین تارڑ

منہ وَل کعبے شریف (سفرنامہ حج)
غارِ حرا میں ایک رات
مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: نکلے تری تلاش میں، اُندلس میں اجنبی، خانہ بدوش
ہنزہ داستان
سفر شمال کے
کے ٹو کہانی
نانگا پربت
یاک سرائے
سنولیک
دیوسائی
برفیلی بلندیاں
چترال داستان
رتی گلی
بہاؤ
راکھ
قربتِ مرگ میں محبت
ڈاکیا اور جولاہا
قلعہ جنگی
پیار کا پہلا شہر
جپسی
دیس ہوئے پردیس
نکلے تری تلاش میں
اندلس میں اجنبی
خانہ بدوش
نیپال نگری
پرندے
پکھیرو
کارواں سرائے
ہزاروں ہیں شکوے
پرواز
مُورت
کالاش
گزارا نہیں ہوتا
چک چک
اُلّو ہمارے بھائی ہیں
سنہری اُلّو کا شہر
شہپر
ہزاروں راستے
سیاہ آنکھ میں تصویر
سورج کے ساتھ ساتھ
شمشال بے مثال
شُتر مُرغ ریاست
پُتلی پیکنگ کی
بے عزتی خراب
گدھے ہمارے بھائی ہیں

Rs. 700.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2595-7
ISBN-13: 978-969-35-2595-3
9789693525953